جشن آزادی
دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ
جاسوسی ڈائجسٹ کراچی
اگست 2025
قیمت 200 روپے
بانی
معراج رسول
www.pklibrary.net

جاسوسی ڈائجسٹ

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

مدیر : [illegible]
نائب مدیر : ڈاکٹر نعیم احمد

مارکیٹنگ و
سرکولیشن مینجر
ثمر عباس
0301-2454188

مدیر اعلیٰ
چینی نکتہ چینی 07
قارئین کی کرم فرمائیاں اور کج ادائیاں
نامہ و پیام، محبتیں، عنایتیں اور شکایتیں

یعقوب بھٹی
لہورنگ 12
سنسنی خیز کرداروں کے وحشت انگیز
روپ میں گندھی ایک لہورنگ داستان

خلیل جبار
پُراسرار وارث 49
دولت اور نشے کی لت میں
گرفتار میاں بیوی کا پُراسرار معاملہ

بشریٰ ماجد
سرخ گلاب 55
خوشبو بکھیرتے سرخ گلابوں
کا حیرت انگیز کمال

طاہر جاوید مغل
سربکف 60
سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات
سے لبریز ایک لہورنگ داستان

احمد سلیم سلیمی
وطن فروش 85
وطن کی سلامتی اور انسانیت کی بھلائی
کے لیے قیامت خیز [illegible]

افشین نسیم
دشمن 93
ایک دل دوز واقعے کی
بازگشت میں چھپے راز

مظہر حسین
سایہ 97
قتل کی سنسنی خیز واردات...... قاتل
نے تقلید و روایت کا چولا پہن رکھا تھا

جلد 55 • شمارہ 08 • اگست 2025 • زرِ سالانہ 3000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 200 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون (021) 35895313 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

digest library.com
Digest Novels com

حسام بٹ
دہر 118
چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی ہوش رُبا حیلہ سازیاں

عائشہ نصیر
ضرر رساں 141
مغربی معاشرے میں پھیلی اچھائیوں اور برائیوں کی ایک جھلک دکھاتی تحریر

عکس فاطمہ
بدلہ 155
انتقام لینے والے شخص کا چونکا دینے والا انجام

ماہ نور
زیرِ تشدد 157
مغربی معاشرے کی وہ جھلک جو بہت سی نگاہوں سے اوجھل ہے

میرزا عمران بیگ
ہوس گر 162
ہمارے ملک کے محافظوں کی کارکردگی کا نرالا انداز......

علی عباس
پیش رفت 181
قتل کی وارداتوں کے معمے کے لیے کی جانے والی پیش رفت کا احوال

محمد ذیشان اختر
وطن کی مٹی 200
جشنِ آزادی کے حوالے سے وطن کی مٹی کے متوالوں کا دل گداز فسانۂ محبت

ادارہ و قارئین
تراش خراش **
اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور ذوق کے لیے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

چینی، نکتہ چینی

صبا علی

digest library.com

عزیزانِ من...... السلام علیکم!

اگست 2025ء کا شمارہ آپ کی نذر ہے۔ تمام پاکستانیوں کو جشنِ آزادی بہت بہت مبارک ہو...... 14 اگست...... یہ وہ تاریخ ہے جب ایک خواب نے حقیقت کا روپ دھارا...... اور غلامی کی زنجیریں امید اور ارادوں کی مضبوطی سے ٹوٹ کر بکھر گئیں۔ یہ ارضِ پاک ہماری شناخت ہے۔ جرأت، فکر و اظہار اور امید و جستجو کا عظیم مسکن ہے۔ جشن آزادی منانا ہے تو صرف جھنڈا نہ لگائیں...... اپنے کردار میں وقار...... قول میں سچائی اور دل میں پاکستان بسالیں۔ بقول شاعر

بیزار ہیں جو جذبۂ حُبُّ الوطنی سے
وہ لوگ کسی سے بھی محبت نہیں کرتے

پاکستان اور پاکستانیوں کے دکھ سکھ کی پروا کریں...... گہرے ادراک اور سچی تڑپ سے حالات و حقائق کا سامنا کریں۔ حالیہ دنوں میں ہونے والی بارشوں نے ملک کے تقریباً ہر حصے کو شدید متاثر کیا ہے۔ تیز سیلابی ریلوں نے ہزاروں ایکڑ زمین اور سیکڑوں مکانات کو خس و خاشاک کی طرح تباہ کر دیا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ وہ پانی جو ایک لمحے میں زندگی ہے تو دوسرے لمحے میں موت کا ہرکارہ...... ربِ کائنات تمام انسانوں کو قدرتی آفات سے محفوظ و مامون رکھے۔ ایسی ہی حفاظت کی دعا اُن بے گھر...... بے بس...... لاچار فلسطینیوں کے لیے ہے جو اس وقت ایک خونی درندے کی درندگی اور وحشت کا شکار ہیں...... اس کی دہشت گردی کے سامنے پوری دنیا کے صاحبِ اختیار سرنگوں ہیں اور مجرمانہ خاموشی کا لبادہ اوڑھے سو رہے ہیں۔ درندہ صفت اسرائیل کا سربراہ نیتن یاہو اب بھوک کا ہتھیار استعمال کر رہا ہے۔ اس کی درندگی نے معصوم...... چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھوک کی موت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ خود غرض...... نااہل رہبر و رہنماؤں کے لیے......

رہنماؤں سے بس اتنا گلہ ہے مجھ کو
ان کے ہونٹوں پہ جو باتیں ہیں وہ ذہنوں میں نہیں

Digest Novels .com

سکھر سے سونالی شیکھر کی سنجیدہ باتیں ”میں خیر خیریت سے ہوں، امید ہے آپ بھی اچھی ہوں گی۔ (بالکل) جاسوسی ڈائجسٹ اس بار دس جولائی کو ملا۔ سر بکف کے بارے میں اپنے جذبات بیان کرنے کے بعد مجھے امید نہیں تھی کہ میں پھر لیٹر بھیجوں گی لیکن چینی نکتہ چینی میں اتنے بھرپور انداز میں مجھے ویلکم کیا گیا ہے کہ میں شکریہ کہنے کے لیے واپس آگئی۔ (یہ تو بہت اچھا کیا) محمد حسنین کا بہت شکریہ، انہوں نے اتنے اچھے سے ویلکم کیا۔ (صنفِ نازک کے لیے بہت حساس ہیں نا) سہانا شیخ کا انداز بھی بہت پیارا لگا۔ یہ سمجھدار اور ذہین لڑکی ہیں اس لیے انہوں نے امجد رئیس کی کہانی میں بے وفائی نوٹ کی ورنہ تمام مرد حضرات تو آفاقی محبت کی تعریفیں ہی کیے جا رہے تھے۔ باقی بھائیوں کا بھی تھینک یو انہوں نے ویلکم کیا لیکن میں ایک بات کی وضاحت کر دوں کہ میری تعلیم پاکستان کی ہے اور میں اتنی ہندی نہیں جانتی جتنی مجھے مخاطب کر کے بولی جا رہی ہے۔ سر بکف کی یہ قسط بھی بہترین تھی۔ شاہ زیب لاسٹ ایپی سوڈ میں اپنی جھلک دکھا چکا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ واقعی میرا فیورٹ انگارے کا شاہ زیب ہے۔ اس ایپی سوڈ میں تو یقین ہو گیا کہ الٹی میٹ ہیرو کی واپسی ہو گئی ہے۔ لیکن یہ کیا مغل صاحب میرے فیورٹ ہیرو کو اتنا نیگیٹیو کیوں دکھایا ہے۔ اوپر سے اسے تابش سے فائٹ میں ہیرو سے زیرو بھی کر دیا۔ ایک ایم ایم اے چیمپئن کے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟ ایک اور چیز بھی نوٹس کی میں نے کہ انگارے میں شاہ زیب کا لہجہ نرم ہوتا تھا اور وہ اتنی اچھی اردو بھی نہیں بولتا تھا۔ یہاں پر وہ پنجابی فلموں کے اسٹائل والے ڈائیلاگ بولتا ہوا بھی عجیب لگ رہا ہے۔ (اتنے عرصے میں ہمارے جیسا نہیں ہو گا کیا) مغل صاحب نے اسکول پر بم حملہ اور بچوں کی سسکتی بلکتی تصویر کشی اتنی اچھی کی کہ میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اوپر والے سے دعا ہے کہ ہمارے ملک پر اپنا کرم کرے اور ان دہشت گردوں سے نجات دے۔ فینٹسی اور سائنس فکشن مل جاتے

ہیں تو دہر جیسی کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ دہر ﷲ سلو سلوی چل رہی۔ اسے پڑھنے میں مزہ بھی آتا ہے اور بوریت بھی ہوتی ہے۔ ٹیلی پورٹیشن کی سائنس البتہ اچھی ہے۔ ٹوناف کے بارے میں پڑھ کر حیرت ہوئی۔ حسام بٹ کیا بتانے اور کیا بتانے کی کوشش کر رہے، سمجھ نہیں آئی۔ شاید نیکسٹ اپی سوڈ میں کچھ جانکاری حاصل ہو جائے۔ شارٹ اسٹوریز میں سب سے اچھی مفرور لگی۔ زر زمین بھی اچھی تھی اور فنکار بھی پسند آئی۔ بشریٰ امجد بہت اچھا لکھتی ہیں۔ زہریلی مکھی کا نام پڑھ کر بہت ہنسی آئی۔ کہانی بھی اچھی لگی۔ زویا صفوان تو میری فیورٹ ہیں لیکن میراث اتنی زیادہ پسند نہیں آئی۔ یہ سچ ہے کہ پاکستان اور انڈیا آپس میں دشمن دیش ہیں لیکن اس لڑائی میں دیشوں کی بات ہونی چاہیے۔ لاسٹ منتھ منظر سلیم ہاشمی کی کہانی میں بھی اور اس منتھ زویا صفوان کی کہانی میں انڈیا کے ساتھ ساتھ کچھ ہندو ازم کا ایسا انداز دکھایا گیا جو مجھے صحیح نہیں لگا۔ انڈین گورنمنٹ تو ظالم ہے اور مائنورٹیز کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتی لیکن سب ہندو برے نہیں ہوتے ہیں۔ ان کو بھی اچھے اور مثبت انداز میں رائٹرز دکھا سکتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ بات رائٹر کو بری نہیں لگی ہوگی اور وہ اس پوائنٹ آف ویو کو بھی سامنے رکھیں گے۔ احمد سلیم سلیمی کی انتقام کے شعلے ایک زبردست ناول تھا۔ کرپشن اور جرم کے خلاف کام کرنے والوں کی بے بسی پڑھ کر افسوس ہوا۔ کاش ماہین جیسی لڑکیوں کو قانون ہاتھ میں نہ لینا پڑے اور وہ انتقام کے بجائے انصاف پر یقین رکھیں۔ باقی ڈائجسٹ ابھی نہیں پڑھا بس سرکیف کی اگلی قسط کا انتظار ہے۔''

ملتان سے محمد حسنین کے کھٹے میٹھے اعتراضات ''جولائی کا جاسوسی ڈائجسٹ ہلکی پھلکی بارش میں ملا۔ ملتان والوں کے لیے تو یہ موسم حد سے زیادہ خوشگوار ہوتا ہے اوپر سے جاسوسی کی آمد نے موڈ مزید خوشگوار کر دیا۔ ٹائٹل روٹین والا ہی تھا۔ آرٹسٹ نے بہت بڑا حصہ خالی چھوڑ کر نیلا رنگ پھیلا دیا۔ بال لہراتی حسینہ کے تاثرات ایسے تھے جیسے ابھی گانے پر پرفارمنس دے گی ''میرا تن من نیل و نیل'' پورے ٹائٹل میں دیکھنے کے قابل بس یہی تھا۔ پرانے زمانے کا فون اٹھائے اور پیٹھ میں خنجر کھا کر لیٹے ہوئے کارٹون بالکل بھی پسند نہیں آئے۔ کئی بار اس حوالے سے شکایت کی ہے کہ جاسوسی ڈائجسٹ کا ٹائٹل ایسے کارٹون ڈیزرو نہیں کرتا لیکن مجبوری کا نام شکریہ ہی ہو چکا ہے۔ فہرست شکل سے اچھی لگی۔ محرم الحرام کی اہمیت کو اداریے میں نہایت خوبی سے اجاگر کیا گیا۔ خود کو پہلے نمبر پر دیکھ کر خوشی سے زیادہ حیرت ہوئی۔ اب اتنی دور سے صرف تعریف کے ٹوکرے بھیجے جا سکتے ہیں لڈو پیڑے تو نہیں۔ راولپنڈی کی سہانا شیخ بھی بڑے عرصے بعد نظر آئیں۔ ویلکم بیک اور اچھا تبصرہ کیا۔ ریگولر آیا جایا کریں۔ کراچی کے محمد اقبال کی ادھوری باتیں اور احمد فراز کی فرمائش بھی اچھی رہی۔ جہلم کے احسن زمان کا تبصرہ لاجواب تھا۔ ایسے تبصرے پڑھ کر دل خوش ہو جاتا ہے۔ کوٹری والے لوگ اس بار غیر حاضر رہے۔ سب سے پہلے عبدالرب بھٹی کی لہو کا سراغ پڑھی۔ پچھلی بار بھی ان کی تحریر پڑھ کر سخت کوفت ہوئی تھی اور آخر میں پڑھنے کا نقصان یہ ہوا تھا کہ پورے ڈائجسٹ سے جی خراب ہو گیا تھا اس لیے سب سے پہلے پڑھ ڈالی۔ یہ تحریر پچھلی کے مقابلے میں تو بہتر تھی لیکن واقعاتی غلطیوں کی بھرمار تھی۔ زیادہ نہیں کہوں گا لیکن اختتام بہت ہی غیر منطقی تھا۔ صبا نہ صرف اپنے باپ کے خلاف ہو گئی بلکہ اپنی محبت کو خوامخواہ چھوڑ کر وکیل صاحب کی پہلی اور آخری محبت بھی بن گئی۔ رائٹر کو کہانی لکھنے کے بعد ایک بار خود بھی پڑھنی چاہیے۔ زویا صفوان کی میراث ایک اچھی کاوش تھی۔ ایک بات کھٹکی کہ ہندوؤں میں کزن میرج نہیں ہوتی۔ (جی سہی کہا) اختتام میں ٹی وی چینل والوں کے پیش کردہ مسلم کرداروں کی وضاحت بہتر انداز میں کی جا سکتی تھی۔ کزن میرج والے پہلو کے علاوہ ایک بہترین تحریر رہی۔ عائشہ نصیر بڑے عرصے بعد آئیں لیکن زر اور زمین پیش کر کے چھا گئیں۔ بہترین کہانی کا انتخاب کیا گیا تھا ترجمے کے لیے اور پڑھتے ہوئے بہت ہی مزہ آیا۔ (پسندیدگی کا شکریہ!) عمران قریشی کی طلب گار ایک نسبتاً بہتر کوشش تھی۔ جرم و سزا کے بجائے رومانوی پہلو حاوی رہا۔ بہرحال رائٹر اس سے بہت بہتر کہانیاں پہلے پیش کر چکے ہیں۔ حامد حسن کی مفرور بھی ایک اچھا ترجمہ رہی۔ خلیل جبار کی زہریلی مکھی پسند نہیں آئی۔ آئیڈیا پرانا مگر اچھا تھا لیکن بچکانہ انداز میں پیش کیا گیا۔ نکس فاطمہ نے اس بار طمانچہ میں خوب فلسفے بھگارے۔ ان کی انگریزی کہانیاں بہترین ہوتی ہیں لیکن اس بار طبع زاد تحریر رنگ نہ جما پائی۔ توفیق بھائی اور انور جیسے غلیظ لوگوں نے نیک نیتی سے سماجی خدمات انجام دینے والوں کو بھی بدنام کر کے رکھ دیا ہے۔ شہلا نے بھی جرم کیا لیکن چوروں کو لوٹنے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ کہانی کا اختتام پسند آیا۔ بشریٰ امجد کی فنکار اپنے انداز کی ایک بہترین مختصر کہانی تھی۔ جمال نے ثابت کر دیا کہ وہ ایک بہترین آرٹسٹ ہے اور اس کے بنائے ہوئے شاہکار نے مجرموں کو پکڑنے میں مدد فراہم کی۔ ویسے آپس کی بات ہے اگر جمال اتنا اچھا آرٹسٹ ہے تو اس سے جاسوسی ڈائجسٹ کا ٹائٹل ہی بنوالیا کریں۔ (یہی سوچ رہے

ہیں) احمد سلیم سلیمی انتقام کے شعلے لے کر جاسوسی کے ابتدائی صفحات پر براجمان تھے۔ طویل عرصے بعد ان کی جاسوسی میں آمد نے دل خوش کر دیا۔ سلیمی صاحب بہترین رائٹر ہیں اور انہوں نے انتقام کے شعلے میں اپنے فن کا خوب مظاہرہ کیا۔ مکرم شاہ کا کردار خوب صورتی سے تراشا گیا۔ ماہین کا کردار اچھا تھا لیکن بہت ہی بے وقوف لڑکی تھی۔ دولت کی چکاچوند دیکھ کر بہک جانے والے ایسے ہی مصیبت میں پڑ جاتے ہیں۔ (حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے) بہر حال شکر ہے کہ اس کو اپنے انتقام کے شعلے ٹھنڈے کرنے کا موقع مل گیا۔ کہانی کی اینڈنگ کافی فلمی سی لگی لیکن بہر حال دل کو تسکین ہوئی کہ کم از کم کہانیوں میں تو مجرم اپنے انجام کو پہنچ رہے ہیں۔ مکرم شاہ کے ساتھ اچھا نہیں ہوا، نوکری بھی گئی اور بیوی بھی گئی۔ بات کریں جاسوسی کی قسط وار کہانی دہر کی تو حسام بٹ اسے بخوبی چلا رہے ہیں۔ بس یہ جاسم کی جو لمبی چوڑی باتیں ہوتی ہیں، وہ بور کرتی ہیں جب وہ اچھل کود کرتا ہوا ایکشن کرتا ہے تو بہت مزہ آتا ہے۔ کہانی کے اختتام میں نوناف کی آمد نے سنسنی پیدا کر دی۔ پہلے بھی اس مخلوق کا ایک سرسری سا تذکرہ ہوا تھا لیکن اب امید ہے کہ اس کو ہم ایکشن میں بھی دیکھیں گے۔ طاہر جاوید مغل جو ہیں وہ قسط وار کہانیاں لکھنے کے شہنشاہ ہیں۔ عام سے واقعات کو خاص بنا دینا، ان کی بہترین خوبی ہے۔ بطور قاری یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم انہیں تواتر کے ساتھ پڑھ رہے ہیں۔ سربکف بہترین انداز میں لکھی جا رہی ہے اور اس میں انہوں نے اپنے پرانے کرداروں شاہ زیب کو واپس لا کر دل خوش کر دیا ہے۔ اس قسط کا بے چینی سے انتظار تھا کیونکہ دونوں ہیرو تابش اور شاہ زیب آپس میں جب ٹکراتے ہیں تو کہانی کا لیول ہی اور ہو جاتا ہے۔ ابھی تو دونوں کی دشمنی چل رہی ہے لیکن بم دھماکے میں اسکول کے بچوں کا زخمی ہونا اور وہاں پر تابش کا کارروائی کرنا ایک بہترین موقع ہے کہ دونوں کی آپس میں صلح ہو جائے۔ اگلی قسط کا شدت اور بے چینی سے انتظار ہے۔ یہ تھا جاسوسی جولائی کے شمارے پر تبصرہ امید ہے کہ اگست کا شمارہ بہترین ہوگا۔" (یقیناً)

کراچی سے محمد اقبال کا تشکرانہ انداز "جولائی کا جاسوسی بروقت حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ٹائٹل مختلف کلرز سے مزین ہے۔ حسینہ کا پوز اس بار مختلف ہے اور حسب روایت دو آدمی بھی نظر آ رہے ہیں جن میں ایک مردہ اور دوسرا زندہ موجود ہے۔ فہرست اچھی لگ رہی ہے۔ احمد سلیم سلیمی پہلی کہانی کے ساتھ حاضر ہیں۔ ماہ محرم کے حوالے سے اداریہ ... ن ہے۔ امام حسینؓ کی یاد آج تک بھرپور طریقے سے منائی جا رہی ہے مگر مقصود حاصل نہیں کر پا رہے کیونکہ نیت اچھی نہیں ہے ہماری لیڈر شپ کی۔ ہمارے ملک کے حالات ہی دیکھ لیجیے۔ خصوصاً کراچی میں کے الیکٹرک کی بدمعاشیاں عروج پر ہیں۔ بارہ بارہ گھنٹے کی لوڈ شیڈنگ ہو رہی ہے اور اکثر علاقوں میں سولہ سولہ گھنٹے بجلی غائب ہے جس کی وجہ سے پورا کراچی کرب و اذیت میں جتلا ہے اور حکومت وقت چین کی بانسری بجا رہی ہے۔ بانسری کے ساتھ ہی ان کے دل میں لڈو بھی پھوٹ رہے ہیں کیونکہ بارشوں نے ملک بھر میں تباہی مچا دی ہے اور ہمارے حکمرانوں کے مزے آنے والے ہیں۔ سیلاب کی تباہ کاریوں کے نام پر ڈھٹائی کے ساتھ قرضے مانگے جائیں اور حکمرانوں کے بینک اکاؤنٹس میں منتقل ہو جائیں گے۔ عوام کے دکھ درد کا سرکاری سطح پر کسی کو کوئی احساس نہیں ہے۔ عوام کے لیے ان کے پاس صرف بھاشن ہے۔ (عوام اپنا خیال خود کیوں نہیں کرتی...... خاموشی بھی جرم ہے) چیں بکتہ چینی میں محمد حسنین کے تعریفوں کے ٹوکرے نے دل خوش کر دیا۔ بہت عمدہ تبصرہ ہے۔ میرے بھانجے اور خواہر نسبتی کے لیے دعا پر ممنون ہوں سب ساتھیوں کا۔ سہانا شیخ، احمد فراز صافی، محمد احسن زمان کے تبصرے بھی بہت عمدہ لگے۔ شروعات سربکف سے کی۔ کہانی کا ٹیمپو ایسا ہے کہ صبر ہی نہیں ہو رہا تھا۔ ہر کردار اپنی جگہ بھرپور فٹ ہے۔ جیسے کہ زرقاب، دلربا، شاہ خانو اور شاہ زیب۔ مگر پہلوان صاحب کی الگ ہی بات ہے۔ گوہار زینت کا کردار بھی بہت پاور فل ہے۔ شاہ زیب سے تابش کی فائٹ ادھوری رہ گئی۔ امید ہے آگے بھرپور فائٹ ہوگی دونوں کی۔ زانی نے گوہار زینت کا سارا کچا چٹھا کھول کر رکھ دیا جس کے باعث عمران وغیرہ کی خیریت تابش کو معلوم ہوگئی۔ آخر میں گوہار زینت نے اپنی اصلیت دکھا دی اور معصوم بچوں کی جانوں سے کھیل گئی بدبخت عورت۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ حسام بٹ کی دہر بھی سبھاؤ سے آگے بڑھ رہی ہے۔ جاسم کے ساتھ بھی نئے نئے لوگ شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ راشد ظاہری کا کردار پُراسرار ہے۔ آگے جا کر اس کا بھید بھی کھل ہی جائے گا۔ ابھی تو ہیری، جاسم کے ساتھ ہر آگ میں کودنے کو تیار ہے مگر پہلا مرحلہ ہی اس کے لیے اتنا حیران کن ہے کہ وہ حواس باختہ ہو گیا ہے۔ بشریٰ امجد کی فنکار ایک مختصر مگر بہترین کہانی رہی۔ جمال نے واقعی کمال کر دیا۔ ویلڈن جی۔ عکس فاطمہ طمانچہ کے ساتھ حاضر ہیں۔ ہمارے معاشرے کی بہت اچھی عکاسی کی عکس فاطمہ نے۔ اور توفیق کے جو طمانچہ رسید کیا، اس کی جلن معاشرے میں پھیلے ہوئے توفیق بھائی جیسے سارے لوگ محسوس کریں تو کیا بات ہے۔ عمران قریشی کی طلب گار بھی اچھی لگی۔

Digest Novels .com

ترچھے نینوں والی کو پانے کے لیے کیا کیا جتن کرنے پڑے۔ بالآخر مایوسیوں کے بعد ہیرو کی مراد پوری ہوئی۔ احمد سلیم سلیمی انتقام کے شعلے لے کر حاضر تھے ابتدائی صفحات پر۔ کہانی کا ٹیمپو مناسب تھا، ماہین لالچ کا شکار ہوئی۔ مکرم شاہ کے کردار نے بھرپور مزہ دیا۔ اس کے ساتھ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا کہ کہانی میں دکھایا گیا۔ عبدالرب بھٹی کی لہو کا سراغ ایوریج کہانی تھی۔ ان کی کہانیاں بھی اب مجھے غلام قادر کی طرح ایویں ہی لگنے لگی ہیں۔ زویا کی کہانی ابھی پڑھی نہیں وقت کی کمی کے باعث امید ہے کہ اچھی ہوگی۔''

ملیر سے مناہل حمیر کی چلبلی باتیں ''جولائی کا ڈائجسٹ اپنی بھرپور چھب دکھلاتے ہوئے ہلکی ہلکی پھوار کے ساتھ موصول ہوا۔ (یعنی آمد مبارک ثابت ہوئی نا......) بڑے دنوں کے بعد قلم ہاتھ میں لیا اور مکمل تبصرہ کاغذ پر اتار ڈالا۔ (خوب صورت اور اچھی چیزوں کو ہاتھ سے دور رکھتی کیوں ہو) ہمیشہ کی طرح جاسوسی ڈائجسٹ ہمارا موڈ بہتر بنانے کا سبب بن گیا۔ نیلے نیلے آسمان جیسا ٹائٹل نظروں کو بھلا لگا۔ اتنا حسین ٹائٹل کو دیکھ کر ہم بھی اس کی مناسبت سے کہانی ترتیب دینے کے بارے میں سوچنے لگے۔ (یااللہ......رحم) ہر بار کی طرح سب سے پہلے اداریہ پڑھا اور محرم الحرام کی نسبت سے معلومات میں اضافہ کیا۔ اس مرتبہ کہانیوں کی فہرست بھی دیکھنے میں خوب صورت نظر آئی۔ آگے بڑھے تو قارئین کے مزے دار تبصروں نے جیسے سماں ہی باندھ دیا۔ تمام خطوط ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ ملتان سے محمد حسنین کا تبصرہ سب سے بہترین رہا۔ زویا صفوان کی کہانی میراث پسند آئی۔ انہوں نے اپنی کہانی کے لیے اچھے موضوع کا انتخاب کیا۔ عمران قریشی کہانی پر بھرپور گرفت رکھتے ہیں، ان کی کہانی طلب گار بہت اچھی لگی۔ [illegible] جبار کو زہریلی کمی نے خوب پریشان کیا۔ لیکن اس کہانی میں نیا پن نظر نہیں آیا۔ عکس فاطمہ ہر مرتبہ کی طرح اس دفعہ بھی کامیاب [illegible] انگریزی ترجمے کے حوالے سے ان کی کہانیاں اچھی ہوتی ہیں لیکن طبع زاد بھی اچھی کاوش ٹھہری۔ آغاز سے اختتام تک [illegible] کسی اور طرف توجہ نہ جانے دی۔ بشریٰ امجد اس مرتبہ فنکار کے ساتھ آئیں اور چھا گئیں۔ مختصری کہانی نے بھی اپنا رنگ خوب جمایا۔ ابتدائی کہانی کے ساتھ احمد سلیم سلیمی کے قلم کا جادو سر چڑھ کر بولا۔ جرم و سزا کے بعد انتقام کے شعلے کی ہی باری آتی ہے۔ طاہر جاوید [illegible] کو کیا ہی بات ہے۔ ان کی کہانیاں پڑھتے ایک عرصہ گزر گیا لیکن ان کے قلم نے شروع دن سے جو سحر طاری کیا تھا، وہ آج تک قائم ہے [illegible] بھی ان کے اندازِ تحریر سے خاص بن جاتی ہے۔ (بالکل) حسام بٹ کے بھی قسط وار کہانی دہر میں جو ہر کھل کر سامنے آرہے ہیں [illegible] لگتا ہے جیسے غیر ضروری الفاظ استعمال کیے جا رہے ہیں۔ یہ تھا جولائی کے ڈائجسٹ پر تبصرہ۔ یار زندہ صحبت باقی۔ انشاء اللہ اگست [illegible] سیر حاصل تبصرے کے ساتھ حاضر ہوں گی تب تک کے لیے اللہ کے حوالے۔'' (بہت شکریہ......ان شاء اللہ انتظار رہے گا)

کوٹری سے حمیرا رفیق کی کاہلی ''اس بار کا جاسوسی شدید حبس اور گرمی کے ماحول میں ملا۔ تبصرہ لکھنے تک گرمی میں کسی حد تک کمی واقع ہوئی جس کا سبب چند روز قبل ہونے والی دھواں دار بارش تھی۔ جس نے [illegible] مچائی اور ابھی بھی صورتِ حال گمبھیر ہے کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو اندرونِ سندھ بڑی تباہی ہوگی۔ پنجاب [illegible] بارشوں سے شدید نقصانات کی خبریں آرہی ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ خیر والی بارش ہو۔ جس سے تباہی نہ مچے۔ سرورق خوب صورت [illegible] فہرست بھی عمدہ ہے۔ اداریے کی کیا بات ہے جتنی نزاکت سے نازک بات اداریے میں لکھی جاتی ہے، [illegible] ممنون ہیں) محفل میں غیر حاضری کی وجہ میری اپنی سستی تھی جس کی وجہ سے تبصرہ لکھنے میں دیر ہوئی سو پوسٹ ہی نہیں [illegible] نکتہ چینی میں تمام لوگوں کے تبصرے عمدہ تھے۔ حسنین صاحب کے تبصرے کی کیا ہی بات ہے۔ جنید صاحب کی غیر حاضری کو کافی ٹائم ہوگیا کہاں گم ہیں؟ (پاکستان کے پہاڑی علاقوں میں) کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کی سر بکف پڑھی۔ ابھی تک پڑھی جانے والی ساری قسطیں بہت عمدہ لگیں۔ تیز ٹیمپو کے ساتھ ہر کردار اپنی جگہ بھرپور انداز میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ یہ مغل صاحب کی تحریر کا خاص انداز ہے کہ کچھ بھی مس فٹ محسوس نہیں ہوتا۔ تابش کو بالآخر عمران مل ہی گیا۔ عمران تک پہنچنے کے لیے تابش نے بہت مسائل کا سامنا کیا۔ اب عمران کو ماہین سے ملانے کی جدوجہد جاری ہے اور مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے تابش اپنی ٹیم کے ساتھ ایکشن میں ہے۔ شاہ زیب نے بھی تابش کو ٹف ٹائم دیا ہے اور آگے بھی اس ٹف ٹائم کو انجوائے کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ حسام بٹ کی دہر بھی بہت عمدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہے۔ جاسم کے ساتھ بھی تیزی سے نئے کردار شامل ہو کر پیچھے رہ جاتے ہیں۔ کامل کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے۔ راشد ظاہری کا کردار بھی اپنے اندر اسرار لیے ہوئے ہے۔ جاسم ابھی پُراسرار چابیاں جمع کر رہا ہے۔ کہانی اس حوالے سے جمود کا شکار لگ رہی ہے۔ عمران

قریشی کی طلب گار بہت اچھی لگی۔ تر چھے نینوں والی اتنی آسانی سے تو نہیں ملتی نا۔ بشریٰ امجد کی فنکار زبردست لگی۔ عکس فاطمہ کی طمانچہ نے تو ہلا کر رکھ دیا۔ بہت عمدگی سے معاشرے کے ان ناسوروں کو نمایاں کرنے پر عکس فاطمہ کو مبارک باد۔ زویا صفوان کی میراث بہت اچھی لگی۔ سارے کردار اپنی جگہ اچھے تھے۔ اس طرح کی کہانیاں پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ زر اور زمین عائشہ نصیر کی اچھی لگی۔ حامد حسن کی مغرور بھی مناسب لگی۔ خلیل جبار کی زہریلی کھمی ٹھیک ہی تھی۔''

کراچی سے شاہدہ مختار کا اظہار خیال ''ماہ جولائی کا جاسوسی ڈائجسٹ اپنے دلفریب ٹائٹل کے ساتھ بک اسٹال پر جگمگا رہا تھا۔ جس میں کہیں ہلکا اور کہیں تیز آسمانی کلر نمایاں ہے۔ اب جاسوسی ڈائجسٹ لیے بغیر آگے بڑھنا مشکل تھا، سو ڈائجسٹ لے کر آگے بڑھ گئی۔ لڑکپن سے ڈائجسٹ پڑھنے کا سلسلہ شروع کیا تو آج پچپن تک جاری و ساری ہے۔ اس عمر میں سب سے اچھا وقت مطالعہ کرتے ہی گزر سکتا ہے۔ حسب روایت فہرست دیکھی جو عمدگی سے ترتیب دی گئی تھی۔ شدید خواہش ہے کہ اس فہرست میں کبھی کسی پرانے منجھے ہوئے رائٹر کی کہانی بھی شائع ہو، جو ماضی کا حصہ بن گئے۔ خصوصاً چودہ اگست، چھ ستمبر اور دیگر مواقع پر کوئی بہت پرانی کہانی بھی اگر دوبارہ شائع کر دی جائے تو بہت اچھا لگے گا۔ نئے رائٹرز بھی اپنی جگہ بنانے میں بھرپور محنت کر رہے ہیں اور کامیاب بھی ہیں مگر اب پرانے جاسوسی جیسا معیار نہیں رہا۔ اسما قادری بھی کافی مہینوں سے غائب ہیں۔ طاہر جاوید مغل کی کوئی سلسلہ وار کہانی پڑھنے کی شدید خواہش ہے جو بہرحال سر بکف کے ذریعے پوری ہو رہی ہے مگر یہ تو دو تین قسطوں کے بعد ختم ہو جائے گی۔ مغل صاحب کی وجہ سے ڈائجسٹ کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ امجد رئیس کا بھی کوئی مقابلہ نہیں۔ یعقوب بھٹی، زویا صفوان بھی میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ اداریہ لکھنا ایک فن ہے جس میں مختصر جگہ اور مختصر الفاظ میں کوئی بھی مفصل بات نہایت خوبی سے بیان کرنا ایک بہت مشکل کام ہے۔ جو ایڈیٹر صاحب ہر ماہ بہت خوب صورتی سے کر رہی ہیں۔ چٹکی نکتہ چینی میں ملتان سے محمد حسنین کے دلچسپ تبصرے بہت اچھے لگتے ہیں۔ جنید صاحب کی مصروفیت ختم نہیں ہو رہی۔ (جنید اب واپس آجاؤ) محمد اقبال، حمیرا رفیق بھی مستقل تبصرہ لکھنے والوں میں شامل ہیں۔ باقی ساتھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ محفل مختصر ہوتی جا رہی ہے۔ میں ہمیشہ مختصر کہانیاں پہلے پڑھتی ہوں، اور سلسلے وار آخر میں۔ عمران قریشی کی طلب گار اچھی لگی۔ عمران قریشی کی خوبی یہ ہے کہ کہانی کا ٹیمپو برقرار رکھتے ہیں۔ عکس فاطمہ نے بھی اپنی موجودگی کو برقرار رکھا کہ ہم کسی سے کم نہیں، بہت عمدہ بھئی۔ بشریٰ امجد نے فنکار میں اپنی بہترین فنکاری پیش کی یعنی عمدہ کہانی ترتیب دی۔ عائشہ نصیر کی زر اور زمین اچھی تھی۔ حامد حسن مغرور کے ساتھ موجود ہیں جو مناسب تحریر ہے۔ زویا صفوان کی میراث اچھی لگی۔ ہندو کلچر کی بھرپور عکاسی کی۔ اب بات ہو جائے سر بکف کی۔ طاہر جاوید مغل سر بکف کو بہت اچھے طریقے سے لے کر چل رہے ہیں۔ اب تک کی تمام اقساط کا ٹیمپو بہت اچھا چل رہا ہے۔ دوستم اپنی یادداشت واپس آنے کے بعد تیزی سے متحرک ہوا اور بالآخر تمام مصائب سے نمٹتے ہوئے بالآخر عمران تک پہنچ گیا۔ زینت گوہار نے عمران کو کیوں اس طرح خفیہ طور پر اپنی قید میں رکھا اور وہ عمران سے کیا چاہتی تھی، یہ تو آگے کی اقساط میں معلوم ہوگا۔ زینت گوہار کا کردار بھی بڑا الجھا ہوا ہے۔ ساتھ ہی شاہ زیب سے اپنے ہیرو ڈپٹی صاحب کا سامنا ڈائیلاگ سے آگے بڑھ کر ایک فائٹ تک پہنچ کر رک گیا ہے۔ آگے امید ہے بھرپور ٹکراؤ دیکھنے کو ملے گا دونوں کا۔ ماہین کی ابھی تک کہانی میں کوئی جگہ نہیں بن پا رہی مگر امید ہے کہ مغل صاحب جلد ہی اسے بھی ایکشن میں لے آئیں گے۔ زانی بے چاری کا کیا بنے گا؟ اب بات ہو جائے حسام بٹ کے سلسلے دہر کی۔ حسام بٹ کا نام بھی رائٹرز میں نمایاں ہے۔ بہت خوب صورتی سے دہر کو لکھ رہے ہیں۔ معلومات کا خزانہ بھی ہوتا ہے ان کی کہانی میں۔ لیکن کہیں کہیں سلو ہو جاتی ہے۔ کامل، اور جاسم کی منگیتر کا ذکر بالکل بھی نہیں ہو رہا۔ ایشتار بھی منظر سے غائب ہے۔ نئے کردار آتے جاتے رہتے ہیں۔ جاسم نے یہودیوں کو پے در پے نقصانات پہنچائے اور بھرپور پہنچائے۔ مزہ آتا ہے جب جاسم ایکشن میں ہوتا ہے۔ خاص طور پر براخا جو یہودیوں کا غرور تھی جس طرح جاسم نے اس کا ناک میں دم کیا اور آخر میں یہودیوں کا غرور خاک میں ملا دیا، ایسے ہی ٹکراؤ پڑھنے میں مزہ آتا ہے۔ اب تک یہی کچھ پڑھ سکی ہوں جس پر تبصرہ کرنے کی کوشش کی ہے، امید ہے محفل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاؤں گی۔'' (پرانے قاری تو ہمارے لیے بے حد قابلِ احترام اور قابلِ فخر ہیں)

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

زینب حنیف، کراچی۔ لطیف الرحمن، حیدر آباد۔ زارا خان، پشاور۔

لہورنگ

یعقوب بھٹی

مے کا نشہ تو کچھ دیر بعد اُتر جاتا ہے لیکن اچانک لگنے والے زخم ٹھیک ہونے میں خاصی دیر لگتی ہے... مگر وہ زخم ایسا لگا تھا جو اکثر نشتر بن کر جاگ اٹھتا ہے... اس کی کسک ہر دم دل میں محسوس ہوتی ہے۔ ایسے ہی دشمنوں کی سازشوں کا قصّہ... جو برسوں سے آستین کا سانپ بن کر ڈس رہے تھے... کتنی جنگیں لڑیں... کتنا خون بہایا... اور کتنے درد سہے... ہزار ہا بدن پر... قبا پر ایسے زخموں کے پیوند اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں... یہ سلسلہ ہے کہ رکتا نہیں... کفر اور اسلام کے مابین دشمنی کا جو آغاز ہے... وہ کبھی ختم نہیں ہوگا... قدم قدم پر ایک نئے جال کے ساتھ قدم بڑھاتی داستان کے ہوش ربا واقعات... جو فتح و شکست، موت و زندگی کے خطرناک اور آخری موڑ پر اپنی اپنی بازی کھیل رہے تھے...

سنسنی خیز کرداروں کے وحشت انگیز روپ میں گندھی ایک لہورنگ داستان

یہ لاس ویگاس کی ایک روشنیوں سے گھائل رات تھی۔ لاس ویگاس جواریوں اور آزاد منش افراد کی امریکی جنت...... یہاں مخصوص علاقوں میں دن سوتے تھے اور راتیں جاگتی تھیں۔

کرنل کمال، لاس ویگاس کی ایک کثیرالمنزلہ عمارت کی چھت پر موجود تھا۔ پوری چھت پر ہر طرف دیوہیکل پائپ ہی پائپ پھیلے ہوئے تھے اور چھت پر موجود سیکیورٹی گارڈ اپنے کیبن میں چند گھنٹوں کے لیے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکا تھا۔

کرنل کمال فلائنگ سوٹ میں ملبوس ایک پائپ کی اوٹ میں دم سادھے بیٹھا تھا۔ اس پوزیشن میں اسے نصف گھنٹے سے زائد ہو گیا تھا مگر وہ مکمل طور پر پُرسکون تھا۔ اسے سارہ کی کال کا انتظار تھا۔ وہ دونوں سویڈش ساختہ شارٹ رینج ڈیوائس کے ذریعے رابطے میں تھے۔ اس ڈیوائس کو خاص طور پر شارٹ رینج موڈ پر پکڑنا تقریباً ناممکن تھا۔

کرنل کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ اس کے کانوں میں سارہ کی مدّھم مگر صاف آواز سنائی دی۔ ''ہوا کا رخ موافق ہو گیا ہے لڑکے اتم حرکت میں آسکتے ہو۔''

سارہ تجونیئر اور کرنل کی ماتحت تھی مگر مخصوص حالات کے سبب کرنل... سے اس انداز میں مخاطب ہوتی تھی۔ کرنل نے فوراً اپنی جگہ چھوڑی۔ ''پچھلے چار دنوں

میں تم نے پہلی اچھی خبر سنائی ہے۔"

سارہ دھیرے سے ہنسی۔"اور اس کے ساتھ ہی اچھی خبروں کا آغاز ہو چکا ہے۔"

کرنل کمال کے باریک ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اس مسکراہٹ کو تاریکی نے چھپالیا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے تھے جو یہ دعویٰ کر سکتے تھے کہ انہوں نے کرنل کو مسکراتے دیکھا ہے۔

کرنل ایک پائپ پر پاؤں رکھ کر چھت کی باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ یہاں ہوا کا دباؤ زیادہ تھا۔ کرنل نے نیچے جھانکا۔ نیچے جیسے پاتال میں روشنیوں کا دریا بہہ رہا تھا۔

کرنل نے پشت پر موجود چھوٹے پیراشوٹ اور سینے سے بندھے بیگ کو چیک کیا۔ اس کے علاوہ اس کے سینے، کمر اور کندھوں پر مخصوص پیڈز بندھے تھے جو نا صرف بلٹ پروف تھے بلکہ شاک پروف بھی تھے۔ سر پر مخصوص ہیلمٹ تھا جس کا نائٹ ویژن موڈ آن تھا۔ کرنل نے اپنے فلائنگ سوٹ کی آخری بندشیں لگائیں۔ اب وہ چھلانگ لگانے کے لیے مکمل طور سے تیار تھا۔ اس نے سارہ سے کہا۔

"الٹی گنتی شروع کرو، یاد رہے میرے چھلانگ لگانے کے بعد تمہارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ کا وقت ہے۔"

سارہ نے اعتماد سے کہا۔"تم بے فکر رہو۔ تمہیں بے موت مرنے نہیں دوں گی۔"

ماتحت کے اعتماد نے کرنل کا اعتماد بھی دگنا کر دیا۔

"گڈ! کامیابی کے لیے یہی حوصلہ اور اعتماد چاہیے۔ گنتی شروع کرو۔"

سارہ کے "تھری...... ٹو...... ون اور گو" کہتے ہی کرنل نے سر کے بل چھلانگ لگادی۔ جسم کو سکیڑے وہ وزنی پتھر کے مانند نیچے گر رہا تھا۔ مخصوص بلندی میسر آتے ہی اس نے بڑی مہارت سے خود کو متوازن کرتے ہوئے ہاتھ، پاؤں پھیلا لیے۔ اگلے چند لمحوں میں وہ تاریک فضا میں فلائنگ سوٹ کے سہارے گلائیڈ کر رہا تھا۔ نائٹ ویژن ہیلمٹ کے سبب سب تاریک مناظر اسے ہلکے سبز رنگ میں نظر آرہے تھے۔ برق رفتاری سے ایک عمارت کے پہلو سے گزرتے ہوئے منظر تبدیل ہوا، اس کے سامنے ایک بے حد بلند و بالا عمارت تھی جو مکمل طور سے تاریک تھی مگر اس کے سامنے کی شیشے کی دیوار پر اردگرد کی عمارتوں کی روشنیوں کا انعکاس نظر آرہا تھا۔

لمحے بھر کو کرنل کی دھڑکن خفیف سی بڑھی۔ اس کی زندگی اور کامیابی کا دارومدار سارہ پر تھا۔ وہ برق رفتاری سے تاریک عمارت کی جانب گلائیڈ کر رہا تھا۔ یہی وقت تھا جب اسے ایسا محسوس ہوا، اس کے قریب سے یکے بعد دیگرے دو جیٹ انجن گزرے ہوں۔ کرنل کی عقابی نگاہیں سامنے تھیں۔ جو کچھ بھی اس کے پاس سے گزرا تھا، وہ سامنے والی عمارت کے ایک مخصوص حصے سے جا ٹکرایا تھا۔ متاثرہ حصے سے دھواں سا اٹھ رہا تھا اور شیشہ پگھل پگھل کر نیچے گر رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں ایک خلا سا نمودار ہو گیا۔ سارہ نے اپنی ذمے داری بڑے احسن طریقے سے ادا کی تھی۔ اب آگے کا کام کرنل کمال کا تھا۔

کرنل نے تاریک خلا کو تولا اور اپنی بلندی تھوڑی سی اور کم کرلی۔

اگلے چند لمحے بے حد اہم تھے۔ اندازے کی معمولی سی غلطی کا نتیجہ یقینی موت تھا۔ کرنل برق رفتاری سے تاریک خلا کی طرف اُڑا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ خلا کے دہانے پر پہنچ گیا۔ اس کی رفتار بہت زیادہ تھی۔ آخری لمحے پر اس نے ممکنہ حد تک سینہ اوپر اٹھا کر رفتار کم کرنے کی کوشش کی اور پھر ہوا ہی میں پینترا بدل لیا۔ اگلے پل وہ خلا کے اندر تھا۔

پینترا بدلنے کے سبب کرنل پشت کے بل ایک لکڑی کے ریک سے پوری قوت سے ٹکرایا۔ شاک پروف پیڈز کے باوجود اسے لگا کہ ریڑھ کی ہڈی جیسے ترخ گئی تھی۔ درد کی ایک بلند و بالا لہر نے وجود کو جھنجوڑ دیا تھا۔ کرنل کتابوں سے بھرے اس ریک کے بارے میں پہلے ہی جانتا تھا۔ ریک کو توڑتے ہوئے وہ ایک کم روشنی والے لاؤنج میں سفید دودھیا قالین پر گرا اور پھر اچھل کر اسٹینڈ پر نصب بہت بڑی ایل سی ڈی سے جا ٹکرایا۔ نیچے گرا تو ایل سی ڈی کے ٹکڑے ٹوٹ کر اس پر گرنے لگے۔

پرسکون سے اس اپارٹمنٹ میں پل بھر میں جیسے بھونچال سا آگیا تھا۔

کرنل کو محسوس ہوا جیسے اس کا وجود کرچی کرچی ہو گیا ہے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ شیر کی کچھار میں ہے۔ اس کے پاس وقت بے حد کم تھا۔ اس نے وجود کو حرکت دی۔ ایل سی ڈی کے پینل کے ٹکڑے اس کے وجود کے نیچے چرچرائے تو یہ اطمینان ہوا کہ اس کا جسم سلامت تھا۔ درد برداشت کرنے کی اسے تربیت دی گئی تھی اور ہمت و حوصلہ اس کا ذاتی ہتھیار تھا۔

درد سے جھگڑتے ہوئے وہ ہر ممکن تیزی سے حرکت میں آیا۔ فلائنگ سوٹ اس نے اپنے جسم سے علیحدہ کیا ہی تھا

کہ سفید مصنوعی موتیوں کے پردے کو ہٹاتے ہوئے کوئی بگولے کے مانند اندر داخل ہوا۔ آنے والا سیاہ فام تھا جس کے ہاتھ میں دبا وزنی لیوگر ننھے سے کھلونے کے مانند نظر آرہا تھا۔

کرنل کی ٹانگ برق کے مانند لہرائی۔ نیچے پڑا ایک بوفر اُڑتا ہوا سیاہ فام کے سینے سے ٹکرایا۔ بوفر نے سیاہ فام کا بگاڑا تو کچھ نہیں مگر وہ بوکھلا ضرور گیا۔ لیوگر گرجا اور گولی کرنل کے قریب قالین پر سیاہ بدنما نشان چھوڑ گئی۔

اس دوران کرنل سینے پر بندھے بیگ سے بریٹا علیحدہ کر چکا تھا۔ پہلی گولی کی بازگشت ابھی باقی تھی کہ بریٹا کا ننھا سا پٹاخا بجا اور سیاہ فام کی کھوپڑی میں سوراخ ہو گیا، وہ لہرا کر ایک فرشی صوفے پر گرا۔

کرنل نے کھڑے ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ موتیوں والے پردے کے دوسری طرف مختصر سا کاریڈور تھا۔ کرنل نے بیلٹ سے ایک سکہ سا علیحدہ کر کے کاریڈور میں اچھال دیا اور اس کے ساتھ ہی اس نے دیوار کی اوٹ لے لی۔

لمحے سے بھی کم وقت میں زوردار چمک کے ساتھ کاریڈور میں زوردار دھماکا ہوا اور اپارٹمنٹ جیسے لرز اٹھا۔ اگلے ہی لمحے کرنل کاریڈور میں تھا۔ جہاں انسانی چیتھڑے اور کپڑوں کے خون آلود ٹکڑے بارودی دھوئیں میں دیواروں سے چپکے بے حد ہیبت ناک منظر پیش کر رہے تھے۔ وہ جو بھی براہِ راست دھماکے کی زد میں آیا تھا... اسے چیخنے کی بھی مہلت نہیں ملی تھی۔

اچانک کرنل کی سماعت سے سارہ کی آواز ٹکرائی۔

"اوپر چھت پر سرگرمی نظر آرہی ہے۔ کیا کرنا ہے؟"

کرنل کی آواز میں موت کی سردی اتر آئی۔ "اُڑا دو، مجھے واپسی کا راستہ صاف ملنا چاہیے۔"

سارہ نے مختصراً "اوکے" کہا۔

اپارٹمنٹ کا داخلی دروازہ اسی مختصر کاریڈور میں تھا جو بند نظر آرہا تھا۔ اس دروازے کو بند کرنے والے دونوں محافظ مارے جا چکے تھے۔ کرنل کا راستہ صاف تھا۔ وہ راہداری میں آگے آیا۔ یہاں ماسٹر بیڈروم تھا جو مضبوط دروازے کے ساتھ اندر سے بند تھا۔ کرنل نے سینے والے بیگ سے ایک سیاہ ہیبت ناک نظر آنے والا ڈبا نکال کر دروازے کے ساتھ لگایا جو مقناطیس کے مانند دروازے سے چپک گیا۔ کرنل نے ایک ننھے سے بٹن کو مسلسل تین دفعہ دبایا اور پھر تیزی سے واپس لاؤنج کی طرف دوڑا۔ اس دوران اپارٹمنٹ کے داخلی دروازے پر کھٹ پٹ سی ہو رہی تھی۔

لاؤنج میں داخل ہوتے ہی کرنل نے ایک فرشی صوفے پر چھلانگ لگا دی۔ دوسرے صوفے پر مردہ سیاہ فام اپنی بے حد سفید ڈیلے والی آنکھوں سے دوسری دنیا میں نہ جانے کسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور پیشانی سے بہنے والا خون سیاہی مائل ہو کر کنپٹی اور گردن پر جمنے لگا تھا۔

کرنل نے اوندھے منہ گر کر سر اور منہ کے گرد بازو لپیٹے ہی تھے کہ زوردار دھماکے نے اپارٹمنٹ کے در و دیوار ہلا دیے۔ دیوار پر لگی ایک پینٹنگ نیچے گر گئی تھی اور کرنل کے کان سنسنا اٹھے تھے۔ یہی حرکت میں آنے کا وقت تھا۔ اس نے ٹٹول کر اتارا ہوا ہیلمٹ دوبارہ سر پر ایڈجسٹ کیا اور ایک بٹن دبا کر اس کے سامنے والا نائٹ ویژن گلاس سمیٹ دیا۔ اس دوران سیمنٹ اور کنکریٹ کے دھول کا ایک بادل سا لاؤنج میں در آیا تھا۔ کرنل بے دریغ اس بادل میں گھس گیا۔ کاریڈور میں یہ بادل اور بھی دبیز تھا۔ اس نے سانس روک رکھا تھا۔ داخلی دروازے کی طرف سے روشنی کی کرن نظر آئی۔ یہ کرن خطرے کی نشاندہی کرتی تھی۔ دروازے کو باہر سے کھول لیا گیا تھا۔ اس نے بیلٹ سے ایک اور سکہ نکال کر داخلی دروازے کی طرف اچھالا اور پھر ماسٹر بیڈروم کی طرف دوڑا جہاں سے دروازہ اپنی بنیادوں سمیت غائب ہو چکا تھا اور اندر سے ایک سے زائد افراد کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔

کرنل فرش پر رول کرتے ہوئے بیڈروم میں داخل ہوا اور اسی لمحے کاریڈور ایک اور دھماکے سے گونج اٹھا۔ بیڈروم میں ٹیرس کی کھڑکیاں کھلی تھیں اور بارودی دھوئیں کی مقدار بہت زیادہ نہیں تھی۔

کرنل نے دیکھا، ایک طویل القامت دُبلا پتلا شخص شب خوابی کے لبادے میں ملبوس تھا اور کھانستے ہوئے ایک نوعمر لڑکی پر جھکا ہوا تھا جو بیڈ کے نیچے بیٹھی بُری طرح سے کھانس رہی تھی۔

طویل القامت شخص بدحواس نظر آتا تھا۔ بیڈروم میں کرنل کی موجودگی کے احساس کے ساتھ ہی وہ لڑکی کو چھوڑ کر بیڈ کی دراز کی طرف جھپٹا مگر دیر ہو چکی تھی۔ بریٹا سے نکلنے والی گولی اس کی ٹانگ پر لگی۔ وہ چیخ مار کر نیچے گرا تو نوعمر لڑکی "پاپا...... پاپا" کہتی اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔ اس دوران اس پر کھانسی کا حملہ بھی جاری تھا۔

کرنل نے پیچھے ہٹتے ہوئے باہر کاریڈور کا جائزہ لیا۔

Digest Novels .com

دھماکوں سے تباہ حال کاریڈور ویران تھا۔ اندر کسی کو گھسنے کی جرأت نہیں ہوئی تھی۔ اسی وقت ٹیرس کے اوپر سے لانگ رینج رائفل گرجی تو کرنل چونک گیا۔ اسی پل سارہ کی سراسیمہ آواز اُبھری۔ ''لانچر سیٹ کرنے سے پہلے مجھے دیکھ لیا گیا ہے۔ مجھ پر فائر آرہا ہے۔''

کرنل نے ہونٹ بھینچتے ہوئے کہا۔ ''فوراً وہاں سے نکلو۔''

''ک...... ک...... کیا...... کہہ رہے ہو؟ تم کیسے نکلو گے؟'' سارہ باقاعدہ گھبرا گئی۔

کرنل نے قدم آگے بڑھاتے ہوئے پُرسکون انداز میں کہا۔ ''فری فال!''

''اس پیراشوٹ کے ساتھ یہ ممکن نہیں ہوگا۔'' وہ بوکھلائی۔

digest library.com

کرنل مسکرایا۔ ''تم بھول رہی ہو، یہ علاقہ بڑے سوئمنگ پولز سے بھرا ہے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے دوسری گولی چلا دی۔ زخمی شخص جو دراز کی طرف گھسٹ رہا تھا، دوبارہ چیخا۔ لڑکی زخمی شیرنی کے مانند کرنل پر جھپٹی۔

''کون ہو تم اور میرے پاپا کو کیوں مار رہے ہو؟''

کرنل نے اسے ایک بازو پر سنبھالا۔ ''تمہارا پاپا مجرم ہے بچے!'' اس کے ساتھ ہی اس نے ایک اور گولی چلائی جو ادھیڑ عمر کی کھوپڑی میں لگی۔

لڑکی، کرنل کو چھوڑ کر باپ کی لاش سے لپٹ کر رونے لگی۔

کرنل نے ٹیرس کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دی۔

☆☆☆

جنرل گوریان کی ''موساد'' کی مین چھتری کے نیچے ہلاکت نے تل ابیب سے لے کر واشنگٹن تک جیسے قیامت برپا کر دی تھی۔ اسرائیلی شاک کی کیفیت میں تھے۔ اس طرح کی کارروائیاں موساد کا طرۂ امتیاز تھیں اور ان پر موساد کے ساتھ ساتھ اسرائیل کی سیاسی قیادت بھی فخر کرتی تھی مگر اس دفعہ بانس الٹے بریلی کو چل پڑے تھے۔

جنرل گوریان امریکا کے نجی اور خفیہ دورے پر تھا۔ بیوی طلاق کے بعد امریکا میں مقیم تھی اور جنرل چند دن اکلوتی بیٹی کے ساتھ گزارنے کے لیے آیا تھا مگر مارا گیا تھا اور مارنے والے کا پیغام بے حد واضح تھا ''گھر میں گھس کر مارنا ہمیں بھی آتا ہے۔'' امریکن ڈیسک کا موساد کا انچارج دانیال ساحر اپنے آفس میں تنہا سر تھامے بیٹھا تھا۔ جنرل گوریان کی حفاظت کی ذمے داری اسی کی تھی مگر وہ اپنی ذمے داری نبھانے میں ناکام رہا تھا۔ جنرل گوریان کوئی عام فوجی جرنیل نہیں تھا۔ وہ سخت گیر پالیسی کا حامی ہونے کے ساتھ ساتھ غزہ پر مکمل کنٹرول اور ایران کو جوہری صلاحیت سے ہر قیمت پر روکنے کے ڈاکٹرائن کا خالق بھی تھا۔ غزہ کو کھنڈر بنانے میں اس کا ہاتھ سب سے نمایاں تھا۔ فلسطینی معصوم بچوں کا قاتل اپنے عبرت ناک انجام کو پہنچا تھا۔ اسرائیل میں تین روزہ سوگ کا اعلان ہو گیا تھا اور پرچم سرنگوں کر دیا گیا تھا۔

دوسری جانب فلسطین اور ایران میں اس خبر نے خوشیوں کے رنگ بکھیر دیے تھے۔ ابتدائی طور پر امریکا اور اسرائیل نے اس کا ذمے دار ایران کو قرار دے کر سنگین نوعیت کی دھمکیاں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ جس کا ایران کی جانب سے بڑھ چڑھ کر جواب دیا جا رہا تھا۔

دانیال ساحر کا ریکارڈ بے حد شاندار تھا جس کے سبب ابھی تک وہ اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ موساد ہیڈ کوارٹر سے ایک طویل کال اس نے موصول کی تھی۔ جس کا لُبِ لباب یہی تھا کہ اپنی سیٹ اور ساکھ بچانے کے لیے اسے جنرل گوریان کے قاتلوں کو جلد از جلد قانون کے دائرے میں لانا ہوگا۔ اس کی ہر ممکن مدد کے لیے موساد کے علاوہ ایف بی آئی اور امریکن ہوم لینڈ سیکیورٹی کا تعاون و اعانت بھی میسر تھی۔

دانیال نے خود کو سنبھالا۔ قاتل بے شک اپنے کام میں غیر معمولی مہارت رکھتا تھا مگر تھا تو ابھی امریکا میں ہی۔ موساد کی مدد کے لیے ہوم لینڈ سیکیورٹی کا فرانزک اور سائبر ونگ حرکت میں آچکا تھا۔ اس کی جانب سے رپورٹ کسی بھی وقت متوقع تھی۔ اس سے پہلے دانیال نے باہر بیٹھے اپنے معاونین کو اندر بلا لیا۔

مائرہ اسمتھ ایک دُبلی پتلی سنہرے بالوں والی چالیس سال کی عورت تھی اور دانیال کے بعد وہی امریکن ڈیسک کی کرتا دھرتا تھی جبکہ ریفر گولڈ نسبتاً نوجوان اور مضبوط جسم کا تھا اور فیلڈ ورک کو پسند کرتا تھا۔

دونوں بڑے سے منہ اور سیاہ ہونٹوں والے دانیال کے سامنے بیٹھ چکے تو دانیال نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''مائرہ! پہلے تم خیال آرائی کرو۔ جنرل کی ہلاکت سے لے کر ہماری داخلی کمزوری اور ممکنہ غداری کے تناظر میں جو کہنا ہے، کہہ جاؤ۔''

مائرہ دھیرے سے مسکرائی۔ ''تمہارا انداز ایسا ہے جیسے ''چیف'' کو ٹاسک دے رہے ہو...... خیر میں تمہاری

توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

اس کے انداز پر ریفر کے ہونٹوں پر بھی بے نام سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ دانیال بھی قدرے پُرسکون ہو گیا۔ مائر کے چہرے پر سنجیدگی اتری اور وہ بولی۔

''زیادہ توقع تو یہی ہے کہ ایران کے ساتھ حالیہ جھڑپ میں جس طرح ہم نے اُن کی ٹاپ فوجی قیادت اور سرکردہ افراد کو نشانہ بنایا ہے، جنرل گوریان کا قتل اسی کا نتیجہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے سکوں میں ہمیں جواب دیا گیا ہے اور بڑی مضبوطی کے ساتھ دیا گیا ہے۔''

ریفر نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے دخل اندازی کی۔ ''تمہیں دشمن کے قصیدے پڑھنے کے لیے تو نہیں کہا گیا۔''

مائر نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ ''جنرل کا قتل دشمن کو کمزور سمجھنے کا ہی نتیجہ ہے۔ ہم نے اپنے بہترین ایجنٹ، کثیر سرمایہ اور زرخریدوں کی ایک فوج کے علاوہ سیکڑوں گھنٹوں کی محنت کے بعد ایران میں ٹارگٹ ہٹس کیے تھے اور کامیابی کا تناسب بھی محض چالیس فیصد رہا تھا۔ جواب میں ایرانیوں نے دیکھ لو ہمارے مضبوط ترین قلعے میں گھس کر جسے مارا ہے، وہ نقصان ناقابلِ تلافی ہے۔''

دانیال نے اس موقع پر مائر کی حمایت کی۔ ''یہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ شاندار کارکردگی اور ناقابلِ یقین منصوبے کو کامیابی کے ساتھ عمل کرتے ہوئے ایرانیوں نے ہمیں اپنی مضبوطی دکھائی ہے اور اب ہماری باری ہے کہ ہم جنرل کے قاتلوں کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں اور تم آگے بڑھو لڑکی!''

مائر نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو تقریباً طے ہے کہ جنرل کو نشانہ بنانے والے ایرانی ہی ہیں...... اب یہ حرکت ان کے ایجنٹوں نے کی ہے یا کوئی کرائے پر ماہر ترین شخصیت ہائر کی ہے، اس کا تعین کرنے کی ضرورت ہے۔''

ریفر خود کو دوبارہ مداخلت سے باز نہیں رکھ سکا۔ ''کرائے کے قاتل والی بات تو ذہن سے نکال ہی دو ٹاپ کے قاتل بخوبی جانتے ہیں کہ اسرائیل اپنے مجرموں کا پاتال تک تعاقب کرتا ہے۔'' اس کا لہجہ تفاخر سے لبریز ہو گیا۔ ''بلکہ موساد ایسے قاتلوں کو نا صرف کام دیتی ہے بلکہ ان سے مخبری بھی لیتی ہے اس لیے اپنا فوکس ایرانی ایجنٹوں پر ہی رکھو۔''

مائر بولی۔ ''میں یہاں تم سے متفق ہوں۔''

دانیال بھی مسکرایا۔ ''میرے لیے یہ اچھی خبر ہے۔''

مائر بولی۔ ''مثبت اختلافِ رائے سے ہی ہمیشہ نیا راستہ نکلتا ہے اور تم دونوں بخوبی جانتے ہو، میں نے ہم عصر اور ماتحتوں کو نا صرف اختلافِ رائے کا حق دیا ہے بلکہ ان کی تعمیری رائے کو قبول بھی کیا ہے۔''

دونوں نے مائر کو سراہا تو وہ دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''اب دوبارہ سے اصل کام کی طرف آتے ہیں اور جنرل کے قتل کو ایک طرف رکھ دیتے ہیں کیونکہ وہ تو ہو چکا۔ ہمیں اب قاتلوں کی نا صرف شناخت کرنی ہے بلکہ انہیں کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔'' سانس لینے کے لمحاتی وقفے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''اس کے ساتھ ساتھ اپنی داخلی کمزوری اور اگر کوئی غدار ہماری صفوں میں ہے تو اسے ڈھونڈ نکالنا...... میرے خیال میں ہمارا ٹارگٹ یہی ہے اور اس حوالے سے جو ذمے داری دی ہے، وہ میں لینے کے لیے تیار ہوں۔''

دانیال کے چہرے پر اپنی ذہین اور قابل معاون کے لیے تحسین ابھری۔ وہ نرم انداز میں بولا۔ ''ظاہر ہے کوئی ذمے داری ہی تمہارے حصے میں آئے گی مگر اس سے پہلے ذرا ریفر کو سن لیا جائے۔''

دونوں کا رخ ریفر کی طرف ہو گیا جو الفاظ پہلے ہی جوڑے بیٹھا تھا۔ فوراً بولا۔

''ابتدائی رپورٹ کے مطابق قاتلوں کی ٹیم کم از کم دو افراد پر مشتمل تھی۔ ان کی پیشہ ورانہ مہارت سے ظاہر ہوتا ہے، وہ ایرانی سپر ایجنٹ ہیں اور میرے خیال میں موساد کے پاس ایسے ایجنٹوں کا ریکارڈ ضرور ہوگا۔''

دانیال کا چہرہ تمتما اٹھا۔ ''تم نے اہم ترین نقطے کو اٹھایا ہے۔ شناخت ہوتے ہی ہم ان کے کام کرنے کے طریقے کے بارے میں جان سکتے ہیں اور اس کے بعد انہیں کھوج نکالنا آسان ہو جائے گا...... اب ذرا آگے چلو اور مائر تم یہ پوائنٹ نوٹ کر لو!'' اس توصیف نے ریفر کو کھولا دیا۔ اس نے چور نظروں سے مائر کو دیکھا جو موبائل پر سپاٹ چہرے کے ساتھ یہ پوائنٹ نوٹ کر رہی تھی۔ ریفر نے مزید کہا۔

''میرے خیال میں ہمیں بیک وقت قاتلوں کے پیچھے بھی جانا چاہیے اور اس سوراخ کو بھی ڈھونڈنا چاہیے جس کے ذریعے قاتل اندر داخل ہوئے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس سوراخ کے ساتھ ہی ہمیں قاتلوں کے نقشِ پا بھی مل جائیں گے اور امید کرتا ہوں کہ مجھے بھی ضرور ذمے داری سونپی جائے گی۔''

ریفر کے خاموش ہونے سے پہلے دانیال پُرجوش ہو چکا تھا۔ تیزی سے بولا۔ ''یہ پوائنٹ بھی نوٹ کر لو اور یہی

Digest Novels .com

ہمارا لائحہ عمل ہوگا۔ فیصلہ ہوگیا کہ میں اور ریفر قاتلوں کا تعاقب کریں گے اور مائرہ وہ سوراخ ڈھونڈے گی جہاں سے قاتل ہمارے قلعے میں داخل ہوئے ہیں۔ اس طرح ہماری کمزوریاں بھی عیاں ہوں گی اور کوتاہی کے ذمے داروں کا تعین ہونے کے ساتھ ساتھ کوئی غدار ہے تو وہ بھی سامنے آجائے گا۔'' لمحہ بھر کے توقف کے بعد وہ مائرہ سے مخاطب ہوا۔

''پہلا جو پوائنٹ نوٹ کروایا تھا...... اسے لے کر ہیڈ کوارٹر سے مدد مانگو! میں ذرا ہوم لینڈ والوں کی خبر لے لوں۔''

☆☆☆

سیوریج کے بڑے بڑے پائپ بنانے والی وہ فیکٹری نہ جانے کب سے بند پڑی تھی۔ کرنل کمال اور سارہ وہاں بڑی تندہی سے مصروفِ عمل تھے۔ سارہ بائیس سالہ ایک توانائی سے بھرپور لڑکی تھی اور کرنل کمال کے مانند اپنا ملک ہی اس کے لیے سب کچھ تھا۔ ایسے نظریاتی جاں نثار اپنے اپنے ملکوں کا قیمتی ترین اثاثہ ہوتے تھے جن پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا تھا۔

سارہ پلاسٹک کے ایک بیگ میں سے انسانی پُتلے نکال نکال کر ایک دستی پمپ سے ان میں ہوا بھر رہی تھی۔ کرنل کمال مہارت کے ساتھ ان پُتلوں کے ساتھ ایک سرکٹ نصب کرتا تھا اور سیلن زدہ سے اس کمرے سے لے کر باہر نکل جاتا تھا۔ جلد ہی انہوں نے اپنا کام مکمل کر لیا۔ اس کے بعد وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پبلک ٹرانسپورٹ کے ذریعے وہ ایرینا مال شاپ پر اترے۔ یہ جگہ کھیل تماشوں کے لیے جانی جاتی تھی۔ خوش فکرے سیاح مختلف روپ دھارے لوگوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے۔ بچوں کا ایک گروپ پانی سے بھری بندوقیں لیے ان کے پاس سے گزرا اور دونوں کو بھگو گیا۔ سارہ نے ایک گول مٹول سی بچی کے گالوں کو محبت سے چھو لیا۔ جواب میں بچی نے اپنی ننھی سی ہتھیلی سارہ کے سامنے کھول دی جس پر ایک کینڈی جگمگا رہی تھی۔ سارہ نے شکریے کے ساتھ وہ کینڈی لے کر منہ میں ڈال لی۔

خوشیوں بھرے اس ماحول میں وہ دونوں بھی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پر جھومنے لگے۔ دونوں ہی کے کانوں میں آئی پوڈ لگے تھے اور مست گانوں پر جھومتے ہوئے وہ ایک خوش فکر سیاح جوڑا ہی لگ رہے تھے۔ دونوں کی عمروں کا فرق نوٹ کرنے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔

وہ ایک ذیلی سڑک پر آئے جہاں بہت بڑا سرکس لگا تھا۔ اس دوران میں ایک مسخرہ ان کے سر ہو گیا۔

''تم دونوں اگر یادگار تفریح چاہتے ہو تو یہ محض سات ڈالرز کے ایک ٹکٹ میں دستیاب ہے۔ ہمارے سرکس کی خاص بات سیون ڈی روشنیوں کا جیتا جاگتا جادو جو تمہیں مبہوت کر دے گا۔''

سارہ نے کہا۔ ''تمہارا شکریہ! مگر ہماری دلچسپی نہیں ہے۔''

مسخرے نے ہار نہیں مانی۔ ''پھر تمہیں اپنی قسمت تو ضرور آزمانی چاہیے۔ سرکس کا ہر ٹکٹ لکی ڈرا میں شامل ہوگا اور ایک خوش نصیب کو شو کے اختتام پر پانچ ہزار ڈالرز کا نقد انعام دیا جائے گا۔ یہ خوش نصیب تم بھی ہو سکتے ہو۔ دو ٹکٹ، جیتنے کے دو مواقع۔ انکار کرنے کو اب تمہارے پاس کچھ نہیں ہے۔'' ساتھ ہی مسخرے نے مخصوص اشارہ کیا۔

کرنل نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔ ''قسمت کو آزما لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آؤ، دیکھ لیتے ہیں تمہارا شو۔''

کچھ دیر بعد وہ ایک مختصر سے کیبن میں مسخرے کے سامنے ایک پرانے سے صوفے پر بیٹھے تھے۔ مسخرہ ایک اسٹول پر ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ کیبن کا دروازہ کھلا تھا اور باہر سے گھوڑوں کی لید کی بدبو آرہی تھی۔

مسخرے نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کامیابی کی خوشبو ٹیکساس سٹی سے ملی ہے۔ ایک ایرانی کھانوں کا ماہر شیف غائب ہو چکا ہے۔''

اس دوران باہر سے گھوڑے ہنہنانے کی آواز آئی تو مسخرہ اٹھ کر تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کی واپسی بھی اتنی ہی تیزی سے ہوئی۔ اس کے چہرے پر اطمینان دیکھتے ہوئے کرنل نے سپاٹ انداز میں کہا۔

''تفصیل بتاؤ!''

مسخرے نے کہا۔ ''آپ کی گائڈ لائن تھی کہ وہ ایرانی کھانوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ہم ہمہ اقسام کے اشتہارات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ٹیکساس کے پرنٹ میڈیا کے علاوہ الیکٹرونک میڈیا پر تواتر کے ساتھ ماہر ترین ایرانی شیف کی ضرورت کا اشتہار نظر آیا تو ہم اس جانب متوجہ ہوئے۔ ہمارے پوری طرح فعال ہونے سے پہلے الباقر نامی ایک ایرانی نژاد شیف منظر سے غائب ہو چکا ہے۔ یقین کی حد تک شبہ ہے کہ اسے اسرائیلیوں نے اپنے مہمان کے پاس پہنچا دیا ہے۔'' مہمان کا لفظ مسخرے نے بڑے زہریلے انداز میں چبا کر ادا کیا تھا۔

کرنل کے چہرے کے عضلات سختی میں ڈھلے۔

''تمہیں فعال ہونے میں تاخیر کیوں ہوئی؟''

مسخرے کا چہرہ پل بھر میں دھواں ہو گیا مگر وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ ہم سینہ گزٹ سے کام چلا رہے ہیں۔ رابطے کی برق رفتاری میسر نہ ہونے کے سبب تاخیر ہوئی مگر کلیول چکا ہے۔ یقین ہے اگلی ملاقات میں آپ کو خوش خبری سنا دی جائے گی۔''

کرنل نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ دشمن ٹیکنالوجی میں واضح برتری رکھتا تھا۔ ذرائع ابلاغ اور ہمہ قسم کے مواصلاتی نیٹ ورک اس کا خاص ہتھیار تھے جن کے ذریعے اس نے بڑی کامیابیاں سمیٹی تھیں۔ اسی سبب کرنل ان ذرائع کا استعمال نہ ہونے کے برابر کر رہا تھا۔ کرنل نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''میں منتظر ہوں۔ دشمن رات کے بعد سے بھوکے بھیڑیوں کے مانند ہمارے تعاقب میں نکل چکا ہے۔ وقت بے حد کم ہے۔''

مسخرہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جانتا ہوں اور رات کی عظیم کامیابی کی مبارک باد دینا تو میں بھول ہی گیا۔'' ساتھ ہی اس نے سارہ کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''تمہاری جیسی بیٹیوں پر امارات اسلامی کو ہمیشہ فخر رہے گا۔''

سارہ ہونٹ بھینچے مسکرا دی۔ کرنل نے مختصراً ''خیر مبارک'' کہنے کے بعد کہا۔

''میرے خیال میں شو کا وقت شروع ہونے والا ہے۔''

☆☆☆

ہوم لینڈ سیکیورٹی والوں کی رپورٹ میں بہت کچھ تھا۔ سی سی ٹی وی فوٹیج میں ایک بے حد فربہ ادھیڑ عمر کا مشکوک شخص ملا تھا جس نے ایک عمارت کی چھت کے رات والے گارڈز سے کیفے ٹیریا میں مسلسل تین، دن گپ شپ لگاتے ہوئے دوستی گانٹھی تھی۔ اس کے بعد وہ فربہ شخص گارڈ کے ساتھ ہی اس کی ڈیوٹی والی چھت پر گیا تھا جس کے بعد گارڈ اپنے کیبن میں بے ہوش پایا گیا تھا۔ یہ گارڈ دل کی معمولی تکلیف میں بھی مبتلا تھا اور ابھی تک انتہائی نگہداشت میں تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ فربہ شخص اس کے بعد دو بیگوں کے ساتھ لفٹ کے قریب بھی دیکھا گیا تھا۔ یقیناً وہ یہ بیگ اوپر چھت پر لے گیا تھا۔

اس بے حد فربہ شخص کے گرد سرخ دائرہ لگاتے ہوئے موساد کو ایک اور دھچکا لگا تھا۔ اس عمارت کی چھت پر سلیکون کا ایک پورا کاسٹیوم اور ماسک ملا تھا جو فربہ شخص نے اپنے چہرے اور جسم پر چڑھانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ اہم ترین بات یہ تھی کہ حلیہ بدلنے کی یہ جدید ٹیکنالوجی اسرائیلی تھی اور ایک ایرانی ایٹمی سائنس داں کو ایران میں اڑانے کے مشن پر مامور موساد کے ایک ٹاپ ایجنٹ کی وجہ سے ایرانیوں کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ بعد ازاں وہ موساد ایجنٹ بھی ایران میں مارا گیا تھا۔ ایران ریورس انجینئرنگ کے تحت اس جدید ترین ٹیکنالوجی کو اب اپنے استعمال میں لے آیا تھا۔

اسی طرح ایک بے حد بوڑھی عورت کے گرد بھی سرخ دائرہ لگایا گیا تھا۔ جو ایک دوسری عمارت کی چھت پر دیکھی گئی تھی۔ ایک فوٹیج میں پورٹیبل راکٹ لانچر کے ساتھ وہ برق رفتاری سے بھاگتی پائی گئی تھی۔

یقینی طور پر وہ بوڑھی عورت بھی بدلے ہوئے حلیے میں تھی۔

جنرل گوریان کو اڑانے کے دوران کسی قسم کی مشکوک کمیونیکیشن اس علاقے میں نہیں پکڑی جا سکی تھی، اس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ قاتل کتنی مضبوط منصوبہ بندی کے ساتھ آئے تھے اور کس قدر محتاط تھے۔ انہوں نے کوئی خاص سراغ نہیں چھوڑا تھا اور فرانزک والے کہیں بھی، ان کی انگلیوں کے نشان ڈھونڈنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

نیچے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئمنگ پول کے پاس سے پیراشوٹ اور کچھ فوٹیج ملے تھے جن پر ہوم لینڈ والے کام کر رہے تھے۔ قاتلوں کی کارروائی کا ایک مکمل خاکہ سا دانیال کے ذہن میں آ گیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ لاشعوری طور پر قاتلوں کو سراہنے پر مجبور ہو گیا۔ خاص طور پر بنیادی کردار ادا کرنے والے قاتل کو جس نے فلائنگ سوٹ کے سہارے موساد کے مضبوط ترین قلعے میں نقب لگائی۔ وہاں بھی کامیابی سمیٹی اور پھر ایک چھوٹے پیراشوٹ کے سہارے فری فال چھلانگ لگائی۔ یقیناً اس نے زمین سے محض دو سو فٹ کے لگ بھگ پیراشوٹ کھولا تھا۔ دوسری صورت میں وہ آسانی کے ساتھ جنرل والی بلڈنگ کی چھت پر موجود نشانے بازوں کا ٹارگٹ بن جاتا۔ بعد ازاں اس نے پیراشوٹ والی کی سوئمنگ پول میں اتر کر پوری کی تھی۔ یقیناً اس کو سوئمنگ پول کا بھی پہلے سے علم تھا۔

دانیال کے دل میں کھد بدی مچ گئی تھی۔ وہ اتنی مہارت کے حامل قاتل کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو رہا تھا کہ مائر کھلے لیپ ٹاپ کے ساتھ چہرے پر

سنسنی بجائے اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور چھوٹتے ہی بولی۔

''ہیڈکوارٹر سے طویل میل آئی ہے۔ ایرانی ٹاپ ایجنٹ کرنل کمال کا ایران میں کہیں سراغ نہیں مل رہا۔ چیف نے ذاتی رائے دی ہے کہ'' مہارت اور دیدہ دلیری کا پرتو'' جنرل کا قاتل کرنل کمال ہی ہوسکتا ہے۔ کرنل کی فائل ساتھ اٹیچ ہے۔''

دانیال کے وجود میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ بھی اس نام سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے نگاہ کی عینک چہرے پر سجائی۔

''دکھاؤ۔''

مائر نے لیپ ٹاپ اس کے سامنے کر دیا۔

دانیال نے پہلے میل دیکھی۔ لکھا تھا۔ ایرانی خفیہ ایجنسی ''ہلالی تلوار'' کا سپر ایجنٹ کرنل کمال دنیا کے ان سیکرٹ ایجنٹس میں شامل ہے جو ہمیشہ سے ہی موساد کے لیے سردرد رہا ہے۔ موساد کبھی بھی اس پر مکمل قابو پانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

کرنل کمال خطرے کو بھانپنے کی خداداد صلاحیت کا حامل ہے۔ اس کی مہارت، دیدہ دلیری اور فیصلے کی زبردست صلاحیت مقابل کو مبہوت کر دیتی ہے۔

کرنل کمال کے کام کرنے کا طریقہ بھی بہت خاص ہے۔ اگر وہ حملہ آور ہے تو یقین رکھو وہ ملٹی ٹارگٹس پر عقاب کے مانند نگاہیں جمائے ہے۔ جو ٹارگٹ تمہیں دکھائے گا، وہ محض دکھانے کے لیے ہوگا۔ وہ ہمیشہ چھپا رہتا ہے۔ اگر مشن کے دوران وہ ظاہر ہو جائے تو سمجھنا کہ وہ اپنا مقصد حاصل کر چکا ہے یا پھر بڑی عیاری سے تمہیں اپنے تعاقب میں لگا کر کسی دلدل میں لے جائے گا۔

کرنل کمال ایران سے باہر عموماً اکیلا کام کرتا ہے۔ ٹیم کے ساتھ ہے تو یقیناً ٹارگٹ اہم ترین اور زیادہ تعداد میں ہوں گے۔ اس کے علاوہ لڑائی بھڑائی میں غیر معمولی مہارت رکھتا ہے۔ ہمہ اقسام کے ہتھیار چلانا اور نت نئے ہتھیاروں کا حصول اس کا مشغلہ ہے۔ سخت جان ہے۔ آوازیں بدلنے میں بھی مہارت رکھتا ہے اور نشانے بازی بھی غضب کا ہے۔ ہلالی تلوار میں اسے ''ون مین آرمی'' کہا جاتا ہے۔

دانیال ٹھوڑی مسلتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''ون مین آرمی ہی ہے'' ساتھ اس نے کرنل کی فائل کھولی۔ ایک طویل القامت جوان...... بے حد کالے بال اور آنکھیں...... سرخ و سفید رنگت کے ساتھ وہ غیر معمولی مردانہ وجاہت کا حامل تھا۔ فائل میں تقریباً وہی باتیں تھیں جو میل میں درج تھیں۔

دانیال نے لیپ ٹاپ مائر کی طرف گھمایا۔ ''ہمارا مقابلہ کرنل کمال سے ہے۔''

مائر نے آنکھیں اس پر جمائیں۔ ''ہمارے لیے ایک شاندار موقع ہے۔ جنرل کی ہلاکت کا داغ ہمارا ڈیسک کاؤنٹر کرنل کمال کو جکڑ کر دھو سکتا ہے۔''

دونوں کی نگاہیں ملیں اور پل بھر میں جو کچھ مائر کے دماغ میں چل رہا تھا، دانیال کے ساتھ شیئر ہو گیا۔ دانیال نے پوچھا۔

''ریفر کیا کر رہا ہے؟''

مائر بولی۔ ''ہوم لینڈ والوں کے ساتھ لگا ہے۔ کرنل کمال جس ہوٹل کے سوئمنگ پول میں اترا تھا، وہاں کچھ فوٹیج ملے ہیں جنہیں لے کر پُرجوش ہے۔ کہہ رہا تھا جلد ہی قاتلوں کی گردن اس کے ہاتھ میں ہوگی۔''

دانیال قدرے مضطرب ہوا۔ ''اس کا کرنل کمال کے بارے میں جاننا بے حد ضروری ہے۔ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھا بیٹھے۔ بلاؤ اُسے۔''

مائر نے اطمینان سے کہا۔ ''اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی ہمارے بغیر اور بنا کسی اطلاع کے وہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔''

دانیال نے سر تھام لیا۔ ''ابتدائی دھچکے نے شاید میرے اعصاب کو متاثر کیا ہے۔''

''تمہیں بلیک کافی کی ضرورت ہے۔''

دانیال نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد تلخ کافی کے گھونٹ بھرتے ہوئے وہ واقعی خود کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ مائر نے اپنے لیے کولڈ کافی بنائی تھی۔ گفتگو دوبارہ سے کرنل کمال کی طرف گھوم گئی۔ مائر نے کہا۔

''کرنل کمال ایک ٹارگٹ کو تو کامیابی سے نشانہ بنا چکا ہے۔ اس کے ممکنہ ٹارگٹ کیا ہو سکتے ہیں؟''

دانیال کو کافی مزید تلخ محسوس ہونے لگی۔ اس نے کہا۔ ''کرنل کا زیادہ دیر آزاد رہنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ بظاہر تو کوئی ٹارگٹ نہیں ہے مگر امریکا ہمارے لیے دوسرے گھر کے مانند ہے۔ ہماری عسکری اور سیاسی قیادت کے سرکردہ افراد عموماً سرکاری یا نجی دورے پر آتے رہتے ہیں۔ تم نے یہ سوال کر کے میری فکرمندی بڑھا دی ہے۔''

مائر بھی فکرمند ہو گئی۔ وہ جو کچھ ایران میں کر چکے تھے، وہ شرمناک تھا مگر اپنے مذموم مقاصد میں کامیابی ضرور

ملی تھی۔ اب کرنل کمال وہی کچھ امریکا میں دہرانے جارہا تھا تو اسرائیلیوں کے پسینے چھوٹنے لگے تھے۔

دانیال نے جھنجلا کر اپنی ہتھیلی پر مُکا مارا۔ ''یہ منحوس شخص میرے اعصاب پر سوار ہوگیا ہے۔''

مائر نے کولڈ کافی کی چسکی لیتے ہوئے سپاٹ انداز میں کہا۔ ''مجھے مایوس کررہے ہو تم...... پہلی دفعہ تو کوئی ہمارے اعصاب پر سوار ہوا ہے اور تم جھنجلا بیٹھے ہو۔ معاف کرنا تم پوری صلاحیت کے ساتھ کام نہیں کرپاؤ گے۔ مجھے ہیڈکوارٹر سے بات کرنا ہوگی۔''

دانیال کو جیسے شاک لگا۔ لحظہ بھر کے لیے اسے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ اس لمحے اس کے سامنے اس کی معاون نہیں، ایک پیشہ ور ایجنٹ تھی جسے اپنے یہودی ہونے پر فخر تھا اور اسرائیل کا مفاد اسے ہر چیز سے عزیز تھا۔

دانیال نے خود کو سنبھالتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''میں خود کو روک نہیں سکتا کیونکہ عظیم تر اسرائیل کا مفاد مجھے بھی اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ تم سے ایک موقع کی درخواست کرتا ہوں۔ مجھے اب تم نارمل پاؤ گی۔''

مائر نے اسے بغور دیکھا اور پھر کندھے اچکائے۔

''میں فی الحال اپنا ارادہ موخر کردیتی ہوں مگر یاد رہے یہ تمہاری کارکردگی سے مشروط ہوگا۔ ذرا سی کوتاہی......''

دانیال نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ ''اس لمحے کے بعد سے تم کوئی کوتاہی پاؤ تو ہیڈکوارٹر کو اطلاع دینے میں لحظہ بھر بھی نہ لگانا...... یہ میرا حکم ہے۔''

مائر کے سپاٹ چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اسی لمحے ریفر گولے کے مانند کمرے میں وارد ہوا اور پُرجوش انداز میں بولا۔ ''ہوٹل سے حاصل ہونے والی فوٹیج اور سیف سٹی کیمروں نے کمال دکھایا ہے۔ ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ جنرل گوریان کے قاتل کہاں موجود ہیں۔''

مائر اور دانیال جیسے خوشی سے اچھل پڑے تھے۔

☆☆☆

رات کا آخری پہر تھا مگر نیند دانیال کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ اور مائر ہوم لینڈ سیکیورٹی کے امریکی ادارے کے آپریشن روم میں تھے۔ دونوں کے چہرے تمتما رہے تھے۔ کامیابی ان سے زیادہ دور نہیں تھی۔

آپریشن روم میں درجن بھر اسکرینز کے سامنے ان کے آپریٹر موجود تھے۔ اسکرینز پر مختلف مناظر نظر آرہے تھے۔ کچھ مناظر متروک پائپ فیکٹری کے تھے۔ فیکٹری کے اوپر خاصی بلندی پر موجود ڈرون یہ مناظر دکھا رہا تھا۔ ڈرون میں موجود جدید ترین سینسرز انسانی وجود سے نکلنے والی حرارت کو مانیٹر کررہے تھے اور اس کی مدد سے ایک کمپیوٹرائزڈ امیج بن رہا تھا جو دکھا رہا تھا کہ فیکٹری کے ایک ٹوٹے پھوٹے کمرے میں دو افراد موجود تھے اور درجن بھر پائپوں کے اندر لیٹے ہوئے تھے۔ یہ امیج ہی دانیال اور مائر کے وجود میں جوش اور سنسنی بھر رہا تھا۔ قاتلوں اور دہشت گردوں کی گویا ایک پوری فوج تھی جو اُن کی دسترس میں تھی۔ ان دونوں کا خیال تھا کہ کمرے میں یقیناً کرنل کمال اور اس کی ساتھی عورت تھے اور دیگر ان کے ماتحت تھے۔

ہوم لینڈ سیکیورٹی کے سربراہ کا اتنے سارے دہشت گرد عین امریکا کے قلب میں دیکھ کر پسینے چھوٹ گئے تھے۔ وہ تھوڑی ہی دیر میں پہنچنے والا تھا۔ اس کے بعد موساد کے امریکن ڈیسک اور ہوم لینڈ سیکیورٹی کی مشترکہ ٹیم نے پائپ فیکٹری پر دھاوا بول دینا تھا۔ ریفر بھی اس ٹیم کے ساتھ تھا اور یہ ٹیم جو چوبیس بہترین ایجنٹوں پر مشتمل تھی، پائپ فیکٹری کو گھیر چکی تھی اور طے شدہ معاملات کے تحت ہوم لینڈ سیکیورٹی کے سربراہ کو آپریشن روم میں آکر اس آپریشن کی باضابطہ منظوری دینی تھی اور پھر اس ٹیم نے پائپ فیکٹری پر ہلا بول دینا تھا۔

ہوم لینڈ سیکیورٹی کا سربراہ آپریشن روم میں داخل ہوا۔ اس کا نام ول پاؤل تھا اور وہ ایک لمبا چوڑا سیاہ فام تھا۔ عمر کا اندازہ پچاس سے اوپر کا تھا۔ اس نے مائر اور دانیال سے بڑی بے دلی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ وہ موساد کی اس آپریشن میں شمولیت کا مخالف تھا مگر ایک فون کال پر اسے اپنا موقف تبدیل کرنا پڑا تھا۔

ول پاؤل نے ایک دستاویز پر دستخط کیے اور پھر آپریشن کا آغاز ہوگیا۔ وہ اسکرین پر لائیو مناظر دیکھ رہے تھے۔ ریفر بھی سیاہ مخصوص وردی میں آپریشن کمانڈو کے ساتھ تھا۔

فیکٹری کے مین گیٹ کو چھوڑ کر دائیں، بائیں کی دیواروں کے ساتھ سیڑھیاں لگادی گئیں۔ جدید ترین مائیکرو بتارہے تھے کہ دیواریں بالکل محفوظ ہیں اور وہاں کوئی وارننگ سسٹم موجود نہیں تھا۔

لمحوں میں ہی پوری ٹیم دونوں طرف کی دیواروں کے اوپر تھی۔ ریفر براہ راست دانیال کے ساتھ رابطے میں تھا۔ اس نے پُرجوش سرگوشی کی۔

''یقین نہیں آرہا۔ دہشت گردوں کی پوری فوج پائی

میں چیختی مخلوق کے مانند ہمارے نشانے پر ہے۔''

''یقین کے ساتھ آگے بڑھو اور کامیابی سمیٹ لو۔''

پوری ٹیم بے حد خاموشی اور سرعت کے ساتھ دوسری جانب کمپاؤنڈ میں اتر گئی۔ ریفر کی قیادت میں چار ایجنٹس کی ٹیم ایک طرف موجود کمرے کی طرف بڑھی اور باقی ایجنٹس اپنے کمانڈو کے ساتھ نشان زدہ پاپوں کی طرف بڑھے۔ پہلی ترجیح دہشت گردوں کو زندہ گرفتار کرنا تھا تا کہ انہیں دنیا کے سامنے پیش کیا جاسکے۔

اس موقع پر دانیال نے بڑے سفاک انداز میں ریفر سے کہا۔ ''اگر کرنل کو گولی مارنے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے تو جنرل گوریان کے نام کی پہلی گولی اس کی پیشانی میں اتارنا۔''

ریفر کی تمام تر توجہ ٹارگٹ پر تھی۔ اس نے کہا۔ ''میری خواہش ہے کہ گولی مارنے کی نوبت آہی جائے۔''

آخری الفاظ ابھی اس کے منہ سے ادا ہوئے ہی تھے کہ قریب ہی زوردار چمک نمودار ہوئی اور اگلے ہی پل جیسے کسی طاقتور ہاتھ نے اٹھا کر ریفر کو دور پھینک دیا۔ زوردار دھماکے کے ساتھ ہی یکے بعد دیگرے پانچ فیکٹری کا کمپاؤنڈ دھماکوں سے گونج اٹھا اور پھر جیسے پورے کمپاؤنڈ کو تیز تر نیلی آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دانیال دیوانوں کے مانند ریفر کو آوازیں دے رہا تھا مگر جواب ندارد۔ اسکرین پر ہر طرف نیلی آگ کی لپٹیں تھیں جو قیامت کا منظر پیش کررہی تھیں۔

☆☆☆

کرنل کمال نیویارک میں تھا۔ وہ ایک سیاہ فام جوان کے بہروپ میں تھا۔ اسرائیلی ٹیکنالوجی کو ایرانی ماہرین نے خوب اچھے سے سمجھ لیا تھا اور اب دشمن کا ہتھیار اسی کے خلاف استعمال ہو رہا تھا۔ ایرانی ایجنٹس اس ٹیکنالوجی کی بدولت بڑی تیزی سے من چاہا روپ اپنا لیتے تھے اور یہ سب اتنا حقیقی نظر آتا تھا کہ دماغ چکرا جاتا تھا۔ اسی سبب وہ بڑے آرام سے امریکا میں دندناتے پھر رہے تھے۔

کرنل ایک ریسلنگ ایرینا میں موجود تھا۔ یہ دو مختلف دنیا کی تھیں۔ ایرینا کے اوپری حصے میں رنگوں، روشنیوں اور گلیمر کا ایک جہاں تھا جہاں نورا کشتی ہوتی تھی اور انسانوں کے ساتھ انسان لڑتے تھے۔ ایرینا کی زیرِزمین دنیا میں تاریکی کا راج تھا۔ اس تاریکی میں انسان اپنے چہرے سے مہذب ہونے کا نقاب اتار کر اپنے حقیقی جامے میں نظر آتے تھے۔ اس تاریکی میں بھی مقابلے ہوتے تھے۔ انسان کے ساتھ انسان کے بجائے درندے لڑتے نظر آتے تھے اور یہ سب دیکھنے کے لیے لاکھوں افراد منہ مانگی ادائیگیاں کرتے تھے۔ یہ سب آنکھوں کے سامنے بھی ہوتا تھا اور ڈارک ویب پر بھی دستیاب تھا۔

رومن ایمپائر کے دور سے یا شاید اس سے پہلے انسان کو درندوں سے لڑتا دیکھنے والوں کی نہ جانے کون سی حس کو تسکین حاصل ہوتی تھی۔ صدیوں پرانا یہ سلسلہ آج بھی جاری تھا۔ انسان نہ بدلا تھا اور شاید نہ ہی بدلے گا۔ حیوانیت کل بھی ننگا ناچتی تھی اور آج بھی لبادے کے بغیر ہی تھی۔

زیرِزمین پارکنگ میں موجود ایک خاص لفٹ میں داخل ہو کر سیکنڈ فلور کے بٹن کو کرنل نے مسلسل تین دفعہ دبایا تو لفٹ حرکت میں آگئی مگر اس کا رخ اوپر کے بجائے نیچے کی طرف تھا۔ تیس سیکنڈ میں لفٹ نہ جانے کتنی گہرائی میں اتر گئی تھی۔

لفٹ رکی اور خودکار کھلنے والے دروازے سے کرنل باہر نکلا تو یہ ایک خوب روشن کمرا تھا جو کسی بھی قسم کے فرنیچر سے عاری تھا۔ کمرے کے وسط میں جیسے اس کے استقبال کے لیے گہری نیلی اور چست وردیوں والے تین افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک تیس بتیس سال کی خوبرو لڑکی تھی۔ کمر پر سنہرے بالوں کی چوٹی گرائے جسم سے چپکی وردی میں وہ کسی ہالی ووڈ ایکٹریس سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ باقی دو بھی خوب لمبے تڑنگے سفید فام تھے۔ ورزشی مضبوط جسم اور ہولسٹرز سے جھانکتے ہتھیار انہیں پُروقار ہیبت عطا کررہے تھے۔ لڑکی کے سینے پر جگمگاتا ایک سنہری اسٹار ظاہر کررہا تھا کہ وہ سینئر تھی اور فوراً ہی کرنل کے اس اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ لڑکی نے نرم لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہاری پروفائل دیکھی ہے۔ تم یقیناً جیمی فورمان ہو۔''

کرنل نے مسکراہٹ کے ساتھ سر کو خم دیا۔ لڑکی مزید بولی۔

''میں روزی وائٹ ہوں اور ''ری روڈ ایرینا'' میں تمہیں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔'' ساتھ ہی اس نے اپنے دونوں ماتحتوں کو مخصوص اشارہ کیا تو وہ کرنل کے گرد پہنچ گئے۔

لڑکی دوبارہ کرنل سے مخاطب ہوئی۔ ''رولز کے مطابق تمہیں اسکین کیا جائے گا۔ یقیناً تم برا نہیں مناؤ گے۔''

کرنل نے دونوں ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں

Digest Novels .com

ذہنی طور پر مکمل تیار ہو کر آیا ہوں۔"

روزی مسکرائی۔ "اچھا ہے۔ ایسے افراد کو مسٹر ووڈ پسند کرتے ہیں۔"

کرنل کی تلاشی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ ہدایت کے مطابق وہ کسی ہتھیار کے بغیر آیا تھا۔ اس کی جیبوں سے معمولی رقم کے علاوہ کچھ نہیں ملا تھا۔ یہ رقم دوبارہ اس کی جیب میں ڈال دی گئی۔

کرنل نے غور کیا تھا کہ تلاشی کے عمل کا روزی نے بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔ یقیناً وہ فرض شناس اور چوکس لڑکی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ کرنل کے پورے وجود پر چڑھی بے حد باریک اور مضبوط جھلی کا تلاشی لینے والوں کو احساس بھی نہیں ہو سکا تھا۔ یہی جھلی اسے سیاہ رنگ عطا کیے ہوئے تھی۔ چہرے پر موجود ماسک قدرے موٹا تھا اور گردن تک آتے آتے وہ بھی بے حد باریک ہو جاتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کرنل ایک آرام دہ کمرے میں تھا۔ روزی اس کے ساتھ آئی تھی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ بولی۔ "فی الحال تم اس کمرے تک محدود رہو گے اور کسی ضرورت کے لیے انٹرکام استعمال کرو گے۔"

کرنل بولا۔ "اس طرح تو میں خود کو قیدی تصور کروں گا۔ میں ایرینا کے اس خاص حصے میں گھومنا پھرنا چاہتا ہوں اور مسٹر ووڈ سے فوری ملاقات میرا ایجنڈا ہے۔"

"تھوڑا دھیرج رکھو، مسٹر ووڈ سے تمہاری کسی بھی وقت ملاقات ہو جائے گی۔ فی الوقت وہ مصروف ہیں۔ چینل اے، میں میری ذمے داری یہاں تک ہے۔ چینل بی میں داخل ہوتے ہی تم مکمل آزاد ہو گے اور چینل بی میں داخلے کا فیصلہ مسٹر ووڈ کریں گے۔" اتنا کہہ کر وہ کرنل کا چہرہ دیکھنے لگی۔

کرنل نے طویل سانس لیا۔ "ٹھیک ہے۔ میں تمہاری ذمے داری سمجھ رہا ہوں۔"

روزی کے چہرے پر طمانیت نمودار ہوئی اور وہ کمر پر چوٹی لہراتی کمرے سے رخصت ہو گئی۔

☆☆☆

موساد کے امریکن ڈیسک اور ہوم لینڈ سیکیورٹی کی مشترکہ ٹیم جس ٹریپ کا شکار ہوئی تھی، اس کے بعد امریکا کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا تھا۔ ریفر سمیت آٹھ ایجنٹ مارے گئے تھے اور باقی بھی مختلف اسپتالوں میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وفاق سے فوراً ہی یہ معاملہ ایف بی آئی کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ اہم معلومات کے لیے دانیال کو تعاون بھی ایف بی آئی کا حاصل تھا۔ اس وقت ایف بی آئی کے ٹاپ ایجنٹ کاپر نائز کے سامنے دانیال اور ہوم لینڈ سیکیورٹی کا سربراہ ول پاؤل ستے ہوئے چہروں کے ساتھ سر جھکائے بیٹھے تھے۔

مکمل بریفنگ کے بعد کاپر سرد لہجے میں دونوں سے مخاطب ہوا۔ "بادی النظر میں تم دونوں مجرمانہ غفلت کے مرتکب ہوئے ہو۔ تم دونوں نے کرنل کمال کے بارے میں مکمل جانکاری کے باوجود اپنی صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔" اس کے لہجے میں سختی در آئی۔ "وہ انگلی تھام کر تمہیں پائپ فیکٹری میں لے گیا اور تم نے وہاں اپنے ایجنٹ کھو دیے۔ ذرا تم دونوں بتاؤ گے کہ ایجنٹ اتارنے سے پہلے کمپاؤنڈ کو مکمل چیک کیوں نہیں کیا؟ تمہارے پاس جدید ڈرون اور ہمہ قسم کے بارود کی کھوج لگانے والے سینسرز دستیاب تھے۔ تم نے ان کا استعمال کیوں نہیں کیا؟"

دونوں کے سر مزید جھک گئے۔

کوپر نے ایک زہرخند نظر دونوں پر ڈالی اور زہریلے طنز سے کہا۔ "یا پھر پتلون پر لگی ڈیوائس سے خارج ہونے والی حرارت نے تمہارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی تھی۔ مجھے جواب دو۔"

ول پاؤل نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "اس دھماکے میں سلفر نائٹر... کا استعمال ہوا ہے۔ سینسرز نے اس کی موجودگی کی نشاندہی کی تھی مگر ہر طرف بکھرے سیمنٹ کی وجہ سے میں نے اس وارننگ کو نظر انداز کیا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ سیمنٹ میں موجود سلفر......" کوپر نے سامنے لیپ ٹاپ کی اسکرین پر نظر ڈالی اور ہونٹ بھینچتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

"سگنل اسٹرینتھ .... 9.6 کو تم نے محض سیمنٹ میں موجود سلفر نائٹریٹ سمجھا۔ تمہیں یہاں سے فوراً جانا ہو گا مسٹر پاؤل! تمہاری بچت کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

ول پاؤل لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکلا تو دو ایجنٹس نے اسے مضبوطی سے بانہوں سے تھام لیا۔

کوپر کی نگاہیں دانیال پر جم گئیں اور لہجہ قدرے نرم ہوا۔ "تمہیں قصوروار گرداننا قدرے مشکل ہے۔ کیونکہ تمہاری بنیادی تربیت سبوتاژ کے لیے ہوئی ہے۔ تم مارو اور بھاگ جاؤ کے فارمولے کے تحت تخلیق ہوئے ہو...... اس طرح کی صورتِ حال سے تمہارا سامنا شاید پہلی بار ہوا ہے۔"

Digest Novels .com

دانیال کو نرمی میں چھپی طنز کی آمیزش صاف محسوس ہو رہی تھی مگر وہ خاموشی سے اسے برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ کوپر مزید کہہ رہا تھا۔

"کرنل کمال ایک ٹاپ ایجنٹ ہے...... اسے تم لوگوں نے ہلکے میں لے لیا ہے۔ دیکھو کتنی آسانی سے سی سی ٹی وی فوٹیج کے سہارے وہ تم لوگوں کو گھیر کر سیمنٹ فیکٹری میں لے گیا اور وہاں سے نکلتے ہوئے ہائی وے تک آٹھ کیمروں کی کوریج تھی مگر آٹھوں ہی اس نے ناکارہ بنا دیے اور وہ دوبارہ سے گدھے کے سر سے سینگوں کے مانند غائب ہو چکا ہے۔"

دانیال نے کمزور سی آواز میں کہا۔ "ممکن ہے وہ اب امریکا سے بھاگنے کی فکر میں ہو...... مشن تو شاید اس کا مکمل ہو گیا ہے۔"

کوپر نے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہارے ہی ہیڈ کوارٹر کی اس کے متعلق حتمی رائے ہے کہ وہ ملٹی ٹارگٹ پر بیک وقت کام کرتا ہے۔ وہ آسانی سے بھاگنے والا نہیں ہے۔ مجھے یہ پریشانی کھائے جا رہی ہے کہ وہ نہ جانے کس ٹارگٹ پر اپنی مخصوص نگاہیں جمائے ہے اور کس قدر ٹارگٹ کے قریب پہنچ چکا ہے اور میں دل پاؤل جیسے گدھوں پر چیخنے کے سوا اور کچھ نہیں کر پا رہا۔"

دانیال کا سر دوبارہ جھک گیا۔

کوپر نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو۔"

دانیال باہر نکلا تو مائر چہرے پر اجنبیت سجائے اس کی منتظر تھی۔ اس نے سپاٹ انداز میں کہا۔

"دو گھنٹے بعد تمہاری تل ابیب کے لیے فلائٹ ہے۔ مجھے، تمہاری جگہ تعینات کرتے ہوئے ایف بی آئی کے ساتھ مل کر کام کرنے کے احکامات موصول ہو چکے ہیں۔"

دانیال کو محسوس ہوا جیسے اس کمرے میں آکسیجن کی مقدار اچانک ہی کم ہو گئی ہو۔ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے وہ ایک صوفے پر گر سا گیا۔

مائر اُسے نظر انداز کرتے ہوئے کوپر والے کمرے میں داخل ہو گئی۔

☆☆☆

درمیان میں فولادی ٹیبل کے دوسری طرف بے حد سرخ چہرے اور سفید بالوں والا آئن ووڈ بیٹھا کرنل کمال کو نگاہوں میں تول رہا تھا۔ اس کی گہری نیلی آنکھوں میں جہاندیدگی نمایاں تھی۔ کرنل کمال نے جب نگاہیں نہیں چُرائیں تو ووڈ نے کہا۔

"تمہارا پروفائل مثالی ہے۔ ڈارک ویب پر ہمارے اشتہار کے جواب میں صرف دو افراد نے رابطہ کیا ہے۔ کیا تم معاہدے پر دستخط کے لیے تیار ہو؟"

"یقیناً...... یہاں میری موجودگی کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں ہے۔"

ووڈ نے میز کی دراز سے ایک فائل نکال کر اس کا سیدھا رخ کرنل کی طرف کرتے ہوئے فائل کور ہٹا دیا۔

"اس پر ایک نظر ڈال لو۔"

کرنل نے اس پر سرسری نظر ڈالی۔ ایک سراسر غیر قانونی اور وحشیانہ کھیل کی قانونی دستاویز کو معاہدے کی شکل دی گئی تھی۔ ووڈ نے قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"رقم کے خانے میں تم مرضی کی رقم لکھنے کے لیے آزاد ہو۔"

کرنل نے قلم لے کر رقم والا خانہ فل کیا اور دستخط کر کے فائل واپس ووڈ کی طرف گھما دی۔ ووڈ نے بے اختیار رقم والے خانے پر نظر ڈالی۔ اس کا رنگ بدلا اور اس نے مقابل کی طرف دیکھا جو بے حد چمک دار آنکھیں بڑے اعتماد سے اس پر جمائے تھا۔ ووڈ نے بوکھلا کر درشت انداز میں کہا۔

"یہ RL70 کیا بلا ہے؟ کیا یہ کسی قسم کی کوئی کرپٹو کرنسی ہے؟"

کرنل نے مسکراتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھائی۔

"زیادہ بھولے نہ بنو! تم جانتے ہو میرا تعلق نائجیرین مافیا سے ہے۔ میں بخوبی جانتا ہوں کہ اسرائیل سے آنے والے کنٹینر میں سے تین صندوق غائب ہو کر کس کے پاس پہنچے تھے۔"

ووڈ کے سرخ چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے۔ کرنل نے بات جاری رکھی۔

"تم نے اشتہار میں واضح طور پر لکھا تھا کہ معاوضے کے عوض منہ مانگی رقم یا کچھ بھی مانگا جا سکتا ہے۔ میں نے خلاف ضابطہ کچھ مانگا ہے تو کہو؟ ویسے بھی RL70 دو سالوں سے تمہارے پاس بیکار ہی پڑے ہیں۔"

ووڈ نے چہرے پر آیا پسینا صاف کیا اور گہرا سانس لے کر بولا۔ "کسے اُڑانے کا ارادہ ہے؟"

"یہ بتانا ضروری ہے کیا؟"

ووڈ بولا۔ "بالکل...... مجھے یہیں امریکا میں رہنا

ہے۔ میرے کاروبار سے اکثر چشم پوشی بھی کی جاتی ہے۔ اس کی صرف اور صرف یہی وجہ ہے کہ میں کبھی امریکی قومی سلامتی اور اس کے بعد صیہونی ریاست کے خلاف نہیں گیا۔ میری بات سمجھ رہے ہو؟''

کرنل نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ ''تمہاری بات میں وزن ہے۔ مجھے اپنے بڑوں سے بات کرنا ہوگی۔ ویسے تمہاری تسلی کے لیے اتنا تو ابھی بتا سکتا ہوں کہ یہ گینگ وار کا حساب کتاب ہے۔ تمہاری صیہونی ریاست یا امریکا کی سلامتی سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

ووڈ کو اطمینان محسوس ہوا۔ ''ٹھیک ہے...... تمہارے بڑے اور تم مل کر اپنے ''نشانہ'' کے بارے میں مجھے مطمئن کر سکو تو ایک صندوق تمہیں مل سکتا ہے...... بشرطیکہ تم مقابلہ جیتنے میں کامیاب ہوگئے تو......'' یہ کہتے ہوئے اسے یقین تھا کہ اس نوجوان کے اس مقابلے میں زندہ بچنے کے چانسز تیس فیصد سے بھی کم تھے۔

کرنل نے بے فکری سے کہا۔ ''تم مقابلے کا اہتمام کرو، ایک سیٹلائٹ فون مہیا کرو اور پھر تماشا دیکھو۔''

ووڈ کا یقین قدرے متزلزل ہوا۔ ''افریقین جنگلی شکاری کتوں سے لڑنا تم شاید بچوں کا کھیل سمجھ رہے ہو۔ مجھے ابھی سے تمہاری فکر ہونے لگی ہے۔''

''میری فکر میں دُبلے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میری ساری زندگی درندوں سے لڑتے ہی گزری ہے۔''

کرنل کے لہجے نے ووڈ کے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑا دی۔ کسی نامعلوم حس نے خطرے کی گھنٹی بجائی مگر بے اندازہ دولت کے حصول کی ہوس نے اس گھنٹی کو نظر انداز کر دیا۔

☆☆☆

ایف بی آئی کے چار یونٹ ایجنٹ کوپر کی قیادت میں متحرک ہو چکے تھے۔ کوپر ابھی لانگ ویسٹ اسپتال سے لوٹا تھا۔ کرنل کمال کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے جنرل گوریان کی نوخیز بیٹی اس اسپتال میں تھی۔ باپ کی اپنی نگاہوں کے سامنے ہلاکت کے منظر نے اس سے ہوش و حواس چھین لیے تھے اور وہ شاک کی سی کیفیت میں تھی۔

ایجنٹ کوپر کو امید تھی کہ شاید جنرل کو قتل کرتے ہوئے جذباتی کیفیت میں قاتل نے کوئی ایسا جملہ کہہ دیا ہو جس سے اس کے ارادوں کی کوئی جھلک مل سکے اور جنرل کی بیٹی کیری گوریان نے وہ جملہ سن لیا ہو تو کوئی کلیو مل سکتا تھا مگر کوپر مایوس لوٹا تھا۔ کیری ٹکر ٹکر اسے دیکھنے اور آنسو بہانے کے سوا کچھ نہیں بتا سکی تھی۔

کوپر نے چاروں یونٹس کو کام پر لگا رکھا تھا۔ ایک یونٹ امریکا کے سبھی قانونی اور غیر قانونی داخلے کے راستوں کو مانیٹر کر رہا تھا۔ دوسرا ایک خاص سوفٹ ویئر کے سہارے سی سی ٹی وی کیمروں پر مامور تھا۔ کرنل کو آنکھوں کے ذریعے یہ سوفٹ ویئر لاکھوں کے مجمع سے بھی علیحدہ کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ کرنل کی ساتھی کی فوٹیج بھی اس سوفٹ ویئر کے حوالے تھیں۔ چند فوٹیج میں کرنل کمال اور اس کی ساتھی عورت کی فوٹیج میں آنکھوں کی پتلیاں واضح نظر آئی تھیں اور اب اگر امریکا بھر میں کسی کیمرے کے سامنے یہ پتلیاں واضح ہوئیں تو فوراً سوفٹ ویئر ان کی نشاندہی کر دے گا۔

digest library.com
Digest Novels .com

تیسرا یونٹ چھوٹے طیارے، ہیلی کاپٹر اور بہترین کمانڈوز پر مشتمل تھا جو کہیں بھی تیز تر کارروائی کے لیے ہمہ وقت تیار تھا۔ چوتھے یونٹ کی ذمے داری سب سے اہم تھی۔ جنرل گوریان کو اُڑاتے ہوئے کرنل نے جدید ترین سوکس 45 اور سوکس 60 سوئیڈش میڈ بموں کا بے دریغ استعمال کیا تھا۔ اس کے علاوہ شیشے کو پگھلانے کے لیے جو نائف گوڈل نامی کیمیکل استعمال ہوا تھا، وہ بھی خاص الخاص شے تھی۔ کرنل کی ساتھی عورت بھی جو راکٹ لانچر چھوڑ کر بھاگی تھی، وہ بھی پورٹ ایبل اور سوئیڈش تھا اور اس کی موثر رینج پانچ سو میٹر تھی۔ اہم ترین نقطہ تھا کہ یہ جدید ترین سوئیڈش ہتھیار امریکا تک کیسے پہنچے تھے؟ یہ نام نہاد فول پروف امریکی سیکیورٹی شیلڈ کے منہ پر طمانچے کے مانند تھا۔

چوتھا یونٹ یہ ہتھیار بنانے والی کمپنیوں کے ساتھ رابطے میں تھا اور امید تھی کہ کوئی کلیو مل جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ یونٹ ممنوعہ اور حساس ہتھیاروں کے حالیہ سودے بھی چیک کر رہا تھا اور ہونے والے نئے سودوں پر بھی نگاہ جمائے تھا۔ فی زمانہ یہ سارے سودے ڈارک ویب اور ڈیپ ویب پر ہوتے تھے۔ یہ یونٹ وہاں بھی سرگرم تھا۔ اس دوران مائز کو پہلی کامیابی ملی تھی۔ وہ اپنی سیکیورٹی میں وہ دراڑیں ڈھونڈ رہی تھی جہاں سے جنرل گوریان کے خفیہ اور نجی دورے کی خبر باہر نکلی تھی۔

جنرل گوریان کی ایک پرانی عرب نژاد عیسائی خادمہ غائب پائی گئی تھی۔ بنت قمر نامی یہ خادمہ آٹھ سال سے زائد عرصے سے جنرل گوریان کے ساتھ تھی اور اسے گھر کے فرد کی سی حیثیت حاصل تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ، کرنل کے نجی دورے کے بارے میں جانتی تھی۔

موساد پوری تندہی سے بنت قمر کو ڈھونڈنے میں لگی تھی۔

مائز نے فوراً یہ خبر کوپر تک پہنچادی مگر کوپر کی صہیونیوں کی داخلی کمزوریوں سے زیادہ توجہ اپنی کمزوریوں پر تھی۔ وہ تندہی سے اپنے کام میں لگا ہوا تھا۔ جلد ہی چوتھے یونٹ کی طرف سے پہلی رپورٹ نے اسے چونکایا۔ جنوبی امریکا کی ایک فرم کی لسٹ میں موجود F ہاک نامی کندھے پر رکھ کر فائر ہونے والے سام میزائل سسٹم میں ایک خریدار نے ڈیپ ویب پر دلچسپی ظاہر کی تھی اور ڈیلیوری امریکی شہر میامی میں مانگی تھی۔

کوپر پُرجوش ہوگیا۔ اس نے اس رپورٹ پر سرخ دائرہ کھینچا اور ماتحت سے کہا۔ ''فرم کو بولو یہ ''گاہک'' کسی صورت ہاتھ سے نہیں نکلنا چاہیے۔''

ایک دوسرے ماتحت سے اس نے کہا۔ ''فوراً معلوم کرو کہ میامی میں صہیونی ریاست کے اثاثے اور کون اہم شخصیت موجود ہے؟ یا کن شخصیات کی طیارے یا ہیلی کاپٹر کے ذریعے آمد متوقع ہے؟''

دوسرا ماتحت فوراً وہاں سے ہٹ گیا۔ کوپر کا ذہن تیزی سے متحرک تھا۔ اسے یقین تھا کہ F ہاک کا ممکنہ خریدار کرنل کمال ہی تھا۔ یقیناً وہ کم بلندی پر اڑتا کوئی جہاز یا ہیلی کاپٹر اُڑانا چاہتا تھا۔ یہ تبھی ممکن تھا کہ اس کا نشانہ کوئی اسرائیلی شخصیت نہ ہو...... امریکا کی صہیونی ریاست کی سرپرستی بھی تو ایران کو چبھتی تھی۔ وہ کوئی امریکی اہم شخصیت بھی تو ہوسکتی تھی؟ اس خیال نے اس کی پریشانی بڑھادی مگر پھر یہ سوچ کر اس نے خود کو تسلی دی کہ ایرانی، امریکی برتر طاقت سے خائف تھے اور آج تک انہوں نے اس طرح کسی امریکی شخصیت یا ادارے کو نقصان نہیں پہنچایا تھا۔

کوپر کی پریشانی جس تیزی سے بڑھی تھی، اتنی تیزی سے گھٹنے لگی۔ کرنل کمال کا اول و آخر ٹارگٹ یقیناً کوئی اسرائیلی ہی تھا۔

☆☆☆

کرنل کمال پر اپنے کمرے سے باہر نکلنے پر عائد پابندی اٹھالی گئی تھی۔ وہ کمرے سے نکلا تو اس زیرِ زمین دنیا کی وسعت نے اسے حیران کردیا۔ اس نے گہرائی میں ایک وسیع تالاب دیکھا جس کے گرد بلندی پر سیکڑوں نشستیں لگی ہوئی تھیں۔ تالاب کے کنارے دو چھوٹی ڈونگی کشتیاں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ کرنل اُلجھن کے عالم میں اس سیٹ اَپ کو دیکھ رہا تھا کہ آہٹ پر اس نے بے اختیار سر گھمایا۔ ایک خوشگوار حیرت سے سامنا ہوا۔ اس کے قریب روزی کھڑی تھی۔ وردی کے بجائے نیلی جینز اور پنک اسکرٹ میں اس کی حشر خیزیاں نمایاں تھیں۔ اس نے بڑی ادا سے اپنی سنہری چوٹی کو جھٹکا دیا۔

''کیا دیکھ رہے تھے؟''

کرنل نے جواب دیا۔ ''اس تالاب، کشتیوں اور اطراف میں لگی نشستوں کا تال میل سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''کچھ سمجھ آیا؟''

''فی الحال تو نہیں۔''

''میں سمجھاؤں؟''

''یہ تو میرے لیے خوشی کی بات ہوگی۔''

''آؤ، میرے ساتھ۔'' اس نے کرنل کو بازو سے تھام لیا اور نشستوں کی طرف بڑھی۔ وہ نشستوں پر بیٹھ چکے تو تالاب کا منظر اور بھی نمایاں ہو گیا۔

روزی پُراسرار سے لہجے میں بولی۔ ''یہاں ایک خاص شو ہوتا ہے۔ روشنیوں کی جادوگری ہوتی ہے۔ تالاب گہرائی تک پورا روشن ہوتا ہے۔ یہ نشستیں ان لوگوں سے بھری ہوتی ہیں جن کے پاس بے تحاشا دولت ہے اور دنیا میں موجود ہر تفریح ان کے لیے بے معنی ہو چکی ہے۔ وہ کچھ نیا چاہتے ہیں۔ نیا، سنسنی اور ایڈونچر سے بھرپور۔ وہ لوگ اس بیس فٹ گہرے تالاب میں سونے کے ٹکڑے اور کبھی کبھار اپنی ہیرے کی قیمتی انگوٹھیاں اور قیمتی ترین ریسٹ واچز بھی پھینک دیتے ہیں۔''

کرنل نے چور نظروں سے روزی کو دیکھا۔ جس کا چہرہ اسرار کے رنگوں میں رنگا تھا اور پھر خود کو مداخلت سے روک نہیں پایا۔

''تو اس بے وقوفانہ عمل میں سنسنی اور ایڈونچر کہاں سے آ گیا؟''

روزی مسکرائی تو اس کے شفاف دانت نمایاں ہو گئے۔ کرنل کو خواہ مخواہ ہی خیال آیا کہ اس لڑکی کو یہ بے ہودہ نوکری چھوڑ کر ہالی ووڈ میں جگہ بنانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

روزی بولی۔ ''آگے بھی تو سنو!''

کرنل پہلے ہی خاموش ہو چکا تھا۔

روزی بولی۔ ''اب یہ تماشائی قیمتی اشیا تالاب میں پھینکتے ہیں۔ ان کشتیوں پر عموماً دو، دو افراد سوار ہوتے ہیں اور غوطہ لگا کر روشنیوں میں چمکتی ان اشیا کو باہر نکال لاتے ہیں اور یہ ان کا انعام ہوتا ہے۔''

کرنل نے بے آواز تالی بجائی۔ ''واہ...... کیا شاندار کھیل ہے۔''

اس کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے روزی نے سرسراتے انداز میں کہا۔ ''ان غوطہ خوروں کو روکنے کے لیے تالاب میں سائمنڈ کو چھوڑ دیا جاتا ہے اور اس کھیل کو ایڈونچر کے ساتھ ساتھ سائمنڈ خون میں بھی رنگ دیتا ہے۔''

کرنل کو کسی انوکھے پن کا احساس ہوا۔ ''یہ سائمنڈ صاحب کون ہیں؟''

روزی نے نیچے تالاب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بارہ فٹ کا ایک ایشیائی مگرمچھ...... جسے اس کھیل سے پہلے بھوکا رکھا جاتا ہے اور اب تو کم بخت کو انسانی گوشت کی لت لگ گئی ہے۔''

کرنل کا وجود سنسنا اٹھا مگر اگلے ہی پل وہ پُرسکون ہو گیا۔ لحظے بھر کو وہ بھول گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ وہ خود بھی تو یہاں افریقن ہنٹنگ ڈاگ سے لڑنے کے لیے آیا تھا۔

کرنل نے بڑے آرام سے پوچھا۔ ''غوطہ خوروں کو کوئی ہتھیار بھی مہیا کیا جاتا ہے؟''

روزی نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''چھوٹے سائز کے خنجر جو میرے خیال میں سائمنڈ کی موٹی کھال کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔''

کرنل نے ہنکارا بھرا۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی اور تالاب کا پانی جھلملا رہا تھا جس میں ایک خونی کھیل کھیلا جاتا تھا۔ روزی نے گفتگو کو آگے بڑھایا۔ ''تمہارے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ تم ایک شاندار مافیا کا حصہ ہو اور یقیناً کسی کلیدی عہدے پر ہو گے۔'' ساتھ ہی اس کا ہاتھ بڑی بے باکی سے کرنل کی ران پر آ گیا۔ کرنل کو محتاط ہونے میں لحظہ بھی نہیں لگا مگر ظاہری انداز میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

''تم، میرے بارے میں کیسے جان گئیں...... میرا مطلب ہے کہ تم تو شاید میرے پروفائل کے بنیادی مندرجات سے ہی واقف تھیں۔''

روزی کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر را۔ ''میں یہاں کلیدی عہدے پر ہوں اور باس کے قریبی ساتھیوں میں میرا شمار ہوتا ہے۔ تم اور تمہارے بڑوں نے جو کہانی باس کو سنائی ہے، اس کی تصدیق کے عمل سے میں بھی واقف ہوں۔''

کرنل نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''وہ کہانی نہیں ہے۔'' ساتھ ہی اس نے روزی کا ہاتھ تھام کر اس کی پیش قدمی روک دی تو روزی مزید بے باک ہوئی۔

''کیا میں، تمہیں اچھی نہیں لگی...... ویسے مضبوط سیاہ فام مرد میری کمزوری ہیں۔'' اس کا لہجہ بوجھل ہو گیا تھا۔

کرنل نے نرمی سے کہا۔ ''تم بہت اچھی ہو مگر مقابلے سے پہلے میں اپنی ''مضبوطی'' محفوظ رکھنا چاہتا ہوں۔ بعد میں ہم ضرور یادگار وقت گزاریں گے۔''

روزی نے بجھے سے انداز میں کہا۔ ''مستقبل بھلا کس نے دیکھا ہے؟''

کرنل ہنسا۔ ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ جذبات کا حملہ پسپا ہو چکا ہے۔ ''تم یقیناً یہی سوچ رہی ہو کہ افریقن ڈاگ کے ہاتھوں میں مارا جاؤں گا۔''

روزی نے صاف دلی سے اثبات میں جواب دیا۔

...بچ بھی گئے تو میرے ساتھ ہفتوں تک بستر شیئر نہیں کر پاؤ گے۔" وہ کرنل کے قریب ہوئی اور اس کا لہجہ دوبارہ سے جذبات انگیز ہو گیا۔

"میں ہفتہ وار چھٹی پر ہوں اور ہمارے پاس یادگار وقت گزارنے کے لیے کافی گھنٹے ہیں۔"

کرنل کھڑا ہو گیا۔ "تمہیں سمجھانا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو ایک خادمہ وہاں مصروفِ عمل تھی اور بستر پر نئی چادر بچھا رہی تھی۔ کرنل کو دیکھتے ہی خادمہ نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔ "صفائی مکمل ہو چکی ہے سر! میں بس جانے ہی والی تھی۔" ساتھ ہی اس نے غیر محسوس انداز میں تکیے کی طرف اشارہ کیا۔

کرنل نے محض اثبات میں سر ہلایا۔ خادمہ کے روپ میں سارہ تھی اور یہ احتیاط اس لیے برتی گئی تھی کہ ممکن تھا کمرے میں کوئی خفیہ کیمرا وغیرہ کام نہ کر رہا ہو۔ اپنے کردار کو مضبوط کرنے کے لیے اس نے زیادہ باریک بینی سے کمرے کا معائنہ نہیں کیا تھا۔ ویسے اس کا خیال تھا کہ کوئی کیمرا وغیرہ وہاں نہیں ہے۔

سارہ کے جانے کے بعد کرنل نے دروازہ اندر سے بند کیا اور پھر بستر پر دراز ہو کر اوپر چادر تان لی۔ کھٹنے کھڑے کرتے ہوئے اس نے تکیے کے اندر ہاتھ ڈالا۔ وہاں ایک کاغذ موجود تھا۔ کرنل نے وہ کاغذ نکالا۔ باریک چادر سے چھن کر آنے والی روشنی میں تحریر واضح پڑھی جا رہی تھی۔ تحریر فارسی کی ایک متروک شاخ میں لکھی تھی۔ ایرانی خفیہ ایجنسی ہلالی تلوار میں اس کا باقاعدہ کورس ہوتا تھا۔ لکھا تھا۔

"آپ کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا ہے۔ RL70 اس کی یادداشت میں جیسے ہی دوبارہ تازہ ہوا ہے۔ نفسیاتی طور پر اسے اپنے سامان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اپنے ایک خاص گارڈ کے ساتھ وہ خود ڈرائیو کرتے ہوئے ویسٹ ہاربر کے صنعتی زون کے ایک ویئر ہاؤس میں وہ گیا ہے۔ بیس منٹ اس نے ویئر ہاؤس میں گزارے ہیں۔ اس کے جانے کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی کے دو سیکیورٹی گارڈ باہر تعینات ہو چکے ہیں۔

پوری امید ہے کہ اس ویئر ہاؤس سے آج رات ہمیں RL70 دستیاب ہو جائیں گے۔ سارہ کو مطلع کر دیا جائے گا۔ آپ اور سارہ وہاں سے اکٹھے نکلیں گے۔"

صفحے کے دوسری جانب جو لکھا تھا۔ اسے پڑھتے ہوئے کرنل کا وجود سنسنانے لگا۔ خون جیسے آتشیں سیال میں تبدیل ہو گیا۔ لکھا تھا۔

"آپ کے لیے اور ہمارے لیے بہت بڑی خوش خبری ہے۔ جہنمی کتے کی خبر لگ گئی ہے۔ ایرانی شیف والا کلیو خوب کام آیا ہے۔ شیف کو موساد نے اسی کی خاطر اٹھایا تھا۔ جہنمی کتا...... موساد کے سیف ہاؤس رماڈا تاور نیوجارک کے ٹاپ پر پینٹ ہاؤس میں مقیم ہے۔ وہاں تواتر کے ساتھ ایک ہیلی کاپٹر کی آمد و رفت ہوتی ہے۔ ٹاور کی سیکیورٹی کو ہم واچ کر رہے ہیں۔ آپ آئیں گے تو اس حوالے سے بھی مکمل رپورٹ تیار ہو گی۔

"آخر میں پھر یقین دہانی کروا دوں کہ سیمینار کی تاریخ پانچ جون ہے۔ شکار پانچ جون کو اترے گا اور سیمینار کے فوراً بعد اس کی واپسی کی فلائٹ ہے۔

آپ کا خنجر...... آپ کا بھائی۔"

کرنل نے چبا کر کاغذ نگل لیا۔ اس کا دماغ برق کے مانند کام کر رہا تھا۔ وقت بڑی تیزی سے اس کی مٹھی سے پھسل رہا تھا۔ جیمی فورٹان والے کردار کی اسے فکر نہیں تھی۔ یہ بڑی مضبوط بنیاد پر کھڑا تھا۔ جیمی فورٹان واقعی نائیجیریا سے اسی مشن پر نکلا تھا جو کرنل نے ظاہر کیا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ جیمی فورٹان اس وقت دبئی میں ہلالی تلوار کے ایک سیف ہاؤس میں تھا اور ضرورت پڑنے پر کرنل نے جیمی کا روپ دھار لیا۔ اور اسی روپ میں نائیجیرین مافیا کے سرکردہ افراد سے ووڈ کی گفتگو بھی کروا دی تھی۔

RL70 کے حصول کے بعد کسی بھی وقت حقیقی جیمی کو چھوڑا جا سکتا تھا۔ ووڈ اپنے طور پر جتنی بھی تحقیق کر لیتا نتیجہ وہی سامنے آتا تھا جو کرنل نے تراش رکھا تھا۔ اسی سبب کرنل کو چنداں فکر بھی نہیں تھی۔

نہ جانے کب کرنل غنودگی میں چلا گیا۔ اس کی آنکھ دروازے پر خفیف سی دستک سے ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو گہرا سانس لے کر رہ گیا۔ باہر روزی تھی اور اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ کرنل نے کہا۔

"کیا ہوا تم پہلے والی روزی لگ نہیں رہیں؟"

وہ زبردستی مسکرائی۔ "اندر تو آنے دو۔"

کرنل متذبذب ہوا تو وہ بولی۔ "فکر نہ کرو میرا، تمہاری "جان" پر حملہ آور ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

کرنل گہرا سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ روزی

نے دروازہ عقب میں بند کرتے ہوئے کہا۔

”کیا میری ایک آخری خواہش تم پوری کر سکتے ہو؟“

”کیوں؟ کیا ہوا اچانک سے تم نے سزائے موت کے قیدی کا روپ کیوں دھار لیا ہے؟“

روزی کمرے میں موجود صوفہ نما کرسی پر ٹک گئی اور خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ ”ممکن ہے آج کی رات میری زندگی کی آخری رات ہو اس لیے میری خواہش تھی کہ زندگی کا آخری کھانا میں تمہارے ساتھ کھاؤں...... دل خواہ مخواہ ہی تمہاری طرف مائل ہو رہا ہے۔ کوشش کے باوجود میں اسے روک نہیں پا رہی۔“ اس نے ہاتھ پھیلا کر جیسے اپنی بے بسی ظاہر کی۔ بے بسی کے ساتھ گہری افسردگی بھی زردی بن کر اس کے چہرے پر نمایاں تھی۔

کرنل کو یقین ہو گیا کہ یہ کوئی اداکاری نہیں ہے۔ ضرور کوئی انہونی ہو چکی تھی۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”کھانا کھانے میں ہرج نہیں...... اس کے علاوہ تمہارے ساتھ کوئی مسئلہ ہے تو اسے حل کیا جا سکتا ہے۔ تم جیمی کے نام سے ابھی واقف ہو، کام سے نہیں...... اس لیے کھل کر بتاؤ کیا ہوا ہے؟“

روزی کے وجود میں جیسے زندگی نے نئے سرے سے سر اٹھایا۔ وہ وارفتگی سے بولی۔ ”دل خواہ مخواہ ہی تو تمہاری طرف مائل نہیں ہو رہا...... تم میں کچھ خاص تو ہے۔“

کرنل کو برا سا منہ بناتے دیکھ کر وہ جلدی سے بولی۔ ”دراصل آج موت کا قرعہ میرے نام نکلا ہے اور ہماری سنڈیکیٹ جن اصولوں پر کھڑی ہے ان میں سے ایک اصول یہ ہے کہ قرعہ جس کے نام نکلے گا اسے موت کے کھیل میں حصہ لینا ہی پڑے گا۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی تو کرنل نے بھی استفسار نہیں کیا۔

”یہ موت کا قرعہ کیا ہے؟“

روزی بولی۔ ”تمہیں تفصیل سے بتاتی ہوں۔ دراصل یہاں کھیلا جانے والا ہر کھیل ہی موت کا کھیل ہے...... اس کھیل کے لیے مخصوص حلقوں میں اور ڈارک ویب پر اشتہار دیے جاتے ہیں۔ جب ایک مخصوص [illegible] تک کوئی کھلاڑی دستیاب نہ ہو تو اس کھیل کو زندہ رکھنے کے لیے قربانی دی جاتی ہے۔ سنڈیکیٹ کے خاص ملازمین کے درمیان قرعہ ہوتا ہے اور جن دو افراد کا نام آتا ہے انہیں اس کھیل میں ہر صورت حصہ لینا ہوتا ہے۔ البتہ عام کھلاڑیوں کے مقابلے میں اپنے افراد کو کچھ خفیہ رعایتیں دی جاتی ہیں۔ جیسے آج رات کے کھیل میں سائمنڈ کا پیٹ بھی بھرا ہو گا اور اسے کچھ مخصوص ادویات کے سہارے سست بھی کر دیا جائے گا۔“

کرنل اُچھل پڑا۔ ”اس کا مطلب ہے آج تالاب والا کھیل ہو گا اور اس میں تمہیں زبردستی حصہ لینے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔“

روزی پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔ ”زبردستی نہیں ہے۔ یہ کنٹریکٹ میں پہلے سے طے ہے اور ایک بات...... تم میری موت کا تماشا دیکھنے ضرور آنا۔“

کرنل نے کہا۔ ”تم چاہو تو میں مسٹر ووڈ سے بات کر کے اس کھیل سے تمہیں بچا سکتا ہوں...... میرے ساتھ نائیجیرین مافیا کی طاقت ہے۔ وہ کسی صورت میرے ساتھ بگاڑ نہیں چاہے گا۔“

روزی اچانک ہی کھڑی ہو گئی۔ ”میں نے بتایا نا کہ سنڈیکیٹ کچھ اصولوں کے سہارے کھڑی ہے۔ ان اصولوں کی پاسداری کبھی جان دے کر کی جاتی ہے اور کبھی جان لے کر۔ مقابلے سے فرار کی کوشش میں جان جانے کا چانس سو فیصد ہے۔ دوسری صورت میں سائمنڈ کے دانتوں سے بچنے کی امید بھی ہے اور انعامات کا تو شمار نہیں۔“

کرنل نے قدرے ناراضگی سے کہا۔ ”تو پھر میرے پاس کیوں دوڑی آئی تھیں؟“

وہ پھر سے ہنسی اور کرنل کے گال کو چھوتے ہوئے لگاوٹ سے بولی۔ ”کسی کے سامنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کو من کر رہا تھا۔ دل تمہاری طرف کھینچ [illegible] دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔

”تم فریش ہو تو پھر کھانا کھاتے ہیں۔ سائمنڈ سے سامنا گیارہ بجے ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے بعد فریش ہونے تک کرنل اس عجیب لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک ہی وہ موت کی دہلیز پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ اپنی طرف مائل ہونے کے بارے میں کرنل کو [illegible] شکوک تو تھے مگر نئی صورت حال [illegible] سامنے آنے کے بعد دور ہو گئے تھے۔ دل خواہ مخواہ ہی اس کی سفارش کرنے لگا۔

لمحے بھر کو جذباتی اُبال کے بعد کرنل اسے دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے سامنے جو مقصد تھا، اس میں سطحی جذبات کی ذرا بھی گنجائش نہیں تھی۔ بھوک کے احساس کے ساتھ وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ روزی کی تلاش میں نگاہیں دوڑائیں، وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ ساتھ ہی اسے محسوس ہوا کہ وردی پوشوں کی تعداد میں اچانک ہی غیر محسوس اضافہ

Digest Novels .com

digest library.com

ہو گیا ہے۔

تھوڑی دیر کی آوارہ گردی میں روزی کو غائب پا کر اس نے ایک سینئر اہلکار سے روزی کے بارے میں استفسار کیا تو اس نے معنی خیز نظروں سے کرنل کو دیکھتے ہوئے ایک آنکھ دبائی۔

”تمہارا کوئی رنگین پروگرام تھا تو اسے کینسل سمجھو۔ وہ اب تمہیں گیارہ بجے وہاں نظر آئے گی۔“ اس کی انگلی کے تعاقب میں کرنل کو نگاہ دوڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا اشارہ خونی تالاب کی طرف تھا۔

کرنل کو فکر دامن گیر ہوئی مگر اس نے آوارہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”واقعی ایسا پروگرام تھا۔ خونی مقابلے میں حصہ لینے سے پہلے وہ میرا بستر گرمانا چاہتی تھی...... اچانک کیا ہوا؟“

سینئر اہلکار نے رشک بھرے انداز میں کرنل کو دیکھتے ہوئے جو تبصرہ کیا، وہ ناقابلِ بیان تھا۔ پھر قدرے تلخ انداز میں جواب دیا۔

”قرعہ کے بعد بظاہر وہ خوشدلی سے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے تیار تھی مگر پھر نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے فرار ہونے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے تمہیں بتایا ہے کہ اب اسے گیارہ بجے ہی دیکھ پاؤ گے۔“

کرنل نے یہ جان کر جان بوجھ کر ٹھنڈا سانس لیا تو اہلکار نے [illegible] انداز میں کہا۔ ”ممکن ہے وہ بچ جائے اور تمہارا ابھی کل مقابلہ اناؤنس ہونے جا رہا ہے۔ جتنی زندگی بھی ہے اسے سنہری زلفوں کے سائے میں گزار لینا۔“ ساتھ ہی اس نے پھر آنکھ دبائی۔

کرنل کے مقابلے والی اطلاع نئی تھی مگر اس نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور اہلکار کے بازو پر گھونسا مارتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے مخصوص کینٹے ٹیریا کی جانب بڑھ گیا۔

بظاہر پُرسکون کرنل کے اندر جوار بھاٹا اچھل مچا رہا تھا۔ مقابلے والی اطلاع کا مطلب تھا کہ ووڈ، اس کی طرف سے مطمئن ہو چکا تھا مگر اتنی جلدی مقابلہ...... پھر خیال آیا کہ ووڈ کو ”جانباز کھلاڑیوں“ کی شدید قلت کا سامنا تھا۔ اس تناظر میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں تھی۔

وقت گزرتا رہا۔ ارب پتی تماشائیوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ نشستیں تیزی سے بھر رہی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ مقابلہ براہِ راست ڈارک ویب پر بھی دکھایا جانا تھا۔ جدید ترین کیمرے پہلے ہی نصب تھے اور پانی کے اندر بھی کیمرے لگے ہوئے تھے۔

تماشائیوں کے ہجوم میں عورتوں کے ساتھ ساتھ چند لڑکوں کو دیکھ کر کرنل حیران ہوا۔ ان لڑکوں کی عمریں تیرہ اور سولہ سال کے درمیان تھیں اور وہ مل کر پُرجوش انداز میں شور مچا رہے تھے۔ جب وہ مل کر ”ہو...... ہو......“ کے انداز میں یک آواز ہوتے تھے تو تماشائیوں کا ایک گروہ تالیاں اور سیٹیاں بجاتا تھا اور دیگر تماشائی بھی اس طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔

ان لڑکوں کے سرپرستوں کی سوچ پر افسوس کرتے ہوئے کرنل نے ایک نشست سنبھالی تو قریب موجود ایک اور وردی پوش تیزی سے اس کے قریب جھکا اور تیز سرگوشی کی۔

”یہ نشستیں مخصوص افراد کے لیے ہیں۔ تم چاہو تو میرے قریب کھڑے ہو کر یہ مقابلہ دیکھ سکتے ہو۔“

کرنل نے سوری کہتے ہوئے فوراً نشست چھوڑ دی۔

تھوڑی دیر بعد میوزک کے ساتھ روشنیوں کا کھیل شروع ہوا۔ تھری ڈی یا پھر اس سے بھی اگلی جنریشن نے کمال کر دکھایا تھا۔ تاریک چھت پر جیسے آسمان نمایاں ہو گیا تھا۔ ستارے جگمگاتے نظر آ رہے تھے اور ان کے درمیان پورا چاند بیٹھا تھا جیسے اس خونی مقابلے کا مہمانِ خصوصی ہو۔

کرنل متاثر ہوا۔ یہ ”سپر مون“ تمام تر جزئیات کے ساتھ بالکل حقیقی لگ رہا تھا۔ تماشائیوں کا جوش و خروش دیدنی ہو گیا۔ اسی شور میں سیاہ سوٹ میں ملبوس سرخ تر چہرے کے ساتھ کہیں سے ووڈ نمودار ہوا۔ اس کے ساتھ نیکر میں ملبوس ایک کسرتی جسم کا نوجوان تھا جس کی کمر سے بندھی چمڑی نیام سے خنجر کا دستہ جھانک رہا تھا۔ نوجوان کے ساتھ جو دوسرا ”کھلاڑی“ تھا، اسے دیکھتے ہوئے تماشائیوں نے سیٹیاں بجائیں۔ کرنل کے کانوں سے کچھ بے ہودہ تبصرے ٹکرائے۔ وہ کھلاڑی روزی تھی۔ تیراکی کے مختصر سیاہ لباس میں اس کا کندن وجود دمک رہا تھا۔ اس کے قدموں کے ساتھ سبک کمر سے بندھا خنجر جیسے رقص کر رہا تھا۔

تماشائیوں کے شور میں یہ مختصر قافلہ ایک جانب بنے اونچے اسٹیج پر چڑھ گیا۔ ووڈ کے ہاتھ کے اشارے پر تماشائیوں کا شور رفتہ رفتہ مدھم پڑ گیا۔ ووڈ نے مائیک میں اپنے مخصوص گونج دار لہجے میں کہا۔

”تم سب معزز ترین مہمانوں کو ایرینا کے اس خاص الخاص حصے میں خوش آمدید کہتا ہوں۔“

تماشائیوں نے شور مچا کر اس انداز کو پسند کیا۔

ووڈ نے مزید کہا۔ ”میں تمہاری بے تابیوں سے آگاہ

Digest Novels .com

تھا مگر کوئی جانباز اس کھیل کے میدان میں اترنے کو دستیاب نہیں تھا۔ آخرکار دو جگرے والے کھلاڑی دستیاب ہوتے ہی میں نے تم لوگوں کو دعوت دی ہے۔'' ایک صداکار کے انداز میں اس نے لہجے کا اتار چڑھاؤ بدلا۔

''تو پھر ملو ان جانبازوں سے۔'' اس نے نوجوان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''یہ پال ہیرس ہے...... ایم سوئمر اور کانگر ندی (دریا) میں حال ہی میں ایک مہم سے کامیاب لوٹا ہے۔''

کئی تماشائیوں نے پال...... پال کے نعرے لگائے۔ نوجوان ایک قدم آگے آ کر قدرے خم ہو گیا۔ اتنی دوری کے باوجود کرنل اس کے چہرے پر چھائی مردنی صاف دیکھ سکتا تھا۔ پال ہیرس کے اس ''تعارف'' پر کرنل نے قریب موجود اہلکار کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ دیکھی۔

پال کے بعد وڈ نے روزی کا ہاتھ تھاما۔ ''اور یہ ہے روزی وائٹ! گہرے پانیوں کی غوطہ خور اور ایک سخت جان لڑکی! حال ہی میں جیوگرافک کے مشہور پروگرام ''سرائیو ٹو لائف'' کی ریکارڈنگ سے فارغ ہوئی ہے۔ یہ پروگرام قاتل صحرا اصحارا میں ریکارڈ ہوا ہے۔''

کرنل نے دل ہی دل میں وڈ کو منتخب گالیوں سے نوازا۔ اہلکار بھی کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ شاید وہ بھی وڈ کو گالیاں دے رہا تھا۔

وڈ کی لاف زنی جاری تھی۔ ''تم لوگ بہت جلد اسے اسکرین پر بھی دیکھو گے۔''

روزی کے لیے تماشائیوں کا شور کچھ زیادہ ہی بلند ہوا اور خوب سیٹیاں بجیں۔ وڈ نے کہا۔

''تو پھر آؤ...... اِن جانباز کھلاڑیوں کے ساتھ تمہارے من پسند کھیل کا آغاز کرتے ہیں۔''

تماشائیوں کے شور اور جوش و خروش کے درمیان سنسنی کا ایک سمندر بہہ نکلا تھا۔ فولادی رسے پُرنصب دو پائپوں کے سہارے روزی اور پال کو نیچے اتارا جانے لگا۔ اس دوران روزی کی متلاشی نگاہیں تماشائیوں پر گردش کر رہی تھیں۔ پھر اس نے کرنل کو دیکھ لیا اور مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ بے شک یہ زندگی سے عاری مسکراہٹ تھی۔ جواباً کرنل نے بھی ہاتھ ہلا دیا۔ تالاب کے ایک جانب مختصر سا پتھریلا حصہ تھا۔ ان دونوں کو اسی حصے پر اتارا گیا۔ دونوں ایک کشتی کھول کر تالاب میں آ گئے۔

میوزک کی لے تیز ہوئی اور پھر خونی کھیل کا آغاز ہو

گیا۔ تالاب کی تہ میں روشنیاں آن کر دی گئی تھیں اور شفاف پانی میں تہ واضح نظر آ رہی تھی۔ سرِدست اس پانی میں کچھ نہیں تھا۔

کرنل کے قریب ہی موجود ایک بوڑھے مگر خوب صحت مند تماشائی نے چرمی بیگ سے ایک سنہرا بسکٹ نکالا اور پوری قوت سے چلایا۔ ''سنہری زلفوں والی حسینہ یہ تمہارے لیے۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سونے کا بسکٹ نیچے تالاب میں پھینک دیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے روزی نے بڑی مہارت سے سر کے بل پانی میں چھلانگ لگائی اور اس بسکٹ تک پہنچ گئی جس کی چمک حواسوں پر اثر انداز ہوتی تھی۔

تماشائی اب ''سائمنڈ...... سائمنڈ......'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ لڑکوں کا جوش دیدنی تھا۔

کرنل اضطراب کا شکار ہو گیا۔ روزی بسکٹ کو اٹھا کر واپس لوٹ رہی تھی جب کرنل نے پانی میں ایک مہیب سایہ دیکھا جو کسی طور پر گیارہ بارہ فٹ سے کم نہیں تھا۔ یقیناً کوئی جنگلا ہٹا دیا گیا تھا اور سائمنڈ تالاب میں در آیا تھا۔

سائمنڈ کی دید نے تماشائیوں کو دیوانہ کر دیا۔ وہ سائمنڈ، سائمنڈ چلّانے لگے۔ ان لوگوں کے ہیرو روزی اور پال نہیں تھے۔ بلکہ ان کا ہیرو سائمنڈ تھا۔ خونخوار اور انسانی گوشت کا رسیا۔

مہیب سایہ روزی کی طرف لپکا مگر آخری لمحے میں پال نے اس کا ہاتھ تھام کر کشتی میں کھینچ لیا۔ سائمنڈ کا خونی جبڑا اور زرد دانتوں کی جھلک نظر آئی تو کئی تماشائیوں کے حلق سے لذت بھری چیخیں آزاد ہو گئیں۔

روزی نے کشتی میں کھڑے ہو کر سونے کا بسکٹ کسی

Digest Novels .com

ٹرانی کے مانند بلند کیا۔ اس نے اپنی چوٹی کو بل دے کر کس کر باندھ دیا تھا۔ پانی میں بھیگتے ہی اس کا جسم دوآتشہ ہوگیا تھا۔ مرد تماشائیوں کی نظریں اس پر جم کر رہ گئی تھیں۔

تالاب میں سائمنڈ کشتی کے گرد چکرانے لگا۔ بلندی سے وہ واضح نظر آرہا تھا۔ خاکستری رنگ، مضبوط اور سخت کھال تھی، کوڑے جیسی دم اسے تیرنے میں مدد دے رہی تھی۔

دونوں زبردستی کے کھلاڑی کشتی میں کھڑے اس موت کے فرشتے کو دیکھ رہے تھے۔ پلاسٹک کے چپو انہوں نے اس طرح اٹھا رکھے تھے جیسے کوئی بہت اہم ہتھیار ہو...... شاید اس لیے کہتے ہیں کہ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا۔

تماشائیوں کی جانب سے کئی سونے کے بسکٹ تالاب میں گرائے گئے تھے اور اب وہ چیخ چیخ کر کھلاڑیوں کو ان کے حصول کے لیے اکسا رہے تھے۔ مگر دونوں میں سے کسی کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ سائمنڈ کشتی کے گرد ہی چکرا رہا تھا۔

چند لمحے بعد دونوں کھلاڑیوں نے آپس میں کچھ بات چیت کی۔ اور اس کے بعد روزی نے ایک جانب سے چپو کی مدد سے کشتی کو تھپتھپانا شروع کر دیا۔ سائمنڈ فوراً اس طرف متوجہ ہوا اور دوسری جانب سے پال بے حد آہستگی کے ساتھ پانی میں اتر گیا۔

تماشائیوں نے دوبارہ سے سائمنڈ کا نام لے کر چلانا شروع کر دیا۔

روزی کا چپو سائمنڈ کے منہ سے ٹکرایا تو وہ مشتعل ہو کر جبڑا پانی سے نکال کر چپو پر جھپٹا۔ کشتی ڈگمگائی اور اگلے ہی لمحے روزی پھسل کر تالاب کے اندر گری۔ جنونی تماشائیوں کو اندازہ ہوگیا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ لذت آمیز سسکیاں اور چیخیں سنائی دینے لگیں۔ لڑکوں کا گروپ آگے جھک آیا۔

کرنل نے اس عفریت کو تیزی سے گھومتے دیکھا۔ بے شک اس کا پیٹ بھرا ہوا تھا اور اسے مخصوص ادویات کے سہارے قدرے ست بھی کر دیا گیا تھا مگر تھا تو وہ ایک آبی درندہ ہی نا...... اور اسے انسانی گوشت کی لت بھی لگ چکی تھی۔

پال گہرائی میں تھا۔ روزی دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ سائمنڈ اسی پر جھپٹا۔ اس کا مہیب جبڑا کھلا اور اگلے ہی لمحے روزی کا جبڑا اس کے منہ میں تھا۔ لمحے بھر میں ہی وہ روزی کو گھسیٹ کر لے گیا۔

تماشائیوں کے قیامت خیز شور کے باوجود کرنل نے اس کی موت کے خوف میں ڈوبی چیخ سنی اور اسے لگا جیسے روزی نے اسے پکارا ہو۔ کوشش کے باوجود وہ خود کو روک نہیں پایا۔ وہ جانتا تھا اپنی خصلت کے مطابق مگرمچھ بے پناہ تیزی سے چکر کھائے گا اور روزی کا جتنا جسم اس کے منہ میں ہے وہ دیگر جسم سے علیحدہ کر دے گا۔

کرنل شرٹ اور شارٹس میں تھا۔ اس نے شرٹ اتاری اور کسی کے متوجہ ہونے سے پہلے ہی نیچے چھلانگ لگا دی۔ نیم گرم پانی میں پیروں کے بل گرتے ہوئے کرنل کی آنکھیں کھلی تھیں۔ پال تیزی سے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے خشک حصے کی طرف جا رہا تھا۔

تیزی سے سرخ ہوتے پانی کے ایک حصے میں روزی خود کو اس عفریت کے جبڑوں سے چھڑانے کے لیے بُری طرح سے ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔

پانی نے تیزی سے کرنل کو اوپر کی طرف اچھالا تو اس نے اپنا رخ روزی کی طرف کر لیا۔ روزی کے قریب سے اوپر ابھرتے ہوئے کرنل نے اس کی کمر سے بندھا خنجر کھینچ لیا۔ کھردرے اور بدبودار سائمنڈ کے پانی سے سر باہر نکالتے ہی کرنل کا خنجر والا ہاتھ حرکت میں آیا اور خنجر سائمنڈ کی گدلی آنکھ میں اتر گیا۔ سائمنڈ بُری طرح تڑپا...... کرنل نے خنجر کھینچا تو سائمنڈ اور روزی کا خون تیزی سے آپس میں مکس ہونے لگا۔

سائمنڈ نے روزی کو چھوڑ دیا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب خرخراہٹ نکل رہی تھی۔ اس کی طاقتور دم کشتی سے ٹکرائی تو وہ تنکوں کی طرح بکھر گئی۔

کرنل نے روزی کو دیکھا۔ اس کے شانے اور گردن کے درمیان بہت بڑا گھاؤ نظر آرہا تھا۔ جہاں سے بے تحاشا خون نکل رہا تھا اور اس کی گردن بے ڈھنگے انداز میں ایک طرف لٹک رہی تھی۔ کرنل کو اندازہ ہوا کہ زندگی کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ اسے مدد کی ضرورت تھی۔ وہ مدد کے لیے بُری طرح سے چلایا مگر نقار خانے میں اس کی سننے والا کون تھا۔ اوپر سے جھانکنے والے انسان اسے بھیڑیوں کے مانند نظر آرہے تھے۔ انہوں نے یہی کچھ دیکھنے کے لیے تو لاکھوں روپے کی ادائیگی کی تھی۔ وہ لوگ اس ''ٹوئسٹ'' سے اور بھی پُرجوش ہوگئے تھے اور کالے ہیرو کے نعرے لگاتے ہوئے قیمتی اشیا نیچے پھینک رہے تھے۔

Digest Novels .com

روزی کو ایک بازو پر سنبھالتے ہوئے وہ تیزی سے خشک حصے کی طرف بڑھا۔ پال وہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا اور دیوار سے لگا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کرنل نے اسے آواز دی کہ آ کر روزی کو باہر نکالنے میں اس کی مدد کرے مگر کانپنے کے سوا اس نے کچھ نہیں کیا۔ دوسری جانب سائمنڈ زخمی ہو کر تالاب میں اودھم مچا رہا تھا۔ اس حالت میں اس کی اکلوتی آنکھ نے کرنل اور زخمی روزی کو دیکھ لیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ میں موت کا سایہ تھا۔ وہ تیزی سے جھپٹا۔ یہ بڑے خطرناک لمحے تھے۔ اس کے حملے سے کم از کم تالاب میں بچنا ممکن نہیں تھا۔ خنجر پر کرنل کی گرفت سخت ہو گئی۔ شکر کا مقام تھا کہ اوپر، نیچے روشنیوں کے باعث وہ عفریت صاف نظر آ رہا تھا۔

سائمنڈ نے پلک جھپکتے میں حملہ کیا۔ قریب آ کر جیسے ہی اس نے حملے کے لیے اپنا مہیب جبڑا کھولا، کرنل کو اسی پل ایک ترکیب سوجھ گئی۔ روزی کو چھوڑتے ہوئے اس نے پاس ہی تیرتا چپو اٹھا کر اس کے جبڑے میں عمودی رخ دے دیا۔ دباؤ سے چپو کھڑا ہی رہ گیا۔ کرنل کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ مگرمچھ کا پیٹ بے حد نرم ہوتا ہے۔ اس نے غوطہ مارا اور اگلے ہی پل وہ سائمنڈ کے نیچے تھا۔ اسی وقت چپو ٹوٹ گیا اور سائمنڈ کے خونی جبڑے مل گئے۔ کرنل کا خنجر والا ہاتھ حرکت میں آیا اور سائمنڈ کو پیٹ سے لے کر جبڑوں تک چیرتا چلا گیا۔ اسے بے حرکت ہونے میں دیر نہیں لگی۔ تالاب کا پانی تیزی سے خون رنگ ہوتا چلا گیا۔ روزی تالاب کی گہرائی میں دھنستی جا رہی تھی۔ زیرِ آب تیرتے ہوئے کرنل نے اسے سنبھالا اور تیزی سے اس کا سر پانی سے باہر نکالا۔

روزی کی طرف دیکھنا ایک خوفناک تجربہ تھا۔ اس کے حلق میں جانے والا پانی گردن کے شگاف سے نکل رہا تھا۔ اس کے گلے سے خرخراہٹ برآمد ہو رہی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے زندگی سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

کرنل، اسے خشک حصے کی طرف نکال لایا۔ کسی کو اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ سائمنڈ کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ پانی میں خون کی سرخی شامل ہو گئی تھی اور سائمنڈ کا مردہ جسم تالاب کی تہ میں بیٹھ گیا تھا اور ایک ہیولے کے مانند نظر آ رہا تھا۔

تماشائی اب بھی سائمنڈ کے نام کی دوہائی دے رہے تھے۔ پال ان کے قریب آنے کے بجائے خوف سے ایک کونے میں سمٹا ہوا تھا۔ اس کا خوف بجا تھا۔ یقیناً سائمنڈ پانی سے باہر آ کر اس خشکی پر بھی اپنے شکار پر جھپٹتا ہوگا۔

کرنل نے آرام سے روزی کو خشکی پر لٹایا۔ لمحے بھر میں ہی اس کے گرد خون پھیل گیا۔ اس کی آنکھوں میں حرکت سی ہوئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے لب تھرتھرائے تو کرنل نے کہا۔

"اس موذی سائمنڈ کو میں نے مار دیا ہے اور تم بھی جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

روزی نے کچھ کہنے کی کوشش کی تو کرنل نیچے جھک گیا۔ اس کے منہ سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکلے۔

"تم، میری خاطر کودے تھے؟"

کرنل نے اثبات میں سر ہلایا تو روزی کے زرد تر چہرے پر طمانیت اتر آئی۔ وہ دھیرے سے بولی۔

"یہاں سے بھاگ جاؤ۔ کتوں والے کنٹینر کا پیچھے والا دروازہ کھلا ہے۔ لفٹ بھی وہیں ہے...... آ......" اس نے ہچکی سی لی تو کرنل کو محسوس ہوا اس کی آنکھیں بھیگ رہی ہیں۔

روزی کی آواز پاتال میں اتر گئی۔ کرنل نے بمشکل سنا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"تم جیت بھی گئے تو وہ تمہیں کچھ نہیں دے گا بلکہ ایف بی آئی کو مطلع کرے گا۔ وہ، تمہاری ہار کی امید پر رکا ہوا ہے۔" یہ کہتے ہوئے روزی کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔

کرنل اوپر منہ کر کے چلایا۔ "تمہارا باپ سائمنڈ مارا گیا ہے اور اس لڑکی کو کچھ ہو گیا تو میں تم سب کو مار دوں گا۔"

کرنل کے دعوے کو ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ سائمنڈ کی کٹے پیٹ والی لاش الٹی ہو کر اوپر آ گئی تھی۔ اس کو دیکھتے ہوئے اوپر سناٹا سا چھا گیا تھا۔

جب انہیں باہر نکالا گیا تو روزی دم توڑ چکی تھی اور کرنل کے وجود میں آتش فشاں اپنے نقطہ عروج کو پہنچ چکا تھا مگر اپنے مشن کے سبب وہ خود کو سنبھالے ہوا تھا۔

وہ تالاب سے باہر آیا تو اس کا سامنا ووڈ سے ہوا جو خشمگیں نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا مگر جب ایک تماشائی نے سونے کے بسکٹ کرنل کے قدموں میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"تم ایک حقیقی ہیرو ہو۔" اس کے ساتھ ہی اس نے تالی بجائی۔ رفتہ رفتہ تالیوں کا شور بڑھنے لگا اور کرنل کے قدموں میں سونے اور دیگر قیمتی اشیا کا بڑھتا انبار دیکھ کر ووڈ کے تاثرات بھی بدل گئے۔ اب اس کی باچھیں پھیل گئی تھیں۔

مصنوعی جھلملاتے ستاروں اور چاند کے عین نیچے

Digest Novels .com

تالاب کے خون رنگ پانی میں اس تالاب کے آسیب کی الٹی لاش تیر رہی تھی اور اس لڑکی کی لاش چادر سے ڈھانپ دی گئی تھی جس کے انگ انگ میں چند گھنٹے پہلے زندگی پوری توانائی سے رواں دواں تھی۔ نہ جانے کتنے دل اس کی سنہری زلفوں سے بندھے تھے۔

اپنے طیش پر قابو رکھنے کی کوشش میں کرنل نے اپنے قدموں میں ڈھیر سیم وزر کے اس ڈھیر کو ٹھوکر ماری اور پھر اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کی نگاہیں سارہ کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

دم توڑتے ہوئے روزی نے جو کچھ بتایا تھا، وہ کوئی ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔ اسی سبب کرنل نے RL70، کے حصول کے لیے دہرا منصوبہ بنایا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے ساتھی RL70 تک یا تو پہنچ چکے تھے یا پھر پہنچنے والے تھے۔ کامیابی کی اطلاع سارہ کے ذریعے ملنی تھی اور اس کے بعد کرنل نے سارہ کے ساتھ وہاں سے نکل جانا تھا۔ روزی وہاں سے نکلنے کا جو راستہ بتا گئی تھی، وہ بے حد اہم تھا۔ کرنل کا ارادہ ووڈ کی گردن سے گن لگا کر نکلنے کا تھا۔ اب یہ دوسرا راستہ بھی معلوم ہو گیا تھا۔ واش روم میں گھستے ہوئے کرنل نے ووڈ کی طبیعت صاف کرنے کا ارادہ باندھ لیا تھا۔

کرنل کپڑے تبدیل کر کے باہر نکلا تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ باہر دو وردی پوش موجود تھے اور کرنل کے لیے ووڈ کا بلاوا آ چکا تھا۔

کرنل اُن کے ساتھ ہو لیا۔

اس دفعہ ووڈ نے فولادی میز والے آفس کے بجائے اپنے خاص چیمبر میں کرنل کو بلایا تھا۔ چیمبر کے داخلی دروازے پر ایک شربتی آنکھوں والی دراز قامت حسینہ نے کرنل کو خوش آمدید کہا۔ وردی پوش واپس لوٹ گئے۔

اندر ایک لاؤنج میں ووڈ خوب پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ام الخبائث اور دیگر لوازمات سجے تھے اور اس کے عقب میں ایک اور شربتی آنکھوں والی حسینہ ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے کرنل کو دیکھ رہی تھی۔ یہ دماغ کو متاثر کرنے والا جھٹکا تھا۔ دونوں حسینائیں جڑواں بہنیں تھیں۔ دونوں میں سرِمو بھی فرق نہیں تھا۔ رہی سہی کسر یکساں لباس، میک اَپ اور ہیئر اسٹائل نے پوری کر دی تھی۔

ووڈ نے کرنل کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرنل سامنے صوفے پر بیٹھ گیا تو ووڈ نے ہاتھ میں تھامے پیانے سے سنہری سیال کی چسکی لی اور خمار بھرے انداز میں بولا۔

"یہاں تک رسائی بہت خاص الخاص لوگوں کو ہوتی ہے۔ اگر تم نے یہاں کچھ وقت گزارا ہوتا تو یقیناً تم فخر کر رہے ہوتے۔"

کرنل نے کہا۔ "اس عزت افزائی کے لیے میں شکر گزار ہوں۔"

ووڈ کے خفیف اشارے پر کرنل کو لانے والی حسینہ نے کرنل کے قریب جھکتے ہوئے ایک جام تیار کر دیا۔ اس کے قریب سے اٹھتی مہک یقیناً ہوش و حواس کو مختل کر دینے والی تھی۔ کرنل نے منہ دوسری طرف کرتے ہوئے گہرا سانس لیا۔

حسینہ جام تیار کر کے پیچھے ہٹ گئی تو ووڈ نے کہا۔

"یہ جام تمہاری ناقابلِ یقین جرأت و بہادری کے نام۔"

کرنل نے شکریہ کے ساتھ پیانہ اٹھا کر اس تلخ سیال کی ہلکی سی چسکی لی تو ووڈ نے سلسلہ کلام جوڑا۔

"تم نے ہماری سنڈیکیٹ کا بہت بڑا اصول توڑتے ہوئے کھیل میں دخل اندازی کی ہے۔ یہ جرم ناقابلِ معافی تھا مگر تمہاری لاعلمی کے سبب میں نرمی برت رہا ہوں۔ تم سنڈیکیٹ کے اصولوں سے باخبر نہیں تھے۔"

کرنل نے دل ہی دل میں اس کے اصولوں پر لعنت بھیجتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں میری مداخلت سے تمہیں نقصان کے بجائے فائدہ ہی ہوا ہے۔"

ووڈ نے اسے گہری نظروں سے دیکھا۔ "کہہ سکتے ہو۔ سائمنڈ کے ساتھ تم جس بے جگری سے لڑے اور اسے ہلاک کرنے میں کامیاب رہے، ان مناظر کی ویڈیو جن لوگوں کے لیے دستیاب ہے، وہ دیکھنے کے لیے دیوانے ہو رہے ہیں۔ گینڈے کے ساتھ ہونے والے مقابلے میں تمہارا ریٹ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ تیس پیسے کا بھاؤ ستر پیسے ہو گیا اور ہاں، تمہیں بتا دوں یہ مقابلہ کل رات گیارہ بجے ہونے جا رہا ہے۔ تم ذہنی طور پر تیار رہو۔"

کرنل نے کہا۔ "میں تو اس مقابلے کے لیے ابھی بھی تیار ہوں۔"

ووڈ کی آنکھوں میں توصیف چمکی۔ "نائیجیرین مافیا یقیناً تمہیں سر آنکھوں پر بٹھاتی ہو گی۔ کاش تمہارے جیسا کوئی بندہ میرے پاس بھی ہوتا...... یہ یاد رکھنا کبھی مافیا چھوڑنی پڑ جائے تو میرے دروازے تمہیں کھلے ملیں گے۔"

کرنل جواب میں صرف مسکرا دیا۔

اچانک کچھ یاد آنے پر ووڈ کسمسایا۔ "مم...... میں

Digest Novels .com

نے سنا ہے کہ تم لوگ آدم خوری بھی کرتے ہو؟ یہ حقیقت ہے یا محض لغو؟''

کرنل مسکرایا۔ ووڈ کی آنکھوں میں ہراس دیکھ کر اس نے لطف لینے کا فیصلہ کیا۔ ''درست سنا ہے تم نے مگر پوری نائیجیرین مافیا آدم خور نہیں ہے۔ مافیا میں جو سائی قبیلے کے لوگ ہیں وہی آدم خوری کرتے ہیں مگر وہ لوگ بھی صرف دشمن کو کھاتے ہیں۔ ایسا دشمن جس نے جانی نقصان کیا ہو یا پھر سنگین دھوکا دیا ہو۔'' یہ کہتے ہوئے کرنل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا مگر وہ بھی کائیاں شخص تھا۔ نگاہ نہیں چُرائی البتہ آنکھوں میں ہراس اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا۔

''کیا تم بھی مسائی ہو؟''

کرنل نے اثبات میں سر ہلایا تو ووڈ نے کراہت سے کہا۔

''انسانوں کو کھاتے ہوئے تمہیں کبھی کراہت نہیں ہوئی؟''

کرنل نے کہا۔ ''اس بحث میں نہ پڑو۔ تمہیں سُور کھاتے ہوئے کبھی کراہت ہوئی؟ نہیں ہوئی نا؟''

ووڈ نے نفی میں سر ہلایا تو کرنل نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''ایسے ہی ہمیں دشمن کو کھاتے نہیں ہوتی۔ آدم خوری صدیوں سے ہماری جینز میں سفر کر رہی ہے اور اس حوالے سے میں زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتا۔'' ساتھ ہی کرنل نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ جیمی کا روپ دھارتے ہوئے اس نے نائیجیرین مافیا کی فائل پر بھی سرسری نظر ڈال لی تھی۔

ووڈ نے جلدی سے کہا۔ ''ٹھیک ہے، تمہیں امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں ہے۔ تم چاہو تو جا سکتے ہو۔ تمہیں کل والے مقابلے کی اطلاع کے لیے میں نے بلایا تھا۔''

کرنل اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اس اطلاع کے لیے شکریہ!'' ساتھ ہی اس نے محسوس کیا کہ ہم شکل حسینائیں اسے ڈری ڈری نظروں سے دیکھ رہی تھیں اور ہراس ان کے چہروں سے نمایاں تھا۔ اس کے عقب میں موجود حسینہ نے غیر ارادی طور پر درمیانی فاصلہ بڑھا لیا تھا۔

کرنل اس کیفیت سے خوب محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے واپسی کے لیے قدم اٹھائے تو ووڈ کی آواز گونجی۔

''مجھے اپنی کیفیات چھپانے والے لوگ پسند نہیں ہیں...... میرا تجربہ ہے کہ وہ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔''

کرنل واپس گھوما۔ ''کھل کر بات کرو۔''

ووڈ نے اس پر نگاہیں جماتے ہوئے کہا۔ ''اس چیمبر میں آنے والے ان جڑواں حسیناؤں کو دیکھ کر ضرور حیرت و دلچسپی ظاہر کرتے ہیں اور کچھ دیر اس حوالے سے گفتگو ہوتی ہے مگر تم نے ذرا بھی حیرت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یقیناً اپنی کیفیات چھپانے میں تم ماہر ہو۔''

کرنل مسکرایا۔ ''کبھی نائیجیریا آؤ...... اس سے بڑے عجوبے دیکھنے کو ملیں گے اور میرے خطرناک ہونے کے بارے میں تو اب تمہیں ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے۔''

کرنل کے عقب میں ووڈ دانت کچکچا کر رہ گیا۔

☆☆☆

ہاک-F کے لیے جنوبی افریقن فرم کو بٹ کوائن میں ادائیگی کر دی گئی تھی۔ میزائل سسٹم کی قیمت سے تین گنا معاوضہ میامی میں ڈلیوری کا مانگا گیا تھا۔ وہ ادائیگی بھی کر دی گئی۔ خریدار کی جانب سے صرف یہی شرط عائد کی گئی تھی کہ ڈلیوری ہر صورت آنے والی نو تاریخ سے پہلے کر دی جائے۔

ایف بی آئی کا جال متحرک ہو چکا تھا۔ دو رکنی ٹیکنیکل ٹیم چارٹرڈ طیارے سے جنوبی افریقہ روانہ ہو چکی تھی جہاں انہوں نے ہاک F کے ساتھ کچھ چھیڑ چھاڑ کرنی تھی۔ اس کے علاوہ ادائیگی کا سارا عمل ایف بی آئی کی نگرانی میں ہوا تھا۔ اب صرف ڈلیوری لینے کے لیے آنے والوں کا انتظار تھا۔ پورے سسٹم کے گرد گھیرا ڈال دیا گیا تھا۔

کوپر اور مائر سر جوڑے ہاک F کے ممکنہ ٹارگٹ کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ یہ ٹارگٹ نو یا اس کے بعد ہٹ ہونا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ٹارگٹ اس وقت میامی میں موجود نہیں تھا۔

مائر نے ایک اخباری سرخی پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

Digest Novels .com

"مجھے یقین ہے کہ کرنل کمال کا ممکنہ ٹارگٹ یہی ہے۔"

کوپر نے اس خبر کا جائزہ لیا۔ میامی میں بارہ تاریخ کو جدید ترین اسلحے کی ایک نمائش منعقد ہونے جارہی تھی۔ جس میں بین الاقوامی ادارے اور دیگر ممالک اپنے بنائے جدید ترین ہتھیاروں کی نمائش کرنے والے تھے۔ دنیا بھر سے خریدار اس نمائش میں شرکت کرنے کے لیے آرہے تھے۔

کوپر نے خبر مکمل پڑھنے کے بعد کہا۔ "یہ نمائش بھلا کیسے ٹارگٹ ہوسکتی ہے؟"

مائر نے سرسراتے انداز میں کہا۔ "اسرائیلی فرمز بھی اس نمائش میں شریک ہورہی ہیں اور سب سے اہم ترین بات یہ ہے کہ ان فرمز کے بھی نمائندے میڈ اِن اسرائیل دنیا کے پہلے مکمل طور سے بجلی سے چلنے والے چھوٹے کمرشل طیارے کے ذریعے میامی میں اتریں گے۔ پوری دنیا کی نظر اس طیارے پر ہے...... کچھ سمجھے؟"

کوپر کا وجود سنسنا اٹھا۔ "وہ کم بخت اس طیارے کو اڑانے کی فکر میں ہے۔"

مائر نے کہا۔ "صرف طیارے کو نہیں، طیارے میں موجود اسرائیل کے برتر دماغوں کو بھی ساتھ میں۔"

کوپر نے کہا۔ "یہ دیوانے کا خواب ہے۔ اس دفعہ ہم ایک قدم آگے ہیں۔"

مائر نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ "کاش ممکن ہوتا کہ ہم انتظار کے بجائے ان کے تعاقب میں ہوتے۔"

کوپر نے لحظہ بھر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "صاف گوئی کی معافی چاہتا ہوں۔ تمہاری ٹیکنالوجی کے سبب ہی وہ بڑی کامیابی سے بھیس بدلے خود کو چھپائے ہوئے ہیں ورنہ امریکا میں انہیں گٹروں کے علاوہ کہیں اور چھپنے کی جگہ میسر نہیں آتی تھی۔ یہ صرف اور صرف تم لوگوں کی کوتاہی اور حد سے بڑھے اعتماد کے سبب ممکن ہوا ہے۔"

مائر جبڑے بھینچے یہ سننے پر مجبور تھی۔

☆☆☆

کرنل کو کمرے میں جانے سے پہلے سارہ مل گئی۔ بنا کسی ہچکچاہٹ کے وہ کرنل کے قریب آکر ہیجانی لہجے میں بولی۔

"کامیابی مل گئی ہے۔ اب ہمیں یہاں سے نکلنا ہے اور یہ پلان آپ کا ہوگا۔"

کامیابی کی خبر نے کرنل کے وجود میں نئی ترنگ جگا دی۔ اس نے کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لیا، ارد گرد دو ہی وردی پوش تھے جن میں سے ایک مشکوک نظروں سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ کرنل نے کہا۔

"تم آس پاس رہنا...... میں اس حرامی ووڈ کو لے کر آرہا ہوں۔ گولی کی آواز سنتے ہی ووڈ والے چیمبر کے دروازے پر مجھے کور دینا۔"

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا تو کرنل الٹے قدم ووڈ کے چیمبر کی طرف چل دیا۔ وہ اس زیرزمین دنیا کا بغور جائزہ لے چکا تھا۔ اس کے ذہن میں پلان بڑا واضح تھا۔

چیمبر کے دروازے پر دو وردی پوش تعینات تھے۔ ان کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں کرنل نے کہا۔

"مسٹر ووڈ اور میرے درمیان ایک بہت ضروری بات رہ گئی ہے۔ ذرا انہیں میرے آنے کی اطلاع دو۔"

ایک وردی پوش نے سخت انداز میں کہا۔ "ہم اس کے مجاز نہیں ہیں...... تمہیں واپس جاکر سیکیورٹی انچارج روف نگر سے بات کرنا ہوگی۔"

کرنل اس دوران اپنا اور وردی پوشوں کا فاصلہ ناپ چکا تھا۔ لکڑی کے منقش دروازے کی مضبوطی کا اندازہ اسے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس نے قدم نہیں روکے۔ "اس اقدام کے لیے تمہیں...... مسٹر ووڈ کی ناراضگی......"

ایک وردی پوش اس کی بات کاٹ کر گرجا۔ "وہیں رک جاؤ!" ساتھ ہی اس کا ہاتھ اپنے ہولسٹر کی طرف بڑھا مگر کرنل درمیانی فاصلہ کم کرچکا تھا۔ اس کی لات سینے پر کھا کر وردی پوش دروازے سے ٹکرایا۔ گرتے گرتے بھی وہ پسٹل نکال چکا تھا مگر اسے فائر کرنے کا موقع نہیں ملا۔ کرنل دوڑ کر بگولے کے مانند آرائشی دروازے سے ٹکرایا۔ اس دوران وہ گرے ہوئے وردی پوش کے ہاتھ سے پسٹل بھی چھین چکا تھا۔ دوسرا وردی پوش پسٹل نکالتا ہی رہ گیا۔ کرنل دروازہ توڑتے ہوئے اندر گرا۔ اس کے کانوں سے سُریلی چیخیں ٹکرائیں۔ وہ گھٹنے کے بل سیدھا ہوا اور توقع کے عین مطابق دونوں وردی پوش اندھا دھند اندر داخل ہورہے تھے۔

کرنل کے ہاتھ میں دبے پسٹل نے یکے بعد دیگرے دو شعلے اُگلے۔ اس کا نشانہ بے خطا تھا۔ دونوں وردی پوش دروازے میں ہی ڈھیر ہوگئے۔

کرنل نے ایک شربتی آنکھوں والی حسینہ کو دیکھا۔ وہ ایک کونے میں منہ چھپائے مسلسل چیخے جارہی تھی۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر کرنل لاؤنج کی طرف دوڑا۔ وہاں کا منظر ہوش رُبا تھا۔ دوسری حسینہ اور ووڈ اپنے جسموں پر لباس چڑھانے میں مشغول تھے۔ لگتا تھا اُم الخبائث نے رنگ

Digest Novels .com

دکھایا تھا اور کرنل کے جاتے ہی یہاں شیطانی کھیل شروع ہو گیا تھا۔

لڑکی اسکرٹ پہننے کی کوشش میں لڑکھڑا کر ایک صوفے پر گری اور چیختی ہوئی صوفے سمیت دوسری طرف الٹ گئی۔ ووڈ کے فاری سور جیسے پلپلے جسم پر محض ایک انڈر ویئر تھا جو وہ ابھی ابھی پہننے میں کامیاب ہوا تھا۔

کرنل کے پاس اس شخص کے لیے نفرت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے باتھ روم کی طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ممکن تھا اس کا ارادہ خود کو اندر بند کرنے کا ہو یا پھر وہاں سے باہر نکلنے کا کوئی خفیہ راستہ ہو مگر کرنل نے اسے درمیان میں ہی جالیا اور گھما کر ایک ستون سے مار دیا۔ وہ ذبح ہوئے بکرے کے مانند ڈکرایا۔

کرنل نے حسینہ کو دیکھا۔ وہ ناگفتہ بہ حالت میں باہر کی جانب بھاگ رہی تھی۔ اسی وقت ایک فائر کی آواز سنائی دی اور اس کی بازگشت میں سارہ کی آواز ابھری۔

"میں دروازے پر ہوں...... آپ بے فکر ہو کر کام کریں۔"

کرنل کا حوصلہ سوا ہو گیا۔ سارہ دلیر اور ذہین تھی۔ دروازے پر ڈھیر دوسرے وردی پوش کے پسٹل پر اس نے قبضہ جمالیا تھا اور شربتی آنکھوں والی ہم شکل حسیناؤں کو قابو میں رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ باہر سے ہونے والی کسی مداخلت کو بھی روکنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

کرنل نے نیچے پڑے ووڈ کی گردن پر پاؤں رکھا تو اس کی آنکھیں مزید پھیل گئیں۔ "کک...... کیا ہوا؟ پاگل ہو گئے ہو کیا؟ تمہاری مافیا بھی تمہیں عبرت ناک موت سے نہیں بچا پائے گی۔"

کرنل نے پاؤں کا دباؤ بڑھایا۔ "پاگل ہی سمجھو! تمہیں زندہ رہنا ہے تو تعاون کرو یہ نہ ہو کہ میں تمہیں زندہ ہی کھالوں۔"

ووڈ کا سانس رکنے لگا۔ کرنل کے دیوانے پن نے اسے خوف زدہ کر دیا۔ "کک...... کیسا تعاون؟"

"سوال جواب جانوروں والے چیمبر میں کریں گے...... پہلے تم کپڑے پہن لو۔"

ووڈ کا خوف مزید بڑھ گیا۔ کرنل نے پاؤں ہٹایا تو وہ اٹھ کر کپڑے پہننے لگا۔ اس دوران سارہ کے لڑکیوں پر چلّانے اور گولی چلنے کا دھماکا سنائی دیا تھا۔

ووڈ نے کپڑے پہن لیے تو کرنل نے کالر سے پکڑ کر پسٹل کی نال اس کی چربیلی گردن میں گھسائی۔ "ہم جانوروں والے حصے میں جا رہے ہیں۔ درمیان میں تمہارے کسی ساتھی نے ٹانگ اڑائی تو گولی اندر گھسا دوں گا۔"

ووڈ مکمل طور سے کرنل کے ہولناک لہجے کے ٹرانس میں تھا۔ کپکپاتی آواز میں بولا۔ "کوئی ایسی جرأت نہیں کرے گا۔ لیکن تمہیں اچانک کیا ہوا ہے؟ تم مقابلے میں حصہ نہیں لینا چاہتے تو یہاں سے چلے جانے میں کوئی پابندی نہیں ہے...... تم جا سکتے ہو مگر میرے بندوں کے سامنے اس طرح میرا تماشا نہ بناؤ...... میں درخواست کرتا ہوں...... مم...... میں تمہارا مطلوبہ سامان بھی دینے کو تیار ہوں۔"

کرنل جانتا تھا کہ یہ پسٹل کی سرد نال کا جادو ہے جو ووڈ یہ ساری پیشکش کر رہا تھا۔ کرنل کے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ "تم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہم جانوروں والے چیمبر میں چلتے ہیں۔ میرے حساب سے وہ محفوظ جگہ ہے۔ وہاں اطمینان سے تم میرا مطلوبہ سامان مہیا کرو اور ہمیں حفاظت کے ساتھ باہر نکالو۔ جاتے ہوئے میں، تمہیں زندہ چھوڑ جاؤں گا۔"

ووڈ کو قدرے اطمینان ہوا۔ "تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟"

"ہاں۔" کرنل نے مختصر جواب دیا۔

ووڈ کی رضامندی ملتے ہی کرنل اسے بیرونی کمرے میں لایا۔ جہاں سارہ نے دونوں لڑکیوں کو اوندھے منہ فرش پر لٹا رکھا تھا اور خود دروازے کے پہلو میں چوکس کھڑی تھی۔ دروازے سے کچھ فاصلے پر وردی پوشوں کی جھلک بھی نظر آئی تھی۔

ووڈ نے سارہ پر زہر خند نظر ڈالی مگر بولا کچھ نہیں پھر اپنے دونوں گارڈز کی لاشیں دیکھ کر اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔

کرنل نے ایک گارڈ کی لاش کے بیلٹ سے واکی ٹاکی نکالا جو مسلسل "بپ...... بپ" کر رہا تھا اور اسے ووڈ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "جانوروں والے پورشن کے اندر کسی انسان کی موجودگی کا مطلب تمہاری موت ہو گا۔ اپنے پالتو سے کہو اس طرف جانے والا راستہ مجھے صاف ملنا چاہیے...... یہ اچھے سے ذہن میں بٹھا لو کسی مس ایڈونچر کا مطلب تمہاری فوری موت ہو گا۔ جان لینا اور دینا میرے لیے بے حد آسان کھیل ہے اب تک اتنا تو تم نے جان ہی لیا ہو گا۔"

ووڈ نے تھوک نگلتے ہوئے واکی ٹاکی تھام لیا اور کرنل

کی تمام تر ہدایات اپنی سیکیورٹی انچارج کو سخت لہجے میں دہرانے کے بعد کہا۔ ”روف! میری زندگی کا رسک بالکل نہ لینا...... میں یہ بات دہرا رہا ہوں۔ میرے اور جیمی کے درمیان جو معاملات ہیں، وہ افہام و تفہیم سے حل ہو جائیں گے۔“

روف نے جواباً کہا۔ ”باس! آپ بے فکر رہیں...... آپ جیسا چاہ رہے ہیں ویسا ہی ہوگا۔“

اس گفتگو کا نتیجہ فوراً نکلا۔ دوسری جانب وردی پوشوں کی جو جھلک نظر آرہی تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گئی۔

کرنل نے دونوں لڑکیوں کو باتھ روم میں بند کرتے ہوئے ایک کو اس کے کپڑے بھی تھما دیے۔

کرنل کے اشارے پر سارہ پسٹل سنبھالے آگے بڑھی۔ راہداری کے سرے پر جا کر اس نے محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لے کر اشارہ کیا تو کرنل [illegible] ووڈ کو آگے [illegible]

ہدایت کے عین مطابق باہر کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف جانوروں والے چیمبر کے نزدیک آہنی گیٹ کھولنے کے لیے ایک وردی پوش موجود تھا اور بظاہر غیر مسلح ہی نظر آتا تھا۔

کرنل نے پسٹل کے ٹہوکے سے ووڈ کو آگے بڑھایا۔ گرد و پیش سے وہ پوری طرح چوکنا تھا۔ سارہ بھی مہارت سے اسے کور کر رہی تھی۔

ووڈ کو واقعی اپنی جان پیاری تھی۔ وہ کرنل (جیمی) کی خطرناکی سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کرنل گولی چلانے میں لحظہ بھی نہیں لگائے گا۔ اسی لیے اس نے سیکیورٹی انچارج کو سخت ترین ہدایت کی تھی۔

جانوروں والے چیمبر کا فولادی ساؤنڈ پروف گیٹ کھلا تو پہلی آواز کرنل نے جو سنی وہ ایک لوگر (شیر کی نسل کا کم جسامت کا جانور) کی باریک دہاڑتی ہوئی آواز تھی اور پھر افریقن ہنٹنگ ڈاگز کی مشترکہ بے چین آوازیں سنائی دیں۔

سارہ نے چیمبر کے اندر گھس کر ہر طرف کا جائزہ لیا اور پھر کرنل نے گھما کر ووڈ کو چیمبر کے اندر پھینکا۔ وہ اڑتا ہوا کتوں والے کنٹینر (پنجرے) کے قریب گرا۔ کنٹینر میں موجود چاروں کتے اس پر جھپٹے...... جنگلے سے ان کی باریک تھوتھنیاں اور اگلے پنجے باہر نکل آئے تھے۔ ووڈ کلائی پر کھرونچے کھا کر تیزی سے دور ہٹ گیا۔

اس دوران کرنل نے گیٹ اندر سے بند کر دیا تھا۔

پسٹل بیلٹ میں پھنساتے ہوئے اس نے کہا۔ ”بڑی شاندار جگہ ہے۔“

بھوکے کتوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ ان کی بھوکی نظریں سامنے موجود انسانوں پر گڑی تھیں اور وہ بے چین ہو کر سلاخوں سے ٹکرا رہے تھے۔ ان کی ہولناک آوازیں اور خون آشام آنکھیں کسی کا بھی خون خشک کر سکتی تھیں۔

ووڈ نے کلائی مسلتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارا سامان جلد سے جلد منگوا دیتا ہوں اور کچھ بھی چاہیے تو وہ بھی بتا دو! میں اس وحشت ناک ماحول میں نہیں رہ سکتا۔“

اسے نظرانداز کر کے کرنل نے اس دوران ایک لائن میں بنے جنگلوں کا جائزہ لیا۔ یہ فولادی کنٹینر سے بنائے گئے تھے۔ ایک کنٹینر میں چار افریقن ہنٹنگ ڈاگز تھے جنہوں نے شور مچایا ہوا تھا۔ دوسرے میں نکیلے کانوں والا لوگر تھا جو [illegible] چینی انداز میں کنٹینر میں ٹہل رہا تھا۔ تیسرے میں [illegible] بے فکری سے ٹانگیں پسارے بیٹھا کچھ چبا رہا تھا۔ چوتھے کنٹینر کی سلاخوں کے آگے جالی لگی تھی اور اندر ایک بہت بڑا سبز اینا کونڈا بے حرکت پڑا تھا۔

کرنل نے دیکھ لیا تھا کہ ہر کنٹینر کے عقب میں ایک چھوٹا دروازہ تھا۔ بند دروازے میں کوئی کنڈی یا تالا نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دوسری جانب سے بند تھے۔

کرنل نے بغور کتوں والے اندرونی دروازے کا جائزہ لیا۔ اگر یہ دروازہ دوسری جانب سے کھلا تھا تو وزنی جانوروں کے ٹکرانے سے کھل بھی سکتا تھا مگر کتوں کی اس جانب توجہ نہیں تھی اور رسک لینا تو کرنل کی سرشت میں تھا...... اس پل وہ بھلا کہاں باز آنے والا تھا۔

کتے، کرنل کو قریب پا کر جیسے دیوانے ہو گئے تھے اور اس پر جھپٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ شاید کل والے مقابلے کی غرض سے انہیں ابھی سے بھوکا رکھا جا رہا تھا۔

کرنل، ووڈ کی طرف گھوما...... اس دوران ووڈ، سارہ کے نشانے پر رہا تھا۔

”اپنے پسندیدہ ماحول سے تمہیں وحشت کیوں ہو رہی ہے؟“

ووڈ نے زچ ہو کر کہا۔ ”مجھے جانوروں کی بو سے وحشت ہے۔ ختم کرو یہ کھیل۔ میرے ساتھ چل کر وہ مخصوص ہتھیار لے لو اور میری جان چھوڑ دو۔“

”تاکہ جان چھوٹتے ہی تم ایف بی آئی کو میرے بارے میں آگاہ کر سکو؟“

digest library.com

کرنل کے لہجے نے ووڈ کا چہرہ دھواں کر دیا۔

''مم...... میں بھلا ایسا کیوں کروں گا...... تم غلط سوچ رہے ہو۔''

''خیر اس بات کو چھوڑو...... میں، تمہاری جان لینے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ تم، روزی وائٹ کے قاتل ہو اور تمہیں چھوڑنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔''

کرنل کے لہجے نے ووڈ کے جسم سے جیسے جان کھینچ لی۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا اور گڑگڑایا۔ ''وہ باہمی رضامندی سے ہونے والا ایک کھیل تھا۔ اس کے پاس جان بچانے کا موقع بھی تھا مگر اس کی قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ اس کی موت کا الزام مجھے نہ دو۔''

کرنل کی آنکھوں میں وحشت اتری۔ ''ایسا ہے تو باہمی رضامندی سے ایک کھیل ہم بھی کھیلتے ہیں۔''

ووڈ، کرنل کے تاثرات سے اندازہ لگانے میں ناکام رہا۔ ''کک...... کیسا کھیل......؟''

''بڑا آسان سا ہے اور تمہارے پاس جان بچانے کا موقع بھی ہے۔ تم کتوں والا دروازہ کھول کر بھاگو اور چیمبر کا گیٹ کھول کر باہر نکل جاؤ جہاں زندگی اور اس کی رنگینیاں تمہاری منتظر ہیں۔''

کرنل کے لہجے میں جو ٹھوس سفاکی تھی، وہ پہلے ہی ووڈ کو اس کے عزائم کی خبر دے رہی تھی۔ اس نے ہمت مجتمع کی۔ بے موت مرنے سے زندگی بچانے کی کوشش کرنا بہتر تھا۔ اس نے کتوں والے کنٹینر اور چیمبر کے گیٹ کا درمیانی فاصلہ ناپا اور پھر ایک خیال آنے پر دوبارہ ڈھیلا پڑ گیا۔

''تمہارا ارادہ مجھے گولی مارنے کا ہے ورنہ جانتے ہو کہ میں سلامت باہر نکل گیا تو پھر تمہارے لیے اذیت ناک موت کا دروازہ کھل جائے گا۔ مجھے مارنا ہے تو مار دو اور کھیل ختم کرو۔''

کرنل نے محسوس کیا کہ موت کا خوف دھیرے دھیرے کم ہو رہا ہے اور اس بدبخت کا دماغ چلنا شروع ہو گیا ہے تو اس نے فوراً پینترا بدلا اور اسے کتوں والے اندرونی دروازے کے کھلے ہونے کے بارے میں بتانے کے بعد کہا۔

''روزی یقیناً کتوں کو ہلاک کر کے اس دروازے سے نکلنے کا پروگرام بنائے تھی مگر اس کے ارادوں کی تمہیں بھنک پڑ گئی۔ اب ہم اس دروازے کو استعمال کریں گے اور تمہارے شور مچانے سے پہلے کہیں کے کہیں پہنچ جائیں گے۔'' ساتھ ہی اس نے ووڈ کو آنکھ ماری۔ ''اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ کتے تمہیں دروازے تک پہنچنے ہی نہ دیں...... چانس برابر کا ہے۔''

ووڈ نے اسے زہرخند نظروں سے دیکھا۔ ''اور RL70؟''

کرنل نے مسکراتے ہوئے اس کا گال تھپتھپایا۔

''جس ویئر ہاؤس میں تم نے انہیں چھپایا تھا، وہ خالی ہو چکا ہے۔''

ووڈ کی حالت دیکھنے والی ہو گئی۔ اس دوران واکی ٹاکی مسلسل شور مچا رہا تھا۔ کرنل نے تاک کر گولی چلائی تو کتوں والے کنٹینر کا قفل ٹوٹ کر جھولنے لگا۔ پسٹل کی نال سے نکلنے والے دھوئیں کو پھونک مارتے ہوئے کرنل نے کہا۔

''تیار ہو جاؤ...... تمہارے ساتھی تمہارے لیے بے چین ہو رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر کرنل کتوں والے کنٹینر کی بند سائڈ سے باہر نکلے ایک چھجے پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھ گیا۔ سارہ کا ہاتھ تھام کر کرنل نے اسے بھی اوپر کھینچ لیا۔ اس دوران اس نے ووڈ پر بھی پوری طرح نظر رکھی تھی۔ اوپر سے اس نے کہا۔ ''خیال رہے کتوں والا گیٹ پورا کھلنا چاہیے۔ ورنہ میں تمہیں گولی مارنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

ووڈ نے چند طویل سانس لیے درمیانی فاصلہ ایک دفعہ پھر ناپا۔ کرنل کے ساتھ ساتھ سارہ بھی یہ منظر دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ خادموں والا لباس اس نے اتار پھینکا تھا۔ نیچے اس نے چست جینز اور پوری آستینوں کی شرٹ پہن رکھی تھی۔

ووڈ آہستہ آہستہ کتوں والے چیمبر کی طرف بڑھا۔ کتے اس پر جھپٹنے لگے۔ دور سے ہاتھ بڑھا کر پہلے اس نے ٹوٹا قفل نکال کر دور پھینکا اور اگلے ہی لمحے گیٹ کھول کر اپنے جسم و جاں کی پوری قوت سے گیٹ کی طرف بھاگا اور لمحوں میں نصف سے زیادہ فاصلہ طے کر گیا۔ کتے بھی برق رفتاری سے باہر نکلے اور انہوں نے گیٹ سے بمشکل چند گز دور ووڈ کو جالیا۔ ایک نے اچھل کر منہ مارا اور ووڈ کے بڑھے پیٹ کا ایک بڑا حصہ شرٹ سمیت اس کے منہ میں آ گیا۔

کرنل اور سارہ نے اس جنگلی جانور کی بے پناہ بائٹ کی قوت کا براہِ راست مشاہدہ کیا۔ اگلے پل ووڈ کی دلخراش چیخ بلند ہوئی اور گوشت کا ٹکڑا شرٹ سمیت کتے کے منہ میں تھا۔ خون کا ایک فوارہ مضروب جگہ سے چھوٹ گیا تھا۔

اس کا فائدہ اٹھا کر ان دونوں نے نیچے چھلانگ لگائی

Digest Novels .com

اور کنٹینر میں داخل ہو کر کنڈی لگالی۔

بھوکے افریقن ہنٹنگ ڈاگز بے رحم شکاری ہوتے ہیں اور اپنے شکار کو زندہ ہی کھانا شروع کر دیتے ہیں۔اس وقت بھی وہ ووڈ کے پھٹے ہوئے پیٹ پر حملہ آور تھے۔ووڈ چلّاتے ہوئے پوری قوت سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔پھر ایک کتّے کے منہ میں آنتیں اور اندرونی اعضا دیکھتے ہوئے سارہ نے بے اختیار کرنل کی بغل میں منہ چھپالیا۔وہ مضبوط اعصاب کی سیکرٹ ایجنٹ تھی مگر تھی تو ایک لڑکی ہی نا...... اس کا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

جانوروں کی خونخوار آوازوں اور چھینا جھپٹی کے درمیان کرنل نے سارہ کو تھپکتے ہوئے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''ووڈ بھی ایک خونخوار جانور ہی تھا اور ایسے انجام کا مستحق تھا۔''

☆☆☆

ایف بی آئی کے سینٹرز میں کھلبلی مچ گئی تھی۔نیویارک کے ایک بڑے مال کے داخلی دروازے سے گزرتے ہوئے ایک سیاہ فام جوان نے کھلونا ریموٹ کنٹرول ہیلی کاپٹر کی زد سے بچنے کے لیے اوپر دیکھا تھا اور اسی لمحے اس کی آنکھوں کی پُتلیاں اسکین ہوگئی تھیں۔کھلونا ریموٹ کنٹرول ہیلی کاپٹر قریب موجود بچوں کے کھیل والے حصے میں ایک بچہ کنٹرول کررہا تھا اور وہ ہیلی کاپٹر کو مکمل کنٹرول کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔

پُتلیاں اسکین ہوتے ہی سوفٹ ویئر نے اسے کرنل کمال کے طور پر پہچانتے ہوئے شور ڈال دیا تھا۔فوراً ہی یہ اطلاع کوپر کو دی گئی۔اس کی ہدایت پر ایف بی آئی کی ایک ٹیم شاپنگ مال کی طرف دوڑی تھی۔کرنل کمال کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔

کوپر ہیجان کا شکار ہوگیا۔کرنل سیاہ فام کے روپ میں نیویارک میں کیا کررہا تھا۔کوپر کو یقین تھا کہ کرنل کمال کے ساتھ وہی لڑکی تھی جو بوڑھی عورت کے روپ میں جنرل گوریان کو قتل کرتے ہوئے اس کی مددگار تھی۔

کوپر نے مائر کو فون کر کے بلایا تھا۔اس دوران پورے نیویارک کے کیمروں کا ریکارڈ چیک ہورہا تھا۔دھڑا دھڑ فوٹیج سامنے آرہے تھے اور پھر تھوڑی دیر بعد ہی ایک اور ٹیم ایرینا کی طرف روانہ ہورہی تھی۔

کوپر کے لیے وہاں بیٹھنا مشکل ہورہا تھا۔مائر کے پہنچنے تک اس کے لیے کمرشل چارٹرڈ طیارہ اڑان بھرنے کے لیے تیار تھا۔وہ، مائر کے ساتھ طیارے میں جا بیٹھا۔

پرواز ہموار ہوتے ہی اس نے پوچھا۔''نیویارک میں اس کا اسرائیلی ٹارگٹ کون ہوسکتا ہے؟''

مائر کے چہرے پر فکرمندی ہی فکرمندی تھی، وہ بولی۔''کل سنٹ یونیورسٹی کی صد سالہ تقریب ہے۔پروفیسر گھمٹ کو اس تقریب میں شریک ہونا ہے۔دو دن پہلے ہی اس حوالے سے مراسلہ آچکا ہے۔اس کی حفاظت کی ذمے داری میری ہے۔''

''پروفیسر گھمٹ وہی تو نہیں...... تمہارے ''آئرن ڈوم'' اور میزائل پروگرام کا خالق...... دنیا جسے خبطی بوڑھا کہتی ہے۔''

''وہی ہے...... بے شک خبطی ہوگا مگر ہمارا قومی اثاثہ ہے۔اس منحوس کرنل کی نگاہیں یقیناً پروفیسر گھمٹ پر ہیں۔دباؤ سے کہیں میرا دماغ پھٹ نہ جائے۔''

کوپر نے کہا۔''دباؤ نہ لو! پروفیسر ابھی زندہ ہے۔اس کا دورہ منسوخ بھی کروا سکتی ہو اور کرنل کے بھی ہم قریب پہنچ چکے ہیں۔مجھے یہ خیال پریشان کررہا ہے کہ کرنل جامع منصوبے کے ساتھ پروفیسر کے درپے ہوگا۔ویسے سیکیورٹی پلان کیا ہے؟''

''پلان تل ابیب سے آیا ہے۔پروفیسر نیویارک ائرپورٹ پر اترے گا۔وہاں سے خصوصی ہیلی کاپٹر سے سنٹ کے ہیلی پیڈ پر اترے گا۔تقریب کے فوراً بعد اسی ہیلی کاپٹر میں ائرپورٹ اور فوراً ہی چارٹرڈ سے روانگی۔''

کوپر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔''ہیلی کاپٹر میں خاص کیا ہے؟''

''گرمی خارج کرنے والے ریفلیکٹر...... عام سا میزائل گرمی کا ہی تعاقب کرتے ہیں۔''

کوپر کی سوچ مزید گہری ہوئی۔''حفاظت کا تو معقول انتظام ہے...... پروفیسر کے علاوہ اور کوئی ممکنہ ٹارگٹ؟''

مائر نفی میں سر ہلاتے ہلاتے چونکی۔''جنرل مصطفائی نیویارک میں ہمارے ایک سیف ہاؤس میں ہے۔وہ بھی ممکنہ ٹارگٹ ہوسکتا ہے۔''

''یہ کون ہے؟''

مائر نے مسکراتی نظروں سے کوپر کو دیکھا۔''ایک ایرانی کمانڈر...... جو ہمارے لیے کام کررہا تھا۔ایران کے خلاف جنگ میں ابتدائی کامیابیاں اسی کے سبب ممکن ہوئی ہیں۔کئی سائنس داں اور اہم فوجی کمانڈر اسی کی دی ہوئی

Digest Novels .com

معلومات کے سبب ہم نے ٹھکانے لگائے ہیں۔''

کوپر نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ مارا۔ ''پروفیسر بے شک کرنل کی ہٹ لسٹ میں نہ ہو مگر تمہارا مہمان ضرور ہوگا۔ اُس کی حفاظت کا زبردست اہتمام کرو۔'' پھر ایک خیال سے کوپر کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔

''کیوں نا ایک غدار کو چارے کے طور پر استعمال کیا جائے؟''

مائز کو آئیڈیا پسند آیا مگر وہ تذبذب سے بولی۔ ''ہیڈ کوارٹر سے اجازت لینا ہوگی۔''

کوپر نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''خود فیصلے لینا سیکھو، کامیاب سیکرٹ ایجنٹ بننے کی یہی کلید ہے۔''

مائز نے خجالت سے سر جھکایا اور پھر جہاز کے نیویارک لینڈ کرنے سے پہلے اس نے خود فیصلہ کرنا سیکھ لیا۔

کوپر نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

وہ نیویارک اترے تو سیڑھیاں اترتے ہوئے کوپر نے کہا۔ ''کرنل واقعی ایک زیرک ایجنٹ ہے۔ مخالف کے دماغ سے کھیلتا ہے۔ میامی میں میزائل منگوا کر اس نے صرف ہمیں بھٹکایا ہے۔ اس کا اصل ٹارگٹ نیویارک ہی ہے مگر خیر اب اسے جال میں آنا ہی ہے۔''

مائز نے اختلاف کیا۔ ''ممکن ہے نیویارک سے فارغ ہو کر وہ میامی کا رخ کرنے کا ارادہ باندھے ہو..... ہمیں اتنی جلدی میامی والے جال سے دستبردار نہیں ہونا چاہیے۔''

کوپر نے فوراً اس کی تائید کی۔

نیویارک اترتے ہی وہ ایف بی آئی آفس بھاگے۔

ایف بی آئی کو شاپنگ مال سے تو کچھ نہیں ملا تھا۔ یقیناً کرنل کمال اور لڑکی پرانے بھیس سے نجات پانے کے لیے اندر گھسے تھے اور پھر کسی نئے بھیس میں وہاں سے نکل گئے تھے۔

ایف بی آئی نے شاپنگ مال میں سارے داخلی دروازے بند کر کے چیکنگ کی تھی اور وہاں موجود مشکوک افراد کی آنکھوں کی پُتلیاں بھی اسکین کی تھیں مگر کرنل کمال اور اس کی ساتھی اس سے پہلے وہاں سے نکل گئے تھے۔ اب دوبارہ نئی فوٹیج کو چھانٹا جا رہا تھا اور سارا فوکس جوڑوں پر تھا۔

ایرینا میں جو کامیابی ملی تھی۔ وہ آنجہانی ووڈ کا ذاتی محافظ اور وہ معاہدہ تھا جو ایرینا اور جیمی کے درمیان پایا گیا تھا۔ دونوں ہی کوپر کے سامنے پیش کردیے گئے۔ معاہدے پر معاوضے کے خانے میں RL70 دیکھتے ہی کوپر اچھل پڑا۔ ''یہ ووڈ کے پاس کہاں سے آئے؟''

ذاتی محافظ نے ہاتھ بلند کیا۔ ''مم...... میں اس بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ایف بی آئی کی گاڑیاں محافظ کو لے کر ویئر ہاؤس کی جانب اُڑی جا رہی تھیں۔ کوپر اور مائز بھی ساتھ ہی تھے۔ ویئر ہاؤس میں لکڑی کے خالی صندوق ان کا منہ چڑا رہے تھے۔ کوپر سر تھامتے ہوئے بڑبڑایا۔

''وہ ہم سے بہتر ہے۔''

مائز نے پوچھا۔ ''کیا کہا تم نے؟''

کوپر نے سر جھٹکا۔ ''کچھ نہیں...... تمہیں پروفیسر کو کل ہر صورت تقریب میں شامل ہونے سے روکنا ہوگا۔ ورنہ کرنل اس ہیلی کاپٹر کو اُڑا دے گا۔''

''ایک معمولی سام میزائل سے؟''

کوپر نے اس پر نگاہیں جمائیں۔ ''جانتی ہو RL70 کیا چیز ہے؟''

مائز اس کے انداز سے ڈر گئی۔ ''کیا یہ بہت خطرناک ہے؟'' اس نے الٹا سوال جڑ دیا۔

''یہ تمہارے ہی ملک کا بنایا ہوا ہے۔ خطرناکی کے بارے میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا مگر اتنا معلوم ہے کہ اس کے جدید ترین سینسرز گرمی خارج کرنے والے ریفلیکٹرز اور انجن کی گرمی میں آسانی کے ساتھ تمیز کر سکتے ہیں۔''

مائز کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اس شخص کا ہوم ورک ناقابلِ یقین ہے۔ وہ انسان ہے یا سُپر کمپیوٹر؟ اس نے کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔''

کوپر نے دھیمی آواز میں اعتراف کیا۔ ''وہ ہر قدم پر ہم سے آگے ہے..... یہیں دیکھ لو وہ کتنے مضبوط بیک گراؤنڈ کے ساتھ ایرینا میں گھسا تھا۔ اس سے ملاقات کی خواہش شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔''

مائز نے طویل سانس لیتے ہوئے بطور سیکیورٹی ذمے دار پروفیسر گھمنٹ سے بات کی۔ پروفیسر نے پوری بات سننے کے بعد سرد انداز میں کہا۔

''تم جانتی ہو جس یونیورسٹی کی صد سالہ تقریبات ہونے جا رہی ہے۔ میں کبھی اس کی راہداریوں میں جوتیاں چٹخاتا تھا۔ اسکالرشپ مجھے وہیں سے ملی تھی۔ میری یونیورسٹی نے بڑے فخر اور مان کے ساتھ مجھے بطور مہمانِ خصوصی بلایا ہے۔''

مائز نے بڑے ادب سے دخل اندازی کی۔ ''مگر

Digest Novels .com

پروفیسر آپ کی زندگی اس سے بڑھ کر ہے۔ ایرانی دہشت گرد آپ کی تاک میں ہیں۔''

پروفیسر نے تنک کر کہا۔ ''سیکیورٹی کی ذمے دار تم ہو اور وزیراعظم کو بھی مجھے روکنے کے لیے لکھ کر دینا ہوگا کہ اگلے سو سال بعد ہونے والی ایسی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے میں زندہ رہوں گا۔'' اس کے ساتھ ہی پروفیسر نے رابطہ ختم کر دیا۔

مائر نے دوبارہ طویل سانس لیا۔ ''بوڑھا واقعی خبطی ہے۔''

کوپر مسکرایا۔ ''ہیلی کاپٹر کے پورے روٹ کو میں کلیئر کراتا ہوں۔ ہر بلند عمارت پر کل ایف بی آئی کے ایجنٹ ہوں گے۔ تم ذرا جنرل مصطفائی میں حفاظتی جھول بناؤ، پروفیسر کو واقعی تمہارا وزیراعظم بھی نہیں روک سکتا۔''

مائر نے ہونٹ بھینچ لیے۔

☆☆☆

کرنل کمال اپنے خفیہ ٹھکانے پر تھا۔ اس کی ساری ٹیم بھی وہیں تھی۔ ماسوا علی کے جو کرنل کی آمد سے پہلے ہی وہ اپنے خاص مشن پر روانہ ہو چکا تھا۔

کرنل آنکھیں مونڈے لیٹا تھا اور سارہ بڑی نرمی سے اس کے سر کا مساج کر رہی تھی۔ مشقت کے سبب اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ باقر...... جو مسخرے کے بھیس میں رہ چکا تھا۔ سکینہ...... آغا سلفی اور شائل ایک دائرے کی صورت اپنے لیڈر کے گرد بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں محبت اور احترام تھا...... یہ شخص ان کا رول ماڈل تھا جو اپنی ارض کی حفاظت کے لیے دشمنوں کے خلاف بگولے کے مانند چکراتا پھر رہا تھا۔ اس وقت بھی کرنل کی بند آنکھوں کے عقب میں بے حد دُبلے پتلے اور روشن آنکھوں والے علی کی تصویر تھی جو بڑے اہم مشن پر گیا تھا۔ کرنل شاید خود وہاں ہوتا مگر علی کی جسامت اور قد و قامت موزوں ہونے کے سبب وہ پہلے ہی علی کا انتخاب کر چکا تھا۔ علی کی کامیابی کے بعد صیہونیوں کو یہ واضح پیغام مل جاتا کہ چھپ کر اور گھات لگا کر ان کے جرنیل اور سائنس دان بھی مارے جا سکتے ہیں۔ خون بہاؤ گے تو جواب بھی ضرور آئے گا اور ''لہو رنگ'' سبھی کا یکساں ہوتا ہے۔ اپنے زعم میں صیہونی بے شک خود کو ارفع و اعلیٰ سمجھتے رہیں۔ ان کے خون کا رنگ بھی ایرانیوں کے مانند سرخ ہی تھا۔

کرنل کو امید تھی کہ وہ صیہونیوں کو ''مضبوط'' جواب دینے میں کامیاب رہا تو وہ آئندہ اپنی بزدلانہ کارروائیوں سے پہلے سوچیں گے ضرور کہ جواب دوبارہ بھی آ سکتا ہے۔''

بند آنکھوں کے ساتھ کرنل کی آواز اُبھری۔

''سکینہ! ٹی وی آن کر دو۔''

سکینہ نے فوراً تعمیل کی اور ہدایت کے مطابق آواز بے حد مدھم رکھی تھی۔ اسکرین پر سی این این چل رہا تھا۔

کرنل کی دوبارہ آواز ابھری۔

''آغا! کتے کی کیا خبر ہے؟''

آغا نے کہا۔ ''سر! کوشش کے باوجود ٹاور کے ٹاپ کی سیکیورٹی کے بارے میں معلومات نہیں مل سکی۔ اوپر آنا، جانا ایک ہیلی کاپٹر سے ہو رہا ہے۔ بیسمنٹ سے ایک علیحدہ کارگو لفٹ ٹاپ تک جاتی ہے اور اسے صرف اوپر سے آپریٹ کیا جا سکتا ہے۔ تین ایجنٹ ہمہ وقت پارکنگ میں ہوتے ہیں اور شک ہے کہ پارکنگ اسٹاف میں بھی ایجنٹ شامل ہیں۔ آپ کے حکم پر میں نے اور سکینہ نے معلومات کے حصول کے لیے ''ریڈ لائن'' پار نہیں کی۔''

آغا خاموش ہو چکا تھا۔ کرنل کا دماغ متحرک اور آنکھیں بدستور بند تھیں۔ سارہ کی انگلیاں بھی سبک خرامی سے حرکت کر رہی تھیں۔

چند لحظوں بعد کرنل کی توانائی سے بھرپور آواز اُبھری۔ ''چھوٹے، موٹے غدار اور جاسوس ہم روزانہ لٹکا رہے ہیں۔ ضرورت بڑے غدار کو لٹکانے کی ہے۔ ہمارے اور کروڑوں ایرانیوں کے دلوں کو تبھی چین آئے گا۔ غدار کو انجام تک پہنچانے کے لیے ہم فدائی حملہ کرنے جا رہے ہیں۔ کون میرے ساتھ ہے؟''

کرنل کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اس کے الٹے ہاتھ کو سبھی نے تھام کر پُرجوش انداز میں کہا کہ اپنے ملک و قوم کے غدار کو انجام تک پہنچانے میں وہ جان دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔

کرنل کے چہرے پر طمانیت دوڑ گئی۔ اس دوران آغا کی آواز اُبھری۔

''سر! جب ہم بیسمنٹ سے نکل رہے تھے تو کچھ ٹرکوں سے اوپر والی لفٹ کے پاس وزنی سامان اتارا جا رہا تھا۔ ممکن ہے اب وہ لفٹ......'' آغا کا فقرہ ادھورا رہ گیا۔

کرنل کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ بولا۔

''ہماری نیویارک میں موجودگی افشا... ہو چکی ہے۔ ہمارے تعاقب میں سارے گدھے نہیں ہیں۔ ہمارے ممکنہ ٹارگٹس ان کی نظروں میں ہیں۔ یہ ہمارے لیے جال پھیلایا جا رہا ہے اور میں ان لوگوں کو مایوس نہیں کروں گا۔''

Digest Novels .com

کرنل کی نگاہیں اب سکینہ اور آغا پر تھیں۔ ''کیا ہم یہ تصدیق کرسکتے ہیں کہ مصطفائی ٹاور پر ہی ہے؟''

آغا نے سکینہ کی طرف دیکھا تو وہ جوش سے بولی۔ ''کیوں نہیں...... سول ایوی ایشن میں رجسٹرڈ جو فرم موساد کے پے رول پر ہے۔ اس کے ہیلی کاپٹر ہی استعمال ہو رہے ہیں بلکہ ابھی تک تو ایک ہی امریکن ساختہ جے روز ویلٹ استعمال ہو رہا ہے۔ وہ جس پرائیویٹ ہیلی پیڈ کو استعمال کر رہا ہے، وہاں کے سارے کیمروں کے کوڈ اور ڈیٹا ہمارے پاس ہے۔ ابھی تک کسی کیمرے میں مصطفائی کی آمدورفت نہیں دیکھی گئی مزید فوٹیج چیک ہو سکتے ہیں۔''

کرنل نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''مجھے فخر ہے کہ میرے پاس ایک شاندار ٹیم ہے۔''

سکینہ کا چہرہ چمک اٹھا۔

کرنل نے آواز دی۔ ''باقر!''

باقر نے ادب سے کہا۔ ''جی سر!''

''جے روز ویلٹ کے پائلٹ کا ماسک کتنی دیر میں تیار ہو سکتا ہے؟''

باقر نے جلدی سے کہا۔ ''تین سے چار گھنٹوں میں سر!''

''گڈ! اسے تیار کرو!''

☆☆☆

نیویارک میں ایک نیم گرم دن کا آغاز ہو چکا تھا۔ دریائے ہڈسن کے کنارے ایک اونچی چٹان پر ایک قدیمی قلعہ تھا جسے میوزیم کی شکل دی جا چکی تھی۔ میوزیم کے کھلتے ہی سیاحوں کی آمدورفت شروع ہو گئی تھی۔ اس میوزیم کی خاص بات ایک بہت بڑی توپ تھی جو امریکا کی خانہ جنگی میں استعمال ہوتی رہی تھی۔ کہتے ہیں کہ انسانی غلامی کے حامیوں پر بھی اس کا استعمال ہوا تھا۔ جنگ کے ساتھ ہی غلامی کا بھی خاتمہ ہوا اور یہ توپ امریکی صدر ابراہام لنکن کے نام سے منسوب کر دی گئی تھی اور آج بھی بڑی شان سے آسمان کی طرف منہ اٹھائے جیسے اپنے ہدف کی تلاش میں تھی۔

ایف بی آئی کے چار ایجنٹ اس میوزیم کی مختلف جگہوں پر موجود تھے اور ہر طرف کڑی نظر رکھے ہوئے تھے مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کے آنے سے بہت پہلے علی اپنی پوزیشن سنبھال چکا تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص مع پورٹیبل میزائل لانچر سمیت ابراہام توپ کے اندر ہو سکتا ہے مگر علی توپ کے اندر تھا اور دہانے کے قریب اس کی نگاہیں اُفق پر تھیں۔ توپ اب گرم ہونا شروع ہو چکی تھی اور علی کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کسی آہستہ آہستہ گرم ہوتے تندور میں لیٹا ہو۔ اس نے پانی کے باقی ماندہ گھونٹ حلق سے اتارے ہی تھے کہ اس کے وجود میں سنسنی دوڑ گئی۔ ہیلی کاپٹر کی مخصوص آواز سنائی دی اور پھر سرخ دم اور چار نیلے ستاروں والا ہیلی کاپٹر اُفق پر نمودار ہوا۔ اس کی رفتار خاصی تیز تھی۔ ایف بی آئی ایجنٹوں نے بھی ہیلی کاپٹر کو دیکھا اور اس کے خیریت سے گزر جانے کی دعا کی مگر ضروری نہیں کہ ہر دعا ہی قبول ہو۔ علی لانچر پہلے ہی سیدھا کر چکا تھا۔ ہاک آئی میں دیکھتے ہوئے جیسے ہی ٹارگٹ گرین سے ریڈ ہوا اس نے ٹریگر دبا دیا۔ میزائل برق رفتاری سے لانچر سے نکلا اور توپ دھوئیں اور آگ کے شعلوں سے بھر گئی مگر اس کی علی کو پروا نہیں تھی۔ اس نے دہانے سے منہ باہر نکال لیا۔

ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کو جیسے ہی سینسرز نے ''لاک'' ہونے کی اطلاع دی، اس نے تیزی سے ایک بٹن دبایا اور فضا میں ہر طرف تیز گرمی والے ریفلیکٹر پھیل گئے۔

ہیلی کاپٹر کی طرف محو پرواز RL70 نے رخ بدلا...... ہوا میں ایک قوس سا بنایا اور قدرے بلندی پر جانے کے بعد دوبارہ جھپٹا اور ہیلی کاپٹر کے پروں کے نزدیک انجن سے جا ٹکرایا۔ اگلے ہی پل ہیلی کاپٹر آگ اور شعلوں میں لپٹا ہڈسن میں گرنے جا رہا تھا۔ اس وقت توپ کے قریب دو درجن کے قریب افراد تھے جن میں بچے بھی تھے۔ مرکز نگاہ توپ ہی تھی۔ کئی افراد نے اس کے اندر سے آگ کا شعلہ نکلتے دیکھا تھا اور جب دہانے پر لانچر سمیت علی نظر آیا تو لوگوں کو اندازہ ہو گیا کہ کیا ہوا ہے۔ خوف زدہ چیخوں کے ساتھ سیاح وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ہیلی کاپٹر ہڈسن میں گرا ابھی تک جل رہا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر علی کا دل شاد ہو گیا۔ وہ سرخرو ٹھہرا تھا۔ ان پر آگ برسانے والا آج خود آگ میں جل مرا تھا۔

لانچر پھینک کر توپ کے دہانے سے لٹک کر وہ نیچے کودا۔ یہ منظر قدرے فاصلے پر موجود ایف بی آئی ایجنٹ نے دیکھا اور بے دریغ گولیاں چلا دیں۔ علی کے گرد چنگاریاں چھوٹ گئیں۔ وہ اٹھ کر فصیل کی طرف بھاگا۔ عقب سے ایجنٹ نے اسے رکنے کی وارننگ دی مگر وہ رکنے کے لیے نہیں بھاگا تھا۔ فصیل پر پاؤں ٹکاتے ہوئے کئی گولیاں اس کی پشت پر لگیں اور سینے سے پار ہو گئیں۔

ہڈسن کی لہروں نے جب علی کو سنبھالا تو وہ دنیا چھوڑ چکا

تھا مگر اپنے پیچھے پوری دنیا کے لیے بریکنگ نیوز چھوڑ گیا تھا۔

☆☆☆

سبھی کی نظریں ٹی وی اسکرین پر تھیں۔ دشمن کی ہلاکت کی خبر کی خوشی کو علی کی شہادت نے گہنا دیا تھا۔ سکینہ اور سارہ روتے ہوئے کرنل کے گلے سے لگیں تو اس نے ہونٹ بھینچے ہوئے کہا۔

''میرے بچے! شہید پر رویا نہیں جاتا...... وہ سبقت لے گیا ہے اور یقیناً بہت بہتر جگہ پر ہے۔ ان آنسوؤں کو دل میں اتار کر آگ بنالو! ہم ابھی غدار کو ٹھکانے لگانے نکل رہے ہیں۔ دل میں اتری یہی آگ ہی تمہارا اصل ہتھیار ہے۔''

کرنل کے جذباتی الفاظ نے جادو کا سا اثر دکھایا۔ لڑکوں نے آنسو مسل دیے اور لڑکیاں بھی خود کو سنبھالنے میں لگ گئیں۔ کرنل نے باری باری دونوں کا سر چوما۔ اس لمحے کرنل کو دیکھنا بڑے حوصلے کا کام تھا۔ اس کا چہرہ جیسے کسی چٹان سے تراشا لگتا تھا اور آنکھوں میں آگ تھی۔

سکینہ نے سرخ چہرے کے ساتھ بتایا کہ ٹاور سے جنرل مصطفائی ایک دفعہ بھی نہیں اترا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے ذریعے نت نئی نوخیز تھائی لڑکیاں آتی اور جاتی تھیں۔ دو دفعہ موساد کا ایک اہلکار بھی ریکارڈ ہوا تھا۔

کرنل سینے میں دہکتی آگ کو بمشکل سنبھالے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ ''دشمن ہماری تاک میں ہے اس لیے ہمیں کمیونیکیشنز کے لیک ہونے کی چنداں پروا نہیں۔ میرے اور سارہ کے علاوہ تم سب بیسمنٹ میں لفٹ کی جانب سے چڑھائی کرو گے۔ انداز ایسا ہو جیسے تمہیں معلوم نہیں ہے کہ لفٹ صرف اوپر سے آپریٹ ہو سکتی ہے۔''

سبھی بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ ان کے چہروں پر آگ کی لپٹوں سے مطمئن ہوتے ہوئے کرنل کا سلسلہ کلام جاری تھا۔

''یقیناً تمہیں بیسمنٹ میں گھیر لیا جائے گا۔ تمہیں وہیں ڈٹے رہنا ہے۔ میں اور سارہ اوپر سے حملہ آور ہوں گے۔ کامیابی خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ہم سرخرو ٹھہرے تو پھر تمہیں لفٹ کے ذریعے اٹھالیں گے۔ پیراشوٹ ہمارے پاس رہیں گے۔ ہڈسن زیادہ دور نہیں، ہم دریا تک پہنچ گئے تو بچت کی آس ہے ورنہ آئندہ ملاقات جنت میں ہوگی۔ رابطہ میں خود کروں گا...... کوئی سوال......؟''

آغا نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ ''سر! میں بڑا گناہ گار بندہ ہوں۔ جنت میں میرے داخلے کی گارنٹی آپ دیتے ہیں؟''

اس کے ساتھ ہی ماحول کا سارا تناؤ ختم ہو گیا تھا۔ سبھی مسکرا اٹھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کرنل کی ایک آنکھ سے آنسو ٹپک گیا۔ اس نے آغا کو سینے سے لگایا۔

''ہاں، چاہے مجھے خدا سے جھگڑا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔''

اس کے ساتھ ہی سبھی ایک، دوسرے کے گلے لگ گئے۔ انداز الوداعی تھا۔

اپنے ٹھکانے سے سبھی ایک ایک کر کے روانہ ہونے لگے۔

☆☆☆

کرنل کمال نے فارسی کی متروک شاخ میں اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔ جواب آغا نے دیا۔ پس منظر سے گولیوں کی گھن گرج نے پہلے ہی کرنل کو بتادیا کہ بیسمنٹ میں کیا چل رہا ہے۔

کرنل کی نگاہیں سامنے تھیں۔ وہ پائلٹ کے بہروپ میں تھا۔ ساتھ والی سیٹ پر سارہ ایک نوخیز لڑکی کا روپ دھارے بیٹھی تھی۔ اس کا لباس بھی ناکافی تھا۔ ٹاور تیزی سے نمایاں ہوتا جارہا تھا۔ ''آغا! کیا صورتِ حال ہے؟''

آغا کی جاندار آواز آئی۔ ''سر! ہم نے موساد کے چار ایجنٹ پہلے ہی ہلے میں گرادیے تھے مگر یہاں دو درجن سے زائد ایجنٹوں کا سامنا ہے۔ ہم ڈٹے ہوئے ہیں اور لفٹ کے قریب دوڑکوں کی کور لے رکھی ہے۔''

کرنل نے جوش سے کہا۔ ''بس یہی چاہیے۔ لفٹ تھوڑی دیر میں ہی ہمارے کنٹرول میں ہوگی۔ میں تھوڑی دیر میں پھر رابطہ کرتا ہوں۔''

☆☆☆

کوپر اور مائر ٹاور کی قریبی سڑک پر ایک موبائل کمانڈ اینڈ کنٹرول ٹرک میں تھے۔ انہوں نے براہِ راست کرنل اور آغا کی گفتگو سنی تھی۔ کوپر کی پیشانی پر شکنوں کا جال سا پڑ گیا۔ اس نے ایک آپریٹر کو اشارہ کیا۔ آپریٹر کی انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔ سامنے موجود چھوٹی اسکرین پر تیزی سے کچھ لکھا جانے لگا تھا۔

مائر بھی اضطرابی کیفیت میں تھی۔ چند سیکنڈ بعد آپریٹر نے مایوسی سے کہا۔

''سر! ہمارا جدید ترین اے آئی سسٹم اس گفتگو کا ترجمہ نہیں کر پارہا۔ وہ صرف یہ بتارہا ہے کہ یہ کوئی فارسی سے ملتی جلتی زبان ہے۔''

کوپر نے طیش بھرے انداز میں سیٹ کے ہتھے پر مُکا مارا۔ ''کم بخت دوہری چال چل گیا ہے۔ آواز کے پس منظر سے اندازہ ہورہا ہے کہ وہ ہیلی کاپٹر میں ہے اور اس کے ساتھی

جہاں حملہ آور ہوئے ہیں۔ خدا جانے وہ خود کس چکر میں ہے؟“

ماڑ نے فوراً کہا۔ ”ممکن ہے وہ خود ہیلی کاپٹر کے ذریعے ٹاور پر اترنے کی جدوجہد میں ہو...... یہ دوطرفہ کارروائی بھی تو ہوسکتی ہے؟“

بات کوپر کے دل کو لگی تھی۔ ”اوہ...... یقیناً، ایسا ہی ہے۔“ ساتھ ہی اس نے سنسناتے لہجے میں کہا۔ ”تم کمانڈ کروا لفٹ بلاک کروادو اور دہشت گردوں کی فریکوئنسی جام کروادو، ان کی گفتگو سننے کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔“ ساتھ ہی اس نے ایک نمبر ملا کر تیز انداز میں کہا۔

”میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ مجھے مسلح ”بلیک ہاک“ چاہیے۔ وہ بھی اسٹیلتھ ماڈل۔“

دوسری جانب سے ایک خاتون نے پُرسکون انداز میں کہا۔ ”میں کوشش کرتی ہوں۔“

”کوشش نہیں...... ہماری قومی سلامتی کی ساکھ کا معاملہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون اتار کر پھینکا اور ٹرک سے باہر آ گیا۔

ٹاور کی وسیع و عریض چھت پر...

ایک جانب ہیلی پیڈ تھا۔ مختصر دو منزلہ سرخ تخروطی چھت والی عمارت...... ایک مکمل گلاس روم اور بے حد خوب صورت سبزہ زار اور اس کے درمیان جھلملاتا نیلگوں پانی والا سوئمنگ پول جہاں تحریک تھی۔

کرنل نے مہارت سے ہیلی کاپٹر ہیلی پیڈ پر اتارا تو سادہ لباس میں ایجنٹ اس طرف پہلے ہی متوجہ تھے۔ دونوں کے کندھوں سے اوزی لٹک رہی تھیں۔ ان کی طرف دیکھتے ہوئے کرنل کی جیسے تمام تر حسیات آنکھوں میں سمٹ آئیں۔

جنرل مصطفائی سوئمنگ پول میں تھا اور اس کے ساتھ دو لڑکیاں بھی تھیں جن کے ساتھ وہ اٹھکیلیاں کر رہا تھا۔ یقیناً اسے اس بات سے بے خبر رکھا گیا تھا کہ سیکڑوں فٹ نیچے بیسمنٹ میں کیا ہو رہا ہے۔

ہیلی کاپٹر کے پروں کی رفتار کچھ کم ہوئی تو دونوں ایجنٹ اوپر چڑھ آئے۔ پائلٹ کی مانوس صورت دیکھتے ہی دونوں کے تیور کچھ ڈھیلے پڑ گئے۔ ایک نے ہوس بھری نظروں سے سارہ کو دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ دوسرے نے کہا۔

”بڑا اطلاع تمہاری آمد کیسے ہوگئی...... ابھی ڈیوڈ نے بیسمنٹ میں حملے کی اطلاع دی ہے۔ اس نے بھی تمہاری آمد کا

گمنام منزلیں

گمنام منزلوں کے مسافر... قدم قدم پر آزمائشوں سے بھری درد بھری داستان...... طاہر جاوید مغل کے قلم سے

ظالم مظلوم

ماضی کا آئینہ... با اختیار اور بے اختیار... اور عبرت آمیز واقعات زویا صفوان کے قلم سے

رمزشناس

خوف میں لپٹی پوشیدہ رازوں کی کڑیاں ملانے والے ایک رمزشناس کی دلچسپ داستان...... نازیہ کامران کاشف کی اچھوتی تحریر

جنگ باز

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم کی جادوگری

اور

مرزا امجد بیگ کی انشیوں کی سحر

آصفہ ضیا احمد، غلام قادر، عائشہ نصیر، جاوید بسام، عبوق بخاری، صائمہ دانش، محمد عثمان ذوالفقار و دیگر کی خوب صورت تحریریں

نہیں بتایا۔"
کرنل کے پاس پائلٹ کی آواز کی مشق کرنے کا ٹائم نہیں تھا مگر ایک اور حل تھا۔ اس نے اطمینان سے بیٹ کھولی۔ دوسرے ایجنٹ نے معنی خیز انداز میں کہا۔

"جنرل کے لیے نیا مال آیا ہے۔ ڈیوڈ بتانا بھول گیا ہو گا۔"

دوسرے گارڈ کی معنی خیز ہنسی حلق میں رہ گئی۔ کرنل کے پسٹل سے نکلنے والی گولیوں نے دونوں کی کھوپڑیاں توڑ دی تھیں۔

کرنل نے سیٹ سے چھلانگ لگاتے ہوئے چیخ کر کہا۔ "مجھے بیک اپ دو۔" اور پھر وہ برق کے مانند دوڑا۔ اس دوران اس نے ایک مردہ کندھے سے اوزی بھی نوچ لی۔ وہ جانتا تھا کہ گولیوں کی آواز سوئمنگ پول تک ضرور سنی گئی ہوگی۔

سوئمنگ پول تک پہنچنے سے پہلے اس نے گولی کا دھماکا سنا...... دوڑتے ہوئے اس نے سر گھمایا۔ ایک اور اوزی بردار سرخ چھت والی عمارت کے برآمدے کے پاس گرا تھا۔ سارہ اسے کور دینے میں کامیاب رہی تھی۔

جنرل مصطفائی دُبلا پتلا اور مضبوط جسم کا تھا۔ وہ مختصر سرخ نیکر میں سوئمنگ پول سے برآمد ہو چکا تھا اور اپنے کپڑوں کی طرف دوڑ گیا تھا۔ جہاں یقیناً کوئی ہتھیار موجود تھا۔ اس وقت وہ سوگنا پھرتی دکھاتا تو بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

کرنل کی لات حرکت میں آئی اور جنرل چکنے پتھروں پر پھسلتا ہوا دوبارہ سے سوئمنگ پول میں جا گرا۔

ایک کونے میں ایک، دوسرے سے لپٹی خوف زدہ تھائی لڑکیوں نے مشترکہ چیخ ماری اور زور زور سے رونے لگیں۔ کرنل نے ڈپٹ کر انہیں کہا کہ وہ خاموش رہیں۔ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔

جنرل نے پانی سے سر نکالا تو کرنل نے ماسک اتار پھینکا۔ جنرل مصطفائی پر جیسے بجلی گری تھی۔ اس کا سرخ و سفید چہرہ راکھ ہو گیا۔ اس دوران سارہ بھی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے جنرل کو قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ اس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ آتے ہی اس نے کہا۔

"سر! عمارت کلیئر ہے۔ ایک ایجنٹ تھا، وہ مارا گیا ہے۔"

"لڑکیوں کو لے جاؤ اور بیگ بھی اندر پہنچاؤ! میں جنرل صاحب کو پروٹوکول کے ساتھ لاتا ہوں۔"

سارہ نے دونوں لڑکیوں کو سوئمنگ پول سے نکالا اور ہانک کر وہاں سے لے گئی۔

"باہر آؤ گے یا یہیں مرنا پسند کرو گے؟"

کرنل کے لہجے کی سفاکی نے جنرل کو لرزا دیا۔ اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "مم...... میں آج بھی انقلاب کا داعی ہوں اور اسلامی جمہوریہ کا وفادار ہوں...... مم...... میں دشمن کی جڑوں میں گھسنے کی کامیاب کوشش کر چکا ہوں۔"

کرنل زہریلے انداز میں ہنسا۔ "باہر آ جاؤ! گھسنے میں جو کمی رہ گئی ہے، وہ، میں پوری کر دیتا ہوں۔"

جنرل کو اندازہ ہو گیا کہ بودا دعویٰ کسی کام نہیں آیا۔ موت کا فرشتہ سر پر تھا۔ اسے باہر آنا ہی پڑا۔

جنرل کو کور کرتے ہوئے کرنل نے اپنے ساتھیوں سے رابطے کی کوشش کی تو ناکامی ہوئی۔ کرنل کو اندازہ ہو گیا کہ دشمن نے فریکوئنسی جام کر دی ہے۔ اس کے ساتھی موت کے منہ میں تھے۔ اس نے جلدی سے جنرل کے ہاتھ پاؤں باندھے۔ اس دوران میں سارہ نے دونوں لڑکیوں کو ایک باتھ روم میں بند کر دیا تھا۔ سارہ کو جنرل کے سر پر تعینات کر کے وہ لفٹ کی طرف دوڑا اور اگلے چند منٹوں میں یہ روح فرسا انکشاف ہوا کہ لفٹ بلاک کر دی گئی ہے۔ اس کے سینے میں زہریلا دھواں بھر گیا اور واپس آ کر وہ بھوکے درندے کے مانند جنرل پر ٹوٹ پڑا۔

غداروں کے لیے بنائی اس جنت میں جنرل کی چیخیں گونج اٹھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے سر، منہ سے خون جاری ہو گیا۔ کرنل نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان بیدردی سے ٹھوکریں ماریں تو وہ بلبلا کر معافیاں مانگنے لگا۔

کرنل نے اسے جھنجوڑا۔ "کیوں کیا تو نے ایسا؟ تو ہیرو تھا ہمارا...... لاکھوں لوگ تجھے سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بتا اپنے ہی ساتھیوں کا خون کیوں بیچا تو نے...... بتا؟"

"وہ مجھے...... ب...... بلیک...... میل کر رہے تھے۔"

یہ کہتے ہوئے جنرل نے خون تھوکا تو کرنل نے پھر ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔

"جب دشمن پوتیوں کی عمر کی لڑکیاں پیش کرے گا اور تو منہ کالا کرے گا تو انہوں نے بلیک میل تو کرنا ہی ہے۔"

جنرل چیختے ہوئے بن پانی کی مچھلی کے مانند تڑپنے لگا۔

کرنل نے خود پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔ "مان لیتے ہیں تو بلیک میل ہو رہا تھا مگر تو نے مجلس شوریٰ کے پاس پیش ہو کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کیوں نہیں کیا؟"

جواب میں جنرل صرف خون تھوکتا رہا۔

کرنل نے زہرخند انداز میں خود ہی جواب دیا۔ "کیونکہ اس بوڑھے جسم میں ہوس کا پجاری رہتا ہے۔ جس کی نوخیز جسموں کے ساتھ کھیلنے کی ہوس روز بروز بڑھ رہی تھی۔ بتا

Digest Novels .com

"ایسا ہی ہے یا نہیں ہے؟" اس کے ساتھ ہی ایک زوردار ٹھوکر نے جنرل کے وجود کو نئے سرے سے لرزا دیا۔ وہ چیخنے اور رحم کی بھیک مانگنے لگا۔ یہ آوازیں... کرنل کے وجود میں بھڑکتی آگ کو... ٹھنڈا کر رہی تھیں جبکہ سارہ دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔

کرنل نے ایک اسٹور سے طویل رسا نکال کر جنرل کی گردن میں پھندا بنا کر ڈالا تو اس کی آنکھوں میں موت کی زردی نمایاں تر ہوگئی۔

"بہتر تھا کہ ملک سے فرار نہ ہوتے اور وہیں پھانسی پر جھول جاتے...... خیر تیری قسمت میں اس ٹاور سے لٹکنا لکھا ہوا تھا تو کیسے ٹل سکتا تھا۔"

اسی لمحے جنرل کے اعصاب جواب دے گئے اور اس کا بول و براز خارج ہوگیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ یہی وقت تھا جب ایک طاقتور ہیلی کاپٹر کی گھن گرج سنائی دی۔ جدید ساخت کا فوجی ہیلی کاپٹر نیچے سے بلند ہوکر سامنے منڈلانے لگا تھا۔ اس کی مشین گن کی نوزل اور سرخ قمقموں والے تباہ کن راکٹس کا نظارہ لرزا خیز تھا۔

کھڑکی سے ہیلی کاپٹر کو دیکھتے ہوئے کرنل نے کہا۔ "RL70 نکالو اور پیراشوٹ باندھ لو۔ زمین سے دو سو فٹ بلندی پر پیراشوٹ کھولنا۔"

سارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور ساتھ لائے بیگ کھولنے لگی۔

☆☆☆

ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے ساتھ کوپر تھا۔ اس نے اپنے کمانڈ سینٹر سے کہا کہ دہشت گردوں کی جام فریکوئنسی کو کاٹ کر کے صرف کرنل کے ساتھ اس کا رابطہ جوڑ دیا جائے۔ اس کی ہدایت پر فوراً عمل ہوا۔ کچھ دیر بعد آپریٹر نے کہا۔

"اب آپ بات کرسکتے ہیں۔"

کوپر نے مکمل برتری کے احساس کے ساتھ کہا۔ "کیسے ہو کرنل! تم نے امریکی سرزمین پر ہمیں خوش آمدید کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔"

کرنل نے طویل سانس لے کر کہا۔ "تم یہ حسرت اب پوری کرلو، کون ہو تم؟"

"کوپر...... ایف بی آئی سے۔ تم جانتے تو ہو ہم دشمنوں کو ویلکم ٹو دی ہیل کہنے کے لیے مشہور ہیں۔"

کرنل نے آخری فقرے پر دھیان دیے بغیر کہا۔ "اوہ...... کوپر نائر! ایف بی آئی کا ٹاپ ایجنٹ۔ اچھا لگا تمہاری قابلیت دیکھ کر۔"

کوپر نے کہا۔ "کرنل! تم گھیرے جاچکے ہو۔ بیسمنٹ میں تمہارے ساتھی مارے جاچکے ہیں۔ بہتر ہے خود کو ہمارے حوالے کردو۔"

"کیوں نہیں...... ابھی لو......" یہ کہتے ہوئے کرنل نے اینگل آئی کے ساتھ آنکھ لگائی اور اگلے چند لمحے اس کے لیے حیرت انگیز ثابت ہوئے۔ موثر رینج میں ہونے کے باوجود سسٹم نشانے کو انگیج نہیں کر رہا تھا۔ اینگل آئی میں نشانہ گرین کا گرین ہی تھا۔ اپنے تمام ساتھیوں کی ہلاکت کو اس نے محض کوپر کی جانب سے مورال ڈاؤن کرنے کی کوشش سمجھا تھا۔

کرنل کی جانب سے خاموشی طویل ہوئی تو کوپر کی ہنسی اُبھری۔ "اوہ...... غالباً تم RL70 مجھ پر آزمانے کی کوشش میں ہو...... یہاں تمہیں ناکامی ہوگی کرنل، یہ ہماری برتر ٹیکنالوجی کا شاہکار ہے۔ تم گرفتاری دیتے ہو یا میں فورس اتاروں؟"

کرنل نے مائیک اتار کر دور پھینکا اور اوزی سارہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کچھ ہدایت دی۔ دروازے کے قریب مردہ پڑے تیسرے ایجنٹ کی اوزی اس نے خود کھینچ لی۔

پیراشوٹ کی ڈوریاں وغیرہ چیک کرنے کے بعد دونوں نے بیک وقت بلیک ہاک پر فائرنگ کردی۔ گولیوں کی بوچھاڑ سامنے بلٹ پروف کیبن پر پڑی تو پائلٹ ہیلی کاپٹر کو اوپر اٹھالے گیا اور یہی کرنل چاہتا تھا۔ دونوں باہر کی طرف دوڑے۔ کرنل بیدردی سے جنرل کو رستے کے ساتھ کھینچ رہا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے سارہ نے ریلنگ سے چھلانگ لگا دی۔ بلیک ہاک کے غوطہ لگا کر دوبارہ پوزیشن لینے تک کرنل نے رستے کا ایک سرا ریلنگ سے باندھ لیا اور گندگی میں لتھڑے مصطفائی کو اٹھا کر نیچے پھینک دیا۔ لمحوں میں ہی ایک جھٹکے کے ساتھ رسا تن گیا اور جنرل مصطفائی سیکڑوں فٹ بلندی پر گردن کے سہارے جھولنے لگا۔ تھوڑی دیر میں یہ منظر دنیا بھر کی ٹی وی اسکرینوں پر نظر آنے والا تھا۔

ہیلی کاپٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کرنل نے ہاتھ ہلایا اور پھر نیچے چھلانگ لگادی۔

کوپر کے لیے یہی متوقع آخری اقدام تھا۔ بلیک ہاک ان دونوں کے تعاقب میں جھپٹا۔ کوپر کی سفاک آواز اُبھری۔

"دونوں کو اُڑا دو!"

پائلٹ نے جواب دیا۔ "سر! دونوں کی رفتار بہت تیز ہے۔ ہیلی کاپٹر اتنی رفتار سے نیچے جائے گا تو کریش ہوجائے

Digest Novels .com

ہے۔ ان کے پیراشوٹ کھلتے ہی آسانی کے ساتھ نشانہ بنالوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' کوپر کی نظریں نیچے تھیں۔ وہ دونوں وزنی پتھر کے مانند نیچے گر رہے تھے اور بلیک ہاک چکراتے ہوئے اپنی بلندی کم کر رہا تھا۔

سب سے پہلے سارہ نے پیراشوٹ کھولا۔

دائرے میں گھومتے ہوئے بلیک ہاک کی مشین گنز گرجیں اور وہ پیراشوٹ سمیت چھلنی ہوگئی۔

کرنل بدستور نیچے گر رہا تھا۔ تیز ہوا اسے دریائے ہڈسن کی طرف دھکیل رہی تھی۔ اس موقع پر پائلٹ نے کہا۔

''یہ شخص پاگل ہے...... زمین سے اس کا فاصلہ بمشکل سوفٹ رہ گیا ہے...... یہ ویسے ہی مارا جائے گا۔''

کوپر نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے کہا۔

''اس پر فائر کرو!''

پائلٹ نے تعمیل کی مگر اتنے برق رفتار ٹارگٹ کو نشانہ بنانا آسان نہیں تھا۔ فضا میں گولیوں کی گھن گرج ابھری۔ اس دوران کرنل ہڈسن پر پہنچ چکا تھا۔

بلیک ہاک کے پائلٹ نے تیزی سے بلندی کم کرنے کی کوشش کی تو ہیلی پر ریڈ اسپائنگ ہونے لگی۔ پائلٹ نے بمشکل توازن درست کیا۔ عین یہی لمحہ تھا جب کرنل کا پیراشوٹ کھلا۔

کوپر چلایا۔ ''اس کا پیراشوٹ کھل گیا ہے۔''

جیسے ہی بلیک ہاک نے پوزیشن میں آتے ہوئے فائر کھولا اسی لمحے کرنل نے خود کو پیراشوٹ سے آزاد کر دیا۔ پیراشوٹ چھلنی ہو گیا مگر وہ ہڈسن میں جا گرا تھا۔

کوپر کا چہرہ مسخ سا ہو گیا۔ اس نے فوراً موٹر بوٹس منگوانے کے لیے کال کی اور چیخ کر پائلٹ سے کہا۔

''اپنا سارا لوڈ وہاں گرا دو جہاں وہ کم بخت گرا ہے۔''

بلندی مزید کم کرنے کے بعد پائلٹ نے تعمیل کی۔ ہڈسن پر آگ و آہن کی بارش ہونے لگی تھی۔ موٹر بوٹس کے آنے تک کوپر کو یقین ہو گیا کہ اب کرنل کمال کے چیتھڑے بھی نہیں ملیں گے۔

تھوڑی دیر بعد وہ میڈیا کے سامنے وکٹری کا نشان بنا رہا تھا اور جنرل مصطفائی کی جھولتی لاش دیکھنے کے بعد ایران میں جشن کا سماں تھا۔

☆☆☆

کیری گوریان کی کیفیت بدستور وہی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ بے آواز طریقے سے کھلا اور ایک بوڑھا لاٹھی کے سہارے اندر داخل ہوا۔ اسپتال والوں کے ریکارڈ کے مطابق وہ کیری کا گرینڈ فادر تھا۔

بوڑھے نے پھولوں کا بکے کیری کے پاس رکھتے ہوئے جھک کر اس کی پیشانی چومی۔ کیری کے وجود میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ بوڑھا اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ بوڑھے نے اس پر جھکتے ہوئے نرم آواز میں کہا۔

''تمہارے باپ کو تمہارے سامنے قتل کرنے کا میرے دل پر بوجھ سا ہے بچے۔ وہ بے شک ہمارے معصوم بچوں کا قاتل ہے مگر ہم ازل سے ہی مظلوم رہے ہیں۔ تمہارا معصوم دل دکھا...... اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔''

کیری کا خوف قدرے کم ہو گیا۔ بوڑھے نے مزید کہا۔

''تمہارے سامنے پوری زندگی پڑی ہے۔ کوشش کرنا باپ کی پیروی نہ کرنی پڑے تمہیں۔ سبھی کو اپنے انداز میں جینے کا پورا پورا حق ہے۔ جب آپ اس حق کو غصب کرتے ہیں تو پھر ایسے ہی کوئی اچانک سے نمودار ہو کر آپ سے بھی جینے کا حق چھین لیتا ہے۔'' بوڑھے نے اس کے گال تھپتھپائے تو کیری کو محسوس ہوا جیسے اس کے وجود کی توانائی لوٹ رہی ہے۔

بوڑھے کی فسوں انگیز آواز ابھری۔ ''سبھی انسان ایک جیسے ہیں۔ برتری کا احساس ایک خناس سے بڑھ کے کچھ نہیں ہے۔ سبھی کے لہو کا رنگ سرخ ہی ہے اور یہ سرخی ایسی ہے کہ بہاؤ گے تو اسے بہتا بھی دیکھو گے اور اپنے وجود سے بہتا دیکھو گے...... اس لیے بچے یاد رکھنا زندگی ''جیو اور جینے دو'' کا نام ہے۔''

بوڑھے کا ہاتھ اس کے سر پر آیا۔ ''میری بات یاد رکھو گی نا؟''

کیری نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔ آج کتنے دنوں بعد اس کے وجود نے حرکت کی تھی۔

''شاباش بچے، میں اب چلتا ہوں۔'' بوڑھے نے پھول اٹھا کر کیری کے سینے پر رکھے جنہیں اس نے تھام لیا۔

بوڑھا لاٹھی ٹیکتے ہوئے آہستہ آہستہ کمرے سے رخصت ہو گیا۔

کیری پھولوں کو سینے سے لگائے آنسو بہاتے ہوئے ارادہ باندھ رہی تھی کہ وہ آزاد ذرائع سے معلوم کرے گی کہ واقعی اس کا باپ معصوم انسانوں اور بچوں کا قاتل تھا۔ ایسا تھا تو اس نے بوڑھے شخص کو معاف کرنے کا ارادہ باندھ لیا......

❖❖❖

Digest Novels .com

پُراسرار وارث

خلیل جبار

عادتیں پختہ ہونے کے ساتھ بڑی پراسرار ہوتی ہیں... ضرورت پڑنے پر بے پائوں داخل ہو کے پرانی یادوں کو تازہ کردیتی ہیں۔ ایک ایسے ہی شوہر کی کہانی جو نشے میں دھت ہو کر بیوی پر تشدد کرنے کی عادت میں مبتلا تھا...

دولت اور نشے کی لت میں گرفتار میاں بیوی کا پُراسرار معاملہ

فلپ کے سیڑھیوں سے گرنے پر اس کے سر پر گہری چوٹ آئی تھی، جس سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی، جب وہ سیڑھیوں سے گرا تو بے تحاشا نشے میں تھا...... یہ بات میڈیکل رپورٹ سے ثابت ہو چکی تھی۔ پولیس کا خیال تھا

digest library.com

کہ فلپ کی کسی سے دشمنی ہوگی اور اس نے فلپ کے نشے میں ہونے کا فائدہ اٹھا کر اسے سیڑھیوں سے دھکا دے دیا۔

آج بھی تفتیشی افسر فلپ کی بیوی ایریل سے تفتیش کرنے آیا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ وہ ایریل سے فلپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔

''اپنے ذہن پر زور دو، فلپ نے کبھی ایسے کسی دوست کا ذکر کیا ہو کہ جس سے اس کی تلخ کلامی ہوئی ہو؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔

''پولیس فلپ کی موت کو حادثہ ماننے کو تیار نہیں ہے، پولیس کو شک ہے کہ فلپ کو قتل کیا گیا ہے۔''

''پولیس کا کام ہی شک کرنا ہے۔'' ایریل نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ پولیس اس نوعیت کے معاملات میں شک کرتی ہے، بعض اوقات شک کرنے کا فائدہ بھی ہوتا ہے اور پولیس اصل ملزم تک پہنچ بھی جاتی ہے۔'' تفتیشی افسر تھامس نے کہا۔

''اس بات سے میں اتفاق کروں گی۔'' ایریل نے کہا۔

''اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم پولیس سے تعاون کرو۔'' اس نے کہا۔

''فلپ کے معاملے میں ہر طرح کا تعاون کر رہی ہوں اور کرتی رہوں گی۔''

''بالکل ہم بھی یہی چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہمیں یہ پتا چل جائے کہ فلپ کا آفس یا کہیں باہر جیسے بار وغیرہ میں کسی شخص سے جھگڑا، لڑائی ہوئی ہو۔'' تھامس نے کہا۔

''فلپ کو زیادہ دوست بنانا پسند نہیں تھا، اس لیے چند لوگ ہی اس کے دوست ہیں جن کے بارے میں بتا چکی ہوں۔''

''میں اُن سے مل چکا ہوں لیکن ان سے بات چیت کرنے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکا۔ آفس میں کام کرنے والوں سے فلپ کے حوالے سے کوئی ایسا پوائنٹ نہیں ملا کہ یہ بات ثابت ہو کہ فلپ کی کسی سے لڑائی ہوئی ہو یا جھگڑا ہوا ہو، میڈم ایریل ہماری اُمید تم سے ہی ہے۔''

''مجھ سے اُمید......'' ایریل چونکی۔

''ہاں تم ہی سے ہے، تم سے کیا چھپانا، پولیس ابھی تک یہ ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی کہ فلپ کو قتل کیا گیا ہے۔''

''میرا ابھی بھی خیال ہے کہ یہ حادثاتی موت ہے۔''

''یہ بات تم کیسے کہہ رہی ہو؟'' تھامس نے ایریل کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''فلپ کی بیوی ہوں اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، فلپ گھر سے باہر کہیں گرا ہوتا تو اسے قتل مان لیا جاتا، وہ گھر میں گر کر مرا ہے، اور گھر میں وہ اکیلا تھا۔''

''ہاں یہ بات تو ہے تبھی ہم تمہارے پاس بار بار آ رہے ہیں۔''

''اور میں اس بارے میں جاننے سے قاصر ہوں کہ تم میرے پاس بار بار کیوں آ رہے ہو۔''

''جانتا ہوں کہ تم قاتل کے بارے میں نہیں جانتیں لیکن مجبور ہوں کہ تفتیش کو مکمل کرنا ہے، اچھا یہ بتاؤ کہ جب فلپ سیڑھیوں سے گرا تم اس وقت کہاں تھیں؟'' تفتیشی افسر نے پوچھا۔

''میں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں اپنی سہیلی لیزا کی پارٹی میں تھی۔'' ایریل نے بتایا۔

''سوری میں بھول گیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''پولیس کی رپورٹ کیا کہتی ہے؟'' ایریل نے پوچھا۔

''ابتدائی رپورٹ کے مطابق فلپ کی موت سیڑھیوں سے گرنے سے ہوئی ہے، فلپ کی لاش کے پاس اور سیڑھیوں پر ٹوٹے کانچ کے گلاس کے ٹکڑوں کی موجودگی ظاہر کرتی ہے، گرتے وقت اس کے ہاتھ میں گلاس موجود تھا۔''

''سیڑھیوں پر سے کانچ کے گلاس کے ٹکڑے ملنا ہی تھے، فلپ کو بے تحاشا شراب پینے کی عادت تھی، وہ اس سے قبل بھی کئی بار سیڑھیوں سے گر چکا ہے۔''

''کیا اسے کبھی چوٹیں بھی آئیں؟''

''ہاں اس کا اسپتال سے علاج بھی ہوا تھا، ایک بار اس کے ہاتھ میں فریکچر بھی ہو چکا ہے۔''

''اس لیے کہ وہ نشے کی حالت میں سیڑھیوں سے اترنے میں احتیاط نہیں کرتا تھا۔'' تفتیشی افسر نے پوچھا۔

''ایسا کون سا انسان ہے، جو احتیاط نہ کرے لیکن نشے کی حالت میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو، میں تمہاری بات سے اتفاق کروں گا۔'' تفتیشی افسر نے کہا۔

''میں امید کرتی ہوں کہ اب دوبارہ مجھ سے یہ نہیں

پوچھیں گے کہ میں کہاں پر تھی۔''

''ہاں۔'' تفتیشی افسر تھامس زیرِ لب مسکرایا۔ ''بعض سوال ہم بار بار کرتے ہیں۔''

''کیوں؟''

''بعض اوقات اس کا فائدہ ہو جاتا ہے۔''

''اچھا وہ کیسے؟'' ایریل نے پوچھا۔

''عدالت میں زیرِ سماعت مقدمے میں وکلاء ملزم اور گواہوں سے کئی بار ایک ہی سوال اس لیے کرتے ہیں کہ شاید کوئی ایسی بات جو ان لوگوں نے نہیں بتائی ہو یا ان کے ذہن میں نہیں آ رہی ہو، وکلاء کے بحث کرنے سے گواہان کو یاد آجاتی ہے اور مقدمہ نیا رخ اختیار کر لیتا ہے۔''

''اکثر ایسا فلموں ڈراموں میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔'' ایریل نے کہا۔

''حقیقت میں بھی ایسا ہوتا ہے، بڑے پیچیدہ قسم کے مقدمات بہت آسانی سے سلجھ جاتے ہیں۔'' تھامس نے کہا۔

''یہ تمہارا شعبہ ہے، تم زیادہ بہتر اس بارے میں جانتے ہو۔'' ایریل نے کہا۔

تھامس سے ایریل جان چھڑانا چاہ رہی تھی مگر وہ جان چھوڑنے کو تیار نہ تھا۔

''ایک سوال اور پوچھنا چاہوں گا۔'' تھامس نے کہا۔

''اس کے بعد کوئی اور سوال نہیں کرو گے۔'' ایریل نے بیزاری سے کہا۔

''یہ تمہارے جواب پر منحصر ہے، ہوسکتا ہے کہ تم ایسا جواب دے دو، جس سے کئی اور سوالات کرنا پڑ جائیں۔''

تھامس نے ایریل کو مسکراتے ہوئے دیکھا۔ پھر پوچھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا کہ فلپ سیڑھیوں سے گر کر مر گیا ہے۔''

''یہ بھی میں بتا چکی ہوں۔'' ایریل نے کہا۔

''دوبارہ بتا دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔''

''میں جب لیزا کی تقریب سے گھر پہنچی تو میں نے فلپ کو سیڑھیوں کے پاس گرے ہوئے دیکھا، اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے، پولیس کو اس حادثے کے بارے میں بتانا ضروری تھا، اس لیے اطلاع کر دی، پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آجانے پر فلپ کی تدفین کر دی گئی۔''

''دیکھو میری باتوں کا بُرا نہیں ماننا، یہ میری پیشہ ورانہ ذمّے داری ہے کہ جب تک پولیس فلپ کی موت کے بارے میں کسی حتمی فیصلے تک نہ پہنچ جائے، اس وقت تک تفتیش جاری رہے گی۔''

''کرتے رہیں تفتیش، جب تک مطمئن نہ ہو جاؤ۔'' ایریل نے غصے سے کہا۔

''تم میری باتوں کا بُرا مان رہی ہو۔''

''نہیں تو کیا میں ہنسوں، خوش ہوں۔'' ایریل نے کہا۔

''تعاون کریں۔''

''اب تک میں تعاون ہی کر رہی ہوں۔''

''مانتا ہوں، تم شوہر کے انتقال کر جانے کے صدمے سے دوچار ہو، ایسے میں اس طرح کے سوالات کرنے سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہوگی، ہم بھی مجبور ہیں، اس مقدمے کو جلد سے جلد نمٹانا ہے۔''

''اچھی بات ہے جلدی نمٹا دیں۔'' ایریل نے کہا۔

''ہاں ایسا ہی ہوگا۔''

''فلپ نے یہ بنگلا اس لیے بنوایا تھا کہ وہ شان سے اس میں رہے گا، لیکن اسے یہ خبر نہ تھی کہ بہت جلد اس گھر میں اس کی موت واقع ہو جائے گی اور پولیس اس کی موت کو معمّا بنا دے گی۔''

''پولیس بھی تحقیقات کر کے یہی سمجھ رہی ہے کہ یہ حادثہ ہی ہے، لیکن......''

''لیکن کیا؟'' ایریل نے پوچھا۔

فلپ کے نام پر بیمہ ہے، بیمہ کمپنی چاہتی ہے کہ اس حادثے کی شفاف طریقے سے چھان بین ہو۔ بیمہ کمپنی خود بھی اس معاملے کی تحقیقات کر رہی ہے۔''

''ہاں...... میرے علم میں بھی یہ بات ہے۔'' ایریل نے کہا۔

''اب میں اجازت چاہوں گا اور کوشش کروں گا کہ دوبارہ زحمت نہ دوں۔'' تھامس نے کہا۔

''اچھا...... خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' ایریل نے کہا۔

تھامس اجازت لے کر چلا گیا۔

ایریل سے زیادہ یہ بات کون جان سکتا تھا کہ فلپ تنہائی پسند نہیں تھا، ایک رنگین مزاج قسم کا آدمی تھا۔ لوگوں سے ملنے سے کتراتا اس کی مجبوری تھا۔ شادی سے قبل وہ آفس سے آنے پر کچھ دیر آرام کرتا تھا، پھر اپنا باقی وقت عیاشی میں گزارتا۔ شراب و شباب کی محفل اپنے گھر پر ہی منانے کا عادی تھا۔ اس کی ایریل سے ملاقات ایک تقریب

Digest Novels .com

سی ہوئی۔ فلپ کے چہرے میں خاص کشش تھی، اس کشش کی وجہ سے ہی لڑکیاں اس کی طرف مائل ہو جاتی تھیں۔ ایریل بھی اس کشش سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی، اس ملاقات سے وہ ایک دوسرے کے قریب آئے اور پھر ان کی دوستی ہو گئی۔ وہ اکثر اپنی شامیں اور راتیں فلپ کے فلیٹ میں گزارنے لگی۔

ایک دن فلپ بہت خوش گوار موڈ میں تھا۔ وہ ایریل کو دیکھ کر مسکرایا، اور بولا۔

''مجھ سے شادی کرو گی ؟''

''ہاں۔ بشرطیکہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہو۔''

''شادی کرنا چاہتا ہوں، اس لیے کہہ رہا ہوں۔''

''شادی کے لیے میں بھی تیار ہوں لیکن ایک شرط کے ساتھ۔'' ایریل شوخی سے مسکرائی۔

''بولو کیا شرط ہے؟''

''مجھ سے شادی ہو جانے پر صرف میرے بن کے رہو گے۔''

''تمہارے جیسی بیوی کسی مرد کو مل جائے، پھر اسے کسی اور عورت کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔'' فلپ نے کہا۔

''سچ کہہ رہے ہو؟'' ایریل نے پوچھا۔

''بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔'' فلپ نے قہقہہ لگایا۔

فلپ سے شادی ہو جانے پر ایریل بہت خوش تھی۔

وہ بے تحاشا دولت کا مالک تھا اور یہ دولت اس نے خود نہیں کمائی تھی، ورثے میں ملی تھی۔ اس کی تنخواہ تو اتنی تھی کہ بمشکل گزارا ہی ہو سکتا تھا۔ عیاشی کرنا ناممکن تھا، لیکن ورثے میں ملنے والی دولت نے اسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ کھل کر عیاشی کر سکے۔ فلپ نے چند ماہ ایریل کو خوش رکھنے کی بھرپور کوشش کی، اور اس پر کھل کر خرچ بھی کیا۔ آہستہ، آہستہ فلپ کی اصلیت اس پر ظاہر ہونے لگی تھی، اس نے ایریل سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کا ہو کر رہے گا، وہ ہر خوب صورت کلی کا رس چوسنے کا عادی تھا، اس مقصد کے لیے وہ اب مختلف ہوٹل کے کمرے استعمال کرنے لگا تھا۔

ایک رات وہ نشے میں دھت گھر دیر سے آیا۔ ایریل نے جب دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو غصے سے بھڑک اٹھا اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ جب وہ ایریل پر اچھی طرح سے تشدد کر چکا تو اس کے چہرے پر اطمینان و سکون کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

''تم نے مجھے کیوں مارا ہے؟'' ایریل غصے سے بولی۔

فلپ زور، زور سے ہنسنے لگا۔

''بہت کوشش کی میں نے کہ اپنی عادت پر قابو رکھوں، لیکن آج اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا۔'' وہ بولا۔

''جب فل نشے میں ہوتا ہوں، اس وقت جو عورت میرے سامنے ہو اسے بُری طرح تشدد کا نشانہ بناتا ہوں، میں نے کئی شادیاں کی ہیں، لیکن اس عادت کی وجہ سے ناکامی سے دوچار ہو چکی ہیں۔''

''تمہیں ایسا کر کے کیا ملتا ہے؟'' ایریل نے پوچھا۔

''بہت تسکین ملتی ہے، اسی لیے ایسا کرتا ہوں۔'' فلپ نے کہا۔

''تمہاری کئی شادی اس عادت کی وجہ سے ناکام ہو چکی ہیں تو، پھر اس عادت کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟''

''جس طرح ورثے میں دولت ملی ہے، اسی طرح یہ عادت بھی ورثے میں ملی ہے۔''

''تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی؟''

وہ اس کی بات پر زور، زور سے ہنسنے لگا اور پھر خاموش ہو گیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت آ گئی۔

''جانتی ہو میں ایسا کیوں کرتا ہوں؟''

''نہیں معلوم تبھی تو پوچھ رہی ہوں۔''

''میرے باپ جولیس کو بھی یہی بیماری تھی۔''

''بیماری!'' ایریل چونکی۔

''ہاں، میں اسے بیماری ہی کہوں گا۔''

''ٹھیک ہے جو بھی ہے تمہیں یہ عادت کیسے پڑ گئی ؟''

''میرا باپ نشے میں دھت ہو جانے پر میری ماں ایلسا پر تشدد کرنے لگتا تھا۔''

''تمہاری ماں نے اس سے جان کیوں نہیں چھڑائی ؟''

''میری ماں بچپن سے ہی میرے باپ کو پسند کرتی تھی، وہ ایک ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے، اس لیے میری ماں میرے باپ سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی۔ میرے باپ میں ایک عادت اور تھی۔''

''وہ کیا تھی؟'' ایریل نے پوچھا۔

''نشہ اتر جانے پر وہ ماں سے معافی مانگ لیتا اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا یقین بھی دلاتا۔ میری ماں اتنی بھولی تھی وہ باپ کے معافی مانگ لینے پر خوش ہو جاتی.....''

''واقعی بہت بھولی خاتون تھی۔''

DigestNovels.com

''جب میں 16 سال کا ہوا، ایک دن ایسا سانحہ ہوا کہ وہ منظر میں آج تک نہیں بھول پایا۔''

''ایسا کیا ہوا، جو تم آج تک نہیں بھول پائے؟'' ایریل نے پوچھا۔

''اس دن ابا بار سے نشہ کر کے آئے تھے۔ جگہ جگہ سے کپڑے بھی پھٹے ہوئے تھے، بار میں کسی سے ابا کا جھگڑا ہو گیا تھا، جس سے جھگڑا ہوا اس نے ابا کو خوب پیٹا، ابا اس کے مقابلے میں کمزور تھے، اس لیے بار سے جب پٹ کر گھر آئے بہت غصے میں تھے، آتے ہی وہ مزید شراب پینے لگے۔''

''اتنی شراب پی کر آئے ہو پھر...اور شراب پی رہے ہو۔'' میری ماں نے کہا۔

ماں کا یہ کہنا تھا کہ وہ سخت غصے میں آ گئے اور پھر میری ماں کی پٹائی شروع کر دی۔ کچھ دیر ماں پٹتی رہیں، پھر نہ جانے انہیں کیا ہوا، وہ بھی غصے میں آ گئیں اور وہ غصے سے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ابا بھی انہیں مارنے کو ان کی طرف لپکے۔ ابا جب کمرے میں گئے ماں نے ان کا ریوالور نکال لیا۔ ان کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھ کر ابا غصے سے بولے۔

''اس ریوالور کو پھینک دو ورنہ تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔''

''میرے نزدیک مت آنا، ورنہ گولی چلا دوں گی۔'' وہ بولیں۔

''ابا کو ماں پر تشدد کرنے کی عادت تھی، اس لیے وہ ان سے ریوالور چھین لینا چاہتے تھے، اس چھینا جھپٹی میں گولی چل گئی۔ گولی سیدھی ابا کے دل کے مقام پر لگ گئی اور وہ موقع پر ہلاک ہو گئے۔ وہ ابا کو قتل کرنا نہیں چاہتی تھیں، صرف ڈرا کر تشدد کرنے سے روک دینا چاہتی تھیں۔ عدالت میں ان پر یہ ثابت ہو جانے پر کہ انہوں نے ابا کو قتل کیا ہے، انہیں عمر قید کی سزا ہو گئی، وہ جیل میں تین سال ہی رہیں، اور جیل میں ہی میں ان کا انتقال ہو گیا، ابا کی ساری جائداد میرے حصے میں آ گئی اور اب میں اس دولت پر عیش کر رہا ہوں۔'' فلپ نے بتایا۔

اس دن کے بعد سے فلپ نے ایریل پر تشدد کرنا معمول بنا لیا، اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فلپ باز آ جائے، لیکن وہ باز آنے والوں میں سے نہیں تھا۔

ایریل کی زندگی فلپ سے شادی کر کے اب بے رنگ سی ہو گئی تھی۔ وہ.... خود کو کوستی رہتی تھی کہ اس نے ڈیوڈ کو چھوڑ کر بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔ وہ جس آفس میں کام کرتی تھی اس میں ڈیوڈ بھی ملازمت کرتا تھا وہ ڈیوڈ کو پسند کرتی تھی لیکن فلپ کے اس کی زندگی میں آ جانے پر اس نے ڈیوڈ کو کھو دیا تھا۔ اس کا.... اسے شدت سے احساس ہونے لگا تھا، لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک دن ایریل کی سہیلی لیزا کے گھر پر تقریب تھی جس میں ایریل کی ڈیوڈ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔

''تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

''کیا کروں؟''

''ارے بھئی کیا کروں سے تمہاری کیا مراد ہے، تم ابھی جوان ہو، لیکن تم نے خود پر بڑھاپا طاری کر لیا ہے، کیا فلپ تمہیں خوش نہیں رکھتا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں ایسا ہی ہے، وہ مجھ سے بہت بُرا سلوک کرتا ہے، اس پر جب نشہ چڑھ جاتا ہے تو مجھ پر تشدد کرنے لگتا ہے۔''

''تشدد کرنے کی کوئی وجہ بھی ہوگی؟''

''اس کا باپ بھی اپنی بیوی کے ساتھ ایسا ہی کرتا تھا وہ جب شراب زیادہ پی جاتا تو اپنی بیوی پر تشدد شروع کر دیتا تھا۔''

''بیٹا بھی باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا ہے۔''

''ہاں ایسا ہی ہے۔''

''کیا تم نے کوئی ایسا معاہدہ کیا ہوا ہے جو اس کے بُرے سلوک پر طلاق نہیں لے رہی ہو؟'' ڈیوڈ نے پوچھا۔

''معاہدے کی رو سے فلپ سے طلاق لینے پر مجھے فلپ کی طرف سے پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔''

''تم نے ایسا بیکار معاہدہ کیوں کیا؟''

''مجھے اس کی اصلیت کا علم نہیں تھا۔''

''اگر شادی سے پہلے اصلیت کا علم ہو جاتا تو کیا کرتیں؟''

''شادی نہیں کرتی۔'' ایریل نے کہا۔

''جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اب مستقبل میں کیا ارادے ہیں؟''

''کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''تم کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتیں؟''

''اس سے کیا ہوگا؟''

''فلپ کے ساتھ رہنے میں جو گھٹن ہوتی ہے اس سے کچھ دیر کو نجات مل جائے گی۔''

Digest Novels .com

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اس طرح دن کا کچھ حصہ اچھا گزر جائے گا۔''

''جہاں میں کام کرتا ہوں، وہاں ایک آسامی خالی ہے تم کہو تو بات کروں؟''

''ہاں۔'' ایریل نے اثبات میں گردن ہلائی۔

جب ایریل نے فلپ سے نوکری کرنے کی بات کی تو فلپ نے پہلے احتجاج کیا، پھر وہ مان گیا۔ اس طرح آفس میں نوکری کرنے سے ڈیوڈ سے اس کی روزانہ ملاقاتیں ہونے لگی۔ وہ ڈیوڈ کی ماتحت تھی۔ ڈیوڈ کا جب دل کرتا ہے اسے اپنے کمرے میں بلا لیتا، کمرے میں کام کی باتیں کم اور آپس کی باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اب اس میں دوبارہ سے اچھی زندگی گزارنے کی امنگ پیدا ہوئی اور اس نے اپنے بارے سوچنا شروع کر دیا کہ وہ فلپ سے نجات حاصل کر کے اپنی نئی زندگی کا آغاز کرے۔ فلپ کے اچانک مرجانے سے اب وہ آزاد تھی، اور اس کی دولت کی بھی مالک بن گئی تھی۔ اسے پولیس کی طرف سے فلپ کے مقدمے کی فائل بند ہونے کا انتظار تھا، تاکہ فلپ کی دولت پر عیش کرنے کے ساتھ کسی اچھے ساتھی کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اور وہ دن بھی آگیا جب اسے پولیس کی طرف سے کال آگئی۔ وہ اس وقت گھر پر ہی تھی۔

''مسز فلپ میں تفتیشی افسر تھامس بات کر رہا ہوں۔''

''جی فرمایئے، آپ اب کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟''

''مجھے کچھ نہیں پوچھنا، صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم نے فلپ کے مقدمے کی فائل بند کر دی ہے۔''

''کیوں؟'' ایریل نے پوچھا۔

''ہم نے ہر طریقے سے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ فلپ کو قتل تو نہیں کیا گیا، لیکن پولیس یہ سراغ لگانے میں ناکام رہی ہے اور ہم نے فلپ کی موت کو کہ وہ ایک حادثہ تھا قرار دے کر اس مقدمے کی فائل بند کر دی ہے۔'' تفتیشی افسر تھامس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ایریل نے کہا۔

فلپ کے مقدمے کی فائل بند ہو جانے کا سن کر اس کے چہرے پر ایک زہریلی مسکراہٹ آگئی۔ فلپ سے اس طرح جان چھڑانا کہ وہ مر بھی جائے اور اس کی دولت بھی اس کے پاس آجائے، یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ ایریل نے ایک پلان ترتیب دیا، اگر وہ اس میں ناکام ہو جاتی تو ساری زندگی اسے جیل میں گزارنا پڑ جاتی، لیکن اس کی قسمت اچھی تھی، اس کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اس منصوبے میں اس نے ڈیوڈ کو بھی شامل نہیں کیا تھا، وہ کسی کو بھی اس منصوبے میں شریک نہیں کرنا چاہتی تھی، ورنہ دولت کے لالچ میں اس راز کو جان جانے والا بھی اسے بلیک میل کر سکتا تھا۔

اس کی سہیلی لیزا کی سالگرہ کی تقریب ایک بڑے ہوٹل میں رکھی گئی تھی، منصوبے کے تحت وہ سالگرہ کی تقریب میں شریک ہوئی، لوگوں کو اپنی صورت دکھا کر گھر آگئی۔ فلپ نے کسی دوشیزہ کو ایک ہوٹل کے کمرے میں عیاشی کے لیے مدعو کیا تھا اس لیے وہ ہوٹل جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ دوشیزہ سے ملاقات کی خوشی میں وہ کئی پیگ شراب کے چڑھا چکا تھا، اور باہر جانے کو اٹھ کھڑا ہوا۔ اس سے قبل ایریل سیڑھیوں پر پانی پھینک چکی تھی، فلپ نے جیسے ہی سیڑھیوں پر قدم رکھے، سیڑھیوں پر پانی دیکھ کر فلپ کو ایریل پر سخت غصہ آگیا، لیکن اسے دوشیزہ سے ملنے کی جلدی تھی اس لیے وہ ایریل کو برا بھلا کہتا ہوا، تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا، پانی سیڑھیوں پر پڑا ہونے سے فلپ کے قدم ڈگمگائے، اس موقع کا ایریل نے فائدہ اٹھایا، اور فلپ کو پیچھے سے دھکا دے دیا۔ اس نے سنبھلنے کی کوشش کی، لیکن ناکام رہا، فلپ سیڑھیوں سے گرتا ہوا نیچے چلا گیا، زمین پر گرنے پر فلپ کے سر میں شدید چوٹ آئی تھی، اس لیے موقع پر ہی دم توڑ گیا۔ ایریل نے اپنے ہاتھوں پر پلاسٹک کے دستانے پہنے ہوئے تھے، وہ کوئی رسک لینے کو تیار نہ تھی اس لیے ایسا کیا۔ فلپ نے جس گلاس میں شراب پی تھی وہ گلاس سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ سے اس طرح چھوڑا کہ کانچ کے کچھ ٹکڑے سیڑھیوں پر اور کچھ ٹکڑے زمین پر جا کر گرے۔ وہ تیزی سے نیچے آئی، اور اچھی طرح سے دیکھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا، جب اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ وہ مر چکا ہے، ایریل دوبارہ سالگرہ کی تقریب میں شریک ہونے چلی گئی، جب تقریب سے لوٹی، اس نے سب سے پہلے پولیس کو اطلاع کر دی۔ پولیس نے اپنی کارروائی مکمل کی، اور تحقیقات شروع کر دیں۔ ایریل کا منصوبہ کامیاب رہا، اور پولیس اس قتل کے مقدمے کو قتل کا مقدمہ ثابت کرنے میں ناکام رہی۔۔۔۔ اس طرح ایریل۔۔۔ فلپ سے جان چھوٹ جانے کے ساتھ ساتھ اس کی ساری دولت کی مالک بھی بن گئی تھی۔

❖❖❖

سُرخ گلاب

بشریٰ امجد

تصور میں جو کچھ ہم سوچتے ہیں جب وہ حقیقت کا روپ دھارتا ہے تو اس میں کافی تغیر آچکا ہوتا ہے... ایک منجھے ہوئے رائٹر کی کہانی... اس کی سوچ تھی کہ وہ بہترین اسکرپٹ رائٹر ہے...

خوشبو بکھیرتے سُرخ گلابوں کا حیرت انگیز کمال......

جیرالڈ نے خط کو پڑھا اور مٹھی میں مسل کر گیندی بنا کر اسے آتش دان میں اُچھال دیا۔

''پانچ سو پاؤنڈز اور تم...... [illegible]''

[illegible] ...... اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''پانچ پاؤنڈز بھی نہیں ملیں گے۔'' وہ بڑبڑایا۔

اس نے کہہ تو دیا لیکن وہ سچائی سے باخبر تھا۔ ہیکٹ تین دن سے زیادہ انتظار نہیں کرے گا۔ اگر اس کا مطالبہ تین دن میں پورا نہ کیا گیا تو وہ زہریلے سانپ کے مانند حملہ آور ہوگا۔

جیرالڈ ساکت [illegible] کو راکھ میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ وہ پینتیس سالہ شائستہ شخص تھا، سر کے بال سیاہ تھے اور آنکھیں نیلی تھیں۔

آہستہ آہستہ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ آنکھوں میں ایک نئی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کش لگا کر دھواں ہوا میں پھینکا۔ اس بحران سے وہ اس مرتبہ کسی اور طرح نمٹے گا۔ کوئی منصوبہ اپنانا پڑے گا۔ اس

نے گہرا سانس لیا اور سرگوشی کی۔
"مرڈر!" جیرالڈ کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ کرسی پر اپنی رائٹنگ ٹیبل کے قریب بیٹھ گیا جہاں وہ مختصر کہانیاں اور مرڈر مسٹریز لکھتا تھا۔
پہلے اس نے بلیک میلر کے پیغام کا جواب لکھ کر لفافے میں ڈالا اور لفافہ جیب میں...... پھر وہ پُراعتماد انداز میں مسکراتا ہوا کھڑا ہوا۔ اس نے دروازے کی سمت قدم اٹھائے تھے کہ اچانک ایک آواز نے اس کے قدم پکڑ لیے۔ اس کی پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ وہ تیزی سے کھڑکی پر آیا اور باہر نظر ڈالی۔
ایک قدرے موٹی گھریلو عورت گھاس کے قطعات کے درمیان سرخ اینٹوں کے راستے پر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے گول چہرے پر قدرتی مسرت اس کی خوش کہ فطرت کی آئینہ دار تھی۔ اس کے سر پر اُسی کے ہاتھ کا بنایا ہوا ہیٹ تھا جس کے عقب میں ایک پَر لگا ہوا تھا۔
جیرالڈ کا منہ بن گیا۔ وہ ناراضی کے ساتھ دروازے پر گیا اور اسے جھٹکے سے کھولا۔
"او...... اوہ...... تو...... تم نے مجھے ڈرا دیا۔" مسز پلینکٹ نے ماؤں والا پُرشفقت انداز اپنایا۔ اس کے ہاتھوں میں گلاب کے پھول تھے۔ "کیا مجھے اندر نہیں آنے دو گے؟"
"مسز پلینکٹ! تم نے مجھے گو ہراساں کر دیا ہے۔ مجھے کافی کام نمٹانا ہے، گڈ نائٹ۔" جیرالڈ نے دروازہ بند کرنے کے لیے قدم پیچھے ہٹائے۔
مسز پلینکٹ کے لیے جیرالڈ کی سرد مہری غیر متوقع تھی تاہم وہ بھی مستقل مزاج تھیں۔ "ڈیئر! میں معذرت خواہ ہوں لیکن تم تو گلابوں کے عاشق ہو۔ تم اپنا کام کرو، میں گلاب میز پر رکھ دیتی ہوں۔ گلابوں کی موجودگی میں تمہارا کام مزید نکھرے گا۔ آج تھوڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ وہ باغبان وولی ہے نا...... اس نے......"
"پلیز، مسز پلینکٹ ...... کہ تم میرے کام میں مخل ہوئی ہو۔" جیرالڈ کو غصہ آ گیا۔ "مجھے کام کرنا ہے اور دیر تک کرنا ہے۔ شاید ساری رات لکھنا پڑے۔"
"میں گلاب رکھ کر فوراً چلی جاؤں گی لیکن گلاب جو ہیں......"
"اوہ گاڈ! ہاں گلاب بہت پیارے ہیں۔" جیرالڈ جھلا گیا۔ "رکھ کر چلی جاؤ، جو کہنا ہے وہ کل بتا دینا۔"
مسز پلینکٹ نے منہ کھولا اور بند کر لیا۔ گلاب، لکھنے کی میز پر رکھ کر واپس چلی گئیں۔

☆☆☆

جیرالڈ نے حلیہ بدلا، پرانا کوٹ پہنا، سر پر ٹوپی اور ہاتھوں پر دستانے چڑھائے، پیروں میں بوٹ جو اس نے استعمال کرنا ترک کر دیے تھے پھر وہ واپس اپنی اسٹڈی میں آیا، کھڑکی کے پردے برابر کیے، لکھنے کی میز پر لیمپ روشن کیا اور جانے کے لیے قدم بڑھائے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر وہ پلٹا اور ناقدانہ انداز میں کمرے کا جائزہ لیا۔ آخر میں نگاہ سرخ گلابوں پر ٹھہر گئی۔ گلاب مسز پلینکٹ شیشے کے شفاف گلدان میں رکھ گئی تھیں۔ گلابوں کا بالائی حصہ گلدان سے باہر تھا۔
"وہ ٹھیک کہہ رہی تھیں۔" جیرالڈ بڑبڑایا۔ "خوبصورت پھول اور پیارا رنگ۔"
باہر نکل کر وہ مکان کے عقبی حصے میں آیا اور خاموشی کے ساتھ بیک سائڈ سے باہر آ کر سائڈ واک پر چلنے لگا۔
چلتے چلتے دھیان مسز پلینکٹ کی طرف چلا گیا۔ وہ عموماً خاموشی سے گلاب رکھ کر چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ فطرتاً خوش مزاج اور باتونی تھیں۔ آج پتا نہیں کیا کہنا چاہتی تھیں جبکہ جیرالڈ کا دھیان اپنے منصوبے پر تھا اور پہلی مرتبہ مسز پلینکٹ کی آمد اسے گراں گزری تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پھول دینے وہ سپرنٹنڈنٹ جارڈن کے گھر بھی جاتی ہیں جس کا گھر کینس فورڈ ہیتھ میں تھا اور مسز جارڈن خود بھی باتونی تھیں۔ ہر قسم کی خبر اور افواہ سننا گویا مسز جارڈن کا شغل تھا۔ یقیناً مسز پلینکٹ، سپرنٹنڈنٹ کی بیوی کو بتائیں گی کہ وہ جیرالڈ کے گھر گئی تھیں۔ اگر اس وزٹ کی رُوداد سپرنٹنڈنٹ جارڈن کے کانوں تک گئی، وہ کیا سمجھے گا؟ کچھ بھی نہیں...... جیرالڈ کا رویہ خشک تھا اور وہ اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہ یہی بتا سکتی تھیں کہ جیرالڈ کو رات دیر تک لکھنا تھا اور بس۔ جیرالڈ مسکرایا۔ وہ مطمئن تھا۔
وہ ایک گھنٹے کے اندر جنگل میں کاٹیج تک پہنچ گیا اور دستک دی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک بوڑھے پروفیسر ...... سنہری فریم کی ...... ٹائپ آدمی نے دروازہ ...... تھی۔
"کون ہے؟" اس کی آواز میں تیزی تھی۔ "کیا چاہتے ہو؟"
"سر! یہ میں ہوں۔" جیرالڈ نے احترام سے کہا اور سر پر ٹوپی کو ذرا اوپر کر کے چہرہ نمایاں کیا۔
بڑے میاں نے غور سے دیکھ کر پلکیں جھپکائیں اور

Digest Novels .com

حیرت کا اظہار کیا۔ ''مائی گاڈ! یہ تم نے کیا حلیہ بنایا ہوا ہے اور چہرے پر کیا لگایا ہے؟ آؤ، اندر آجاؤ۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' جیر اللہ نے اندر پہنچ کر نشست سنبھالی۔ ''سر! میں ایک مرڈر اسٹوری پر کام کر رہا ہوں۔ پلاٹ کیسا ہے، اس کے بارے میں رائے لینے آیا ہوں۔''

اسٹڈی روم نفیس اور آرام دہ تھا۔ سر ایفرام کی پیشانی اور آنکھوں سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ وہ چھریرے بدن کا مالک تھا۔ چہرہ قدرے لمبوترا تھا۔ جیر اللہ سر ایفرام کی نازک گردن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اطمینان سے بیٹھ کر اس نے دوبارہ بولنا شروع کیا۔

''یہ قتل کی کہانی ہے۔ میں عام کہانیوں سے مختلف کہانی لکھنے جا رہا ہوں۔ یہ ایک بے عیب قتل ہونا چاہیے، ناقابل گرفت، پرفیکٹ...... اگر متعدد قتل کیے جائیں گے تو کہانی کو بے داغ رکھنا مشکل ہے، لہٰذا اس کہانی میں صرف ایک قتل کیا گیا ہے۔ کہانی میں، میں نے سادہ انداز اپنایا ہے۔''

''سادہ انداز محفوظ تر ہے۔''

''بالکل سر! آپ نے ٹھیک کہا۔ میں اسی لیے یہاں آیا ہوں۔ آپ کی رائے میرے لیے اہم ہے۔ اس مرتبہ میں ایک معنوی ڈراما کروں گا جس کے صرف دو کردار ہوں گے۔ میں اور آپ...... قاتل اور مقتول۔ میں قاتل اور آپ مقتول۔''

سر ایفرام نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ چہرے پر تم نے کیا لگایا ہے...... اور کپڑے......؟''

''ڈراما حقیقت سے قریب رکھنے کے لیے میں نے حلیہ بدلا ہے۔'' جیر اللہ نے جواب دیا۔

''تم بھی ایک شیطان ہو۔'' سر ایفرام نے کہا۔ ''یعنی میرا کردار ایک لاش کا ہوگا۔'' ایفرام پھر ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی جیر اللہ کو اعصاب زدہ کر رہی تھی۔ اس نے خود کو قابو میں رکھنے کے لیے بات آگے بڑھائی۔

''سر! میں نے بہت سادہ انداز اختیار کیا ہے۔ آپ کی عمر کا ایک دولت مند آدمی ہے۔ جب اس کی بیوی کا انتقال ہوتا ہے تو وہ زندگی کے بکھیڑوں سے خود کو دور کر لیتا ہے۔ از خود ریٹائر ہو کر آپ کی طرح تنہا زندگی کا آغاز کرتا ہے، جیسے آپ یہاں کاٹیج میں ہیں، کوئی ملازم بھی نہیں ہے۔ آپ ہیں اور آپ کی کتابیں۔''

''اوہ، کیا واقعی؟'' سر ایفرام نے کہا اور ٹھنڈی سانس بھری۔ ''وہ بھی میری طرح آنجہانی بیوی سے ملنا چاہتا ہوگا اور اسے یقین بھی ہوگا، جیسے مجھے یقین ہے۔ میں بھی اس دروازے سے گزر کر پھر اپنی بیوی سے ملوں گا...... موت کا دروازہ...... راہِ اجل سے گزر کر ہی بیوی سے دوبارہ ملا جا سکتا ہے۔'' سر ایفرام نے وقفہ لے کر پھر کہا۔ ''وہ ان احمقوں میں سے تو نہیں ہے جو لائف آفٹر ڈیتھ پر یقین نہیں رکھتے؟''

''یہ مجھے نہیں معلوم۔'' جیر اللہ نے فوراً جواب دیا۔ ''لیکن آپ اس نظریے کو مانتے ہیں اور آپ ضرور اپنی بیوی سے دوبارہ ملیں گے۔''

رائٹر (جیر اللہ) کی دوستی بوڑھے ایفرام سے کئی برسوں میں باپ بیٹے کی طرح پروان چڑھی تھی اور سر ایفرام نے اپنی وصیت بدل دی تھی۔ پہلے وصیت کے مطابق اس کی دولت فلاحی اداروں میں منقسم ہونی تھی۔ وصیت کو بدل کر ایفرام نے فلاحی اداروں کے ساتھ منہ بولے بیٹے اور لکھاری جیر اللہ کو بھی شامل کر لیا تھا۔ ایفرام نے اسے خفیہ بھی نہیں رکھا تھا اور جیر اللہ کو اس تبدیلی سے آگاہ کر دیا تھا۔

''فکشن کا پارٹ کب آئے گا؟ تم اچھا لکھتے ہو۔ مجھے بتاؤ کہانی کے بارے میں۔ تم پہلی مرتبہ نئے طریقے سے لکھ رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری یہ کہانی مشہور ہو جائے گی۔''

''میں بتاتا ہوں۔'' جیر اللہ نے کہا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ خود کو پُرسکون اور نارمل رکھنا چاہتا تھا۔

''اس کہانی میں جو رائٹر ہے، اس کی عادتیں ٹھیک نہیں۔ وہ جوا بھی کھیلتا تھا، کئی ایک کلب اس نے جوائن کیے ہوئے تھے، مے نوشی بھی خوب کرتا تھا۔ نشے کی حالت میں جوا وہ کھیلے تو مزید خطرناک ہو جاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک رائٹر ہونے کے باوجود کوئی اچھی اور آرام دہ زندگی گزارنے سے محروم تھا۔''

سر ایفرام کے لیے یہ ناپسندیدہ اعمال تھے۔ وہ کتابوں کا کیڑا تھا اور مذہبی رجحان رکھتا تھا۔ اس نے رائٹر کے لیے ناپسندیدگی کے جذبات محسوس کیے۔ اگرچہ وہ بے خبر تھا، جواری رائٹر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

جیر اللہ کو بخوبی علم تھا کہ اگر سر ایفرام کو اس کی حقیقت کا علم ہوا تو پہلی فرصت میں وصیت ایک بار پھر تبدیل کر دی جائے گی جس میں جیر اللہ کا نام کہیں نہیں ہوگا اور ایک نئی کہانی جنم لے گی جس میں خود جیر اللہ بلیک میلر کے ہاتھوں مارا جائے گا۔

سر ایفرام الجھن زدہ نظروں سے جیر اللہ کو دیکھ رہے

تھے۔اس سے پہلے کہ وہ کوئی سوال کرتے، جیراللہ نے موقع نہیں دیا۔

''یہ نامعقول رائٹر اپنی حرکتوں کی وجہ سے مقروض ہوگیا۔قرض خواہ کے علم میں تھا کہ رائٹر کا دوست ایک ریٹائر امیر آدمی ہے۔قرض دار نے رائٹر کو دھمکانا شروع کردیا کہ وہ اس کے دوست کے سامنے اس کی پول کھول دے گا۔ بہرحال یہ سلسلہ چلتا رہا۔رائٹر بھی جیت جاتا اور زیادہ تر ہارتا رہا۔نوبت یہ آگئی کہ اس نے قرض لے کر کھیلنا شروع کردیا پھر وہ قرض واپس کرنے کے قابل بھی نہ رہا اور قرض خواہ اس کے پیچھے پڑ گیا۔رائٹر کے پڑوسی کو سب علم تھا۔وہ رائٹر سے ہمدردی رکھتا تھا لیکن جوا اور شراب دونوں بُرے نشے کے مانند ہیں۔رائٹر نے پڑوسی کے مشوروں پر کان نہیں دھرے اور پھنستا چلا گیا۔''

''بُری بات ہے مگر کہانی میں دلچسپ ہے۔آگے بتاؤ لیکن میں سمجھ رہا ہوں کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔'' سر ایفرام نے مسکراتے ہوئے کہا۔''رائٹر اپنے امیر دوست کو قتل کرے گا کیونکہ اس کا امیر دوست بھی اکیلا رہتا ہے اور وہ شک بھی نہیں کرسکتا کیونکہ بدمعاش رائٹر بظاہر اس کا اچھا دوست ہے۔البتہ قرض خواہ یا بلیک میلر......'' ایفرام سوچ میں پڑ گیا۔

''بلیک میلر۔'' جیراللہ نے آہستہ سے کہا۔لبوں پر مسکراہٹ تھی۔''اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔کوئی وجہ نہیں ہوگی کہ وہ رائٹر کے خلاف جائے۔رائٹر کا مال دار دوست مرے گا تو بلیک میلر کو کیا فرق پڑے گا۔ فرض کرو وہ کچھ کرتا بھی ہے تو زیادہ سے زیادہ پولیس کو بتائے گا کہ رائٹر جوئے کی لت میں گرفتار ہے اور شراب نوشی کرتا ہے۔بہت سے لوگ ایسا کرتے ہیں۔یہ اطلاع رائٹر کو قاتل ثابت نہیں کرسکتی۔مزید یہ کہ وہ یہ بتائے گا کیوں۔ اس میں تو اس کے لیے خطرہ ہے کہ کہیں وہ بلیک میلر کے طور پر بے نقاب نہ ہوجائے اور امکان ہوگا کہ رائٹر کو اس کے لکھے گئے خطوط ٹریس نہ ہوجائیں۔اس کے لیے بہترین اقدام یہی ہوگا کہ وہ پولیس کے چکر میں نہ پڑے کیونکہ رائٹر اس کو قرض چکانا شروع کردے گا......''

''سر! رائٹر محفوظ پوزیشن میں رہے گا۔غالب امکان ہوگا کہ پولیس سوال جواب کرے۔وہ کہے گا کہ میں تو رات بھر گھر پر لکھنے میں مصروف تھا۔''

''لیکن اس بات پر شک بھی کیا جاسکتا ہے۔'' سر ایفرام نے اعتراض کیا۔

''رائٹر نے فون کا ریسیور نیچے رکھ دیا تھا کہ لکھائی میں خلل نہ پڑے۔کمرا روشن تھا یعنی رائٹر گھر میں تھا۔'' جیراللہ نے اعتراض کا جواب دیا۔

''کوئی گھر پر وزٹ کرسکتا تھا۔'' سر ایفرام نے دوسرا اعتراض کیا۔

''ایک تو وقت زیادہ ہوگیا تھا اور رائٹر لکھنے میں مگن تھا۔کوئی آتا بھی ہے تو وہ دروازے پر نہیں جائے گا اور ہاں، رائٹر کے پاس ایک گواہ بھی ہے۔ایک خاتون آئی تھیں۔رائٹر نے وقت نہیں دیا اور کہا کہ وہ مصروف ہے۔'' جیراللہ نے فخریہ انداز اپنایا۔''میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ایک فول پروف پلاٹ تیار کیا ہے۔اس کہانی میں قاتل ہمیشہ آزاد رہے گا۔''

''بہت خوب۔'' سر ایفرام نے کہا۔''کہانی بہت عمدہ ہے لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تم نے یہاں آنے کی زحمت کیوں کی اور وہ بھی اس حلیے میں؟ تم اسے ریہرسل کہہ رہے ہو۔میں یہ ضروری نہیں سمجھتا۔یہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔''

جیراللہ ہنسنے لگا۔

''شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔

''مجھے اس طرح تصور کرنے میں مدد ملی ہے......اور ایک چیز کسی قدر غیر یقینی رہے گی جب تک میں عملی طور پر خود ایسا نہ کروں۔''

''میں نہیں سمجھا؟''

اتنے میں جیراللہ، سر ایفرام کے عقب میں آن کھڑا ہوا۔

''قاتل کے لیے مقتول سے بات کرنا ضروری تھا تاکہ وہ اندازہ لگا سکے کہ مقتول یا رائٹر کا دوست گھر پر اکیلا ہے۔یہ نکتہ کہانی کا اہم جز و ہے بلکہ لازم ہے۔جب ہر شے پاپختہ کہانی کے مطابق مکمل ہوگیا تو رائٹر نے آخری عملی ڈراما بھی کرنا تھا۔وہ جاننا چاہتا تھا کہ مقتول مرنے سے پہلے چیخے گا یا اسے چلانے کا موقع ملے گا یا نہیں۔''

سر ایفرام نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس دوران جیراللہ کے دستانوں والے ہاتھ اس کی پتلی گردن پر گرفت مضبوط کرچکے تھے۔

☆☆☆

جیراللہ صبح حسبِ معمول دیر سے بیدار ہوا۔ناشتا تیار کرکے دوسرے کمرے میں ڈائننگ ٹیبل پر آ گیا۔ابھی اس نے ناشتا ختم نہیں کیا تھا کہ سپرنٹنڈنٹ جارڈن آن ٹپکا۔وہ

Digest Novels .com

خبر لایا تھا کہ سرایفرام کو ان کے کاٹیج میں رات قتل کر دیا گیا ہے۔

''اوہ گاڈ! کیا یہ مذاق ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ وہ شریف آدمی میرا بہترین دوست تھا۔ کہہ دو کہ تم مذاق کر رہے ہو؟'' جیرالڈ نے بدحواسی کے عالم میں بہترین اداکاری کی۔

''قاتل بے رحم تھا۔'' جارڈن نے تبصرہ کیا۔ ''ایفرام کو کبھی نہیں مار سکتا تھا۔ قاتل کا انجام بھی سبق آموز ہونا چاہیے۔''

جیرالڈ کرسی پر بیٹھ گیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ رائٹر نہیں بلکہ پیشہ ور اداکار ہے۔ چہرے پر غم کا گہرا سایہ تھا۔

''میرا عزیز دوست......!'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

جارڈن نے پُرسوچ انداز میں بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ اس دوران جیرالڈ قدرے پُرسکون ہوا تو جارڈن نے زبان کھولی۔

''سر! ہمارا کام ایسا ہے کہ تفتیش کرنی پڑتی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں۔'' جیرالڈ نے اُداس لہجے میں کہا۔

''میں رات دیر تک لکھنے میں مصروف رہا۔''

''کیا تم گھر پر تھے؟ میرا مطلب رات میں کسی وقت گھر سے باہر نہیں گئے؟''

''نہیں۔''

''تم کب سوئے تھے؟''

''میں چار بجے کے بعد کسی وقت لیٹا تھا۔ کل مجھے بہت زیادہ لکھنا پڑا۔ جب مسز پلینکٹ پھول لے کر آئی تھیں، میں اس وقت بھی لکھ رہا تھا۔''

''مجھے خبر ملی تھی کہ وہ یہاں آئی تھیں۔'' جارڈن نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''صبح اس کی میری بیوی سے گپ شپ رہی تھی۔ وہ پھول تمہاری لکھنے کی میز پر رکھ کر چلی گئی تھیں۔''

جیرالڈ سوچ رہا تھا کہ یہ اچھا ہوا کہ جارڈن کو اس بات کی خبر ہے یعنی اس کا معاملہ صاف ستھرا ہے۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' جیرالڈ نے کہا۔ ''بہت خوبصورت گلاب تھے۔'' وہ مسکرایا۔

جارڈن نے عام سے انداز میں کہا۔ ''ہاں، وہ ہمیشہ ہی بہترین پھول لے کر آتی ہیں۔ تم نے صبح گلابوں کو پانی دیا تھا؟''

''نہیں، میں نے ایسا نہیں کیا۔ عموماً دیر سے اٹھتا ہوں۔ ابھی تک اپنی اسٹڈی میں بھی نہیں گیا۔'' جیرالڈ نے جواب دیا۔

''اوہ، مجھے حیرت ہے کہ میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔'' وہ اٹھ کر آگے آیا۔

جیرالڈ احمقانہ انداز میں جارڈن کو دیکھ رہا تھا۔ جارڈن نے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''میں تمہیں سرایفرام کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔ کوئی بات ایسی نہ کہنا جو ٹرائل میں تمہارے خلاف استعمال ہو۔''

☆☆☆

پولیس اسٹیشن پر بہت جلد جیرالڈ نے گھٹنے ٹیک دیے اور وہ جانتا تھا کہ یہ نوبت آئی تو اسے ہتھیار ڈالنے پڑیں گے کیونکہ اس کے بعد تلاشی کی نوبت آئے گی جس کے بعد پولیس کافی کچھ جان جائے گی۔ حلیہ بدلنے کے لیے جو کچھ اس نے استعمال کیا تھا، وہ وارڈروب سے مل جائے گا۔ سر ایفرام کی وصیت کا بھی علم ہوجائے گا۔

اس نے اعترافِ جرم کرنے کے بعد دستخط کیے اور جارڈن کو گھورنے لگا۔

''کس نے بتایا کہ میں جھوٹ بول رہا تھا؟''

''پھولوں نے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔

''گلاب نہیں بولتے۔''

''تم نے انہیں بولنے پر مجبور کیا۔''

''کیسے؟''

''میرا اندازہ تھا۔ میں نے چانس لیا اور تمہارے جواب نے تمہیں پھنسا دیا۔''

''کیا مطلب؟''

''تم نے مسز پلینکٹ کو وضاحت کا موقع ہی نہیں دیا۔ وہ کچھ بتانا چاہ رہی تھیں اور تم ابھی تک نہیں سمجھے کہ ہوا کیا۔ تم گلابوں کو پانی دیتے تو مجھے جواب کچھ اور ملتا۔ نتیجتاً تمہاری جان چھوٹ جاتی۔''

''کیا بکواس ہے؟'' جیرالڈ بے قابو ہوگیا۔

''مسز پلینکٹ بتانا چاہ رہی تھیں کہ باغبان علیل تھا اور اسے ضرورت سے کم پھول ملے تھے۔ تمہارے حصے میں جو گلاب آئے تھے وہ مصنوعی تھے، کاغذی تھے۔ اگر تم گھنٹوں لکھنے کی میز پر ہوتے تو گلابوں کی اصلیت جان جاتے۔ گلابوں کو پانی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔''

❖❖❖

Digest Novels .com

سربہ کف

طاہر جاوید مغل

پانچواں حصہ

دکھ کی کہانی بڑی دردناک ہوتی ہے... جسے سنانا آسان نہیں ہوتا... بعض اوقات سنانے والے کے پاس اُس کا اپنا ذہن ساتھ نہیں ہوتا... مضبوط شانیں ڈھلک چکے ہوتے ہیں... اب تجھے کیا بتائیں کہ ہمیں دکھ کیا ہے... شدید ترین مسافت کی تھکن کے باوجود حالات کا بوجھ کندھوں پر اٹھائے چپ چاپ چلتا چلا جاتا ہے... کبھی خود سے کبھی راستوں سے الجھتا ہے... مگر کسی آواز پر رکتا نہیں... اسے تلاشنا تھا... اپنا کھویا ہوا پیرہن... دل گرفتہ تھا... طلسماتِ غم ہستی سے سانس بھی رکی ہوئی... مگر اس کی تلاش... شناخت کا رقصِ جنوں سی طرح تازہ تھا... ہر بچھڑی ساعت سے اسے گلے ملنا تھا... ظلم کی ڈور کہاں تک کیسے ٹوٹی تھی، ابھی معلوم نہ تھا... ایک دھن تھی جو سنائی نہیں دیتی تھی پھر بھی اس کی لے پر آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری تھا...

سنسنی خیز واقعات اور انتقام کے جذبات سے لبریز ایک انوکھی داستان

اسکول کے وسطی حصے میں مسلسل بھاگ دوڑ کے آثار نظر آرہے تھے۔ اچانک ایک عورت کی دلدوز صدائیں دھواں دھواں فضا میں گونجنے لگیں۔ ”میرا بچہ...... میرا بچہ......“

میں نے مڑ کر دیکھا، جواں سال عورت کو دو تین مرد و زن نے بازوؤں میں لیا ہوا تھا اور اسے پیچھے کی طرف گھسیٹ رہے تھے۔ مصیبت زدہ عورت کی نگاہیں کلاس روم کے ایک جلتے ہوئے حصے کی طرف تھیں۔ یہاں چھ سات سال کا ایک بچہ ملبے میں پھنسا ہوا تھا۔ اس غریب کی ٹانگیں گھٹنوں تک ملبے میں جکڑی گئی تھیں۔ اوپر آگ تھی جو دوسری منزل کے کمرے تک پھیلتی جارہی تھی۔ ایک دلیر بلوچی نوجوان بچے کو باہر کھینچنے کی کوشش کررہا تھا مگر پھر اس کے سر پر لکڑی کی ایک جلتی ہوئی لکڑی گری اور وہ زخمی ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔

میں سانس روک کر آگے بڑھا اور میں نے بچے کو بازوؤں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی۔ نجانے اس معصوم کی ٹانگیں کہاں پھنس گئی تھیں۔ وہ رو رہا تھا اور فریادی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اگلے پندرہ بیس سیکنڈ میں، میں نے جان توڑ کوشش کی۔ اس کی ایک ٹانگ تو کسی حد تک باہر آگئی مگر دوسری اسی طرح جکڑی ہوئی تھی۔

یکا یک بھک بھک کی آواز سے دوسری منزل بھی دھڑا دھڑ جلنے لگی۔ یہ لکڑی کی چھتیں تھیں۔ تپش بے پناہ ہو گئی۔ اب کسی وقت بالائی کمرے کا سارا ملبا بھی نیچے گر کر مجھے اور بچے کو زندہ نذرِ آتش کر سکتا تھا۔ تین چار باہمت افراد بچے کی مدد میں ہاتھ بٹانے میری طرف آ رہے تھے مگر بدلتی ہوئی صورتِ حال دیکھ کر وہ بھی پیچھے ہٹ گئے۔ عورت کے رونے چلّانے کی آواز مزید دردناک ہو گئی۔ شاید اس نے بھی دیکھ لیا تھا کہ آگ یکا یک بہت پھیل گئی ہے۔

دُبلا پتلا بچہ مجھ سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔ جمشید صاحب کی صدا مجھے اپنے عین عقب سے سنائی دی۔ وہ وحشت زدہ آواز میں چلّائے۔ ''اب چھوڑ دو تابش...... ملبا نیچے آنے لگا ہے...... اوپر کی چھت گرنے لگی ہے۔''

پھر انوار گنگوری بھی اسی انداز میں چلّایا۔ ''سر جی! پیچھے آجائیں، ملبا گر رہا ہے۔''

میں نے بچے کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں دیکھا۔ اس کی خاموش التجا فضا میں گونجتی محسوس ہوئی...... مجھے بچا لیں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتا...... میں تو صاف ستھرے کپڑے پہن کر، نئی کتابیں، نئے بستے میں ڈال کر پڑھنے کے لیے اسکول آیا تھا۔ میں یہاں مرنے کے لیے تھوڑی آیا تھا۔ مجھے ابھی زندہ رہنا ہے انکل...... اپنی ماں کے پاس پہنچنا ہے مجھے۔ یہ کون لوگ ہیں جو مجھے اتنی سی عمر میں مار دینا چاہتے ہیں۔

بالائی کمرے کی کڑیاں ٹوٹ رہی تھیں...... چیخ رہی تھیں...... میں نے اوپر دیکھا، پھر ایک آخری زور لگایا...... ہاں بہادری اور خودکشی میں فرق ہوتا ہے۔ کوشش اور دیوانگی ایک سے نہیں ہوتے۔ کبھی کبھی ہار ماننے سے کلیجا پھٹ جاتا ہے لیکن ہار ماننا پڑتی ہے۔ اس سے پہلے کہ میں بچے کے ساتھ ہی جلتے ملبے میں دفن ہو جاتا...... میں نے اس کے بازو چھوڑے اور جست لگاتا ہوا پیچھے کی طرف گیا۔ اوپر کی پوری منزل دھما کے سے نیچے آن گری تھی۔ ملبے کے کئی جلتے ٹکڑے میرے جسم کو لگے اور میرے سر پر سے گزرے۔

ہر طرف ناقابلِ برداشت گاڑھا سیاہ دھواں پھیلا، انوار گنگوری اور ایک مقامی نوجوان جو خود بھی بے طرح کھانس رہے تھے، مجھے سہارا دیتے ہوئے کچھ اور دور لے گئے۔

☆☆☆

کوئی دو تین گھنٹے میں اسکول کی آگ بجھ گئی۔ اس نے بجھنا ہی تھا۔ عمارت کے اس حصے میں جلنے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ ہاں آگ بجھ گئی لیکن جو آگ میرے سینے میں بھڑکی، وہ نہیں بجھ پا رہی تھی۔ اس کے شعلے مزید بلند ہو رہے تھے، پھنکار رہے تھے۔ میں سردار حویلی کے اپنے کمرے میں تھا، میرے دونوں بازو آگ سے متاثر ہوئے تھے اور انوار گنگوری نے جلے ہوئے حصوں پر مرہم لگا دیا تھا۔ جمشید صاحب اور انسپکٹر بھی کمرے میں ہی موجود تھے۔ اطلاعات سے پتا چل رہا تھا کہ کم از کم بارہ بچے جان سے گئے ہیں۔ ایک ٹیچر کے علاوہ پانچ چھ بچوں کی حالت چائی کے اسپتال میں نازک ہے۔

میری نگاہوں میں بار بار اس بچے کا فریادی چہرہ گھومتا تھا اور سینے میں آتشیں ہلچل مچ جاتی تھی۔ میں نے گنگوری سے پوچھا۔ ''وہ بندہ کہاں ہے جس نے بم کی اطلاع دی تھی؟''

''وہ جانبر نہیں ہوا سر! اس کی لاش بھی اسپتال بھیج دی گئی ہے۔''

''اس کی قاتل بھی یہی باسٹرڈ گوہار زینت اور اس کا بدبخت پوتا ہیں۔ بے رحم قاتل ہیں، یہ لوگ کسی رعایت کے مستحق نہیں۔''

میں نے اٹھ کر اپنا پسٹل قمیص کے نیچے لگایا تو جمشید صاحب چونکے اور پھر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ''نہیں تابش...... ہمیں جذبات سے نہیں تحمل سے کام لینا ہو گا۔''

''یہ میرے بس میں نہیں رہا جمشید صاحب۔'' میں نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''یہ میرا حکم ہے۔'' وہ ٹھوس لہجے میں بولے اور پسٹل میری قمیص کے نیچے سے نکال کر الماری میں رکھ دیا۔

میں کل انہیں اس وڈیو کے بارے میں سب کچھ بتا چکا تھا جو زانی نے کچھ دن پہلے بڑی ہوشیاری کے ساتھ چھپ کر ریکارڈ کی تھی اور جس میں گوہار زینت کی شیطانیت کے خلاف ایسے ٹھوس ثبوت موجود تھے جنہیں جھٹلایا جانا ممکن ہی نہیں تھا...... اور ان میں اہم ترین ثبوت یہی تھا کہ عمران سمیت ہمارے تینوں ساتھی افغانیوں کے پاس نہیں بلکہ گوہار زینت کے پاس ہیں اور اسی حویلی میں ہیں......

جمشید صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تابش، ادھر آؤ...

... جو مر رہا ہے اسے زہر کیوں دیا جائے...... اور دوسری بات یہ کہ ہماری پہلی ترجیح اپنے تینوں ساتھیوں کی بازیابی ہونی چاہیے۔''

''آپ کھل کر بات کریں سر!'' میں نے کہا۔

"پہلے تم بیٹھو اور ایک گلاس پانی پیو۔"

میں بیٹھ گیا۔ ان کے اشارے پر منگوری نے مجھے پانی پینے کے لیے دیا۔

جمشید صاحب پُرسوچ انداز میں بولے۔ "کچھ بھی کرنے سے پہلے ہمیں فوری طور پر پولیس کی مزید نفری یہاں منگوانی ہوگی۔ لیکن یہ صرف احتیاطی طور پر ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمیں سب سے پہلے عمران، وقاص اور انوش کو برآمد کروانا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جو وڈیو ہمیں ملی ہے وہ گوھار زینت کو اس کام پر مجبور کرنے کے لیے کافی ہے۔"

"سر! یہ وڈیو نہ بھی ہو تو اس مجرمہ کے خلاف بہت ثبوت اکٹھے ہو گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، مگر ہمیں عمران وغیرہ کی رہائی کے لیے محفوظ ترین راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ بالفرض ہم طاقت استعمال کرتے ہیں اور گوھار زینت اور مستان وغیرہ کے سیکڑوں حامی مزاحمت پر اتر آتے ہیں تو پھر......؟"

میں نے ذرا دھیما پڑتے ہوئے کہا۔ "جمشید صاحب! اب مجھ سے زیادہ برداشت نہیں ہو پائے گا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ پہلے عمران وغیرہ کو رہا کرا لیا جائے تو پھر یہ کام ہم آج رات ہی کسی طرح کر لیں۔"

جمشید صاحب اور دیگر دونوں ساتھیوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔

سب سے پہلا کام یہ کیا گیا کہ قریبی تھانوں سے مزید نفری منگوانے کی درخواست انتظامیہ سے کر دی گئی۔ ہمیں یقین دلایا گیا کہ یہ نفری رات دس بجے تک حجرہ نوشیر پہنچ جائے گی۔ بظاہر پولیس کی اضافی نفری کا آنا اس [illegible] کے پیش نظر ہوگا جو آج دوپہر بم دھماکوں کی صورت میں رونما ہوا ہے۔

اب شام کے سائے طویل ہو رہے تھے۔ پورے علاقے میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اسکول کا ملبا ابھی تک سلگ رہا تھا اور اس کے ساتھ اَن گنت سینے بھی سلگ رہے تھے۔ دو مقامی مساجد سے بار بار مختلف اعلانات ہو رہے تھے۔ دور دراز علاقہ ہونے کے باوجود، میڈیا کے کچھ لوگ یہاں پہنچ گئے تھے۔ گوھار زینت نے اپنے آدھے گھونگھٹ کی اوٹ سے ان میڈیا پرسنز کو تند و تیز انٹرویوز دیے تھے اور اعلان کیا تھا کہ مجرموں کو عبرت کا نشان بنائیں گے۔ ڈھونڈیں گے اور کیفرِ کردار تک پہنچا کر دم لیں گے وغیرہ وغیرہ۔

ہمارے کمروں کے عین سامنے سرخ پتھروں والے احاطے میں سردار گزین کا پوتا شاہ خانو کیمرے کے سامنے ایک اینکر سے بات کر رہا تھا۔ اس کے پہلو میں وہی چوڑا چکلا، سانولے رنگ کا صف شکن کھڑا تھا جو یقیناً مستان کا قریبی ساتھی تھا اور اسکول میں ہونے والی تباہی کا ذمے دار بھی۔ اسے دیکھ کر میں خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ ابھی کمرے سے نکلوں اور مار مار کر اس کی ہڈیوں کا چورا کر دوں۔

شاہ خانو "درد بھری" آواز میں کہہ رہا تھا۔ "ہمارے اندر ہی کچھ لوگ ہیں جو اس دہشت گردی کو ہوا دے رہے ہیں۔ بارڈر پار والی باتیں تو فی الحال کسی ثبوت کے بغیر ہی ہیں۔"

پھر اس نے پہلو میں کھڑے صف شکن کا کندھا تھپتھپایا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ اس بندے بخت زمانی نے صورتِ حال کو مزید خراب ہونے سے بچایا ہے۔ جب اس نے مشکوک شخص کو اسکول کے قریب دیکھا تو اسے للکارا اور پھر اس پر گولیاں چلائیں۔ وہ زخمی ہو کر بھاگ گیا۔ بعد میں کچھ دور جنگل میں جا کر گر گیا اور جہنم واصل ہوا۔ اس کے موبائل فون میں سے جو ثبوت ملے ہیں ان سے پتا چلتا ہے کہ اس نے علاقے کے دیگر دو اسکولوں میں بھی دھماکے کرنا تھے۔ اوپر والے نے ہمیں ایک بہت بڑے نقصان سے بچایا......"

میرا خون کھولنے لگا۔ ضبط کرنا مشکل ہوتا جا رہا تھا مگر مجھے کرنا تھا۔ اسی دوران میں دھول سے اٹی ہوئی ایک لگژری جیپ تیزی سے احاطے میں داخل ہوئی۔ اس میں دو بندوں کے علاوہ شاہ زیب اور [illegible] پہلوان بھی موجود تھے۔ مجھے کچھ ہی دیر پہلے پتا چلا تھا کہ دھماکوں کے وقت شاہ زیب گوٹھ میں نہیں تھا۔ چاغی سے آگے کہیں گیا ہوا تھا۔

☆☆☆

یہ رات بڑی اہم تھی۔ دس بجے کے لگ بھگ 40 اہلکاروں پر مشتمل مزید نفری گوٹھ میں پہنچ گئی۔ ایک دو میڈیا والے اب بھی گوٹھ میں موجود تھے۔ انہیں یہی بتایا گیا کہ یہ سب کچھ عمومی سیکورٹی کے پیش نظر کیا جا رہا ہے۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ جمشید صاحب نے براہِ راست گوھار زینت کو سیل فون پر کال کی...... اسپیکر آن ہی تھا۔ دوسری کال پر گوھار زینت کی بوجھل آواز، ناگواری کے تاثر کے ساتھ سنائی دی۔ "ہیلو ایس پی صاحب، خیریت ہے؟"

"بہت معذرت چاہتا ہوں کہ بے وقت آپ کو

تکلیف دے رہا ہوں۔"

''تکلیف تو بے شک ہے، اور بے وقت بھی ہے۔ بہرحال فرمائیے۔"

''میں اور تابش آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ابھی اسی وقت۔"

''کیسی بات کررہے ہو آپ؟ میں دس بجے کے بعد کسی سے نہیں ملتی۔ میں اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے لیٹ چکی ہوں۔"

''آپ کے معمولات کا سارا علم ہے گوھار جی مگر بات ہی کچھ ایسی ہے کہ آپ سے فوری اور اکیلے میں ملنا بہت ضروری ہوگیا ہے۔"

''یہ کیا بات کررہے ہو آپ۔ میں اس وقت اکیلے میں کسی سے کیوں ملوں گی؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''جب آپ کو اصلی بات معلوم ہوگی تو آپ جان جائیں گی کہ اکیلے میں آپ سے ملنا آپ کے لیے کس قدر فائدہ مند تھا۔"

جمشید صاحب نے جس گمبھیر انداز میں یہ فقرہ کہا تھا اس نے گوھار زینت کو چونکایا۔ یہ مکالمہ ایک دو منٹ مزید جاری رہا پھر گوھار زینت نے بے حد جھلاہٹ اور بیزاری کے عالم میں ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں آنے کی اجازت دے دی۔

قریباً دس منٹ بعد میں اور جمشید صاحب، گوھار زینت کے سامنے بیٹھے تھے۔ حویلی کے اکثر کمروں میں روم کولر تھے مگر اس حصے میں اے [illegible] کا اہتمام تھا۔ گوھار زینت [illegible] تھی سنہری رنگ کے سلکی نائٹ گون میں تھی۔ ادھورے سے گھونگھٹ کی شکل میں شال اس کے سر پر تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ بیک وقت اپنے جوان جسم کو دکھانے اور چھپانے کی کوشش کرتی رہتی ہے۔

''کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟'' اس نے نارمل نظر آنے کی ناکام کوشش کی۔

میں نے کہا۔ ''آپ سمجھو کہ قیامت ہی ٹوٹ پڑی ہے۔ کم ازکم آپ کے لیے تو ایسا ہی ہے۔"

اس کی خوب صورت پیشانی پر تحیر اور طیش کی کئی شکنیں اُبھر آئیں۔ ''ڈپٹی! تم صاف صاف بات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟"

''ہم یہاں بات کرنے نہیں، آپ کو کچھ دکھانے آئے ہیں۔'' جمشید صاحب نے ٹھہری آواز میں کہا۔ ''اور یہ سب دیکھنے کے بعد مجھے امید ہے کہ تم عقلمندی کا ثبوت دو گی۔ کیونکہ اسی میں سب کی بھلائی ہے۔"

جمشید صاحب ایک دم ہی آپ سے تم پر اتر آئے تھے۔ وہ حیران رہ گئی۔ چہرے پر رنگ سے آنے جانے لگے۔ ''یہ آپ دونوں کس لہجے میں بات کررہے ہو مجھ سے؟'' وہ بُری طرح تلملائی۔

میں نے مداخلت کی۔ ''گوھار زینت ابھی تمہیں بہت سے لہجے سننا پڑیں گے اور سہنا پڑیں گے۔ خوامخواہ ابھی سے اپنی انرجی ضائع نہ کرو۔"

جمشید صاحب نے موبائل فون نکالتے ہوئے کہا۔ ''زینت ہم جان چکے ہیں کہ ہمارے تینوں یرغمالی کہیں اور نہیں، اس وقت یہیں سردار حویلی میں تمہارے پاس ہیں اور وہ تمہارے لوگ ہی تھے جنہوں نے بارڈر کے قریب ہمیں بھی یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ بہرطور ہمارے نزدیک سب سے اہم یہی ہے کہ ہمارے تینوں بندے سلامتی کے ساتھ ہمارے پاس پہنچ جائیں۔ باقی سارے مسئلوں پر بعد میں بات کی جاسکتی ہے......"

''یہ کیا بکواس ہے؟ وٹ اے ربش؟'' وہ چلّائی۔ ''تم لوگ ہوش میں تو ہو؟'' تین چار دن پہلے کی طرح اس کا پارا پھر چڑھ رہا تھا۔

''یہ بکواس نہیں ہے۔'' میں نے اُس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک پھانسی کا پھندا ہے جو تمہارے گلے میں پڑنے والا ہے۔ بہت بُرے وقت کی طرف بڑھ رہی ہو تم، اور وہ تمہارا ہم عمر پوتا شاہ خانو بھی۔"

وہ سکتہ زدہ تھی۔ اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ اس سے ایسے لہجے میں بھی بات کی جاسکتی ہے۔

جمشید صاحب بولے۔ ''لیکن دیکھو زینت! تم تعاون کروگی تو تمہارے ساتھ نرمیاں ہوسکیں گی...... اور یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں وعدہ معاف گواہ بنایا جاسکے۔"

جمشید صاحب کے ہاتھ میں جو موبائل تھا وہ ایک اضافی موبائل تھا۔ یہ انہوں نے گوھار زینت کے ہاتھ میں تھمادیا اور بولے۔ ''دیکھو اس کو۔"

موبائل اسکرین پر وہی وڈیو چلنے ہوئے لگی جس میں گوھار زینت اپنے قیدی عمران کی نظر کرم کے لیے مری جارہی تھی۔ معمولی لباس پہنے کسی کنیز کی طرح اس کے قدموں میں بیٹھی ہوئی تھی۔

گوھار زینت کا چہرہ پہلے حیرت کی آماجگاہ بنا، پھر زرد ہوتا چلا گیا۔ اس کا ادھورا سا گھونگھٹ ختم ہوگیا، بلکہ یوں لگا کہ شال بھی سر سے سرکتی جارہی ہے۔ سانس پھول

Digest Novels .com

گئی۔ پھر یکایک اس نے موبائل دیوار پر کھینچ مارا اور گرجی ”یہ سب جھوٹ ہے، فیک ہے...... مجھے بدنام کرنے کی گندی سازش ہے یہ۔“

پھر اس نے پھرتی سے فرش پر سے ٹوٹا ہوا موبائل اٹھا کر قریب رکھے پانی کے جگ میں ڈال دیا۔ اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں ہو گئے تھے۔

”واہ کیا عقلمندی ہے۔“ میں نے ہولے سے تالی بجائی۔ ”موبائل ختم...... ثبوت ختم......“

میرے فقرے نے اُسے سمجھا دیا کہ وڈیو اور جگہ بھی موجود ہے۔ طیش سے مغلوب ہو کر اس نے بدحواسی کے عالم میں میرے والا موبائل مجھ سے چھیننے کی ناکام کوشش کی۔ اس کوشش میں کرسی کی اونچی پشت کا کنارہ اس کے منہ پر لگا اور ہونٹ سے خون رسنے لگا۔ میں نے اسے پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ قدرے ٹھنڈی نظر آئی۔ صورتِ حال کی بدترین سنگینی اس پر واضح ہونے لگی تھی۔

یکایک ڈرائنگ روم کا بھاری دروازہ زوردار آواز سے کھلا اور شاہ زیب کی صورت نظر آئی۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے تھے، چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ یہاں سے اُبھرنے والی آوازیں سن کر بیدار ہوا ہے۔ ایک پریشان ملازمہ بھی اس کے عقب میں تھی۔

شاہ زیب کی عقابی نظروں نے ایک لمحے میں صورتِ حال کو بھانپ لیا۔ گوہار زینت کے ہونٹ سے رسنے والا خون اور کمرے کی حالت گواہی دے رہی تھی کہ یہاں دھینگا مشتی ہوئی ہے۔

وہ سیدھا مجھ پر آیا اور ہیجانی انداز میں میرا گریبان پکڑ لیا۔ ”کیا ہو رہا ہے یہاں؟ کیا ہو رہا ہے؟“ وہ چنگھاڑا۔

اس کے ساتھ ہی طیش کے عالم میں وہ مجھے دھکیلتا ہوا آگے گیا۔

”او بے ہوش کر۔“ میں نے بھی اس کی گردن پکڑی۔

اس نے مجھے گھونسا رسید کرنا چاہا۔ میں نے جھک کر اس کا وار بچایا اور اسے گھما کر ایک دیوار سے دے مارا۔ سردار گزین کی پینٹنگ زمین پر آ رہی۔ وہ پھر مجھ پر جھپٹا اور گریبان پکڑ لیا۔ گوہار زینت تڑپ کر ہم دونوں کے درمیان آ گئی۔ وہ چلائی۔ ”نہیں شاہ زیب...... نہیں...... پیچھے ہٹ جاؤ...... میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ پیچھے ہٹ جاؤ۔“

میں نے دیکھا کہ شاہ زیب کا دایاں ہاتھ جو پستول نکالنے کے لیے بے ساختہ اس کی شرٹ کے نیچے جا رہا تھا، رک گیا۔

گوہار زینت نے میرا گریبان شاہ زیب کے ہاتھوں سے چھڑایا...... اور اسے مزید پیچھے دھکیل دیا۔ ”نہیں شاہ زیب! یہ لڑائی جھگڑے کا موقع نہیں ہے، بالکل نہیں ہے...... اگر مجھے تمہاری ضرورت ہو گی تو میں تمہیں بتاؤں گی...... لیکن فی الحال بالکل نہیں۔ پلیز جاؤ تم...... جاؤ پلیز......“

شاہ زیب کی جلتی نگاہیں گوہار زینت کے خون آلود ہونٹ پر جمی تھیں۔ گوہار زینت نے اس کا زاویۂ نظر دیکھ کر بلوچی شال کے کنارے سے خون پونچھا اور بولی۔ ”یہ کچھ نہیں ہے۔ یہ چوٹ خود ہی لگی ہے مجھے...... جاؤ تم۔“

اسی اثنا میں شاہ خانو اور دو ملازم بھی دندناتے ہوئے اندر آ گئے۔ شاہ خانو کے ہاتھ میں رائفل اور چہرے پر طیش آمیز تحیر تھا۔

”کیا ہوا دائی ماں؟“ اس نے پوچھا۔

گوہار زینت اسے دھکیل کر ڈرائنگ روم سے باہر لے گئی۔ شاہ زیب اور دیگر افراد بھی باہر چلے گئے۔ دروازہ بند ہو گیا۔ ڈرائنگ روم میں بس ہم دونوں رہ گئے۔

شیشے کے جگ میں ٹوٹا ہوا موبائل فون، گوہار زینت کی بدحواسی کی نشانی تھا اور ہمیں دعوت نظارہ دے رہا تھا۔ میری ہلکی پھلکی شرٹ کے نیچے کمر کی طرف بھرا ہوا پستول موجود تھا اور ہم دونوں ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار تھے۔ اندازہ یہی تھا کہ گوہار زینت صورتِ حال کو زیادہ نہیں بگاڑے گی...... اور یہ اندازہ درست ثابت ہوا۔ چار پانچ منٹ بعد گوہار زینت اکیلی ہی ڈرائنگ روم میں واپس آئی۔ اس بار اس نے دروازہ اندر سے بولٹ کر دیا۔ کھڑکیوں کے پردوں پر بھی نگاہ ڈالی کہ برابر ہیں یا نہیں۔

وہ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ کچھ دیر تک صوفے پر بالکل گم صم بیٹھی رہی۔ اس کے اندر جیسے ایک جنگ جاری تھی۔ آخر ٹھہری آواز میں گویا ہوئی۔ ”کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟“

”سب سے پہلے اپنے تینوں ساتھیوں کی فوری رہائی۔ باقی معاملات پر ہم بعد میں بات کریں گے۔“ جمشید صاحب نے کہا۔

ایک لمبے توقف کے بعد وہ بولی۔ ”مجھے اس کے لیے تھوڑا وقت چاہیے...... کم از کم ایک دن۔ مجھے کچھ لوگوں کو

Digest Novels .com

مطمئن کرنا پڑے گا۔"

میں نے کہا۔ "تم ایک دن کی بات کرتی ہو، ہم تمہیں ایک گھنٹا بھی نہیں دے سکتے۔ جس طرح کے جھوٹ اس سردار حویلی میں بولے گئے ہیں اور جس طرح کی مکاریاں یہاں ہوئی ہیں، ہم کوئی رسک نہیں لے سکتے۔ جو کچھ طے ہونا ہے ابھی ہونا ہے۔"

میرے دوٹوک لہجے نے اس کا رنگ پھر زرد کر دیا۔ "مم...... میں سمجھتی ہوں کہ...... جلد بازی میں کام بگڑ سکتے ہیں۔ میں یہاں کوئی اکیلی کرتا دھرتا نہیں ہوں۔ مستان اور اس کے ہزاروں عقیدت مند ہیں، اگر......"

"اگر مگر کچھ نہیں زینت بی بی۔" میں نے بات کاٹی۔ "ہمیں ابھی جواب چاہیے۔ ہاں یا نہ...... باقی رہی اس حرامی مستان کی بات تو اس کی جینڈ بھی بہت جلد بجے گی اور اس طرح بجے گی کہ زمانہ دیکھے گا۔"

چند لمحے پہلے گوھار کے چہرے پر جو سرخی نظر آئی تھی وہ اب مکمل طور پر زردی میں اوجھل ہو چکی تھی۔ وہ بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ بات صرف کل جاں بحق ہونے والے ڈیڑھ درجن بچوں کی ہی نہیں ہے، مولانا رحیم کے بیٹوں کے قتل سمیت درجنوں نہایت سنگین جرائم سردار حویلی کے کھاتے میں پڑنے والے ہیں (ان لمحوں میں شاید وعدہ معاف گواہ والی بات بھی اس کے ذہن میں گونج رہی ہو) اس کا رویہ بتدریج دفاعی ہوتا جا رہا تھا۔ ساری اکڑفوں ناپید ہوتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

گوٹھ کی یہ گرم رات بہت ڈرامائی تھی۔ ڈرامائی اور سنسنی خیز۔ قریباً ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ ہم مسلسل ڈرائنگ روم میں تھے۔ آخر بڑی خاموشی سے ڈرائنگ روم کا اندرونی دروازہ کھلا اور ہمیں گوھار زینت کے دست راست اکبر خاں کی صورت نظر آئی۔ وہ ہمیں لے کر حویلی کی ایک خاموش راہداری میں آیا۔ یہ راہداری آگے جا کر ایک اور طویل لیکن تنگ راہداری سے مل گئی۔ میں اور جمشید صاحب سمجھ گئے کہ یہی وہ خفیہ راستہ ہے جو ہمارے ساتھیوں کے بندی خانے کی طرف جاتا ہے۔

وہ بڑے جذباتی اور پُرجوش لمحے تھے جب ہم نے ایک بند کمرے میں عمران، وقاص اور انوش کو اپنے سامنے پایا۔ یقیناً ان تینوں کو بھی ہماری آمد کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ عمران لپک کر آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ ہم کتنی ہی دیر بغل گیر رہے۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں ہولے سے میرے کان میں بولا۔ "چاچو ڈیئر! بڑے بڑے لوگوں سے بغل گیر ہوا ہوں جن میں انڈیا کی کئی بڑی ایکٹریس بھی شامل ہیں لیکن جتنی ٹھنڈ آپ سے مل کر پڑی ہے کہیں نہیں پڑی۔"

میں نے اسے خود سے جدا کیا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں نمی تھی۔ میں نے اس کی پیشانی چومی اور پھر گلے لگایا۔ اس کے بعد وقاص اور انوش ناگرا کی باری آئی۔ یہ رقت آمیز مناظر تھے۔ مہینوں پہلے اس بھیانک شب میں جب خونخوار چہروں والے قاتل، موت کا روپ دھار کر ہمارے پیچھے تھے، بھکور کے نواحی ٹیلوں میں ہم نے ایک خوفناک لڑائی لڑی تھی...... اور پھر ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ نیم بے ہوش زخمی عمران کو وقاص اور انوش اٹھا کر اس کے لیے زندگی کی تلاش میں بھاگے تھے اور میں نے موت کا راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی تھی۔ اس کے بعد ہم آج ایک دوسرے کی صورتیں دیکھ رہے تھے۔ اکبر خاں جو یقیناً گوھار زینت کا راز دار بھی تھا ایک کونے میں سر جھکائے کھڑا تھا۔ کافی دیر بعد جمشید صاحب نے جذبات سے بھرائی ہوئی آواز میں اکبر خاں سے پوچھا۔ "کہاں ہے تمہاری گوھار زینت؟"

"وہ بیٹھک (ڈرائنگ روم) میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔" اس نے ہم سے نظریں ملائے بغیر جھکے سر کے ساتھ کہا۔

ہمارے اور گوھار کے درمیان طے ہوا تھا کہ فی الوقت ہمارے تینوں ساتھی اسی محفوظ جگہ پر رہیں گے۔ ہم جس وقت چاہیں ان سے مل سکیں گے۔ ہمارے مطالبے پر عمران اور انوش ناگرا (جٹ) کو ایک ایک پستول مع اضافی میگزین فراہم کیا گیا تھا۔ اب رات کے تین بج گئے تھے۔ ہم ایک بار پھر گوھار زینت کے سامنے تھے۔ تاہم اس مرتبہ یہ ایک اور کمرا تھا...... گزر جانے والے پچھلے دو تین گھنٹوں نے گوھار زینت کو کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اس تمام عرصے میں مسلسل سوچ بچار کے گہرے سمندر میں غوطہ زن رہی ہے۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی محسوس ہوتی تھیں اور چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔ میں نے دیکھا اس کے سفید دودھیا ہاتھوں میں ہلکی سی لرزش تھی۔ گھونگھٹ وغیرہ کا تکلف وہ اب قریباً بھول ہی چکی تھی۔

جمشید صاحب نے ٹھہری ہوئی گمبھیر آواز میں کہا۔ "یہ سب کیا ہے گوھار زینت؟ تم نے قریب المرگ سردار گزین سے شادی کی اور پھر اس علاقے کی سردارنی بن کر

digest library.com

بیٹھ گئیں۔ہم کچھ عرصہ پہلے تک یہی سمجھتے تھے کہ تم ان لالچی جوان عورتوں میں سے ہو جو امیر اور بااثر بڈھوں سے ان کی دولت کے لیے شادی کرتی ہیں۔لیکن اب یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ تمہارا لالچ اور تمہارا مقصد کہیں زیادہ سنگین نوعیت کا ہے۔تم یہاں آئی نہیں ہو، تمہیں اس حویلی میں شاید باقاعدہ پلانٹ کیا گیا ہے۔یہاں کے غریب سیدھے، سادہ لوح لوگ جو تمہیں اور تمہارے اس منحوس پوتے کو اپنا نجات دہندہ سمجھ رہے ہیں، احمقوں کی جنت میں ہیں۔بے چارے جانتے نہیں کہ تم ایک آفت کی طرح ان پر نازل ہوئی ہو۔سردار گزین سے کہیں زیادہ بڑی آفت۔"

ہمارا خیال تھا کہ شاید وہ جواب میں کچھ بولے گی لیکن اس کے ہونٹوں پر تو جیسے چپ کا تالا لگ گیا تھا۔وہ سر اٹھا ہی نہیں پا رہی تھی۔

"خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔" جمشید صاحب نے کہا۔"فی الحال تو ہم تمہاری ذاتی زندگی اور نجی معاملات پر ششدر ہیں۔تمہاری اس شرمناک وڈیو کو کوئی جرگہ، پنچایت کوئی عدالت جھٹلا نہیں سکتی۔یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے تمہارے، اور تمہارے چاہنے والوں کے لیے۔"

یکا یک گوہار زینت نے اپنے بال دونوں مٹھیوں میں جکڑے اور سر اپنے گھٹنوں میں گھسا دیا۔زور سے چلّائی۔"چپ ہو جائیں...... خدا کے لیے چپ ہو جائیں۔آپ کچھ نہیں جانتے یہاں جو کچھ ہو رہا ہے...... اور ہونے والا ہے...... یہ ایک بڑا گورکھ دھندا ہے۔ایک بڑی سازش ہے......"

دفعتاً اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔اس لرزش کے سبب کلائیوں کی جڑاؤ طلائی چوڑیاں خود بخود ہی جھنجھنا رہی تھیں۔میں نے اور جمشید صاحب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

باہر غالباً آندھی چلنا شروع ہو گئی تھی، کسی قریبی کمرے کا دروازہ ہوا ہی کے سبب دھماکے سے بند ہوا۔

گوہار زینت بُری طرح ٹھٹک کر رہ گئی۔یہ وہ رعب دار اکڑفوں والی گوہار زینت لگتی ہی نہیں تھی جو کل تک اس حویلی پر اور یہاں کے لوگوں پر راج کر رہی تھی۔اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ کاغذ اور گتے وغیرہ سے بنی ہوئی ایک پُرشکوہ عمارت چند ہی جھٹکوں سے زمین بوس ہو گئی ہے۔

اس نے اپنی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں ہماری طرف اٹھائیں اور ڈرامائی لہجے میں سرگوشی کی۔"دیکھو...... یہاں میری جان کو شدید خطرہ ہے۔وہ مجھے مار ڈالیں گے۔کسی بھی وقت مجھے لاش بنا دیں گے۔ان کے ہاتھ آپ لوگوں کے خیال سے زیادہ لمبے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں؟ مستان اور اس کے ساتھی؟"

اس نے نفی میں سر کو جنبش دی۔"نہیں...... فی الحال میں آپ لوگوں کو کچھ نہیں بتا سکتی۔"

اس نے ایک بار پھر سر کے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے اور اپنی ٹھوڑی گردن سے لگا دی۔وہ بہت بڑے جرائم کی مرتکب ہو چکی تھی۔اسکول والا سانحہ کوئی چھوٹا تو نہیں تھا۔ایسے مجرم جب پھانسی کا پھندا اپنے گلے کی طرف آتے دیکھتے ہیں تو سارا ملبا کسی دوسرے پر ڈالنے کی کوشش بھی کیا کرتے ہیں، یہاں بھی یہی صورتِ حال ہو سکتی تھی، تاہم یہ امکان بھی تھا کہ گوہار زینت کے بیانیے میں سچائی کا عمل دخل ہو۔

ایک دم اُس نے اپنا سر اٹھایا۔وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئی تھی۔ہماری طرف دیکھ کر بولی۔"آپ مجھے اریسٹ کر لیں...... اپنی تحویل میں لے کر اپنی سیکیورٹی کے ساتھ مجھے یہاں سے لے جائیں۔جتنی جلدی ہو سکتا ہے، یہ کام کر لیں۔"

یہ چونکا دینے والی پیشکش تھی۔اس کے پیچھے کوئی چال تھی...... یا پھر واقعی وہ اتنی خوف زدہ تھی کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی۔ابھی چند گھنٹے پہلے تک وہ اس حویلی اور علاقے کی آن بان تھی۔یہاں کے سیاہ و سفید کی مالک...... اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ اریسٹ ہونا چاہتی ہے۔

میں نے کہا۔"کیا تم یہ چاہتی ہو کہ ہم تمہیں اریسٹ کر کے یہاں سے لے جانا چاہیں اور علاقے کے لوگ ہم پر حملہ کرنے کے لیے گھروں سے نکل آئیں؟ جب تک تمہاری اصلیت کا پتا عام لوگوں کو نہیں چل جاتا، ہم یہ رسک نہیں لے سکتے۔"

"میں...... کب کہتی ہوں، سرِعام مجھے پکڑیں۔بس اپنی سیکیورٹی میں مجھے یہاں سے لے جائیں۔"

"کون لوگ ہیں جن سے خوف زدہ ہو؟"

"مم...... میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گی۔مگر جو کام فوری کرنے کا ہے وہ یہی ہے جو آپ دونوں کو بتا رہی ہوں۔"

سچویشن اتنی تیزی سے تبدیل ہو رہی تھی کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

جمشید صاحب نے پوچھا۔"کیا تم اپنے 'پوتے' شاہ خانو کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی ہو؟"

Digest Novels .com

"نہیں، اس کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

"اور وہ باسٹرڈ صف شکن..... مستان کا ساتھی...... جس نے تمہارے حکم پر ڈیڑھ درجن معصوموں کی جان لی ہے۔" میں نے زہرناک لہجے میں پوچھا۔

گوھار زینت کا زرد رنگ کچھ اور بھی ہلدی ہو گیا۔ کوئی جواب نہیں بن پڑ رہا تھا اُس سے۔ ہونٹ نیلگوں اور جسم لرزتا جا رہا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود ہم سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔ سر جھکائے جھکائے کراہی۔ "مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہنا۔ آپ چاہتے ہیں تو اسے بھی ضرور گرفتار کریں۔"

وہ مسلسل رو رہی تھی لیکن اس کے لیے ہمدردی کا شائبہ تک میرے دل میں نہ تھا۔ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میرے ہاتھوں میں سے نکل کر میرے سامنے آتشیں ملبے میں دب جانے والے بچے کا چہرہ برق کی طرح گاہے بگاہے میری آنکھوں میں لہراتا تھا اور روح کو خاکستر کر دیتا تھا۔

گوھار زینت کی زبانی مستان کے اس درندہ صفت ساتھی کا نام بخت زمانی معلوم ہوا جس نے کم و بیش اٹھارہ بچوں کے لیے ان کے اسکول کا پہلا دن ان کی دردناک موت کا دن بنا دیا تھا۔ جمشید صاحب اور میں نے دوسرے کمرے میں جا کر مشورہ کیا اس مشورے کے لیے سب انسپکٹر ننگشکوری کو بھی وہیں بلا لیا گیا۔ (ننگشکوری اب تک بے حد باصلاحیت اور کارگر نوجوان ثابت ہوا تھا)

آپس میں مشورے کے بعد ہم نے ریز رو نفری کے انسپکٹر دلاور سے بھی فون پر بات کی۔ یہی طے ہوا کہ جو کچھ بھی کرنا ہے صبح ہونے سے پہلے ہی کر لیا جائے۔ ہم نے مقامی زمیندار کے احاطے میں موجود نفری کو بھی پوری طرح الرٹ کر دیا۔

علی الصباح چار بجے جب پورا گوٹھ نیند میں تھا اور گلی کوچوں میں آندھی کے جھکڑ چل رہے تھے، ہم نے بڑی خاموشی کے ساتھ اپنے تینوں ساتھیوں یعنی عمران، وقاص اور انوش جٹ کو حویلی کے عقبی راستے سے زمیندار کے احاطے میں، ریز رو نفری کی گاڑیوں تک پہنچا دیا۔ اس دوران میں انوار ننگشکوری نے حویلی کے مہمان خانے میں سوئے پڑے بخت زمانی کو جا لیا تھا۔ انوار ننگشکوری کے ساتھ اسپیشل پولیس کے سات آٹھ جوان بھی تھے۔ بخت زمانی کو کسی طرح کے شور شرابے یا مزاحمت کا موقع ہی نہیں دیا گیا..... گوھار زینت کی ہدایت پر اکبر خاں ہمارے ساتھ پورا تعاون کر رہا تھا۔ بالکل آخر میں گوھار زینت بھی ایک بڑی سیاہ چادر میں لپٹی لپٹائی اس احاطے میں پہنچا دی گئی جہاں پولیس کی گاڑیاں تیار کھڑی تھیں۔ زانی بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کے علاوہ ہم نے اس تاجک لڑکی دلربا کو بھی حویلی سے نکال لیا تھا جس نے اس کیس میں ہمیں اہم ترین سراغ دیا تھا۔ درحقیقت یہ دلربا ہی تھی جس نے ہمیں آگاہ کیا تھا کہ ہمارے تینوں مغوی افغانیوں کے پاس نہیں سردار حویلی والوں کے پاس ہیں۔ زرقاب خاں کے ظلم و ستم سے رہائی پانے کے بعد دلربا کی صحت اب خاصی بہتر تھی۔

گوھار زینت بُری طرح نروس دکھائی دیتی تھی۔ اس کی حالت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کا بدن بے طرح لرز رہا تھا اور یہ لرزش اس چادر میں بھی صاف محسوس کی جا سکتی تھی جس میں وہ سرتاپا لپٹی ہوئی تھی۔ پولیس کی گاڑیوں میں ایک بکتر بند نما گاڑی بھی تھی۔ جمشید صاحب اور میں نے فیصلہ کیا تھا کہ زینت کے غیر معمولی خوف اور سیکیورٹی خدشات کے پیشِ نظر اسے بکتر بند گاڑی میں ہی سوار کرایا جائے۔ مجھے اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانا پڑا۔ اس کی ایک خاص ملازمہ سدرہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ وہ سدرہ سے مخاطب ہو کر شکستہ آواز میں بولی۔

"میرے شولڈر بیگ میں سے میری دوا نکالو۔"

ملازمہ نے قیمتی بیگ میں سے ایک میڈیسن نکال لی۔ یہ "ایٹی وان" تھی۔ میرے سامنے گوھار زینت نے اکٹھی تین گولیاں نگلیں اور نشست سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ وہ اپنی اندرونی بے چینی کم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو ڈوز اس نے لی تھی وہ خطرناک تو نہیں تھی مگر اسے دنیا و مافیہا سے بے خبر کرنے کے لیے کافی تھی۔

حفاظت کے پیشِ نظر ہم زانی اور تاجک دلربا کو بھی بکتر بند میں سوار کرانا چاہتے تھے مگر دلربا کو بکتر بند میں بیٹھتے ہوئے گھبراہٹ محسوس ہوئی۔ اسے جمشید صاحب اور مقامی انسپکٹر کے ساتھ ایک دوسری جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ میں جس جیپ میں سوار ہوا، اس میں ننگشکوری کے علاوہ میرے ساتھ عمران، وقاص اور انوش جٹ تھے۔

وقت بہت کم تھا۔ اب کسی بھی وقت گہرے اندھیرے میں اُجالے کی آمیزش ہو سکتی تھی۔ دو گاڑیوں میں چھوٹے کینوں کے ذریعے پیٹرول ڈالا جا رہا تھا..... ننگشکوری نے کہا۔ "یہ بخت زمانی بڑا خطرناک ہے جی۔ اوپر سے نشے میں بھی تھا۔ لیکن اس کا نشے میں ہونا ہمارے فائدے میں ہی گیا۔ جب تک وہ پوری طرح سنبھلا، ہم اسے ہتھکڑی لگا چکے تھے۔"

Digest Novels .com

''اب وہ کس گاڑی میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

ملنگوری نے اسٹیشن ویگن کی طرف اشارہ کیا۔ جس میں کوئی دس عدد اہلکار سوار تھے۔ ''آپ فکر مند نہ ہوں جی۔ پوری طرح مشکیں کس دی ہیں حرامزادے کی۔''

اسی دوران میں جمشید صاحب نے ملنگوری کو اپنی والی جیپ میں بلا لیا۔ (گوھار زینت کا دستِ راست اکبر خاں بھی اسی جیپ میں تھا) یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ اب میں اپنے ہمسفروں عمران اور اس کے دونوں ساتھیوں کے ساتھ آزادانہ گفتگو کر سکتا تھا۔

میں نے سردار حویلی پر نگاہ دوڑائی۔ پوری حویلی میں فی الحال چند جگہوں پر ہی روشنی تھی۔ مکمل سکوت تھا۔ بس کسی وقت باڑے کی طرف اونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں یا مویشیوں کی گھنٹیاں سنائی دیتی تھیں۔ یقیناً گوھار زینت نے شاہ زیب اور اپنے پوتے شاہ خانو وغیرہ کو پوری طرح مطمئن کر دیا تھا کہ خطرے، پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم سب کا یوں سردار حویلی سے نکل آنا آسان نہ ہوتا۔ جو تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی، وہ گوھار زینت کے وفادار اکبر خاں نے پوری کر دی تھی۔ اس نے نہ صرف شاہ خانو وغیرہ کو مطمئن کرنے میں گوھار زینت کا ساتھ دیا تھا بلکہ بڑی حکمت سے..... مسلح پہریداروں کو ہمارے راستے سے دائیں بائیں کر دیا تھا۔ گرد و غبار سے اٹی ہوئی آندھی بھی کسی حد تک ہمارے لیے آسانی پیدا کر رہی تھی۔

گاڑیاں بڑی ترتیب کے ساتھ گوٹھ کی حدود سے نکلیں۔ گوھار زینت والی بکتر بند کو درمیان میں رکھا گیا تھا۔ آگے پیچھے اسپیشل فورس کی گاڑیاں تھیں۔ گوٹھ جبرہ نوشیر سے قریباً پانچ کلومیٹر آگے آنے کے بعد ہمیں کچھ سکون محسوس ہوا۔ میں نے اپنے ساتھ بیٹھے عمران کو دھیان سے دیکھا۔ پچھلے چند مہینوں میں اس کا وزن کچھ کم ہوا تھا۔ وقاص جمالی اور انوش بھی دُبلے نظر آتے تھے۔ خوشنما داڑھی والا نیک صورت وقاص جمالی...... اپنے دو بھائیوں کی المناک موت کا غم جیسے کئی ماہ بعد بھی اس کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس غم میں اس کے کزن دوست مصطفیٰ کی موت کا دکھ بھی یقیناً موجود تھا۔

''کیسے ہو وقاص؟'' میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں جی...... میری سمجھ میں نہیں آتا کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ خدا کی ذات کے بعد آپ ہی ہیں جنھوں نے مجھے موت کے منہ سے نکالا۔'' اس نے جذباتی انداز میں پہلے میرے اور پھر عمران کے گھٹنے چھونے کی کوشش کی جسے ہم نے ناکام بنایا۔

مجھے وقاص کی وہ باپردہ شرمائی لجائی منگیتر ابھی تک یاد تھی جو یقیناً جبرہ نوشیر میں اس کی جدائی کی گھڑیاں گن گن کر گزار رہی تھی۔

وقاص، عمران اور انوش کے ساتھ کرنے کی تو بے شمار باتیں تھیں لیکن فی الحال ہم ضروری باتوں تک محدود رہنا چاہتے تھے۔

میرے کہنے پر عمران نے اپنی شرٹ اٹھا کر مجھے اپنے کندھے کا وہ کئی ماہ پرانا زخم دکھایا جس نے اسے قریباً موت کے جبڑوں میں پہنچا دیا تھا۔ اب زخم کا بس نشان ہی تھا۔

عمران نے مجھ سے جو پہلا سوال پوچھا، وہ ماہین کے بارے میں ہی تھا۔ ''چاچو جان! وہ خیریت سے ہے نا؟''

''ہاں...... اور تمہاری خیریت کے لیے اتنی پریشان ہے جتنا کوئی بھی کسی کے لیے ہو سکتا ہے۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''اب تو کوئٹہ میں ہے لیکن تمہاری تلاش میں بہت بھٹکتی رہی ہے۔ بہت ہی زیادہ۔''

''تو کیا آپ نہیں بھٹکے؟''

''میرا بھٹکنا تو تمہارے سامنے ہی ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''پھر اتنی دیر کیوں لگی جناب۔ مہینوں ہی گزر گئے۔ میں تو اب سوچ بیٹھا تھا کہ یہیں کسی گھریلو سی [illegible] پاس لڑکی سے شادی کر لوں اور دنیا جہان کی بدحادثوں سے نمٹنے کے ساتھ ساتھ اپنا جنازہ بھی جائز کرا لوں۔''

میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ ''عمران! تمہاری تلاش میں دیر اس لیے ہوئی کہ سات آٹھ مہینے میں اس دنیا میں ہی نہیں تھا۔''

''ہائیں، یہ کیا بات ہوئی؟''

''سمجھو کہ ایک حادثے کے بعد وہ سات آٹھ مہینے میری زندگی سے منفی ہو گئے تھے۔ لمبی کہانی ہے۔ یہ سفر ختم ہو جاتا ہے تو تمہیں سناتا ہوں......''

ابھی میرا فقرہ بمشکل مکمل ہوا تھا کہ ایک گاڑی اچانک دائیں جانب سے دکھائی دی۔ یہ کوئی چھوٹی گاڑی نہیں تھی۔ ریت سے لدی ہوئی ٹریکٹر ٹرالی تھی۔ ہم ایک تنگ پُل پر سے گزر رہے تھے۔ پولیس گارڈز کی جیپ اور بکتر بند نما گاڑی پُل پار کر چکی تھی۔ جبکہ باقی قافلہ ابھی پُل

Digest Novels .com

پر تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی اتنی تیزی سے آئی اور پُل کے جنگلے سے ٹکرائی کہ کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ راستہ مسدود ہو گیا۔ درحقیقت اس ٹریکٹر ٹرالی نے آناً فاناً باقی قافلے کو بکتر بند اور پولیس جیپ سے علیحدہ کر دیا تھا۔

''یہ کیا ہوا؟'' عمران نے چونک کر پوچھا۔

میرے ذہن میں خطرے کی بے شمار گھنٹیاں بج اٹھی تھیں۔ دھیان سیدھا جس کی طرف گیا تھا وہ ''مستان'' ہی تھا۔ اب یہ ثابت ہو چکا تھا کہ مستان اور سردار حویلی اندر سے ایک ہی ہیں۔ اب ہم سردار حویلی کی کرتا دھرتا گوہار نازنینت کو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ غالب امکان یہی تھا کہ اس کی اطلاع مستان اور اس کے صف شکنوں کو ہو چکی ہے اور جیل توڑ کر بھاگا ہوا مستان اپنی دانست میں گوہار نازنینت کو چھڑانے کے لیے یہاں پہنچ گیا ہے۔

ایک دم ہی ہمارے پورے قافلے میں کھلبلی مچ گئی۔ اندازہ یہی ہوتا تھا کہ ٹریکٹر ٹرالی والا اپنا کام کرنے کے بعد ٹرالی چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ اب ٹرالی نہ صرف ہمارا راستہ بلکہ نظر کا راستہ بھی مسدود کر چکی تھی۔ یکا یک اوپر تلے کئی فائر سنائی دیے۔ ملگجے اندھیرے میں ہم چھلانگیں لگا کر گاڑیوں سے اترے۔ آندھی کے ریتیلے جھکڑوں کے سبب آنکھیں پوری طرح کھل بھی نہ پا رہی تھیں۔

تب میں نے دو افراد کو تیزی سے بکتر بند کی طرف لپکتے دیکھا اور یہی لمحے تھے جب مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہماری گاڑیوں پر حملہ کرنے والا مستان نہیں۔ یہ سردار حویلی کے شاہ خانو کا قریبی دوست اور میرا نیا حریف وہی شاہ زیب تھا۔ میں نے اسے اس کے قد کاٹھ اور بھاگنے کے انداز سے پہچانا۔ کافی فاصلے سے بھی مجھے اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل صاف نظر آئی۔ بے حد تیزی سے وہ بکتر بند کی دوسری جانب اوجھل ہوا۔ اس کا دوسرا مسلح ساتھی بکتر بند کی فرنٹ سائڈ کی طرف گیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں نے بکتر بند کا دروازہ کھلتے ہوئے دیکھا۔ یقیناً شاہ زیب اور اس کے ساتھی نے بکتر بند کے ڈرائیور اور گن مین کو ''گن پوائنٹ'' پر رکھ کر دروازہ کھلوا لیا تھا۔

گشکوری میرے پاس آن کھڑا ہوا تھا، چلا کر بولا۔ ''سر! یہ لوگ اندر گھس گئے تو پھر کچھ نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں فائر کرنا چاہیے۔''

گشکوری ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا، اتنی تیزی سے ہو رہا تھا کہ بے بسی والی صورت حال بن گئی تھی۔ ہم تنگ پُل پر تھے اور ٹریکٹر ٹرالی نے راستہ مکمل بلاک کر دیا تھا۔ میرے اشارے پر پولیس کے اہلکاروں نے ٹرالی کے پیچھے پوزیشن لی اور فائر کھولا۔ فضا لرزہ خیز تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ہم ٹریکٹر کے اوپر چڑھ کر دوسری طرف اترنے کی کوشش کر رہے تھے جب میں نے بکتر بند کو نہایت تیزی سے موڑ کاٹتے اور درختوں کی جانب جاتے دیکھا۔

''وہ بھاگ رہے ہیں سر۔'' گشکوری چلایا اور سیدھا برسٹ مارا۔ بکتر بند پر کلاشنکوف کا یہ برسٹ، غلیل سے پھینکے جانے والے کنکروں سے بڑھ کر نہیں تھا۔ پولیس فورس کی جو گاڑی بکتر بند سے آگے تھی، اس میں سے بھی بکتر بند پر فائر ہو رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بکتر بند درختوں اور آندھی کے جھکڑوں میں گم ہو گئی۔ میں بھاگتا ہوا اس اکلوتی جیپ تک پہنچا جو ٹریکٹر ٹرالی کی دوسری جانب تھی۔

''پیچھا کرو۔'' میں نے جیپ میں سوار ہوتے ہوئے بلند آواز سے کہا۔

جیپ نے تیزی سے یوٹرن لیا۔ اور تب ہی مجھے پتا چل گیا کہ ہم پیچھا نہیں کر سکیں گے۔ جیپ کا دایاں اگلا ٹائر برسٹ ہو چکا تھا۔ دراز قد شاہ زیب کی شبیہ نگاہوں میں گھومی اور خون کھول کر رہ گیا۔ چند سیکنڈ میں اس نے ہماری ساری سیکیورٹی کو تہس نہس کر ڈالا تھا۔ میں نے اب تک یہی سنا تھا کہ وہ ایک خطرناک مارشل آرٹسٹ ہے لیکن اب پتا چل رہا تھا کہ وہ کئی اور لحاظ سے بھی خطرناک ہے...... بلکہ غیر معمولی خطرناک۔

جمشید صاحب وائرلیس پر اس ڈرامائی واردات کا پیغام چلا چکے تھے۔ اگر اردگرد کی پولیس زیادہ سست نہیں تھی تو پانچ دس منٹ کے اندر اسے پوری طرح حرکت میں آجانا چاہیے تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی والا چابی نکال کر بھاگا تھا لہٰذا اسے فوری طور پر راستے سے ہٹانا ممکن نہیں تھا۔ پولیس اہلکار اسے دھکیل کر حرکت میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسی دوران میں کسی طرح عمران اور انوش نے تار وغیرہ جوڑ کر ٹریکٹر کو اسٹارٹ کر لیا اور پُل کا راستہ کھول دیا۔ بکتر بند یقیناً اب دور جا چکی تھی۔ تاہم پیچھا کرنے کے سوا ہم اور کیا کر سکتے تھے۔ جمشید صاحب ہمارے والی جیپ میں آن بیٹھے تھے۔ وہ وائرلیس پر مسلسل پیغامات جاری کر رہے تھے۔ ان کی پیشانی پر پسینے کی نمی تھی اور پریشانی کی یہ کیفیت شاید سب کے ساتھ ہی تھی۔

جمشید صاحب نے وائرلیس بند کرتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ ''یہ بندہ تو ہماری توقع سے کہیں زیادہ عیار نکلا۔ لگتا ہے کہ زبردست منصوبہ ساز بھی ہے۔''

"یہ صرف ایم ایم اے فائٹر ہی نہیں ہے۔" مشکوری نے کہا۔ "سنا ہے کہ برونائی یا جاماجی میں سیکیورٹی کا کوئی بڑا عہدہ بھی ہے اس کے پاس۔"

میں نے پُرپیچ راستے پر ڈرائیو کرتے ہوئے کہا۔ "سچویشن سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو رات ہی خبر ہوگئی تھی کہ ہم گوھار زینت کو گرفتار کر کے یہاں سے لے جانے والے ہیں لیکن انہوں نے سردار حویلی میں ہمارے خلاف مزاحمت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ راستے میں کارروائی ڈالی ہے۔"

"ایک بار پھر اس بندے کی غیر معمولی چالاکی ثابت ہوتی ہے۔" جمشید صاحب دل گرفتہ لہجے میں بولے۔ "اسے اور اس کے ساتھیوں کو ہمارے راستے کا علم تھا اور انہوں نے بہترین مقام چنا۔"

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ "جیسا کہ آپ کہتے ہیں گوھار زینت بظاہر گرفتار ہے لیکن اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ آئی ہے تو پھر وہ اپنے ان خیر خواہوں کے ساتھ کیوں چلی گئی ہے؟"

عمران کا سوال قرار واقعی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ زینت نے ٹرنکولائزر لے رکھی ہے اور غالب امکان یہی ہے کہ بھاری ڈوز کے سبب وہ اس وقت نیم بے ہوشی کی کیفیت میں ہے۔

اب ایک اور گرم دن کا جلتا ہوا سورج طلوع ہو چکا تھا۔ بکتر بند کا دور دور پتا نہیں تھا۔ نہ ہی ٹریکٹر ٹرالی والے کا کوئی کھوج ملا تھا۔ اب ہمارے پاس دو راستے تھے۔ ہم بھی دیگر پارٹیوں کی طرح تلاش جاری رکھیں یا پھر واپس گوٹھ پہنچیں اور اس سراغ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں، جو ہمارے پاس ہمارے قبضے میں تھا۔ میری مراد اس شقی القلب دہشت گرد بخت زمانی سے ہے جسے ہم گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔

میرا ذہن اور کسی حد تک جمشید صاحب کا ذہن بھی یہی کہتا تھا کہ ہمیں اب واپس گوٹھ حجرہ نوشیر نہیں جانا چاہیے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس خیال کی تائید بھی ہوگئی۔

وائرلیس پر جمشید صاحب کو جو پیغام موصول ہوا اس سے پتا چلا کہ گوھار جی یعنی گوھار زینت کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح علاقے میں پھیل گئی ہے۔ لوگ ٹولیوں اور گروہوں کی شکل میں گوٹھ کی طرف آ رہے ہیں اور سردار حویلی کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی "گوھار جی" کے حق میں نعرہ زنی کر رہے ہیں اور پولیس کے خلاف آگ بگولا ہیں۔

وہ سادہ لوح لوگ کیا جانتے تھے کہ ان کی گوھار جی کے کالے کرتوت کیا ہیں اور وہ اس وقت کس طرح پشیمانی اور پچھتاوے کے گہرے پانی میں غوطے کھا رہی ہے۔

جمشید صاحب کی کشادہ پیشانی پر سوچ کی گہری شکنیں تھیں۔ آخر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے۔ "ہم نوشکی چلیں گے۔ وہیں چل کر بخت زمانی سے تفتیش بھی کرتے ہیں۔"

گوھار زینت کے الفاظ بار بار میرے کانوں میں گونجتے تھے اور رگوں میں لہو کی گردش تیز کرتے تھے...... یہ ایک گہری سازش کے تانے بانے ہیں، بہت گہری سازش کے۔

☆☆☆

ہم نوشکی پہنچ چکے تھے۔ یہاں ہمارا قیام نوشکی کی متوسط آبادی سے کوئی ایک کلومیٹر دور ایک پرانی عمارت میں تھا جو کبھی کبھی سرکاری استعمال میں بھی ہوتی تھی۔ کشادہ عمارت کے اردگرد احاطے میں مقامی درخت لگائے گئے تھے۔ عمارت کی طرح چار دیواری بھی زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھی۔

بکتر بند گاڑی کو غائب ہوئے اب بارہ گھنٹے ہونے کو آئے تھے۔ ہمیں حجرہ نوشیر کی خبریں بھی مسلسل مل رہی تھیں۔ ان خبروں کا ذریعہ اکبر خاں کا ایک دوست تھا جو بڑی رازداری کے ساتھ فون پر اسے اطلاعات دے رہا تھا۔ لوگ مشتعل تھے۔ پولیس کو گوٹھ میں سے مکمل طور پر نکال لیا گیا تھا۔ یہ بھی پتا چلا تھا کہ گوھار کا "پوتا" جو اس کا ہم عمر ہی تھا گوٹھ میں ہی ہے۔ وہ بڑے دھواں دھار بیانات دے رہا تھا۔ لوگوں کو اشتعال دلا رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ سردار حویلی کے وقار کو تاراج کیا گیا ہے۔ پورے علاقے کی مقبول اور ہر دلعزیز گوھار زینت جی کو مردانہ پولیس نے رات کے اندھیرے میں گرفتار کیا اور چوروں کی طرح لے کر نکل گئے۔ وہ اس ساری کارروائی کی زیادہ تر ذمے داری مجھ پر ہی ڈال رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا۔ "یہی بدطینت ڈپٹی ہے جو چند ماہ پہلے بھی اسی طرح گوٹھ میں آیا تھا اور فساد کا سبب بنا تھا۔ بجائے اس کے کہ یہ پولیس والے ان لوگوں کو گرفتار کرتے جنہوں نے گوٹھ کے اسکول میں دھماکے کر کے معصوم بچوں کی جانیں لیں، یہ اس عورت کو گرفتار کر کے لے گئے جو دن رات اپنے علاقے کے لوگوں کی بھلائی کے کام کر رہی ہے اور اس سانحے پر غم سے چُور ہے۔"

یقیناً شاہ خانو وغیرہ کو معلوم ہو چکا ہوگا کہ ان کے

"خاص ہمدرد" شاہ زیب نے ایک تیز رفتار کارروائی کر کے گوہار زینت کو چھڑا لیا ہے لیکن وہ عام لوگوں سے یہ بات چھپا رہے تھے۔ شاید ابھی لوگوں کا اشتعال برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

میرے فون پر کال کے سگنل آئے۔ میں نے کال ریسیو کی اور دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز پہچان کر حیران رہ گیا۔ یہ اسی شاہ زیب کی آواز تھی جو کھل کر سامنے آرہا تھا۔ بڑی ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔ "کیا حال ہے ڈپٹی انکل! مجھے لگتا ہے کہ فی الحال کافی تکلیف میں ہو گئے تم۔ یہ تکلیف تم نے خود مول لی ہے۔ بہت بڑی حماقت ہوئی ہے تم سے۔"

"ہم نے جو کچھ کیا ہے، قانون کے مطابق کیا ہے۔"

"غلط...... تم نے جو کچھ کیا ہے اپنے تکبر اور ہٹ دھرمی کے مطابق کیا ہے۔ تم نے اور تمہارے ساتھیوں نے ایک آن بان والی خاتون کو بے عزت کیا ہے۔ اس سے ذاتی رنجشیں چکائی ہیں اور اس کی سزا میں تمہیں دے کر رہوں گا...... اور ہاں اس فون کی لوکیشن وغیرہ ٹریس کرنے کی جرأت نہ کرنا...... یہ ٹریس نہیں ہوگی۔" وہ بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔

"ہمارے تینوں مغوی سردار حویلی سے برآمد ہوئے ہیں، کیا یہ ہماری ذاتی رنجشیں ہیں؟"

اس نے ہلکا سا طنزیہ قہقہہ لگایا۔ "تم تو وہ لوگ ہو جو ایک اسکوٹر میں سے دو من چرس برآمد کر سکتے ہو۔ حویلی سے تمہارے ساتھیوں کا برآمد ہونا کون سی بڑی بات ہے۔"

"اچھا...... تمہاری وہ باعزت، آن بان والی خاتون اس بارے میں کیا کہہ رہی ہے؟"

"وہ جو کچھ کہہ رہی ہیں، وہ بھی ہماری سمجھ میں آنا شروع ہو گیا ہے۔ تم لوگ کسی طریق انہیں بیدردی سے بلیک میل کر رہے ہو...... لیکن اطمینان رکھو...... تمہاری اس خباثت کا کھوج بھی میں جلد ہی لگا لیتا ہوں...... اور ہاں ڈپٹی! ایک بات کان کھول کر سن لو۔ اگر گوٹھ میں شاہ خانو یا گوہار جی کے دیگر وارثوں سے کوئی زیادتی ہوئی تو جو سلوک تمہارے ساتھ ہوگا، وہ تا زندگی یاد رکھو گے۔"

"تم اصلیت سے بے خبر ہو، اسی لیے خالی دیگچے کی طرح بجتے چلے جا رہے ہو ورنہ تم......" اچانک مجھے چپ ہونا پڑا۔ وہ فون بند کر چکا تھا۔

میں نے اسے کال بیک کرنے کی کوشش کی مگر دوسری طرف مکمل سناٹا تھا۔ غالباً اس نمبر پر کال کی نہیں جاسکتی تھی۔

علاقے کے عام لوگوں کی طرح یہ شاہ زیب بھی بہت طیش میں لگ رہا تھا۔ وجہ یہی تھی کہ یہ لوگ حقیقت سے بے خبر تھے۔ انہیں حقیقت سے آگاہ بھی کیا جاتا تو شاید وہ اتنی جلدی یقین نہ کر پاتے۔ مجھے کچھ فکر زعفران یعنی زانی کی طرف سے بھی لاحق ہونا شروع ہو گئی تھی۔ وہ اسی بکتر بند میں تھی جو اب شاہ زیب اور اس کے ساتھیوں کے قبضے میں تھی۔ زانی نوجوان اور خوب صورت تھی۔ شاہ زیب خود تو ذرا اور طرح کا بندہ لگتا تھا۔ اس کے حوالے سے خوش گمانی رکھی جاسکتی تھی مگر اس کے مددگار ساتھیوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ زانی کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جاتی تو میں خود کو کبھی معاف نہ کر سکتا۔ اسی طرح کے اندیشے تھے جن کے سبب میں نے اسے خود سے دور کر کے عطا خاں کے سپرد کر دیا تھا مگر وقت کا پہیا گھوم گھما کر اسے پھر میرے آس پاس لے آیا تھا۔ زانی ہی تھی جس نے سردار حویلی میں حالات کا پانسا پلٹ دینے والی وڈیو بنائی تھی، اگر کسی جبر یا تشدد کے سبب یہ اعتراف اس کی زبان پر آجاتا تو وہ سخت ترین مصیبت میں پھنس جاتی۔

اسی دوران میں کوئٹہ سے ماہین کی کال آگئی۔ اسے کسی طرح پتا چل گیا تھا کہ چاغی کے نواحی گوٹھ میں پولیس نے ایک اہم آپریشن کیا ہے اور امید ہے کہ تینوں مغویوں کے بارے میں کوئی مثبت خبر ہے۔ ماہین کی آواز تجسس، اندیشے اور امید کے ملے جلے جذبات سے لرز رہی تھی، اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ "کوئی اچھی خبر سنائیے گا تابش انکل۔ وہ مل گیا ہے نا؟"

"ہاں ماہی...... مل گیا ہے۔" میں نے ٹھہری آواز میں کہا۔

"وہ ٹھیک ہے نا...... بالکل سلامت ہے نا...... تندرست ہے نا......؟" وہ بے تاب تھی۔

"ہاں ماہی...... ہماری دعائیں اور کوششیں رنگ لائی ہیں۔ اس کے دونوں ساتھی بھی صحیح سلامت ہیں۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ آج یا کل صبح اس سے تمہاری بات کرا سکوں۔"

وہ جلدی سے بولی۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نوشکی میں کہیں ہیں۔ نوشکی کا فاصلہ تو یہاں سے زیادہ نہیں سو ڈیڑھ سو کلو میٹر ہوگا...... آپ...... ایسا کریں ابھی میری بات نہ کرائیں۔ میں خود آتی ہوں وہاں۔ سرپرائز دیتی ہوں اُسے۔"

"دیکھو ماہی! ہر وقت سرپرائز کے چکر میں نہ رہا

Digest Novels.com

کرو۔ دیکھو پہلے بھی سرپرائز ہی کے چکر میں تم دونوں آپس میں بات کرتے کرتے رہ گئے تھے۔"

"لیکن اس دفعہ کچھ نہیں ہوگا۔ میں بس نکل رہی ہوں یہاں سے۔ آپ مجھے بس اپنی لوکیشن بھیجیں۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ آنے پر تُلی ہوئی تھی۔ خودسر تو تھی ہی، مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ کہیں بغیر اتے پتے کے ہی روانہ نہ ہو جائے۔ میں نے اسے ضروری ہدایات دیں اور پھر ایک اہلکار کا انتظام بھی کیا جو سادہ کپڑوں میں اس کے ساتھ یہاں تک آسکے۔

محبت کی یہ ایک معصوم دل گداز سی کہانی تھی جو اب تک کسی واضح اظہار کے بغیر ہی چلتی آرہی تھی۔ اظہار کی وہی جھجک جو محبت کرنے والے جوڑوں میں پیدا ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی اٹل ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس جھجک کی شدت اس رُوداد میں ماہین کی طرف سے زیادہ تھی۔ لیکن اب چونکہ وہ ہشام سے منہ موڑ کر ہر طرح کی بندش سے آزاد ہو چکی تھی، لہٰذا عمران سے وہ سب کچھ کہہ دینا چاہتی تھی جو اب تک نہ کہہ سکی تھی۔

اب ہمیں جو سب سے پہلا کام کرنا تھا، وہ یہی تھا کہ بخت زمانی کی زبان کھلوائی جاسکے۔ کوماری زینت نے اندرون خانہ کسی گہری خطرناک سازش کا ذکر کیا تھا جو اس علاقے میں اور کچھ دیگر علاقوں میں پروان چڑھ رہی تھی۔ یہ بات عین ممکن تھی کہ مستان کا یہ اہم ساتھی بھی اس سے باخبر ہو یا کم از کم اس کی سُن گُن رکھتا ہو۔

رات دس بجے کے قریب میں اور گنگوری ایک بخت گیر حوالدار کے ساتھ اس اندرونی کمرے میں پہنچے جہاں خطرناک بخت زمانی کو پابہ زنجیر رکھا گیا تھا۔ میری اطلاع کے مطابق وہ اب تک بہت اودھم مچاتا رہا تھا لہٰذا ہتھکڑی کے ساتھ ساتھ اس کے پاؤں میں بیڑی بھی پہنا دی گئی تھی۔ جب ہم کمرے میں پہنچے تو وہ اپنے چوڑے چکلے جسم کے ساتھ فرش پر چت لیٹا تھا۔ چھت پر چلتے پنکھے کو مسلسل گھورتا چلا جارہا تھا۔ سب رب پیاروں کی طرح اس نے اپنے لمبے بالوں کے بیچ میں سے مانگ نکالی ہوئی تھی اور تو اور گلے میں نارنجی رنگ کے منکوں کی مالا چمک رہی تھی۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اٹھ جاؤ۔ کافی آرام کرلیا ہوگا تم نے۔"

وہ اطمینان سے اسی طرح چوڑا ہو کر گرم فرش پر لیٹا رہا۔ میرے اندر اس کے لیے رحم کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے صرف کچھ دن پہلے بڑی سفاکی سے قریباً اٹھارہ بچوں کی جان لی تھی اور ان میں وہ بچہ بھی تو تھا جس کا نام مجھے گلفام معلوم ہوا تھا جس کی ٹانگیں ملبے میں پھنس گئی تھیں اور جس نے مجھے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اپنی پوری جان سے میرے بازوؤں کو پکڑ لیا تھا۔ اس کی آخری فریادی نگاہیں جیسے میرے دل میں دہکتے نیزوں کی طرح پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان نگاہوں نے بڑے کرب کے ساتھ مجھ سے پوچھا تھا مجھے بچالیں گے نا؟ مجھے چھوڑ تو نہیں جائیں گے نا؟ آپ بھی مجھے چھوڑ گئے تو میں مر جاؤں گا اور وقت کا المناک ستم تھا کہ بالآخر مجھے اسے چھوڑنا پڑا تھا۔ خاموشی کی زبان میں کہنا پڑا تھا "خدا حافظ بچے" آہ ماں باپ نے اس کا نام بڑے پیار سے گلفام رکھا ہوگا، یعنی پھول سے چہرے والا۔ اور یہ پھول پوری طرح کھلنے سے پہلے ہی دہشت گردی کے جلتے ہوئے ملبے میں دب گیا تھا۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ میری نگاہ زیادہ دیر بخت زمانی کے چہرے پر نہ رہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں طیش سے مغلوب ہو کر اس پر پل پڑوں گا اور جان سے مار دوں گا اور اسے یوں مار دینا ہمارا نقصان تھا۔

میں نے اس کی ٹانگ کو اپنے پاؤں سے ہلکی سی ٹھوکر لگائی۔ "میں کہتا ہوں اٹھ کر بیٹھو۔"

وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ "تم نے پھر مجھے لٹا کر مارنا ہی ہے تو لیٹا ہی رہنے دو۔ لیکن لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ میں "مرشد مستان رب پیارے" کا چاکر ہوں۔ مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے تو اپنے لیے قیامت اٹھاؤ گے۔ سیخ کباب کی طرح انگاروں پر بھونے جاؤ گے۔ مرنے کی دعا مانگو گے لیکن موت بھی جلدی نہیں آسکے گی۔"

گنگوری نے کہا۔ "ٹھیک ہے، وہ وقت آئے گا تو وہ بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال تم بندے کے پتر بنو اور اٹھ کر بیٹھو۔" اس کے ساتھ ہی گنگوری نے اسے لمبے بالوں سے پکڑ کر کھینچا اور اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔

بخت زمانی کا سانولا چہرہ خون کے دباؤ سے کچھ اور بھی سانولا ہوگیا۔ گہری سرخ آنکھوں سے گنگوری کو گھور کر پھنکارا۔ "چند ٹکوں کی نوکری کے لیے اپنی زندگی برباد کر رہے ہو مرشد مستان کے غضب سے ڈرو۔ بیٹھے بیٹھے ساری ہڈیاں ٹوٹ جائیں گی تمہارے جسم کی۔ لال بیگ کی طرح فرش پر رینگتے نظر آؤ گے۔"

"فی الحال تم اپنی ہڈیوں کی خیر مناؤ زمانی۔" میں نے کہا۔ "اور ہڈیوں کی خیر منانے کا عملی طریقہ یہی ہے کہ اسکول کی تباہی اور اس تباہی کے پیچھے جن لوگوں کا ہاتھ ہے،

Digest Novels .com

ان کے بارے میں سب کچھ اگلے دس منٹ میں بتا دو۔‘‘ میں نے کلائی کی گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

’’وہ اسکول کی تباہی کیوں ہوئی؟‘‘ زمانی پھنکارا۔ ’’یہ اس نحوست کی وجہ سے ہوئی جو انگریزی تعلیم ہمارے علاقے میں لا رہی ہے۔ یہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، اپنے ساتھ بے شرمی، بے غیرتی اور گندگی کا سیلاب لے کر آئے گا۔‘‘

’’تو اس وجہ سے تم نے اس اسکول کو تباہ کر ڈالا۔ معصوم بچوں کو قبرستان کی راہ دکھا دی؟‘‘

وہ ذرا چونکا پھر سنبھل کر بولا۔ ’’ہم نے کچھ نہیں کیا، نہ ہی کریں گے...... کیونکہ گوھار جی ایسا نہیں چاہتیں...... لیکن...... جس دن انہوں نے حکم دیا ہم...... کفر اور نحوست کا یہ طوفان روکنے کے لیے سب کچھ کر گزریں گے۔‘‘

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ ’’بنومت زمانی۔ گوھار زینت حکم دے چکی ہے اور تم وہ قہر توڑ بھی چکے ہو جو تمہیں توڑنا تھا۔ اب کچھ بھی چھپا نہیں رہا۔ تمہاری وہ گوھار زینت سب کچھ اُگل چکی ہے۔ وہ بھی بہت جلد پھر قانون کے شکنجے میں ہوگی۔‘‘

زمانی کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیرتے تھے اور اس کا اعتماد دیدنی تھا۔ اس نے فرش پر آلتی پالتی مار رکھی تھی اور پشت دیوار سے لگا رکھی تھی۔

وہ اپنے میلے کچیلے دانت نکوس کر بولا۔ ’’بہت بڑی غلطی کر رہے ہو تم لوگ...... تم رب پیاروں کو ٹھیک سے نہیں جانتے۔ یہ کچھ کرنے پر آ گئے تو تمہاری یہ وردیاں اور بندوقریاں وغیرہ ان کا رستہ نہیں روک سکیں گی۔ تم نے مرشد مستان کو قید کر کے دیکھ لیا۔ کیا تم ان کا راستہ روک سکے؟ میرا بھی نہیں روک سکو گے اور اگر روکو گے تو موت کی بھیک مانگتے پھرو گے۔‘‘

اس کا لب ولہجہ میرے خون میں شدید اُبال پیدا کر رہا تھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں حوالدار مولا بخش کو اشارہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ یہ لاتوں کا بھوت باتوں سے نہیں مانے گا۔ اس کی طبیعت صاف کرو۔

مولا بخش عرف مولا ایسے کاموں کا ماہر تھا مگر میں نے دیکھا کہ وہ زیادہ پُرجوش نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیم دراز زمانی کو سیدھا کر کے بٹھانا چاہا تو زمانی نے اس کا ہاتھ زور سے جھٹکا اور صلواتیں سنانے لگا۔ انوار گشکوری نے آگے بڑھ کر زمانی کے گریبان پر ہاتھ ڈالا۔ اس کھینچا تانی میں نارنجی رنگ کے منکوں کی موتی مالا ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئی۔ مالا کے ٹوٹنے پر زمانی ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے اتنا شور مچایا کہ الامان...... وہ زمین سے اچھل اچھل جا رہا تھا۔ اگر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑیاں نہ ہوتیں تو پتا نہیں کیا کر گزرتا۔ وہ دہاڑا۔ ’’تم نے رب پیارے کی یہ مالا توڑی۔ بدبختو! تم نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ بہت بُری طرح پچھتاؤ گے۔ اس مالا کے منکے تمہیں برباد کر دیں گے۔ گندی نالی کے کیڑے کی طرح رینگتے پھرو گے۔‘‘

اس کے ساتھ ہی اس نے گشکوری اور مولا بخش کی طرف تھوکا۔ میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے مولا بخش سے کہا۔ ’’لٹاؤ اس کنجر کو فرش پر چھترول کرو اس کی...... یہ ایسے نہیں مانے گا۔‘‘

مولا نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن پھر ساکت ہو گیا۔ مجھے اس کے چہرے پر شدید تذبذب نظر آیا۔

’’کیا بات ہے مولا؟‘‘ میں نے سختی سے کہا۔

’’بس...... سر...... میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔‘‘

میں اس کے ساتھ کمرے سے باہر آیا۔ اس نے ایک دم میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ’’سر! میں آپ کے حکم کا غلام ہوں...... لیکن...... آپ یہ کام مجھ سے نہ کرائیں۔ یہ میرے بس کا نہیں ہے۔‘‘

’’کیا بات ہے؟ اس شعبدہ باز کی دھمکیوں سے ڈر گئے ہو؟‘‘

مولا کی سیاہ آنکھوں میں خوف ہی خوف جمع تھا۔ ’’سر! میں اَن پڑھ سا بندہ ہوں۔ گہری باتیں تو میں نہیں جانتا لیکن...... ہم میں سے کچھ لوگ بہت مجبور ہیں۔ ان رب پیاروں کا ڈر اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتے......‘‘

ڈرے ڈرے لہجے میں مولا نے جو کچھ کہا، اس سے پتا چلا کہ وہ زمانی رب پیارے کی مالا ٹوٹنے کے سبب زیادہ پریشان، ہوا ہے۔ مولا کو یہ بھی یقین تھا کہ مرشد مستان اور اس کے کچھ خاص رب پیارے ایسا عمل جانتے ہیں جس کے سبب اچھے بھلے بندے کی ہڈیاں بیٹھے بیٹھے ٹوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ وہ دردناک طریقے سے مرتا ہے۔

میں نے مولا کو واپس بھیجنے کا سوچا لیکن پھر فیصلہ بدل دیا۔ میں نے کہا۔ ’’چلو ٹھیک ہے، تم کچھ نہ کرنا لیکن یہیں پر رہو۔ جو کام تمہیں کرنا تھا وہ میں اور گشکوری کرتے ہیں۔ اس نے جو آفت ہم پر لانی ہے لے آئے۔‘‘

مولا شدید تذبذب میں تھا۔ اچانک ایک آہٹ نے

Digest Novels .com

مجھے اور مولا کو چونکا یا۔ نیم تاریکی میں یہی لگا تھا جیسے کوئی احاطے کے درختوں میں سے نکلا ہے اور تیزی سے برآمدے کی سیڑھیوں کی طرف گیا ہے۔ میں نے قمیص کے نیچے سے پستول نکالا اور مولا کے ساتھ سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ سیڑھیوں کے درمیان کوئی تاریکی میں دبکا ہوا تھا۔ مولا نے موبائل ٹارچ کی روشنی اس پر پھینکی۔ مقامی لباس میں وہ ایک ادھیڑ عمر شخص تھا۔ شیو بڑھی ہوئی، آنکھیں سوجی ہوئی، جسم کافی فربہ اور سانس بے طرح پھولی ہوئی۔ عجب وحشت سی تھی اُس کے چہرے پر۔ مولا نے اسے دبوچنے کے لیے قدم آگے بڑھایا لیکن میں نے ہاتھ سے اسے روک دیا۔ مجھے شک ہوا تھا کہ اس شخص نے اپنی چادر کے نیچے کوئی ہتھیار چھپا رکھا ہے۔ میں نے تیزی سے جھپٹ کر اس کا دایاں ہاتھ دبوچ لیا۔ اس نے معمولی مزاحمت کی لیکن پھر مزید بُری طرح ہانپنے لگا۔ اس کے ہونٹ سیاہ پڑ رہے تھے۔

میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ میلی کچیلی چادر کے نیچے اس نے کوئی ایک فٹ لمبی تیز دھار چھری چھپا رکھی تھی۔ یہ ویسی ہی چھری تھی جو عید پر قربانی وغیرہ کے لیے گھروں میں استعمال ہوتی ہے۔

میں اور مولا نو وارد کو گھسیٹ کر بالائی منزل کے ایک کمرے میں لے گئے۔ آوازیں سن کر دو تین اور اہلکار بھی اس کمرے میں پہنچ گئے۔ وہ بھی حیران ہوئے۔ (جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، یہ شخص عمارت کی چار دیواری کے ایک ٹوٹے ہوئے حصے سے اندر داخل ہوا تھا) ہم نے چھری اپنے قبضے میں لے لی۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ لگتا تھا فی الحال بولنے کے قابل ہی نہیں ہے۔ وہ اپنی بُری طرح بگڑی ہوئی سانس کو نارمل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخص صحت مند نہیں، بیمار ہے۔

وہ قدرے سنبھلا تو میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔ ”کس نیت سے آئے ہو۔ کون ہو تم؟“

اس کے نیلگوں ہونٹ بے ساختہ کپکپاتے چلے گئے پھر یکایک اس نے اپنا چہرہ چادر میں چھپایا اور ہچکیوں کے ساتھ رونے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خستہ حال قمیص کی جیب سے کچھ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ دو طرح کی میڈیسن تھی۔ اس نے اشارے سے پانی طلب کیا۔ مولا فوراً پانی لے آیا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے دوا کھائی اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی سانس تو قدرے ہموار ہوئی مگر اس کی پلکیں بوجھل ہوتی چلی

بہترین تحریریں، لاجواب روداد اور اعلیٰ داستانیں پڑھنے والوں کے لیے سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

ماہنامہ سرگزشت کراچی

شمارہ اگست 2025ء کی جھلکیاں

ہمہ گیر
اردو کے درویش صفت فنکار کا احوال زیست

خوابوں کی قیمت
ایک سعی لاحاصل کا عبرت بھرا انجام

مڈ بحران
کرکٹ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے تحفہ

شہر آشوب
اسی شہر میں صرف جرائم پلتے تھے

جان بچا
قدم قدم پر حادثات تھے، ایک بے وطن کی روداد

انیس درد مند ان
1947ء کے فسادات سے ابھری ایک انوکھی سچ بیانی

اس کے علاوہ

ڈھیر سارے سچے قصے، دلچسپ واقعات اور عبرت بھری سچ بیانیاں

وہ سب کچھ جو آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کو پڑھنا چاہیے

یہ شمارہ بہت خاص ہے، ضرور ملاحظہ کریں

digestlibrary.com
Digest Novels .com

گئیں۔ وہ جیسے غنودگی میں چلا گیا۔
یہ مقامی شخص تھا اور ہم میں سے کوئی اسے جانتا نہیں تھا۔ غنودگی کی حالت میں وہ پتا نہیں کیا بڑبڑانے لگا مگر بس اس کے سیاہی مائل ہونٹوں کی حرکت ہی دکھائی دے رہی تھی۔
”کہیں یہ نیچے موجود بخت زمانی ہی کا تو کوئی عقیدت مند نہیں؟“ ایک سب انسپکٹر نے خیال ظاہر کیا۔
”کیا کہا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا اور ایک بار پھر کان لگا کر اس کی بڑبڑاہٹ سننے کی ناکام کوشش کی۔
کل ساری رات جو بھاگ دوڑ ہوئی تھی، اس کے نتیجے میں جمشید صاحب اور کچھ دیگر ساتھی جلدی سو گئے تھے البتہ عمران اور انوش وغیرہ جاگ رہے تھے۔ کچھ دیر میں وہ دونوں بھی موقع پر پہنچ گئے۔ اس شخص کی ڈرامائی آمد پر کئی تبصرے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ ہم وہ بڑبڑاہٹ سننے کی کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھے جو وہ غنودگی کی حالت میں کرتا تھا اور بار بار اپنی دائیں مٹھی بھینچتا تھا۔
اسی دوران میں عمران نے عقب سے میرا کندھا دبایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ بولا۔ ”ٹھیک ہی کہتے ہیں جی کہ گھر کی مرغی دال برابر۔“
”کیا مطلب؟“
”ادھر آئیں میرے ساتھ۔“ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ ”جناب! اتنا بڑا ”لپ ریڈر“ آپ کے پاس ہے اور آپ آدھے گھنٹے سے یہاں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔“
میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ عمران کی لپ ریڈنگ اب مسلمہ تھی لیکن فی الوقت اس کی یہ زبردست صلاحیت واقعی میرے ذہن سے نکلی ہوئی تھی۔ اگلے دو منٹ میں عمران نے جو کچھ بتایا، وہ دلچسپ تھا اور حیران کن بھی۔
بولا۔ ”جناب یہ بار بار اپنی کسی لاڈلی بیٹی زرقا کا ذکر کر رہا ہے، جسے کسی ”رب پیازے“ نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور وہ اپنی جان بچاتے ہوئے کسی ایکسیڈنٹ میں یا کہیں سے گر کر مر گئی۔ وہ خود مرنے سے پہلے اس ہوس پرست کو جان سے مارنے کی بات کر رہا ہے۔ خود اپنے ہاتھ سے مارنے کی بات کر رہا ہے تاکہ اس کی بیٹی کی روح سکون پا سکے وغیرہ وغیرہ۔“
وہ تیز دھار چھری میری نگاہ میں چمکی جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے قبضے میں لی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ نیچے کمرے میں موجود وہ منحوس زمانی ہی اس شخص کا مجرم ہو۔

عمران نے مزید کہا۔ ”اس کی ایک دو باتیں سمجھ میں نہیں آئیں...... کسی گوگڑکاں (پہاڑی کوے) کی بات بھی کرتا ہے...... کہتا ہے وہ گوگڑکاں نہیں تھا...... وہ بھی حرامزادہ تھا۔ اسی نے تو چامیری لاڈلی کو......“ دور دراز دیہی علاقوں میں اس طرح کے واہے اور ایسی خرافات عام ہوتی ہیں......
ہم اُلجھن میں تھے۔ یہ شخص سخت بیمار لگتا تھا۔ پاؤں ورم زدہ تھے، ہونٹ نیلگوں۔ عین ممکن تھا کہ اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت بھی ہو جو کچھ عمران اپنی لپس ریڈنگ کے بل بوتے پر بتا رہا تھا اس سے بھی کوئی تصویر واضح نہیں ہو رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ہماری یہ اُلجھن فوری طور پر رفع ہو گئی۔ مولا اس چوکیدار کو ڈھونڈ لایا تھا جو خالی دنوں میں اس سرکاری عمارت کی حفاظت کرتا تھا۔ اس کا نام کرم دین تھا اور وہ اسی علاقے کا رہنے والا تھا۔
اس کے آنے پر میں نے سب اہلکاروں کو باہر بھیج دیا۔ کمرے میں عمران، انوش اور میرے علاوہ صرف کرم دین ہی رہ گیا۔ وہ ذرا لمبوترے چہرے والا چالیس پینتالیس سالہ گم صم شخص لگتا تھا۔ یہاں نیم بے ہوش شخص کو دیکھ کر حیران بھی تھا۔ ڈری ڈری آواز میں بولا۔ ”اس کا نام مقبول احمد ہے جی۔ کافی عرصے سے بہت بیمار ہے جی۔ کوئٹہ میں دو بار اس کے دل کا آپریشن بھی ہو چکا ہے۔ اپنی بیٹی اور اپنی ماں کا غم اسے لے مرا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”جیسا کہ میں نے بتایا ہے، یہ یہاں چھری سمیت پکڑا گیا ہے۔ یہ کس کے لیے آیا ہوگا؟“
”میں سمجھ گیا جی...... ساری بات سمجھ گیا...... میں بتاتا ہوں آپ کو......“
”لیکن کیا پہلے اس بندے کو فوری طور پر اسپتال پہنچانا نہیں چاہیے؟“ عمران نے سوال کیا۔
جواب میں کرم دین نے جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ اب تو مقبول نامی اس لوہار کو ڈاکٹر بھی تقریباً جواب دے چکے ہیں۔ اب اسے اکثر اس طرح کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ ختم ہی ہو گیا۔ اپنی ”دوائی“ ہر وقت اس کی جیب میں ہی رہتی ہے۔ مقبول عرف قبولے کے بارے میں کرم دین نے جو کچھ ڈرے ڈرے انداز میں بتایا، وہ مختصراً یوں ہے۔
قبولے کی بیٹی زرقا کی عمر 30 سال کے قریب پہنچ رہی تھی۔ وہ اپنے باپ اور دادی کے ساتھ رہتی تھی، ماں مر چکی تھی، دو جگہ پر زرقا کا رشتہ طے ہونے کے بعد ختم ہو گیا تھا جس کے بعد وہ اور اس کے گھر والے سخت مایوسی کا شکار

تھے۔ ابھی دنوں زرقا کچھ واہموں کا شکار ہوگئی۔ رات کو جب وہ سونے کے لیے بستر پر لیٹتی تو اسے لگتا کہ کمرے میں پروں کی پھڑپھڑاہٹ ہے۔ پھر اسے یوں لگنے لگا کہ اچانک سیاہ رنگ کا ایک بڑا سا پہاڑی کوا اس کے سینے پر آبیٹھا ہے اور اس کی گردن اور سینے پر چونچیں مار رہا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور چلانا شروع کر دیتی۔ ایک دو بار اس کے جسم پر سرخ نشان بھی دیکھے گئے۔ یہ سب ایک دوشیزہ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عمر کا شاخسانہ تھا۔ مناسب طریقہ تو یہ تھا کہ اسے کسی بااعتماد روحانی معالج کے پاس لے جایا جاتا یا کوئٹہ وغیرہ جا کر کسی سائیکاٹرسٹ کو دکھایا جاتا۔ اس کے بجائے کسی نے حجرہ نوشیر گوٹھ کے مرشد مستان کا نام لے دیا۔ مصیبت زدہ باپ اور دادی اسے مرشد مستان کے پاس لے گئے۔ مرشد مستان نے انہیں اپنے چیلے بخت زمانی کی طرف بھیج دیا۔ زمانی نے وہی کچھ کیا جو اس طرح کے جعلی عامل کرتے ہیں۔ زرقا کے گھر والوں کو بتایا کہ یہ جو پہاڑی کوا یعنی گوگڑ کاں لڑکی کو نظر آتا ہے۔ یہ گوگڑ کاں نہیں اس کے اندر کوئی ہوائی مخلوق ہے جو بُری طرح لڑکی کے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ یہ افغانی پہاڑوں سے یہاں پہنچی ہے۔ لڑکی کی جان بھی لے سکتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ قصہ مختصر زرقا کو مکمل علاج کے لیے زمانی کے ڈیرے پر چھوڑ دیا گیا جہاں ایک دو اور عورتیں بھی موجود تھیں۔ نتیجہ وہی نکلا جو ایسے موقعوں پر اکثر نکلتا ہے اور بھیانک ہوتا ہے۔ ایک دن زرقا کی لاش گوٹھ کی نواحی سڑک کے کنارے درختوں سے ملی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ اس نے بدحواسی میں سڑک پار کرنے کی کوشش کی اور ایک تیز رفتار پک اَپ اسے ٹکر مارتی گزر گئی۔ ان واقعات کو اب قریباً تین سال گزر گئے تھے۔ رب پیاروں کی طرف سے کہا یہ گیا تھا کہ مریض لڑکی ”سخت علاج“ اور عمل سے گھبرا کر بھاگی اور حادثے کا شکار ہوئی۔ یہ مبینہ حادثہ ایک دو روز میں ہی ایک اور جان لے گیا تھا، یہ زرقا کی دادی تھی جو پوتی کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر پائی۔ پھر چند ہفتوں بعد قبولے لوہار کو دل کا پہلا شدید دورہ پڑا تھا۔

چوکیدار کرم دین کی باتوں سے پتا چلا کہ قبولے برملا بخت زمانی کو اپنی بیٹی کا قاتل کہتا تھا اور یہی نہیں وہ بیماری کی حالت میں دو دفعہ چوری چھپے حجرہ نوشیر جا بھی چکا تھا تاکہ بخت زمانی سے بدلہ لے سکے۔ کوئی ایک سال پہلے مستان کے صف شکنوں نے اسے مار کوٹ کر پولیس کے حوالے بھی کیا تھا۔

غنودگی کی حالت میں مقبول عرف قبولے نے ایک بار پھر بڑبڑانا اور اپنی دوا کی تلاش میں اپنی جیب کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کر دیا تھا۔

میں نے کرم دین سے کہا۔ ”تم اس کے پاس ہی رہو۔ ذرا ہوش میں آئے تو اس سے پوچھ کر اسے دوا کھلاؤ۔“

کرم دین کے مطابق قبولے کا کوئی آگے پیچھے تھا ہی نہیں جسے اطلاع دی جاسکتی۔

☆☆☆

میں نیچے کمرے میں پہنچا تو بخت زمانی اسی طرح آلتی پالتی مارے فرش پر بیٹھا تھا۔ عمران، انوش جٹ اور سب انسپکٹر گنگوری بھی وہیں موجود تھے۔ اندازہ ہوتا تھا کہ گنگوری اور انوش جٹ نے اس کی تھوڑی بہت ٹھکائی بھی کی ہے۔ انوش کا ہاتھ بہت بھاری تھا اس کے ایک تھپڑ سے زمانی کا ایک کان اندر سے پھٹ گیا تھا اور وہ بار بار ہماری طرف منہ کر کے خون تھوک رہا تھا۔

اب تک کی پوچھ گچھ سے نجانے کیوں مجھے یہ احساس ہونا شروع ہو گیا تھا کہ یوں تو یہ جانور صفت انسان گردن تک جرائم کی دلدل میں ہے لیکن شاید، جس گہری سازش کا اشارہ گوھار زبخت نے دیا تھا، یہ اس سے زیادہ باخبر نہیں۔

مجھے دیکھ کر وہ گرجا۔ ”بہت بُری موت مرنے والے ہو تم...... اور سب سے بُری موت تیری ہوگی ڈپٹی۔ یہ مالا جو تم نے توڑی، اس کی سزا تمہاری نسلیں یاد رکھیں گی۔“

”مالا پر اتنا شور مت مچاؤ۔“ عمران نے کہا۔ ”ابھی تمہاری اپنی بہت سی چیزیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے والی ہیں، ظاہری اور پوشیدہ چیزیں بھی......“

”یہ ہتکار تمہیں برباد کر دے گا۔ یاد رکھنا...... یاد رکھنا۔ میرے پاؤں پر سر رکھنا پڑے گا تمہیں۔ اور وہ مولوی رحیم کا بیٹا، موت کی بھیک مانگنا پڑے گی اُسے۔“

یکایک دروازے پر دستک ہوئی۔ ”کون؟“ میں نے تحکم سے پوچھا۔

”دروازہ کھولو تابش۔“ دوسری طرف سے جمشید صاحب کی عجلت آمیز آواز اُبھری۔

میں نے جلدی سے دروازہ کھولا۔ جمشید صاحب غالباً ابھی ابھی جاگے تھے۔ ان کے ہاتھ میں موبائل فون تھا، چہرہ پریشانی کی آماجگاہ تھا۔ انہوں نے ایک نظر فرش پر بیٹھے مشتعل بخت زمانی پر ڈالی۔ پھر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

Digest Novels .com

میں اُن کے ساتھ ایک قریبی کمرے میں گیا تو جمشید بولے۔ ''تابش! بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔ کوئٹہ سے اعلیٰ افسر فون کررہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ رب پیاروں اوران کے عقیدت مندوں میں بہت اشتعال پایا جارہا ہے۔ وہ کل سے مختلف جگہوں پر جمع ہورہے ہیں۔ چاغی کے اردگرد سے بھی بہت سے لوگ پبلک ٹرانسپورٹ اور دوسری گاڑیوں پر یہاں نوشکی پہنچے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ ان کا یہ اجتماع بخت زمانی کی گرفتاری کے خلاف ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ وہ لوگ ہماری طرف رخ کرسکتے ہیں؟''

''بالکل، یہ عین ممکن ہے۔ رب پیاروں کے مخبر ہر جگہ موجود ہیں۔ ممکن ہے کہ یہاں بھی ہوں اور یہاں بخت زمانی کی موجودگی کی اطلاع دے چکے ہوں۔''

''تو کیا کرنا چاہیے؟''

''ہمیں بالکل چوکس رہنا ہوگا اور بدلتے ہوئے حالات سے باخبر بھی۔ اس بخت زمانی کی زبان کھلوانے کا پروگرام فی الحال ملتوی کردو۔ ویسے بھی مجھے اندازہ ہورہا ہے تابش! کہ یہ کچھ بڑے لوگوں کے مہرے کے طور پر کام کررہا ہے، عین ممکن ہے کہ اصل سازش اور منصوبے کے متعلق یہ بھی کچھ نہ جانتا ہو۔''

میرا اپنا خیال بھی کچھ اسی طرح کا تھا۔ لہٰذا میں نے جمشید صاحب کی بات رد نہیں کی۔ جمشید صاحب ساری نفری کو الرٹ کرنے کے لیے گراؤنڈ فلور پر چلے گئے۔ میں وہیں کھڑکی میں کھڑا دور تک دیکھتا رہا۔ یہ ہلکی چاندنی والی رات تھی۔ دائیں طرف نوشکی کی روشنیاں تھیں۔ بائیں طرف عمارت کے احاطے میں بلند درختوں کے سائے ہولے ہولے جھومتے تھے اور شب بیدار پرندوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ پُراسرار سا منظر تھا۔ نجانے کیوں میرا دھیان پھر اسی رُوداد کی طرف چلا گیا جو کچھ دیر پہلے عمارت کے نگہبان کرم دین نے سنائی تھی۔ ایسے دور دراز علاقوں میں ایسی کہانیاں پروان چڑھ ہی جاتی ہیں۔ اٹھائیس تیس سالہ لڑکی پر گوگڑکاں (پہاڑی کوے) کا عاشق ہوجانا۔ اس کا راتوں کو اٹھ اٹھ کر چلانا...... پھر علاج معالجہ اور ایک دردناک انجام۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کرم دین ہی تھا۔ اس کے دُبلے پتلے چہرے پر شدید گھبراہٹ تھی۔ وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا یہاں پہنچا تھا۔ ''کیا ہوا کرم دین؟''

''جناب! مجھے لگتا ہے کہ اسے کچھ ہوگیا ہے...... وہ سانس نہیں لے رہا...... بالکل نہیں لے رہا۔ آپ دیکھیں آکر۔'' وہ سرگوشی کے انداز میں بولا تھا۔

میں اس کے ساتھ فوراً اس کمرے میں پہنچا جہاں مفلوک الحال قبولا لوہار ایک پرانے صوفے پر پڑا تھا۔ اس کا منہ تھوڑا کھلا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ مرگیا ہے۔ میں نے اس کی نبض ٹٹولی، سانسوں کی آمدورفت محسوس کرنے کی کوشش کی کچھ بھی نہیں تھا۔

''دروازہ بند کردو۔'' میں نے کرم دین سے کہا۔ اس نے جلدی سے دروازے کو چٹخنی چڑھا دی۔

میں نے قبولے کا منہ بند کیا اور ادھ کھلی پلکیں بھی نیچے گرا دیں۔ وہ دکھوں کا مارا اپنی بن بیاہی بیٹی کی موت کا روگ دل کو لگائے تین سال تک انگاروں پر لوٹتا رہا۔ وہ زرقا کے قتل کا بدلہ لینا چاہتا تھا مگر کمزور لوگوں کے لیے طاقتوروں تک پہنچنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ وہ دو دفعہ چاغی سے ناکام لوٹا۔ پھر جب کل اسے پتا چلا ہوگا کہ پولیس جس مجرم کو پکڑ کر یہاں نوشکی لائی ہے، یہ وہی شقی القلب بخت زمانی ہے تو وہ سخت بیمار ہونے کے باوجود ایک آخری کوشش کے لیے یہاں آن پہنچا۔ منزل پھر بھی اُس سے دور رہی۔ اس طویل کہانی کا انجام اس پرانی سرکاری عمارت میں...... اس ہلکی چاندنی والی رات میں یہاں ہمارے سامنے ہوگیا۔

ہم نے مقبول احمد قبولے کی لاش کو ایک چادر سے ڈھانپ دیا۔ میں نے کرم دین سے کہا۔ ''ابھی کئی مسئلے موجود ہیں۔ اس موت کی خبر کسی کو نہ ہو۔''

''آپ بے فکر رہیں سرجی۔'' ریٹائرڈ اہلکار کرم دین نے مستعدی سے کہا۔

میں دوبارہ نیچے بخت زمانی کے پاس پہنچا۔ جمشید صاحب پہلے سے یہاں موجود تھے۔ اسپیشل پولیس فورس کا انسپکٹر دلاور بھی وہیں پر تھا۔ اتنے میں جمشید صاحب کے فون پر پھر کال آگئی۔ انہوں نے کال ریسیو کرتے ہوئے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہم ایک علیٰحدہ کمرے میں پہنچے۔ جمشید صاحب نے موبائل کا اسپیکر آن کردیا۔ دوسری طرف کوئٹہ سے ایک ایڈیشنل آئی جی صاحب تھے، وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بول رہے تھے۔ ''مسٹر جمشید یہ پکی خبر ہے...... ہوائی بات نہیں ہے، ان کی تعداد ہماری توقع سے زیادہ ہے۔ ان کے پاس ہر طرح کے ہتھیار موجود ہیں...... لاٹھیاں، کلہاڑیاں، برچھیاں اور آتشیں اسلحہ بھی۔ وہ سیدھا نوشکی کے رخ پر ہی آرہے ہیں۔''

DigestNovels.com

’’کہیں وہ جیل سے بھاگا ہوا مستان بھی تو......‘‘ جمشید صاحب نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

’’ہنڈرڈ پرسینٹ تو نہیں لیکن غالب امکان ہے کہ مشتعل لوگوں کو وہی لیڈ کر رہا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ کسی بدلے ہوئے روپ میں ان کے ساتھ ہو......اور جمشید! میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں، ہم اس مستان رب پیارے کو ہلکا ہرگز نہیں لے سکتے۔ واقف حال لوگ جانتے ہیں وہ کیا شے ہے اور کیا کرسکتا ہے۔‘‘

’’سر ہمارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟‘‘ جمشید صاحب نے پوچھا۔

’’ہمارے پاس اور کوئی آپشن نہیں مسٹر جمشید۔‘‘ ایڈیشنل آئی جی ذرا جھنجلا کر بولے۔ ’’ہم فی الوقت اس پوزیشن میں ہرگز نہیں کہ اس شارٹ نوٹس پر کوئی کمک تمہاری طرف روانہ کرسکیں۔ وہ لوگ اس عمارت کو اور پولیس پارٹی کو چاروں طرف سے گھیر لیں گے...... وہ لوگ جتنے غصے میں ہیں اور جتنی بڑی تعداد میں ہیں یہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اوپر سے بھی یہی حکم ہے۔ فی الحال اس بخت زمانی پر لعنت بھیجی جائے اور پولیس پارٹی جلد سے جلد وہ جگہ چھوڑ کر متبادل راستے سے کوئٹہ کی طرف نکل آئے۔‘‘

میں نے آنکھوں آنکھوں میں جمشید صاحب کو اشارہ کیا۔ وہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے ایڈیشنل آئی جی سے بولے۔ ’’ٹھیک ہے جی۔ آپ کا حکم ہے تو پھر ہم نکلتے ہیں۔ لیکن بہتر نہیں ہوگا کہ اس بخت زمانی کو ساتھ ہی رکھا جائے۔‘‘

’’سوری نو سے مسٹر جمشید۔‘‘ اعلیٰ آفیسر نے اس مرتبہ غصے سے کہا۔ ’’آپ صورتِ حال کی سنگینی کو پوری طرح اب بھی سمجھ نہیں پا رہے ہیں۔ مرشد مستان کو انڈر اسٹیمیٹ مت کرو۔ وہ ایک بلا کا نام ہے۔ اگر بخت زمانی پولیس پارٹی کے ساتھ ہوا تو وہ زخمی جانور کی طرح پولیس پارٹی کا پیچھا کرے گا۔ اور میں اعلیٰ کمان کے ’’بی ہاف‘‘ پر پھر کہہ رہا ہوں، تمہارے پاس ٹائم بہت کم ہے اور ہم فی الحال تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔‘‘

’’اوکے جناب، ہم حکم پر عمل کر رہے ہیں۔‘‘ جمشید صاحب نے بجھے لہجے میں کہا۔

☆☆☆

اب رات کے بارہ بج چکے تھے جو اطلاعات آ رہی تھیں ان کے مطابق سیکڑوں مشتعل افراد اور بے شمار چھوٹی بڑی گاڑیوں پر مشتمل قافلہ ہمارے ٹھکانے سے فقط آدھ پون گھنٹے کی دوری پر تھا۔

جمشید صاحب نے بخت زمانی کی بیڑیاں کھلوا دی تھیں۔ الٹی ہتھکڑی بھی کھلوا دی تھی۔ اب اسے بس سامنے سے ہتھکڑی لگی ہوئی تھی۔ اس ہتھکڑی کی زنجیر ایک کھڑکی کی آہنی گرل سے منسلک تھی۔ زمانی اب پھیل کر ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور سگریٹ پھونک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور ان آنکھوں میں ہمارے لیے ایک طنزیہ مسکراہٹ اور حقارت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں کی صورتِ حال نے اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اس کے مددگار پہنچ رہے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہم افراتفری میں یہاں سے نکل رہے ہیں۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ’’زمانی! جنگ میں لوگوں کو آگے پیچھے ہونا پڑتا ہے۔ ہم بھی پیچھے ہٹ رہے ہیں مگر یہ مت سمجھنا کہ تم بچ گئے ہو۔ شاید کچھ دانہ پانی تمہارا ابھی باقی ہے، وہ کھا پی لو اور باقی کی سانسیں بھی لے لو۔ دوبارہ ملاقات ہوتی ہے ایک چھوٹے سے وقفے کے بعد۔‘‘

وہ زہر خند انداز میں بولا۔ ’’ملاقات نہ بھی کرو گے تو خود ڈھونڈ لوں گا تمہیں۔ تمہاری وردی ہی نہیں، تمہاری کھال بھی اترے گی اور تمہاری کھال اتارنے سے پہلے مولوی رحیم کے آخری پتر کی موت کا تماشا بھی دکھائیں گے تمہیں۔‘‘ اس کا اعتماد غیر معمولی تھا۔

نارنجی رنگ کے منکوں والی مالا پھر سے بخت زمانی کی توانا گردن میں نظر آ رہی تھی۔ جمشید صاحب کی ہدایت پر ایک اہلکار نے ہی مالا دوبارہ جوڑ کر اس کے گلے میں پہنائی تھی۔

باہر سے ہماری گاڑیوں کے ہارن سنائی دینا شروع ہوگئے تھے۔ عمران اندر داخل ہوا۔ مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔ ’’آجائیں جی۔ منگل، بدھ کو گوشت کا ناغہ ہوتا ہے۔ اس کالی بھیڑ کے گلے پر پھر کسی دن چھری چلائیں گے۔‘‘

میں زمانی پر آتشیں نگاہ ڈالتا ہوا باہر آ گیا۔ زیادہ تر ساتھی گاڑیوں میں سوار ہو چکے تھے۔ سنگین صورتِ حال کے پیشِ نظر عمارت کے چوکیدار کرم دین نے بھی ہمارے ساتھ ہی جانا مناسب سمجھا تھا۔ اسے میں نے اکبر خاں کے ساتھ بٹھا دیا تھا۔ تابک لڑکی دلربا اسی جیپ میں تھی جس میں جمشید صاحب اور میں سوار تھے۔ عمران، وقاص اور انوش جٹ اسٹیشن ویگن میں تھے۔ قبولے کی لاش بالائی منزل کے کمرے میں ہی پڑی رہ گئی تھی۔

Digest Novels .com

میرا دل بہت بوجھل تھا۔ اوپر والا کبھی کبھی ظالموں کی رسّی دراز کرتا ہے۔ یہ گہرے سانولے تھوبڑے والا بخت زمانی نجانے کتنے جرائم کا مرتکب تھا مگر اس کے جو دو جرم ہمارے سامنے تھے وہی اسے کئی بار پھانسی پر لٹکانے کے لیے کافی تھے۔ تین سال پہلے ایک بے بس لڑکی کی عزت سے کھلواڑ اور اس کی موت کی ذمے داری...... دوسرے صرف دو دن پہلے قریباً 18 عدد معصوم بچوں کی زندگیوں کا خاتمہ۔

مجھے وہ دُبلا پتلا معصوم پھر یاد آیا جسے میں سر توڑ کوشش کے باوجود ملبے سے نکال نہ پایا تھا۔ اس کے ننھے منے ہاتھ آج بھی مجھے اپنے بازوؤں پر محسوس ہوتے تھے۔ اس کی فریادی نگاہیں گاہے بگاہے مجھے گھائل کرتی تھیں۔

جیپ میں بیٹھے بیٹھے میں نے اپنے بازوؤں پر نظر دوڑائی۔ ان پر آج بھی عمران نے مرہم لگایا تھا۔ کہنیوں تک کئی جگہ جلنے کی سرخی اب بھی موجود تھی۔

گاڑیاں حرکت میں آچکی تھیں مگر تھوڑے ہی فاصلے پر گئی تھیں کہ رک گئیں۔ قافلے میں موجود ہماری ایک اسٹیشن ویگن کا پہیا پنکچر تھا۔ اہلکار تیزی سے پہیا بدلنے میں مصروف ہو گئے۔ تین چار منٹ کا کام تھا۔ اچانک میرے دل میں ایک عجیب سا ابال آیا۔ ایک شبیہ نگاہوں کے سامنے اُبھری۔ ہاں وہ سلگتے ملبے میں پھنسا ہوا دبلا پتلا گمنام ہی تھا۔ اس شبیہ پر زمانی کی منحوس مسکراہٹ ”سپرامپوز“ ہو رہی تھی۔ یکایک میرا سینہ دہک اٹھا۔ میں نے آگے بیٹھے جمشید صاحب سے کہا۔ ”اوہ سوری سر...... ویری سوری...... میں اپنا موبائل اُدھر ہی بھول آیا۔“

”اوہو۔“ وہ ذرا بیزاری سے بولے۔ ”لے آؤ جلدی سے۔“

میں جیپ سے نکل کر تیزی سے پھر عمارت کی طرف بڑھا۔ ساٹھ ستر قدم میں نے بھاگ کر طے کیے اور احاطے میں گھس گیا۔ اب یہاں ہُو کا عالم تھا...... صرف اس کمرے میں روشنی تھی جہاں بخت زمانی موجود تھا۔

میرے ذہن میں آندھی سی چلنا شروع ہو گئی تھی۔ میں بخت زمانی کو مار کر ہائی کمان کی نافرمانی نہیں کرنا چاہتا تھا...... کیونکہ اس سے کئی مسائل بھی پیدا ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف اس کی ہستی اور اس کی طنزیہ مسکراہٹ بھی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی...... میں اسے جگر پاش مسکراہٹ کا نام دوں گا۔

میں دوڑتا ہوا بالائی منزل پر گیا۔ قبولا لوہار چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہا تھا۔ میں نے الماری سے وہ تیز دھار چھری نکالی جو قبولے سے برآمد ہوئی تھی۔ چھری نکالنے سے پہلے میں نے ایک رومال ہاتھ پر لپیٹ لیا تھا۔ چادر ہٹا کر میں نے قبولے کی قدرے بھاری لاش کندھے پر اٹھائی اور جس تیزی سے آیا تھا اسی تیزی سے واپس نیچے بخت زمانی والے کمرے میں پہنچ گیا۔ برآمدے میں میرے بھاری قدموں کی آوازیں سن کر وہ غالباً یہی سمجھا تھا کہ اس کے مددگار پہنچ گئے ہیں...... پہلے وہ پکارا۔ ”کون ہے؟“

پھر مزید بلند آواز سے پکارنے لگا۔ ”میں یہاں ہوں...... اِدھر ہوں کمرے میں......“

میں لاش سمیت کمرے میں داخل ہوا تو وہ حیرت سے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پتا ہے کہ مستان رب پیارے کا سب سے بے غیرت سفاک اور کمینہ ساتھی اسی کمرے میں ہے۔“

”یہ...... یہ کون ہے......؟“ وہ لاش دیکھ کر ذرا ہکلایا۔

”تمہاری ہکلاہٹ بتا رہی ہے کہ تم اسے پہچان گئے ہو۔ دیکھو، بالآخر یہ اپنا بدلہ لینے کے لیے تم تک پہنچ ہی گیا ہے۔“ میرا فقرہ ایک بم تھا جو اس کے سر پر پھٹا۔ زمانی نے میرے ہاتھ میں تیز دھار چھری بھی دیکھ لی تھی۔ وہ اپنی زنجیر زور زور سے کھینچنے لگا، جیسے توڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ ساتھ ساتھ وہ گندی گالیوں کی بوچھاڑ کرنے لگا۔

میں نے اپنے رومال لپٹے ہاتھ سے چھری لاش کی [illegible] میں دی، مٹھی کو مضبوط کرنے کے لیے میں نے اسے اپنے ہاتھ میں جکڑ لیا۔ صوفے سے اٹھنے کی کوشش میں زمانی کو [illegible] کی زنجیر نے کھینچا مارا اور وہ فرش پر گرا۔ میں نے قبولے کی لاش اس کے اوپر چڑھا دی۔ پہلا وار میں نے [illegible] پیٹ پر کیا۔ یوں تو میں ہی وار کر رہا تھا مگر لگتا یہی تھا کہ میری مدد سے لاش اس پر وار کر رہی ہے۔ بخت زمانی کی آنکھیں دہشت سے کھلی رہ گئی تھیں۔ دوسرا وار میں نے پھر اس کے پیٹ پر کیا اور ایک چوتھائی پیٹ چیر ڈالا۔ تیسرا وار اس کی گردن پر ہوا اور شہ رگ کا خون آلود منظر نظر آنے لگا۔ وہ کسی بدروح کی طرح چنگھاڑ رہا تھا۔

میں نے قہرناک نظر اس پر ڈالی۔ ”کہا تھا نا دوبارہ ملاقات ہوگی۔ چلو اچھا ہوا جلدی ہو گئی۔“

وہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ

Digest Novels .com
digestlibrary.com

آنکھوں میں حیرت منجمد تھی۔ جیسے اسے یقین نہ ہو پا رہا ہو کہ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔

میں اپنی موجودگی کی چھوٹی موٹی نشانی مٹا کر تیزی سے باہر نکل آیا۔ موبائل فون میری جیب میں ہی تھا۔ میں نے اسے ہاتھ میں لیا اور بھاگتا ہوا گاڑیوں تک پہنچ گیا۔ ٹائر بدلا جا چکا تھا۔ گاڑیاں حرکت میں آنے کے لیے بالکل تیار تھیں۔

ہمیں جو وقت بتایا گیا تھا، اس کے مطابق اب بخت زمانی کے مددگار کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔

☆☆☆

ہلکے بادلوں کی وجہ سے چاندنی ختم ہو چکی تھی۔ کوئٹہ جانے کے لیے ہم جو متبادل راستہ اختیار کر رہے تھے، وہ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ تنگ سڑک کو کہیں کہیں سے مرمت کیا گیا تھا، کئی جگہوں پر وہ مرمت کے بغیر تھی۔ ہمارے اس مختصر قافلے میں ایک ٹرک اور پانچ مختلف گاڑیاں تھیں۔ اندھیری گرم شب میں ہم نوشکی سے کم وبیش 60 کلومیٹر دور آچکے تھے جب ایک جگہ ہمیں رکنا پڑا۔ یہاں بھی سڑک کی تعمیر ہو رہی تھی۔ مگر راستہ بند تھا...... ٹیلوں کے درمیان دو روڈ رولر اور دو تین بڑی مشینیں اس طرح کھڑی کی گئی تھیں کہ گاڑیاں آگے نہ جا سکتی تھیں۔

ہمارے ڈرائیور نے کہا۔ ''سر! لگتا ہے کوئی ہڑتال ہے، وہ دیکھیں سامنے بینرز وغیرہ لگے ہوئے ہیں۔''

گاڑیوں کی روشنی میں بینرز پڑھے جا رہے تھے۔ یہ یقیناً مقامی لوگوں کی طرف سے تھے۔ ایک بڑا بینر اس طرح تھا۔ ''ہمیں پورا معاوضہ دو یا ہمارے زمینوں میں سے سڑک نہ گزارو۔'' باقی بینرز بھی اس سے ملتے جلتے ہی تھے۔

ہم گاڑیوں سے اتر آئے۔ اردگرد کوئی متنفس نظر نہیں آتا تھا۔ اب رات کے اس پہر بھاری بھرکم مشینری کو یہاں سے کون ہٹاتا۔

عمران اور انوش جٹ وغیرہ بھی ہمارے پاس آن کھڑے ہوئے تھے۔ جمشید صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اب تو صبح ہی کچھ ہو سکے گا...... ویسے نوشکی سے محفوظ فاصلے پر تو ہم پہنچ ہی چکے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے جناب، آپ کوئٹہ میں ہائی کمان کو صورت حال سے آگاہ کر دیں۔ اگر وہ کوئی مدد کر سکتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے ورنہ پھر صبح۔''

دو جیپیں ائرکنڈیشنڈ تھیں لیکن ہمیں یہ بالکل اچھا نہیں لگا کہ ہم دوسروں کو گرمی میں چھوڑ کر اندر جا بیٹھیں۔ ہم وہیں ٹیلوں پر اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ جمشید صاحب آئی جی صاحب سے رابطہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ یہاں سگنل بے حد کمزور آ رہے تھے۔ میں نے کچھ ہی دیر پہلے ماہین کو ٹیکسٹ میسج کے ذریعے مطلع کر دیا تھا کہ وہ اب نوشکی آنے کی کوشش ہرگز نہ کرے کیونکہ وہاں حالات بہت مخدوش ہو چکے ہیں...... اور وہ مان بھی گئی تھی۔ عمران کو اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔

میں اور عمران ایک پتھر پر بیٹھے اردگرد کے نیم تاریک لینڈ اسکیپ کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہلکی چاندنی اور تاریکی میں آنکھ مچولی سی ہو رہی تھی۔ عمران بار بار ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ ''ایسے کیا گھور رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

وہ ذرا تذبذب میں رہنے کے بعد بولا۔ ''اچھا...... مجھے بتائیے کیا آپ واقعی موبائل فون لینے واپس عمارت میں گئے تھے؟''

میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''پتا نہیں مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ بات صرف موبائل کی نہیں تھی، بلکہ شاید موبائل کی تھی ہی نہیں۔''

''یعنی میں جھوٹ بول رہا ہوں۔'' میں نے ذرا سنبھل کر کہا۔

''توبہ توبہ۔ میں آپ کو جھوٹا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''لیکن یہ بھی کہتے ہیں نا کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔''

میں اپنے دل کی گہرائی میں حیران سا رہ گیا۔ اس کا باپ بھی اسی طرح میرے دل کی بات جان لیا کرتا تھا یا کم از کم بات کے قریب پہنچ جاتا تھا۔

ہم کچھ دیر تک بالکل گم صم بیٹھے رہے۔ پھر وہ اچانک بہت دھیمی آواز میں بولا۔ ''آپ نے مار دیا نا اُسے؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''نہیں، میں نے نہیں مارا۔ اس کے کالے کرتوتوں نے اسے مارا۔ اس شخص قبولے نے اپنا بدلہ لیا اُس سے، جو مدت سے بدلے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ نوشکی کے بہت سے لوگ یہ بات جانتے ہیں۔''

''لیکن آپ نے تو مجھے بتایا تھا کہ اوپر کمرے میں قبولا دم توڑ گیا ہے۔''

''تو کیا لاش قتل نہیں کر سکتی؟'' میں نے زہرخند انداز میں کہا۔

میں نے اسے مختصراً بتایا کہ وہاں کیا ہوا ہے۔ وہ سب

کچھ جس طرح ہوا تھا، پولیس پارٹی پر کسی طرح کا کوئی الزام آ ہی نہیں سکتا تھا۔ کرم دین کے علاوہ کسی کو خبر نہیں تھی کہ قبولا کو بارہ رات بارہ بجے سے پہلے دم توڑ چکا تھا۔

اسی دوران میں کمزور سگنلز کے باوجود میرے موبائل فون کا میوزک بج اٹھا۔ میں نے اسکرین دیکھی اور بُری طرح ٹھٹک گیا۔ یہ وہی نمبر تھا جس سے شاہ زیب نے پہلے کال کی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ اس کی لوکیشن ٹریس نہیں ہو سکتی۔ یہ کچھ عجیب سا نمبر تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یہ کال کہیں پاکستان کے باہر سے گھوم گھما کر آرہی ہے...... جبکہ کرنے والا پاکستان میں ہی ہے۔

''ہیلو ڈپٹی! میں شاہ زیب بات کر رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے شاہ زیب کی پہچانی سی آواز ابھری۔

میں نے کہا۔ ''مجھے پتا تھا جب گوہار زینت سے تمہاری تفصیلی بات ہوگی تو...... شاید تم مجھے کال کرو گے۔''

''میں کسی طرح کی بکواس سننا نہیں چاہتا۔'' وہ ایک دم جیسے پھٹ پڑا۔ ''کہاں ہے گوہار زینت؟'' اس کی بھاری آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔

میں حیران رہ گیا، پھر سنبھل کر بولا۔ ''بڑے بدذوق ہو۔ مذاق کے لیے یہ اچھا وقت ڈھونڈا ہے تم نے۔ جو سوال مجھے پوچھنا ہے وہ تم پوچھ رہے ہو۔ کہاں ہے گوہار؟''

''ڈپٹی تابش! تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میرا دماغ گھوم گیا تو برباد ہو کر رہ جاؤ گے۔ زیادہ ہوشیاری چالاکی دکھاؤ گے تو اور بُری حالت کر دوں گا۔ گوہار زینت کو سیدھا سیدھا ہمارے حوالے کر دو۔ وہ عورت ذات ہے۔ اس کی عزت آبرو پر ذرا بھی آنچ آئی تو پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں ملے گا تمہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے بارے میں جو تھوڑے بہت اچھے جذبات میرے تھے، انہیں تم نے خود ہی اپنی زہریلی زبان سے دریا بُرد کر دیا ہے۔ بہت سیانے بنتے ہو تم اور شاید کچھ مانگے تانگے کا سیانا پن تم میں ہو بھی لیکن اس وقت تم بالکل عقل کے اندھے بنے ہوئے ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ کچھ پتا نہیں تمہیں، تمہارے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔''

''مجھے کچھ پتا کرنا بھی نہیں۔ مجھے صرف گوہار جی واپس چاہئیں۔ تم نے جو ہوشیاری دکھائی ہے، وہ تمہیں تمہارے تصور سے بھی زیادہ مہنگی پڑنے والی ہے۔ تم دوسری بار گوہار جی کے اغوا کے مرتکب ہوئے ہو۔''

میری رگوں میں سنسنی کی کیفیت بڑھ گئی۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ لگ رہا تھا کہ گوہار زینت کو ہم سے چھڑانے کے بعد شاہ زیب اور اس کے ساتھی گوہار زینت کو واپس گوٹھ لے کر نہیں گئے۔ شاید انہیں خطرہ تھا کہ پولیس انہیں پھر اٹھانے پہنچ جائے گی۔ اسے کہیں اور رکھا گیا تھا اور وہ وہیں سے کہیں غائب ہوگئی تھی یا پھر اٹھالی گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، میں تمہیں آخری بار سمجھا رہا ہوں۔ عقل کے اندھے نہ بنو۔ تم صرف اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہو۔ اپنے یار کی محبت میں ہوش کھو رہے ہو۔ جس کو تم آن بان والی گوہار زینت کہہ رہے ہو، اس کی صرف ایک وڈیو ہی تم دیکھ لو تو تمہارے چودہ طبق روشن ہو جائیں...... اور تمہارے ہی نہیں شاید اس پورے علاقے کے ہو جائیں۔''

''تم کوئی نئی بات نہیں کر رہے ہو۔ مجھے پہلے ہی یقین ہوتا جا رہا تھا تم، وردی میں ایک مکار بلیک میلر ہو۔ تم نے گوہار جی کو کسی جال میں پھنسا رکھا ہے۔ تمہارا یہ وردی والا خمار میں آج رات ہی اتار سکتا ہوں لیکن تمہیں ایک آخری موقع دیتا ہوں، گوہار جی... کو ہمارے حوالے کر دو۔ میں اس کو کوئی نہیں لے جانے دوں گا۔''

اس نے مکار کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہ میرے سینے میں آگ بھڑکا رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہیں آخری موقع دیتا ہوں، اپنی زبان کو لگام دے لو...... ورنہ اینٹ کا جواب پتھر سے ملے گا اور ایک بات صاف سن لو۔ گوہار زینت میرے پاس نہیں ہے۔ وہ تمہارے پاس ہے۔ تم نے پولیس پارٹی پر باقاعدہ حملہ کر کے اسے چھڑایا ہے۔ اسے واپس کرنا ہوگا اور تمہیں خود بھی اب قانون کا سامنا کرنا پڑے گا اور ایک دوسری بات بھی یاد رکھنا۔ ہماری ساتھی زانی تمہارے قبضے میں ہے......''

''سمجھ میں آ گیا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ ''یہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ ٹھیک ہے پھر تگڑے ہو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تم گوہار جی کو کیسے لے جاتے ہو کوسٹ۔'' اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

میرے پہلو میں بیٹھے عمران کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا، بولا۔ ''یہ کون تھا جو آپ سے اس لہجے میں بات کر رہا تھا؟''

''تمہارے خیال میں کون ہو سکتا ہے؟'' میں نے الٹا سوال کیا۔

''میرے خیال میں...... بلکہ مجھے یقین ہو رہا ہے کہ یہ وہ شاہ زیب ہے جس نے راستے میں گوہار زینت کو پولیس پارٹی سے چھڑوایا ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ بولا۔ ''مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ اس نے سردار حویلی میں آپ سے کوئی ''مقابلہ'' بھی کیا ہے۔ بہت بڑا فائٹر سمجھتا ہے خود کو؟''

''فائٹر تو شاید وہ ہے...... لیکن اپنے جرائم پیشہ دوست کی محبت میں وہ قانون کی حدیں توڑ رہا ہے۔''

''اب وہ کیا کہتا ہے؟'' عمران غصیلے آہنگ میں بولا۔

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے لگ رہا ہے کہ گوہار زینت اب اس کے پاس بھی نہیں ہے۔ وہ گوہار کی گمشدگی کا الزام ہم پر لگا رہا ہے۔''

''وہ بڑی فتنہ ساز عورت ہے جی...... اس علاقے کو کسی بڑی تباہی سے دوچار کر کے رہے گی۔'' عمران کے گلے کی رگیں پھول گئیں۔

میں سردار حویلی میں ہی عمران کو ساری صورت حال سے آگاہ کر چکا تھا۔ زانی کی مدد سے زینت کی نازیبا ویڈیو کا حاصل ہونا اور پھر اس ویڈیو کے حوالے سے زینت کا مجبور ہو کر عمران وغیرہ کی رہائی پر آمادہ ہونا...... یہ سب کچھ عمران وقاص اور انوش جٹ کے گوش گزار ہو چکا تھا۔

''اب یہ ماں کا فائٹر سپوت کیا کہہ رہا ہے؟'' عمران نے پوچھا۔

''مجھے اندازہ ہو رہا ہے عمران کہ وہ ہماری توقع سے زیادہ ہوشیار ہے۔ ہم فون کے ذریعے اس کی لوکیشن ٹریس نہیں کر سکتے لیکن مجھے شک ہے کہ وہ ہماری لوکیشن ٹریس کر سکتا ہے...... بلکہ شاید کر بھی چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ دیر بعد وہ ہمارے آس پاس کہیں پہنچ جائے۔''

''اللہ کرے پہنچ جائے۔'' عمران نے عجب پُرتپش لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے اسے گھورا۔

''بے شک آپ فائٹر ہیں لیکن آپ کا درجہ ایک استاد کا بھی ہے۔ اس باسٹرڈ نے آپ کی عمر کا لحاظ کیے بغیر اور آپ کی زخمی ٹانگ کی پروا کیے بغیر آپ کو میدان میں اتارا۔ اب اگر وہ للکارے گا تو اس للکار کا جواب میں دوں گا اور آپ دیکھیں گے کہ میں کیسا جواب دیتا ہوں۔'' عمران کے لہجے میں انگارے دہکنے لگے تھے۔

''ہاں وہ اسی باپ کا بیٹا تھا جو ہر وقت میرے پسینے پر اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ میری طرف آنے والی موت کے لیے اپنے سینے کو ڈھال بنا کر اسے ہمیشہ فخر محسوس ہوتا تھا۔ آج اس کا بیٹا بھی اسی لب و لہجے میں بات کر رہا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا وہ عمران تابش نہیں ہے...... اور شاید ابھی وہ شاہ زیب جیسے نہایت خطرناک فائٹر کو برابر کی ٹکر بھی نہیں دے سکتا۔

مجھے سوچ میں دیکھ کر وہ کچھ اور بپھر گیا۔ ''دیکھیں آپ ہر جگہ اپنی مرضی کرتے ہیں، لیکن اگر وہ یہاں آ گیا اور اس نے ہمیں للکارا تو آپ مجھے روکیں گے نہیں۔ میں بالکل صاف بات کر رہا ہوں۔'' وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا تا کہ میں مزید کچھ کہہ نہ سکوں۔

دو تین منٹ ہی گزرے تھے کہ میرے فون پر پھر کال کے سگنل آ گئے۔ دوسری طرف پھر شاہ زیب کی بھاری بھر کم آواز آ رہی تھی۔ ''آ گیا ہوں ڈپٹی! تمہاری تین گاڑیوں کی روشنیاں مجھے یہاں سے نظر آ رہی ہیں۔ اب بتاؤ کیا چاہتے ہو تم؟''

میری دھڑکن سرپٹ ہو گئی۔ حیرانی ہو رہی تھی کہ وہ اتنی سرعت سے یہاں تک پہنچ گیا ہے۔ ایسا کام جدید ٹیکنالوجی سے ہی ہوتا ہے۔ اس نے لوکیشن ٹریس کر لی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ...... تم کیا چاہتے ہو؟''

''میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کوئی بڑا تصادم نہ ہو۔ میں پولیس پارٹی کے خلاف کچھ بھی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ بے چارے تنخواہ دار تو اپنی ڈیوٹی پر ہیں۔ ان میں اصل ''رستم زماں'' تو تم ہی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم گوہار زینت صاحبہ کو لے کر یہاں آ جاؤ۔ میں چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اگر میں پھر کہوں کہ گوہار ہمارے پاس نہیں ہے تو......؟''

''تو بھی آ جاؤ، ہم ون ٹو ون بات کر لیتے ہیں۔'' اس کی آواز میں آگ بھڑکنے لگی تھی۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں دو منٹ میں جواب دیتا ہوں...... بلکہ دو تین منٹ بعد تم ہی کال کرو مجھے۔''

فون بند کر کے، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو عمران عین میرے عقب میں کھڑا تھا۔ وہ سب سن چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چنگاریاں تھیں۔

گمشدہ ماضی کی کھوج میں سرگرداں
ایک سرپھرے اجنبی کی دیوانگی اور جنونی
سرکشی کی سنسنی خیز داستان کے باقی
واقعات اگلے ماہ پڑھیں

Digest Novels .com

وطن فروش

احمد سلیم سلیمی

کہتے ہیں کہ انسانیت کے لیے خیر اور خوبصورتی ایک انسان سے دوسرے انسان میں منتقل ہوتی چلی جاتی ہے... جبھی تو انسان اب بھی زندہ ہے... لیکن اسی خیر کے ساتھ شر بھی جڑا ہوتا ہے... کچھ انسانوں میں شدت پسندی شر کی حد تک بڑھی ہوتی ہے... ان کا ذہن و دل اسی بے اعتدال زندگی میں ڈوبا رہتا ہے جبکہ انسانی برادری کی بھلائی اور نکھار انسانیت میں پوشیدہ ہے... ملک میں انتشار پھیلانے والے شدت پسندوں کے خفیہ منصوبے...

وطن کی سلامتی اور انسانیت کی بھلائی کے لیے قیامت خیز نذرانہ

زمان خان کی زندگی کولہو کے بیل کی طرح بس ایک کھونٹے سے بندھی ہوئی تھی۔ ہر صبح وہ اپنا ریڑھا لے کر فروٹ منڈی جاتا تھا۔ وہاں سے انگور اور انار ریڑھے پر لاد کر بازار آتا تھا۔ یہ انگور اور انار افغانستان سے یہاں لائے جاتے تھے۔ پشاور کی مرکزی فروٹ منڈی سے پھر انہیں خیبر پختون خواہ کے علاوہ پورے ملک میں بھیج دیا جاتا تھا۔

زمان خان پشاور کے جس علاقے میں ریڑھا لگا کر

پھل بیچتا تھا، وہ شہر کا معروف بازار تھا۔ صبح سے رات گئے تک ہزاروں لوگ وہاں سے گزرتے تھے۔ ان میں مقامی لوگ زیادہ ہوتے تھے۔ دوسرے شہروں سے آئے لوگ بھی دکھائی دیتے تھے۔

ریڑھا لگا کر پھل بیچنے والا صرف زمان خان نہیں تھا۔ بہت سے دوسرے لوگ بھی یہی کام کرتے تھے۔ بس اتنا فرق تھا کہ زمان خان مرکزی چوک کے پاس ایک ہی جگہ اپنا ریڑھا لگاتا تھا۔ جبکہ دوسرے لوگ گھوم پھر کر روزی روٹی کماتے تھے۔

اس مستقل ٹھکانے کی وجہ سے بہت سے لوگ زمان خان کے مستقل گاہک بن گئے تھے۔ بڑی تعداد میں لوگ جانتے بھی تھے کہ وہ اس ایک جگہ کیوں ریڑھا لگاتا تھا؟

زمان خان کی مرکزی چوک کے اس مقام سے ایک جذباتی وابستگی تھی۔ ایک دردناک حادثے کی ناقابلِ فراموش یادیں تھیں جن کی زنجیریں دو سال بعد بھی اس کے پیروں سے بندھی ہوئی تھیں۔

دو سال پہلے اس جگہ زمان خان کی محبوب بیوی کا ایک خودکش دھماکے میں خون ہوا تھا۔ اتنے عرصے بعد خون کے نشان کہیں نہیں تھے مگر اس سے جڑی الم ناک یادوں کے ایسے نشان باقی تھے جو دکھائی نہیں دیتے تھے لیکن زمان خان کے حواس کو اب بھی جھنجھوڑتے تھے۔

پانچ سال پہلے وہ شمالی وزیرستان کے ایک گاؤں ہرمز سے روزگار کی تلاش میں پشاور آیا تھا۔ ابتدائی دو ڈھائی سال اس نے بہت مشکل سے گزارے۔ کبھی مزدوری مل جاتی تھی۔ کبھی کئی کئی دنوں تک بے روزگار پھرتا رہتا۔ پشاور میں اس کے علاقے کے بہت سے جوان موجود تھے۔ ایسے ہی دو جوانوں کے ساتھ وہ ایک تنگ و تاریک کمرے میں رہتا تھا۔

تین سال بعد اس کی ملاقات سردار خان سے ہوئی۔ یہ افغان مہاجر تھا۔ بیس سال سے زیادہ عرصہ ہوا وہ قندھار سے آکر پشاور میں رہائش پذیر تھا۔ پھلوں کا آڑھتی تھا۔ افغانستان سے پھلوں کے ٹرک آتے تھے۔ ان میں تین چار ٹرک روزانہ سردار خان کے ہوتے تھے۔ پشاور کے علاوہ پنجاب اور سندھ کی منڈیوں تک اس کا مال جاتا تھا۔

زمان خان کام کی تلاش میں فروٹ منڈی کے چکر لگاتا رہتا تھا۔ کبھی کبھار ٹرک لوڈ ان لوڈ کرنے کا کام مل جاتا تھا۔

اس دوران سردار خان کی اس پر نظر پڑی۔ زمان خان صحت مند نوجوان تھا۔ سادہ مزاج اور محنتی۔ سردار خان کو اس کے ساتھ ہمدردی ہوئی۔ اس نے اپنے پیسوں سے زمان خان کے لیے ٹھیلا خریدا۔ اسے کمیشن پر مال دیا۔ زمان خان ٹھیلے پر افغانستان کے تازہ پھل لاد کر مختلف بازاروں اور سڑکوں پر پھرا کرتا اور شام تک ٹھیلے کا سارا مال بیچ دیتا۔

سردار خان اسے اتنا کمیشن دیتا تھا کہ عام مزدوری سے دگنی رقم اسے مل جاتی تھی۔ تین چار مہینے بعد وہ اس قابل بن گیا کہ کمیشن پر مال لینے کے بجائے اپنا مال خود خریدنے لگا۔

سردار خان اس کی ترقی پر خوش ہوا اور مارکیٹ کی نسبت خاص رعایت پر پھل اسے دینے لگا۔ رفتہ رفتہ زمان خان کے کام میں برکت ہوئی اور وہ خوب منافع کمانے لگا۔

سردار خان نے ایک دن اس سے کہا۔ ”زمان خان! تم ایک محنتی اور ایماندار نوجوان ہو۔ اب اچھا کمانے لگے ہو۔ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟“

”سردار صاحب! میرے ماں باپ مر گئے ہیں۔ ایک بہن ہے۔ شادی کے بعد وہ اپنے گھر کی ہو گئی ہے۔ میرے لیے کون لڑکی تلاش کرے گا؟“ اس نے مایوسی سے کہا۔

”میری نظر میں ایک لڑکی ہے۔ قندھار کے ایک غریب اور شریف خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ امریکی ڈرون حملے میں مارا گیا ہے۔ اپنی ماں اور چھوٹے بھائی کے ساتھ ادھر رہتی ہے۔ تم چاہو تو بات چلاتا ہوں؟“

زمان خان منع کیوں کرتا؟ اسے بغیر کسی دوڑ دھوپ کے بیوی مل رہی تھی۔ اس نے آمادگی ظاہر کی۔ سردار خان کی کوششوں سے جلد ہی بات پکی ہو گئی۔

زمان خان اب بھی میران شاہ کے دو نوجوانوں کے ساتھ ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا۔ اسے یہ پریشانی تھی کہ شادی کے بعد بیوی کو کدھر رکھے گا؟

سردار خان نے اس کی یہ پریشانی بھی دور کر دی۔ فروٹ منڈی کے نزدیک دو کمروں کا ایک کوارٹر بہت مناسب کرائے پر زمان خان کو دلوا دیا۔

مکان کی پریشانی دور ہوئی تو شادی کی تاریخ طے ہوئی اور گل دانہ بیاہ کر اس کے چھوٹے سے کوارٹر میں آگئی۔

زمان خان پڑھا لکھا نہیں تھا۔ ایک سیدھا سادہ جوان تھا۔ اس کے تصور میں بیوی کے حوالے سے کوئی خاص

رنگ ڈھنگ اور نین نقوش نہیں تھے۔ جب پہلی رات اُس نے گل دانہ کا گھونگھٹ اٹھایا تو حیرت اور مسرت سے جیسے سانس لینا بھول گیا تھا۔ بس پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ سرخ و سفید رنگ کی ایک بھولی بھالی لڑکی تھی۔ زمان خان کے تصور کی ہر حسین لڑکی سے زیادہ جاذب نظر تھی۔ پہلی ہی نظر میں وہ زمان خان کے دل میں اتر گئی تھی۔

وہ خود کو سردار خان کے احسانات تلے دبا محسوس کرتا تھا۔ وہ بے روزگار تھا۔ ان کی وجہ سے روزگار مل گیا تھا۔ ایک خوب صورت بیوی کی سنگت نصیب ہوئی تھی۔ نہایت مناسب کرائے پر مکان مل گیا تھا۔ ایسے میں سردار خان کا وہ بے دام غلام بن چکا تھا۔ ان کی بات زمان خان کے لیے حکم کا درجہ رکھتی تھی۔

جب بھی وہ کام سے فارغ ہوتا تھا۔ فروٹ منڈی میں سردار خان کے دفتر میں جا کر بیٹھ جاتا تھا۔ سردار خان کے مہمانوں کے لیے چائے پانی کی خدمت بجالاتا تھا۔ اس بہانے زمان خان کو بھانت بھانت کے لوگوں سے ملنے اور ان کی باتیں سننے کا موقع ملتا تھا۔ زمان خان اپنے محسن کے مہمانوں کی خدمت کر کے دلی راحت محسوس کرتا تھا۔

ان مہمانوں میں افغان تاجر بھی ہوتے تھے۔ سردار خان کی جان پہچان کے افغان مہاجر بھی۔ ان کے علاوہ شمالی اور جنوبی وزیرستان سے آئے لوگ بھی ہوتے تھے۔

اکثر و بیشتر قہوہ اور سگریٹ پیتے ہوئے سیاسی گفتگو بھی کرتے تھے۔ زمان خان ایک طرف سر جھکائے بیٹھا رہتا اور ان کی گفتگو سنتا۔ وہ اَن پڑھ تھا۔ ملکی اور عالمی حالات کا زیادہ علم نہیں تھا۔

اپنی سادگی اور کم علمی کے باوجود کچھ باتیں اسے زہر لگتی تھیں۔ خاص کر افغان تاجر اور مہاجرین جب پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کے خلاف باتیں کرتے تھے۔ افغانستان کے مسائل اور مشکلات کا ذمے دار انہیں ٹھہراتے تھے تو زمان خان کے دل و دماغ میں ایک شدید احتجاجی لہر اٹھتی۔ دل ہی دل میں وہ افسوس کرتا۔ جب سردار خان بھی ایسے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

زمان خان سوچتا تھا، یہ لوگ کتنے ناشکرے ہیں؟ اس کی پیدائش سے بھی بہت عرصہ پہلے افغان مہاجرین پاکستان آئے ہیں۔ تیس چالیس لاکھ پناہ گزینوں کو پاکستان کھلا پلا رہا ہے۔ انہیں رہنے کے لیے جگہ دی ہے۔ کمانے کے مواقع دیے ہیں۔ اس کے باوجود یہ لوگ پاکستان کی مخالفت میں بات کرتے ہیں۔

اس کا دل چاہتا تھا، ان سے بحث کرے۔ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کی حمایت میں بات کرے لیکن یہ سوچ کر کہ سردار خان کہیں ناراض نہ ہو جائیں، وہ خاموش بیٹھا رہتا تھا۔

انہی دنوں افغانستان میں کرزئی حکومت کا خاتمہ ہوگیا۔ طالبان ایک بار پھر تختِ کابل پر براجمان ہو گئے تھے۔ اس سے پاکستان میں اطمینان اور خوشی کی لہر پھیل گئی۔ کیونکہ کرزئی حکومت کا جھکاؤ انڈیا کی طرف زیادہ تھا۔ اس دور میں انڈین عمل دخل بھی افغانستان میں بڑھ گیا تھا۔ جس کی وجہ سے پاکستان میں انڈین اسپانسرڈ دہشت گردی بھی بڑھ گئی تھی۔

اب طالبان کی حکومت قائم ہونے سے یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ بھارت کا اثر ورسوخ ختم ہوگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ایسا تو ہوگیا مگر ایک اور خطرہ سر اٹھا کر کھڑا ہوگیا۔ یہ داعش، القاعدہ اور ٹی ٹی پی جیسی انتہا پسند تنظیموں کا دوبارہ طاقت حاصل کرنے کا اندیشہ تھا۔ طالبان کا برسرِ اقتدار آنا ان تنظیموں کے لیے نیک شگون تھا۔ افغان سرزمین اب ان انتہا پسند تنظیموں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بن گئی تھی۔

افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہونے کے تھوڑے ہی عرصے بعد یہ اندیشے سچ ثابت ہوئے۔ خاص کر ٹی ٹی پی جیسی پاکستان دشمن تنظیم کی جنگجویانہ سرگرمیاں بڑھنے لگیں۔ بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگ اور پاک فوج کے خلاف حملوں میں اضافہ ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ باتیں کھل کر سامنے آگئیں کہ انڈیا ان عناصر کی پشت پناہی کر رہا تھا۔

پاک فوج اور دیگر سیکیورٹی فورسز نے قربانیاں بھی دیں اور ان وطن دشمن عناصر کے خلاف بے رحمانہ کارروائیاں بھی شروع کیں۔ اس کے ردِعمل میں شہری علاقوں میں بم دھماکے اور خودکش حملے ہونے لگے۔ خاص کر بلوچستان اور خیبر پختون خواہ میں ان فتنہ الخوارج اور فتنہ الہند کی تباہ کن سرگرمیوں سے بدامنی اور خوف و ہراس کا ماحول پیدا ہونے لگا۔

زمان خان کی شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے۔ ایک دن گل دانہ کی طبیعت خراب ہوئی تو اسے لے کر اسپتال گیا۔ گل دانہ کی والدہ بھی ساتھ تھی۔

واپسی پر زمان خان کو یہ خوش خبری سننے کو ملی کہ اس کی بیوی امید سے تھی۔ طبیعت بھی اسی وجہ سے خراب ہوئی تھی۔

زمان خان کے لیے یہ خبر جیسے زمانے بھر کی خوشیوں کا پیغام لے کر آئی تھی۔ گل دانہ کو گھر چھوڑ کر وہ سیدھا سردار

Digest Novels .com

خان کے پاس گیا۔ مسرتوں کے ہجوم میں انہیں بھی یہ خوش خبری سنائی اور وہاں موجود سب لوگوں کو مٹھائی کھلائی۔

سردار خان نے بھی زبردست خوشی کا اظہار کیا اور یہ اعلان کیا کہ بچے کی پیدائش پر وہ بکرا ذبح کرے گا اور منڈی کے سب لوگوں کی دعوت کرے گا۔

زمان خان کی خوشیوں کا عرصہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ ایک روز اس کی بیوی اپنی والدہ کے ساتھ لیڈی ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔ معمول کے چیک اپ کے بعد ایک رکشے میں بیٹھ کر دونوں ماں بیٹی گھر کی طرف آرہی تھیں۔ مرکزی بازار میں سے گزر رہی تھیں کہ قریب ہی کھڑی ایک پولیس وین کے پاس خودکش دھماکا ہوا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ سو میٹر کے دائرے میں ہر شے تباہ ہوگئی تھی۔ متعدد گاڑیوں سمیت کئی لوگ مارے گئے تھے۔ درجنوں زخمی ہوئے تھے۔

زمان خان کی دنیا جیسے اندھیر ہوگئی۔ اس کی محبوب بیوی ہی نہیں ماری گئی تھی، اس کا دو مہینے کا بچہ بھی پیدائش سے قبل ہی عالم بالا واپس جا چکا تھا۔

کئی مہینوں تک وہ جیسے زندہ لاش بن کر رہ گیا تھا۔ اس نے حادثے کا اتنا اثر لیا کہ کام پر جانا چھوڑ دیا۔ کھانے پینے کا کچھ ہوش نہیں تھا۔ کئی کئی دن تک کمرے سے باہر نہیں نکلتا تھا۔ کسی اشد ضرورت سے باہر جاتا بھی تو گم صم سا رہتا۔ کسی سے بات نہ کرتا۔

سردار خان اس کی حالت سے بہت فکرمند رہتا تھا۔ اس کی کوششوں سے تین چار مہینے بعد وہ سنبھل گیا۔ زندگی کی رونقیں روٹھ گئی تھیں مگر زندگی کے معاملات سے چھٹکارا ممکن نہیں تھا۔ ایک بار پھر وہ اپنا ریڑھا لے کر بازار میں آیا۔ پہلے جگہ جگہ گھوم پھر کر پھل بیچتا تھا۔ اب جیسے اس کے ریڑھے کے پہیے زمین میں دھنس گئے تھے۔ مرکزی چوک کے پاس عین اس مقام پر جہاں اس کی گل دانہ بم دھماکے میں جان سے گئی تھی۔ وہ اپنا ریڑھا لگا کر بیٹھ جاتا تھا۔ آس پاس کے لوگ زمان خان کی بیوی کے ساتھ ہوئے الم ناک واقعے سے واقف تھے۔ وہ اس پر ترس کھاتے۔ اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے لیکن زمان خان درد کے جس دور سے گزر رہا تھا اسے بانٹ کر کم نہیں کرسکتے تھے۔

ایک سال گزر گیا۔ اس دوران کئی موسم آئے اور گئے لیکن زمان خان کے دل پر بس ایک ہی موسم چھایا رہا۔ وہ غم کا موسم تھا۔

وہ فارغ وقت میں صرف سردار خان کے دفتر میں جا کر تھوڑی دیر بیٹھ جاتا تھا۔ بجھا بجھا سا، افسردہ سا ایک طرف بیٹھا رہتا۔ سردار خان کے مہمان آتے تو ان کے لیے چائے قہوہ پیش کرتا۔

ایک شام وہ سردار خان کے دفتر گیا تو پانچ چھ افراد وہاں بیٹھے تھے۔ سگریٹ اور چائے کا دور چل رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ کسی موضوع پر بڑی گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ وہ اک ذرا جھجکتا ہوا ایک طرف کرسی پر بیٹھ گیا۔ ذرا ہی دیر میں وہ سمجھ گیا، ان کی بحث کا موضوع پاکستان میں بم دھماکے اور ان کی وجوہات تھا۔ ایک آدھ کے علاوہ سب کی یہ رائے تھی کہ پاکستان میں دہشت گردی کے جو واقعات ہو رہے تھے، ان کے پیچھے پاکستان کی سیاسی، عسکری اور خارجی پالیسیاں تھیں۔

زمان خان نے غور سے دیکھا۔ ان میں تین افراد پہلی بار اس محفل میں دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں ایک مچگی داڑھی کا، کمزور جسامت کا شخص تھا۔ اس کے سر پر گول اونی ٹوپی تھی۔ اس کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان تھی۔ بات کرتے ہوئے اس کی آنکھیں تیزی سے دائیں بائیں حرکت کرتی تھیں۔ وہ سب سے زیادہ پاکستان اور سیکیورٹی اداروں کے خلاف زہر اگل رہا تھا۔

کچھ دیر بیٹھ کر زمان خان باہر نکلا۔ ان کی گفتگو سے اس کا دل کھٹا ہوگیا تھا۔ سردار خان کے احترام میں وہ بحث میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ ورنہ بہت سے خیالات اور جوابات اس کے ہونٹوں تک آکر رک جاتے تھے۔

سردار خان کے دفتر کے باہر اک ذرا کھلا لان تھا۔ وہاں پر آکر اس نے سگریٹ سلگایا۔ چند کش لیے تھے، اسے مچگی داڑھی والا وہ شخص اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آکر وہ شخص رکا۔

''اے جوان! مجھے بھی سگریٹ دے دو۔'' اس مچگی داڑھی والے شخص نے کھردری سی آواز میں کہا۔

زمان خان نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔ سگریٹ لے کر اس شخص نے سلگایا۔ ایک گہرا کش لے کر کہا۔ ''سردار صاحب بتا رہا تھا ایک سال پہلے تمہاری بیوی بم دھماکے میں ماری گئی ہے۔''

''جی ہاں۔ میری بیوی کے ساتھ میری آنے والی اولاد بھی...... میری ساس بھی اس حادثے میں جاں بحق ہوئی تھیں۔''

اس نے بوجھل سی آواز میں کہا۔

''بہت افسوس ہوا سن کر۔ لیکن کیا کریں؟ یہ واقعات اب معمول بن گئے ہیں۔ کتنے ہی گھروں میں تمہاری طرح

کی دردناک کہانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ کس کس کا افسوس کریں؟ کس کس کا ماتم کریں؟ سارا قصور اس ملک کے سیاسی اور فوجی بڑوں کا ہے۔ تمہاری بیوی کی شہادت کے اصل ذمّے دار بھی وہی ہیں۔''

زمان خان کا دل اس دلیل سے مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے سادگی سے کہا۔ ''میری بیوی کو مارنے والا فوج کا یا سیاست کا بندہ نہیں تھا۔ ایک دہشت گرد تھا۔ جس نے اپنے جسم سے بم باندھا اور پھٹ گیا۔ اپنے ساتھ بہت سے عام لوگوں کو بھی مار ڈالا۔''

''یہی تو بات ہے برخوردار! کوئی وجہ تو ہوگی کہ اس بندے نے اپنے ساتھ بہت سے معصوم لوگوں کو بم سے اُڑا دیا۔''

''وجہ ہے نا۔ پاکستان کے دشمن ملک یہاں امن اور ترقی نہیں چاہتے۔ بم دھماکے کرا کے وہ ہمیں کمزور بنانا چاہتے ہیں۔''

''تم بہت سیدھے سادے نوجوان ہو۔'' اس چُگی داڑھی والے نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر اس کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں بہت سی باتوں کی سمجھ نہیں۔ مثلاً تم اس شخص کو ہی اپنی بیوی کا قاتل سمجھتے ہو جس نے بم باندھ کر خود کو اُڑا دیا تھا۔ جبکہ تمہاری بیوی کے قتل کے اصل ذمّے دار کوئی اور ہیں۔ یہ بتاؤ۔ اگر تمہیں اپنی بیوی کے قاتلوں کا پتا چلا تو ان کے ساتھ کیا کرو گے؟''

زمان خان کی آنکھوں میں ایک دم خون اتر آیا۔ وہ ہونٹ بھینچ کر کپکپاتی آواز میں بولا۔ ''میں ان کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا۔ جس طرح میری معصوم اور خوب صورت بیوی کے جسم کے ساتھ انہوں نے کیا تھا۔''

''ہوں۔ تم واقعی ایک غیرت مند پٹھان لگتے ہو۔ اب مجھ پر بھروسا کرو۔ تمہاری بیوی کے قاتلوں کو میں جانتا ہوں۔ میں تمہیں بھی بتادوں گا۔''

زمان خان نے تڑپ کر اس چُگی داڑھی والے شخص کو کاندھے سے پکڑا۔ ''کون ہیں وہ خنزیر کے بچے! مجھے بس اشارہ کردو۔ میں ان کا حشر نشر کردوں گا۔''

''اگر تم اپنی بیوی کے قاتلوں تک پہنچنا چاہتے ہو تو میں جہاں لے جاؤں، میرے ساتھ آنا ہوگا۔''

''کدھر جانا ہے؟ مجھے ابھی لے جاؤ۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔

''ابھی صبر کرلو۔ رات کے وقت میں تمہیں امیر صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ تمہیں ان کی باتوں کو دل سے سننا ہوگا۔ ان پر عمل بھی کرنا ہوگا۔''

''یہ امیر صاحب کون ہے؟ وہ کیسے جانتے ہیں؟''

''امیر صاحب ایک غیرت مند مومن ہیں۔ تم جب ان کی باتیں سنو گے تو خود سمجھ جاؤ گے۔ میں رات دس بجے آؤں گا۔ میرا انتظار کرو۔''

چُگی داڑھی والا شخص اس کی بے قراری بڑھا کر وہاں سے چلا گیا۔

رات دس بجے اس کے مکان کا دروازہ کسی نے زور زور سے کھٹکھٹایا۔ وہ سمجھ گیا چُگی داڑھی والا شخص آیا ہوگا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ وہی تھا۔

''زمان خان! چلو آؤ۔ امیر صاحب سے ملنے کا وقت ہوا ہے۔''

اس نے دروازے بند کیے۔ سڑک پر ایک وین موجود تھی۔ اس میں دونوں بیٹھ گئے۔ ڈرائیور نے وین آگے بڑھادی۔ زمان خان کا خیال تھا کہ پشاور شہر کے اندر ہی کہیں جانا ہوگا۔ لیکن بہت دیر سڑکوں اور بازاروں میں چلتے رہنے کے بعد وین کا رخ شہر کے مضافات کی طرف ہوا۔ پھر ایک جگہ وین رک گئی۔ چُگی داڑھی والا شخص اسے اپنے ساتھ لے کر ایک گلی میں داخل ہوا۔ گلی تنگ اور تاریک تھی۔ چُگی داڑھی والے شخص نے اندھیرے میں ڈوبے ایک دروازے پر دستک دی۔ ذرا دیر بعد کسی نے اندر سے ٹٹولنے کے انداز میں پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں۔ جہانگیر شاہ۔ جنت کا مسافر لے کر آیا ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' اس نے پُراسرار سرگوشی میں کہا۔

دروازہ کھل گیا۔ ایک آدمی نے ٹارچ کی روشنی ان پر ڈالی پھر ایک طرف ہوکر انہیں اندر آنے کا راستہ دے دیا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں کلاشنکوف تھی۔

زمان خان حیران پریشان سا چُگی داڑھی والے کے ساتھ مکان میں داخل ہوا۔ مکان وسیع و عریض رقبے پر تھا۔ اس میں بجلی تھی لیکن صرف کمروں میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔

چُگی داڑھی والا شخص جس کا نام پہلی بار زمان خان کے علم میں آیا تھا۔ اسے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا۔ فرش پر قالین تھا۔ اس پر گدے اور تکیے دھرے تھے۔ زمان خان کو وہاں بیٹھنے کا اشارہ کرکے وہ خود باہر چلا گیا۔

زمان خان اس کمرے میں ایک تکیے سے ٹیک لگا کر

Digest Novels .com

بیٹھ گیا۔ اسے ابھی تک سمجھ نہیں آئی تھی کہ جہانگیر شاہ اسے جس امیر صاحب سے ملوانے لے آیا تھا، وہ اتنے پُراسرار ماحول میں کیوں رہتا تھا؟

تھوڑی دیر بعد جہانگیر شاہ کمرے میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں تانبے کا بڑا سا گلاس تھا۔

وہ بولا۔ ''زمان خان! یہ خاص مشروب ہے۔ امیر صاحب کے پاس جانے سے پہلے اسے پی لو۔ اس سے تمہارے دل ودماغ سے غلط سوچیں دور ہوں گی۔''

اس نے گلاس تھاما۔ گھونٹ گھونٹ اسے پینے لگا۔ مٹھاس کے ساتھ گلے سے اترتے ہی کڑوا سا ذائقہ محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے پورا گلاس ختم کرلیا۔

جہانگیر شاہ اسے ٹٹولتی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ابھی ہم دوسرے کمرے میں جائیں گے۔ وہاں امیر صاحب تمہارے منتظر ہیں۔ تم اُن کی باتیں سنو گے۔ اس کے بعد تمہیں اندازہ ہوگا کہ تم کتنے اندھیرے میں ہو؟ تمہیں اپنی منزل تک جانے کے لیے روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ روشنی تمہیں امیر صاحب دکھادیں گے۔''

زمان خان اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکلا۔ ایک راہداری سے ہوتے ہوئے وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ بڑا سا کمرا تھا۔ سامنے ایک تخت تھا۔ جس پر گاؤ تکیے تھے۔ کمرے میں کوئی دوسرا شخص نہیں تھا۔

اسی وقت بجلی چلی گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔

اچانک ہی ایک بھاری سی اور گونجتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ یہ کسی لاؤڈ اسپیکر میں سے نکل کر اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔

''آؤ، آؤ زمان خان! تمہارے جیسے غیرت مند جوان ہماری طاقت ہیں۔ ہمارے مقصد کی کامیابی کی ضمانت ہیں۔''

اس نے اپنے دائیں جانب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ بجلی جانے سے پہلے وہاں جہانگیر شاہ کھڑا تھا۔ گھپ اندھیرے میں وہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

زمان خان نے آہستہ سے کہا۔ ''چچا جہانگیر شاہ! یہ اندھیرا کیوں ہے؟''

جہانگیر شاہ کے بجائے اسی گونجتی ہوئی آواز نے جواب دیا۔ ''یہ اندھیرا پاکستانیوں کا مقدر ہے بیٹا! اس سے نجات حاصل کرنا ہے تو اپنے حصے کا چراغ خود جلانا ہوگا۔''

زمان خان کو حیرت ہوئی۔ اس نے آہستہ سے بات کی تھی مگر اسپیکر کے ذریعے بولنے والے نے دور سے سن لی تھی۔ ایک اور بات اس کے دماغ میں بے چینی پیدا کر رہی تھی۔ اسے یہ آواز کچھ سنی سنی سی لگ رہی تھی۔ لیکن واضح نہیں ہو رہا تھا کہ کہاں سنی تھی۔ اسپیکر میں سے گزر کر آنے کی وجہ سے شاید آواز بدل گئی تھی۔

اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا آپ امیر صاحب ہیں؟ آپ کس اندھیرے کی بات کر رہے ہیں؟''

''میرے بارے میں تمہارا اندازہ درست ہے لیکن میں حیران ہوں۔ چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو تم کیوں نہیں سمجھ رہے ہو؟ میرے بیٹے! یاد رکھو، اندھیرا دو قسم کا ہے۔ ایک وہ اندھیرا ہے جو اس وقت تمہاری آنکھوں کے آگے ہے۔ دوسرا اندھیرا دیکھنے کے لیے آنکھ کی نہیں دماغ کی ضرورت ہے۔ یہ وہ اندھیرا ہے جو ظلم سے، بے دینی سے اور کفر کے نظام سے پھیل جاتا ہے...... اور پاکستان میں اس وقت یہ اندھیرا پھیلا ہوا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے تمہارے جیسے غیرت مند جوانوں کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔''

زمان خان کے دماغ میں ہلکا سا سُرور چھا رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا، ایسی کیفیت کیوں ہو رہی تھی؟ لیکن ایک بات اس کے دماغ میں کھٹک رہی تھی کہ دوسرے کمرے میں جو مشروب پیا تھا۔ شاید اس کی وجہ سے سُرور سا دماغ میں چھایا ہوا تھا۔

اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''امیر صاحب! پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اسے کفر کا نظام کیوں کہتے ہیں؟''

''یہی تو غلط فہمی ہے میرے بیٹے! جسے تم اسلامی ملک کہتے ہو۔ برائے نام ایسا ہے۔ اصل میں سارا نظام، سارے قانون انگریزوں کے چلتے ہیں۔ کالج اور یونیورسٹیوں میں کافرانہ تعلیم دی جا رہی ہے۔ بے حیائی پھیلائی جا رہی ہے۔ نوجوان نسل کو بے غیرت بنایا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کے سب سے بڑے دشمن امریکا کی مرضی اور حکم سے یہ ملک چلتا ہے۔ اسی امریکا کی خوشی کے لیے شمالی اور جنوبی وزیرستان میں بے گناہ مسلمانوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔ جہاد کے جذبے سے سرشار مجاہدوں کو چن چن کر شہید کیا جا رہا ہے۔ افغانستان کے غیور اور اسلامی جذبے سے بھرے مسلمانوں کے خلاف امریکا اور اس کے حواریوں نے جتنی جنگی کارروائیاں کی ہیں پاکستان ان کی مدد کرتا ہے۔ ایسے میں تم کیسے کہتے ہو کہ پاکستان میں اسلامی نظام رائج ہے۔''

زمان خان کے دل ودماغ میں کشمکش جاری تھی۔ امیر

صاحب کی باتیں کانوں سے اتر کر دماغ اور دل پر دستک دے رہی تھیں۔ ایک طرف ان کے خلاف احتجاجی ردِعمل پیدا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف ہلکے ہلکے سُرور کی کیفیت میں یہ باتیں اپنا اثر بھی پیدا کر رہی تھیں۔

اس کے احتجاجی ردِعمل نے سوال اٹھایا۔ ''امیر صاحب! اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان میں دہشت گردی کی جائے۔ جگہ جگہ بم دھماکے کیے جائیں۔ معصوم لوگوں کو مارا جائے۔''

''ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے، اسے مزید ظلم سے باز رکھنے کے لیے انتہائی اقدام ضروری ہوتا ہے۔ یہ خودکش حملے کرنے والے مجاہد اللہ کے خاص بندے ہوتے ہیں۔ اس مختصر سی اور پریشانیوں سے بھری دنیا کے بجائے کبھی نہ ختم ہونے والی اور نعمتوں سے بھری آخرت کے مسافر ہوتے ہیں۔ بم باندھ کر خود کو اُڑا کر یہ نہ صرف ظالموں کو للکارتے ہیں بلکہ اپنے لیے جنت کے راستے کھول دیتے ہیں۔ ایک بٹن دبانے کی دیر ہوتی ہے پھر فرشتے جنت کے ان مہمانوں کے استقبال کے لیے زمین پر اتر آتے ہیں۔ ذرا سوچو، کیسی سعادت کی موت ہوتی ہے ان مجاہدوں کی...... سبحان اللہ!''

''آپ اندھیرے میں بات کیوں کرتے ہیں؟ کیا سامنے نہیں آئیں گے؟''

''میں تمہارے دل اور دماغ کو پہلے روشن کر دوں گا میرے بیٹے! پھر سامنے آؤں گا۔''

''جہانگیر شاہ بتا رہے تھے کہ آپ میری بیوی کے قاتلوں کو جانتے ہیں اور ان سے انتقام لینے میں میری مدد بھی کریں گے۔''

''کیا تم ابھی تک اُن کو پہچان نہیں سکے ہو؟ تمہاری بیوی کے قاتل اس ملک کے حکمران ہیں۔ چاہے وہ سیاسی ہوں یا محافظ۔ اس ملک کا کافرانہ نظام ہے۔ تمہیں ان سے انتقام لینا ہوگا۔ یہ صرف خون کا بدلہ نہیں بلکہ ایک مقدس جہاد ہے۔''

''میں اُن سے انتقام کیسے لوں گا؟ وہ مجھے کہاں ملیں گے؟''

''ان سے انتقام لینا مشکل نہیں۔ تمہاری طرح بہت سے غیرت مند مجاہدوں نے پہلے بھی ایسا کیا ہے۔ بس اس کے لیے ضروری ہے کہ اس عارضی اور بے فائدہ زندگی کی محبت دل سے نکال دی جائے۔ اس بے کار زندگی کو قربان کرنے کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ ایک ایسی سعادت والی موت کو گلے لگایا جائے جو ہمیشہ رہنے والی زندگی اور نعمتوں سے بھری جنت کے دروازے کھول دے۔ دو تین سیکنڈز کی بات ہے۔ ایک بٹن دب جائے گا۔ دھماکا ہوگا۔ پھر قطار اندر قطار فرشتے اتریں گے۔ دولھے کی طرح برات کی شکل میں جنت لے کر جائیں گے۔ اس جنت میں جہاں حوروں کا ہجوم ہوگا۔ ان سب کی ملکہ تمہاری بیوی گل دانہ ہوگی۔''

زمان خان کے دماغ پر نشے کے اثرات گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ امیر صاحب کی باتیں کسی جادوئی تاثیر کے ساتھ اس کے دل و دماغ میں اتر رہی تھیں۔ اس کی مزاحمت اور اس کے احتجاجی ردِعمل کو توڑ پھوڑ کر اسے ایک نئے سانچے میں ڈھال رہی تھیں۔

☆☆☆

تین چار دن بعد کی ایک رات کا ذکر ہے۔ زمان خان کمرے میں آنکھیں بند کیے نیم دراز تھا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں امیر صاحب سے پہلی ملاقات سے پہلے اسے مشروب پلایا گیا تھا۔ اس کے دماغ پر سُرور کی کیفیت اب بھی طاری تھی۔ جسم بوجھل بوجھل سا تھا مگر دل و دماغ کسی طلسمی نشے کے زیرِ اثر جیسے ہواؤں میں اُڑ رہے تھے۔ ان دیکھی وادیوں اور جنت نشاں باغوں کی سیر کر رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا ان باغوں میں نرم و نازک پریاں ناچ رہی تھیں۔ حوریں بہشتی گیت گا رہی تھیں۔ ان کے بیچ اس کی گل دانہ کسی ملکۂ حُسن کی طرح پورے وقار سے سبک سبک چلتی دونوں بازو پھیلائے اس کی جانب آ رہی تھی۔

اچانک وہ چونک اٹھا۔ کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ جہانگیر شاہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ ''زمان خان! کیسا محسوس کر رہے ہو؟ جنت کے راستے پر چلنے کے لیے تیار ہو نا؟'' اس نے ٹٹولتی آواز میں پوچھا۔

زمان خان نے اثبات میں سر ہلایا اور کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ''میں شہادت کے شوق سے تڑپ رہا ہوں۔ میں جلد سے جلد اپنی گل دانہ سے ملنے کو بے تاب ہوں۔''

''سبحان اللہ! جذبہ ہو تو ایسا، شہزادے! تم بہت جلد اپنی محبوب بیوی کے پاس پہنچ جاؤ گے۔ بس آج کی رات کاٹ لو۔ کل صبح تم ایک بڑے مقصد کی خاطر اپنی عارضی زندگی قربان کر دو گے۔ اور ہمیشہ کی کامیاب اور نعمتوں سے بھری زندگی پا لو گے۔ تمہیں یاد ہے نا کل تم کو کیا کارنامہ

Digest Novels .com

سرانجام دینا ہے؟“

”جی ہاں۔ کل چودہ اگست ہے۔ پاکستان کا یوم آزادی۔ کل گورنر ہاؤس کے باہر عین اُس وقت جب فوجی اور سیاسی قائدین یوم آزادی منا رہے ہوں گے۔ میں بم باندھ کر دھماکا کر دوں گا۔ ان بے دین لوگوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اپنی گل دانہ کا بدلہ لوں گا۔ پھر اس سے ملنے جنت کے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔“

”شاباش! اللہ پاک تمہیں اس عظیم مقصد میں کامیابی دے دے اور تمہاری قربانی قبول فرمائے۔ ابھی تم آرام سے سو جاؤ۔ کل صبح ایک عظیم مقصد کے لیے تازہ دم ہو کر بیدار ہو جاؤ گے۔“

”میری درخواست امیر صاحب تک پہنچائی ہے نا؟ میں آخری سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اپنے محسن سردار خان سے ملنا چاہتا ہوں۔ اُن کی دعائیں لینا چاہتا ہوں۔“

”جی جی۔ تم بے فکر رہو۔ امیر صاحب نے تمہاری درخواست منظور کر لی ہے۔ کل ٹارگٹ کی طرف جاتے ہوئے فروٹ منڈی میں سردار خان سے تمہاری آخری ملاقات کرائی جائے گی۔“

جہانگیر شاہ اُسے ایک دو ہدایات دے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ دروازہ بند ہوتے ہی زمان خان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ بند دروازے کی طرف سلگتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس نے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

بند دروازے کے پیچھے تنہائی میں اس کی آنکھوں سے نشے کے اثرات مٹ گئے تھے۔ ان کی جگہ چنگاریاں سی چھوٹ رہی تھیں۔

☆☆☆

وین شہر کی طرف دوڑ رہی تھی۔ مختلف راستوں، سڑکوں اور بازاروں سے گزرتے ہوئے وہ فروٹ منڈی کے پاس پہنچ گئے۔ جگہ جگہ بچے بھی بڑے بھی قومی پرچم ہاتھوں میں تھامے جشنِ آزادی منا رہے تھے۔ دکانوں اور گاڑیوں سے وطن کے گیت اور ملی نغمے اونچی آوازوں میں سنائی دے رہے تھے۔

جہانگیر شاہ بولا۔ ”اے جنت کے شہزادے! تمہاری خواہش پوری کر رہے ہیں۔ چلو سردار خان سے آخری ملاقات کر لو۔ آدھ گھنٹے بعد تمہیں اپنے ٹارگٹ کے پاس پہنچنا ہے۔“

وہ خاموشی سے وین سے اترا۔ جہانگیر شاہ کے ساتھ چلتا ہوا سردار خان کے دفتر میں آیا۔ قریب ہی کوئی من چلا محبِ وطن ڈیک پر اونچی آواز میں وطن کے گیت بجا رہا تھا۔ ایک معروف ملی نغمہ ہر طرف گونج رہا تھا۔

”تو سلامت وطن...... تا قیامت وطن“

سردار خان اکیلا ہی اپنی کرسی پر بیٹھا بہ ظاہر میز پر جھکا کچھ لکھ رہا تھا۔ زمان خان کو دیکھ کر کھڑا ہوا اور دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔ ”میرے بیٹے! جہانگیر شاہ نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ جس عظیم مقصد کی خاطر تم جا رہے ہو۔ ہم سب کو تم پر فخر ہے۔ بہت جلد تم گل دانہ بیٹی سے جنت کے باغوں میں ملو گے۔ اِن شاء اللہ!“

یہ کہہ کر وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کی طرف بڑھا۔ زمان خان کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ وہ سردار خان کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سما کر ان کے سینے کے ساتھ لگ گیا۔

”سردار خان چچا! آپ میرے محسن ہیں۔ مجھے فٹ پاتھ سے اٹھا کر عزت سے جینے کا طریقہ سکھا دیا۔ یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گا......“

اس نے سردار خان کے گرد اپنے بازوؤں کا گھیرا سخت کر لیا اور سرسراتی آواز میں کہا۔ ”میں یہ بھی نہیں بھولوں گا کہ آپ بھیڑ کی کھال اوڑھ کر ایک بھیڑیا ہیں۔ جس ملک نے آپ پر احسان کیا۔ جس سالوں سے آپ کو پالا پوسا اور عزت سے زندگی گزارنے کا موقع دیا۔ اسی پاک وطن کو نقصان پہنچانے کی ذلیل حرکتیں کرتے ہیں۔ سب کے لیے پھلوں کے آڑھتی ہیں۔ درپردہ میرے جیسے ناسمجھ اور حالات کے ستائے ہوئے جوانوں کو خودکش بم بار بنا رہے ہیں۔ میری گل دانہ کے قاتل اس وطن کے فوجی اور سیاست دان نہیں۔ بلکہ آپ جیسے احسان فراموش اور ملت فروش غدار ہیں۔ میں نے قسم کھائی تھی اپنی گل دانہ کے قاتلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا۔ اس کا موقع آپ نے خود مجھے دے دیا ہے، امیر صاحب!......“

اس کے ساتھ ہی زمان خان نے اپنے جسم کے ساتھ بندھے بم کا بٹن دبا دیا۔ ایک کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا۔ خدا جانے وہ اپنی گل دانہ سے ملے گا یا نہیں۔ لیکن وطن دشمن عناصر کا ایک خطرناک آلۂ کار عبرت ناک انجام سے دوچار ہو گیا تھا۔

باہر ساحر علی بگا کی جوش بھری آواز اب بھی گونج رہی تھی۔

”تو سلامت وطن...... تا قیامت وطن“

❖❖❖

دشمن

افشین نسیم

زندگی میں اپنوں کی محبت ہی سب کچھ ہوتی ہے... ایسے پرسکون اور پرعافیت شب و روز میں کوئی ایک واقعہ ایسا رونما ہوتا ہے کہ مٹی ہٹانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی کیونکہ اوپر ہی سے پتھر اور چٹانیں نظر آجاتی ہیں...

ایک دل دوز واقعے کی بازگشت میں چھپے راز......

صائم نے آج آفس سے چھٹی کی تھی اور ایاز اکیلا ہی آفس چلا گیا تھا۔ دونوں کا آئی بی میں ڈیوٹی دیتے ہوئے چوتھا سال تھا۔ دونوں کنوارے تھے۔ اماں کی لاتعداد کوششوں کے باوجود بھی دونوں میں سے کوئی بھی رام نہیں ہو سکا تھا۔ انہوں نے بھی اب چپ سادھ لی تھی۔ یعنی دونوں بیٹوں کو اُن کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔ آج صائم نے طبیعت کی خرابی کی وجہ سے چھٹی کی تھی۔ ایاز بھی آفس میں ایک کام سے چلا آیا تھا جو جلدی ہی نمٹ گیا تھا۔ اس نے بھی واپسی کا

digest library.com
Best Novels .com

سوچا۔ ابھی ایاز پارکنگ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ”چھوڑ دو مجھ کو میرے بیٹے کو جان سے مارا ہے ان لوگوں نے، میں انہیں سزا دلوائے بغیر نہیں مانوں گی۔“

ایک چالیس، پینتالیس سالہ عورت جو پڑھی لکھی اور اچھے گھرانے کی لگ رہی تھی؛ اس کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچیں۔

ایاز نے آئی بی کی لیڈی کانسٹیبل سدرہ کو آواز دی۔

وہ اس عورت کے ہاتھ پکڑے ہوئے ہی قریب آگئی۔

ایاز نے دھوپ کا چشمہ اُتار کر اس سے پوچھا۔

”سدرہ...... یہ سب کیا ہے؟“ ایاز کا لہجہ سخت تھا۔

”ج......ج......جی سر......“ یہ خاتون پہلے بھی آچکی ہیں۔ ان کے بیٹے کا سوتے وقت ہارٹ فیل ہوا ہے لیکن یہ بضد ہیں کہ اس کا قتل ہوا ہے۔“

”کیوں محترمہ آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟“ ایاز نے بدستور سخت لہجے میں سوال کیا۔

اس عورت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں آپ سے تنہائی میں بات کرسکتی ہوں۔“

ایاز نے سر سے پیر تک اس پر ایک نظر ڈالی اور اپنے آفس کی طرف مڑ گیا۔ وہ عورت اور سدرہ دونوں ہی ساتھ آئی تھیں۔

ایاز کے آفس میں اے سی ابھی تک چل رہا تھا۔ اس آفس میں وہ اور صائم...... انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد ساتھ ہی بیٹھتے تھے۔ ایاز نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آپ بے فکری سے بتائیے کیا بات ہے؟“

”پانی ملے گا؟“ عورت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

ایاز نے سدرہ کی طرف دیکھا، سدرہ اٹھ کر ایک کونے میں رکھے ڈسپنسر کی طرف بڑھ گئی۔

”میں فاروق سلمان کی بیوی ہوں...... شرمین سلمان۔“ اس عورت نے پانی کا گلاس ایک سانس میں ختم کرتے ہوئے کہا۔

”میرا بیٹا فرخ سلمان محض سولہ سال کا تھا جناب۔“

اس کی آواز کپکپا گئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ خاموش ہوکر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

”سران کے شوہر نے اور اس ڈاکٹر نے بھی تصدیق کی ہے کہ وہ ہارٹ فیلور کا ہی کیس ہے اس لیے پوسٹ مارٹم نہیں کیا گیا تھا۔ ان خاتون نے متعلقہ تھانے میں رپورٹ درج کرائی تھی اور وہاں ان کی تشفی کر دی گئی تھی اب یہ ہمارے آفس آگئی ہیں، ان کا کیس سر خلیل نے میرے حوالے کیا تھا لیکن کافی چھان بین کے بعد بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا جناب یہ شاید......“

”نہیں، نہیں میں پاگل نہیں ہوں، میں اپنے بیٹے کو انصاف دلاؤں گی۔“

سدرہ کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شرمین سلمان اس طرح سے چلائی جیسے اس کے دل پر کسی نے خنجر مار دیا ہو۔

ایاز نے ہاتھ اٹھا کر سدرہ کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا اور خود شرمین سلمان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

”ہاں محترمہ جذبات پر قابو رکھ کر مجھے بتائیں کہ آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ کے بیٹے کا قتل ہوا ہے؟ کیا اس کے جسم پر کہیں ہونٹوں پر یا ہاتھوں کی انگلیوں پر نیلاہٹ پائی جاتی تھی۔ یہ میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ یہ زہر خورانی کی ایک بہت واضح علامت ہے۔“

”نہیں، اس کے جسم پر کسی طرح کی نیلاہٹ تھی اور نہ ہی قتل کی کوئی علامت پائی جاتی تھی۔“ شرمین نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔ ”وہ رات مجھے ایک بات بتا کر سونے چلا گیا تھا اور صبح جاگا ہی نہیں، ایسا لگتا تھا کہ وہ بس سو رہا ہے کتنی معصومیت تھی اس کے چہرے پر۔“ اس کی آواز پھر بھرا گئی۔

ایاز نے پہلو بدلا اور کھنکھار کر اسے احساس دلایا کہ وہ اس کا وقت برباد کر رہی ہے۔

شرمین نے ایاز کو چونک کر دیکھا اور پھر کچھ خواب جیسی کیفیت میں کہنا شروع کیا۔ ”سلمان میرا دوسرا شوہر ہے، میرے دو بیٹے اور بھی ہیں جو چھوٹے ہیں، سلمان نے فرخ کو اپنا نام ضرور دیا تھا کیونکہ میں اس کی بچپن کی محبت تھی لیکن فرخ میری محبت کی اولاد تھا۔ اس لیے......“

”بس کیا اسی وجہ سے آپ اسے قتل سمجھ رہی ہیں؟“ اب ایاز کے لہجے میں بھی بیزاری در آئی تھی۔

شرمین نے اس کے تُرش رویے کو محسوس کرلیا اور ہونٹ بھینچ کر اپنا غصہ ضبط کیا۔

”اگر ایسا ہی تھا تو آپ کے شوہر کو اسے بہت پہلے قتل کر دینا چاہیے تھا۔ سولہ سال کی عمر تک انتظار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ ایاز نے بیزاری سے اپنی بات جاری رکھی۔

”اور پھر قتل ہوتا تو وہ اس طرح سوتا ہوا کیسے پایا

Digest Novels .com

جاتا؟'' ایاز کو اب اپنے وقت کی بربادی پر غصہ آرہا تھا اور وہ گھنٹی بجا کر سدرہ کو دوبارہ بُلانے کا سوچ رہا تھا۔

''میری بات سنیں آفیسر، اس نے مجھے بتایا تھا۔''

''کیا بتایا تھا؟'' ایاز نے گھنٹی کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ پیچھے کرلیا۔

''اس نے بتایا تھا کہ وہ سلمان کی لائبریری میں کوئی کتاب تلاش کر رہا تھا اور الماری کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ وہ سلمان کو پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ سلمان لائبریری میں داخل ہوا تو موبائل فون پر گفتگو کر رہا تھا۔ گفتگو کچھ یوں تھی۔

''کب تک، آخر کب تک میں تمہارا منہ بند رکھنے کے لیے رقمیں دیتا رہوں گا، اس سنپولے کی اولاد کو جسے تمہارے ہاتھوں مروایا تھا۔ اپنا نام دے کر پال رہا ہوں۔ تم سے ڈیل میں دونوں کی موت شامل تھی۔ اب میں تمہیں آخری بار رقم دوں گا۔ دو کروڑ، سنا تم نے پورے دو کروڑ...... یہ آخری رقم ہوگی...... تم یہ شہر چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ اس سنپولے کو بھی ٹھکانے لگا دو بس جلد از جلد۔ ہاں ہاں میں رقم دے دوں گا، آج تک بھی تو دیتا آیا ہوں۔''

ایاز چونک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا۔

شرمین نے ایک ٹیبلیٹ جو کہ بلڈ پریشر لو کرنے میں استعمال ہوتی تھی...... کا خالی پتا ایاز کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ مجھے کچن سے ملا تھا اور اس نے سونے سے پہلے دودھ پیا تھا۔''

ایاز نادان بچہ نہیں تھا جو سمجھ نہیں پاتا کہ بلڈ پریشر لو کرنے والی دس گولیاں ایک سولہ سالہ بچے پر کس طرح اثر انداز ہوئی ہوں گی۔ وہ اسی وقت اٹھا اور اپنے محافظوں کے ساتھ سلمان فاروق کے آفس کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ شرمین سے اس طرح کے سوالات کرتا رہا تھا جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ وہ اس شخص سے مل چکا ہے یا نہیں۔ شرمین نے بتایا کہ آج بیٹے کی موت کے بعد سلمان پہلی بار آفس گیا ہے۔ پچھلے سات دن سے گھر پر ہی موجود تھا۔

گاڑی تیزی سے راستہ طے کرتی رہی۔ سلمان انٹر پرائز کے آفس میں شرمین اور ایاز اکیلے داخل ہوئے تھے۔ فورس کو آفس کے آگے اور پچھلے حصے میں ایاز نے ہوشیاری سے تعینات کردیا تھا کہ کوئی بھی نکل کر بھاگ نہ سکے۔ آفس میں داخل ہوکر شرمین، سلمان کے آفس کی طرف بڑھی تو سیکریٹری نے کہا کہ ''سر آفس میں نہیں ہیں۔''

''پھر کہاں ہیں؟'' شرمین نے پوچھا۔

''میم ابھی ایک آدمی آیا تھا۔ چند منٹ پہلے ہی سر اس کے ساتھ اکاؤنٹنٹ کے کمرے میں گئے ہیں۔''

ایاز اور شرمین تیزی سے اس طرف بڑھے۔ اندر کا منظر شیشے کی دیوار سے نظر آرہا تھا۔ شرمین کے گھر کا مالی جو شرمین کے پچھلے شوہر کے گھر میں کام کرتا تھا اور یہ کہہ کر شرمین کے ساتھ آگیا تھا کہ ''بابر صاحب کے علاوہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

شرمین ساکت رہ گئی۔ وہ اور سلمان کمرے میں اکیلے تھے اکاؤنٹنٹ وہاں موجود نہیں تھا۔ ایاز دفتر کے باہر بیٹھے ہوئے ایک کلرک کی طرف بڑھا اور اس سے سی سی ٹی وی کیمرے میں وائس ریکارڈر کی معلومات فراہم کرنے لگا۔ اس نے کہا کہ ''اکاؤنٹنٹ کے کمرے کی وائس ریکارڈ ہوتی ہے۔ لیکن کیمرے کے نہیں کمپیوٹر میں لگی ہوئی ڈیوائس کے ذریعے۔ اس نے اس وقت کی ریکارڈنگ آن کردی جو گفتگو اس وقت کمرے میں جاری تھی اور جو اس سے پہلے ہو چکی تھی، وہ سب ریکارڈ تھی۔ کلرک نے بتایا کہ اس سے پہلے والے اکاؤنٹنٹ پر غبن کے الزام کے بعد یہ سسٹم خود سلمان صاحب نے لگوایا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس بات کو بھولا ہوا تھا۔ اور اس آدمی مالی جس کا نام شکور تھا، سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے بابر کی طرح بالکل درست طریقہ اختیار کیا ہے بس اب اکاؤنٹنٹ پیسے لے کر آجائے گا اور میں اس کے سامنے ہی تمہیں چترال کا پتا دے کر وہ رقم فوراً لے کر جانے کے لیے کہوں گا۔ چترال میں میرا سوتیلا چچا رہتا ہے اور کئی بار مجھ سے اتنی ہی رقم کا مطالبہ کرچکا ہے۔ میں یہ ظاہر کروں گا کہ اس کو یہ رقم تمہارے ہاتھ بھجوا رہا ہوں۔ پھر تم کہیں بھی چلے جانا اس طرح بات بھی بن جائے گی اور تم روپوش بھی ہوجاؤ گے۔''

''بہت اچھے صاحب۔'' شکور کی بلغم زدہ ہنسی کی آواز آئی۔ ''میں روپوش ہوجاؤں گا اور پولیس مجھے ڈھونڈ لے گی۔ کیونکہ تم خود ہی میرے خلاف ثبوت فراہم کردو گے اور اپنے جرم پر بھی ہمیشہ کے لیے پردہ ڈال دو گے۔''

سلمان چپ رہ گیا تھا۔ اس کو شکور سے اس عقل مندی کی اُمید نہیں تھی۔

ایاز کے لیے بھی یہ الفاظ کافی تھے۔ اس نے شرمین کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''ویلڈن مسٹر سلمان آپ بھی نرے گاؤدی ہیں جو شخص آپ کو بابر کے قتل کے بعد 13 سال سے بلیک میل کر رہا ہے، وہ اتنا احمق تو نہیں ہوسکتا ہے کہ

پورے آفس کے سامنے رقم لے کر نکل جائے اور آپ پیچھے اس کی ایف آئی آر درج کرا کر اس کی موت کا انتظام کر دیں، کیوں شکور تم سمجھ رہے ہو نا؟ یہ سلمان پیسے دے کر تمہیں نکال دیتا اور پیچھے تم پر دو قتل ثابت کر دیتا۔ اس کے بعد اپنی بیوی اور دنیا کی نظروں میں بالکل معصوم ثابت ہوتا اور تم پر انعام رکھ کر پولیس جہاں دیکھے گی وہیں گولی مار دے گی لاوارث تو ہو ہی تم ......'' ایاز نے بڑے ہی ہمدردی بھرے انداز میں کہتے ہوئے ان کے سامنے والی کرسی سنبھالی اور شرمین کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جو غصے اور غم کی کیفیات میں پاگل ہو رہی تھی۔

سلمان اپنے سامنے شرمین کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ ایاز کے الفاظ سن کر ہی حواس باختہ ہوتے ہوئے اچانک ہی شکور کا گریبان پکڑ لیا اور زور زور سے چلّانے لگا۔

''شرمین یہ ہمارے فرخ کا قاتل ہے، یہ مجھے بلیک میل کر رہا تھا۔''

ایاز استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھا اور سلمان کے منہ پر ایک ہاتھ رسید کر کے گریبان سے پکڑ کر کرسی میں دھکیل دیا۔ ''ہم تمہاری ساری باتیں نہ صرف سُن چکے ہیں بلکہ ریکارڈ بھی کر چکے ہیں۔'' ایاز نے زہریلے انداز میں کہا۔

اب سلمان کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس نے پینترا بدل کر خوشامدی انداز میں کہا۔ ''آفیسر میں آپ کو تین کروڑ روپے دینے کے لیے تیار ہوں۔''

ایاز نے قہقہہ لگایا اور پھر ضبط کر کے بولا۔ ''چلو یہ بعد میں طے کر لیں گے، پہلے تم پوری بات بتاؤ۔'' ایاز نے محسوس کیا کہ شرمین اسے شاکی نظروں سے دیکھ رہی ہے لیکن وہ سلمان اور شکور کی طرف متوجہ رہا تھا۔ شکور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف کھسک رہا تھا لیکن ایاز نے نظر انداز کر دیا۔

سلمان نے اُلجھن بھری نظروں سے ایاز کو دیکھا پھر شرمین کی طرف رخ کر کے بہت جذباتی انداز میں کہا۔ ''میری بچپن کی محبت ہو تم، تم نے مجھے ٹھکرا کر بابر سے شادی کر لی تھی اس لیے میں نے اس شکور کو پچاس ہزار روپے دے کر بابر کے دودھ میں بھی وہی گولیاں شامل کروا دی تھیں، وہ بہت پاور والی گولیاں ہیں سوتے وقت اگر ان کی زیادہ مقدار استعمال کر لی جائے تو موت واقع ہو جاتی ہے۔''

''اور میرے معصوم بیٹے نے...... اس نے تمہارا کیا بگاڑا تھا ظالم انسان؟'' شرمین چلّائی۔

اتنے میں شکور دروازے سے باہر نکل گیا تھا لیکن ایاز نے پروا بھی نہیں کی تھی۔

''پہلے اسے مارنے کا میرا ارادہ نہیں تھا لیکن جیسے جیسے وہ بڑا ہو رہا تھا، ویسے ویسے بالکل بابر کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ میں جس بات، جس جرم کو بھول گیا تھا، اس کی صورت اسے یاد دلاتی تھی۔ اور تم...... تم بھی تو میرے بچوں کو چھوڑ کر اس سے پیار کرنے لگی تھیں۔''

ایاز خاموشی سے بیٹھا رہا۔ اسی وقت باہر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ ہی ایک چیخ کے ساتھ خاموشی چھا گئی۔ پورے آفس کے لوگ باہر جانے کے بجائے اس آفس کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ اندر ہونے والی گفتگو کلرک ایاز کے کہنے پر ریکارڈ کر رہا تھا اور باقی سب بھی سُن رہے تھے۔

''سلمان میں تمہیں کیا سمجھی تھی اور تم کیا نکلے خبیث انسان۔'' شرمین نے غم اور غصے سے سینہ تھام کر روتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ایاز نے سلمان کی طرف چھلانگ لگا دی۔ لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ سلمان کے پاس ایک ریوالور تھا۔ جو اس نے اپنی کنپٹی پر رکھ کر فائر کر دیا تھا اور اب اس کی لاش زمین پر پڑی ہوئی تھی اور اس کا خوب صورت چہرہ مسخ ہو گیا تھا۔

شرمین چند لمحوں تک کھڑی اسے دیکھتی رہی پھر تیورا کر گرنے لگی تھی کہ ایاز نے تھام لیا۔ ساتھ ہی آفس کی خاتون ورکر کو اشارہ کیا۔

اس نے آگے بڑھ کر شرمین کو اکاؤنٹنٹ کی کرسی پر بٹھایا۔

''سر اس آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے ڈرانے کے لیے فائرنگ کی تھی، ایک گولی اس کی ران میں لگی ہے۔ اسے اسپتال بھیج دیا گیا ہے۔'' ایاز کے ساتھ آئے فورس کے آدمی نے اندر آ کر اطلاع دی۔

ایاز نے سر اٹھا کر لیڈی کانسٹیبل سدرہ کو دیکھا۔ ''تم نے اس عورت کی بات کیوں نہیں سنی تھی؟''

''س...... س...... سر میں گولیاں دیکھ کر سمجھ نہیں سکی تھی کہ کیا ہوا ہوگا، اگر وہ نیند کی گولیاں ہوتیں تو سر میں......''

''تم اس کو پاگل سمجھ رہی تھیں؟'' ایاز نے غرا کر پوچھا۔

''ج...... ج...... جی نہیں تو جناب......'' سدرہ نے اس کی خونخوار نظروں کی تاب نہ لاتے ہوئے آنکھیں جھکا لیں۔

⁂ ⁂ ⁂

Digest Novels .com

سایہ

[illegible]

دولت کا بھی ایک نشہ ہے... جس پر اس [illegible] چڑھ جائے وہ پھر اس کے سحر سے بہ مشکل ہی نکل پاتا ہے... نسل در نسل منتقل ہوتی دولت کا سرور ہمیشہ خطرناک ہی ثابت ہوتا ہے... آپ کے جانے مانے مصنف جیمز ہیڈلے چیز کی تحریر کردہ ناول اور ناولٹ کسی تعارف کے محتاج نہیں، ان کا انداز تحریر ہی ان کی پہچان ہے... پیچ در پیچ الجھی کہانی کے کردار جو ہر بار ایک مختلف روپ میں نمودار ہو رہے تھے...

قتل کی سنسنی خیز واردات...... قاتل نے تقلید و روایت کا چولا پہن رکھا تھا

لموزین سڑک کے کنارے پر رکی۔ ایک شاندار لباس میں ملبوس ڈرائیور نے اپنی سیٹ سے چھلانگ لگاتے ہوئے دروازہ کھولا اور سلویسٹر جونز کے باہر نکلنے تک سیدھا کھڑا رہا۔ جونز کی موجودگی ایسی تھی کہ جیسے وہ زمین کی سب سے قیمتی چیز ہو۔ تیس ڈالرز کی ٹوپی سے لے کر چالیس ڈالرز کے جوتوں تک، وہ بالکل بے عیب تھا، اُس نے اپنے مغرور انداز میں ڈرائیور سے کہا۔ ”تم انتظار کر سکتے ہو، ہاکر۔“

جونز نے اپنے چابیوں کے گچھے میں سے ایک چابی

Digest Novels .com
digest library.com

نکالی اور آہستہ آہستہ اسٹرک لینڈ گرنی کے عالیشان گھر کی طرف بڑھا، جہاں شام کا اندھیرا آہستہ آہستہ چھانے لگا تھا۔ بڑے ہال میں مکمل خاموشی تھی، جیسے وہاں کچھ ہونے والا ہو۔ جونز نے لائٹ آن کی اور بڑی دلچسپی سے کمرے کی طرف دیکھا۔

''بریڈلے!'' اس نے گرجتے ہوئے پکارا۔ ایک بوڑھا نوکر جس کی آنکھوں میں دھندلا سا رنگ تھا، ہال میں داخل ہوا۔ اس کے قدموں کی آواز ہال میں گونج رہی تھی۔

''مجھے اس بے پروائی پر تعجب ہو رہا ہے، بریڈلے۔'' جونز نے غصے سے کہا۔ ''باقی ملازم کہاں ہیں؟''

''آہ، مسٹر سیلویسٹر، آپ کا آنا خوشی کا باعث ہے۔'' بوڑھا نوکر اپنی پتلی اور لرزتی ہوئی انگلی سے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''کچھ غلط ہے، مسٹر سیلویسٹر، مجھے یہ اپنی ہڈیوں میں محسوس ہو رہا ہے......'' اس کی آواز میں ایک لرزش اور بے چینی تھی، جیسے وہ ایک ایسی بات بتانے والا ہو جو کسی کی موت کے متعلق ہو۔

''غلط؟ کیا غلط ہوسکتا ہے؟''

''آج صبح آپ کے چچا نے تمام ملازموں کو چھٹی دے دی تھی۔ مجھے کچھ بے چینی محسوس ہوئی تھی، تو میں اپنے کمرے میں جاکر بیٹھ گیا جہاں دوپہر تک رہا۔ پھر میں ان کی اسٹڈی میں گیا اور دروازہ کھٹکھٹایا مگر انہوں نے جواب نہیں دیا۔ بعد میں، میں نے دو یا تین بار دروازہ کھٹکھٹایا، مگر کوئی جواب نہ ملا۔''

''بکواس کرتے ہو۔'' جونز نے تیز آواز میں کہا۔ ''کیا غلط ہوسکتا ہے؟ تم تو اتنے تجربہ کار بوڑھے ہو، اس طرح کی بے چینی تمہیں زیب نہیں دیتی، بریڈلے۔ میں تمہارے ساتھ اوپر جاؤں گا، اور ہم چچا کو جگا لیں گے۔ شاید وہ اپنے بینک کے کھاتوں کو گنتے گنتے سو گئے ہوں گے۔''

وہ دونوں بلوط کی لکڑی سے بنی سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ ماحول میں ایک سنگینی تھی، ایک پُراسرار سی فضا چھائی ہوئی تھی۔ نوکر کا جسم لرز رہا تھا۔ جونز کی آنکھوں میں خاص چمک تھی۔ کوئی خاص بات نظر نہیں آرہی تھی مگر دونوں کو پتا تھا کہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

اسٹرک لینڈ گرنی کا اسٹڈی روم بڑی سیڑھیوں کے سامنے تھا۔ جونز نے کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا، اپنے چچا کا نام پکارا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔

''میں نے آپ کو بتایا تھا، سر۔'' نوکر لرزتے ہوئے بولا۔ جونز نے دروازے کی چابی کے سوراخ میں آنکھ لگا کر اندر جھانکا۔ کمرے کا ایک چھوٹا سا حصہ دکھائی دیا۔ بے ترتیب کتابوں کی شیلف، ایک میز اور بڑی نقوش والی کرسی لیکن ان سب میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جو جونز کو سانس روک کر اپنی جگہ پر کھڑا ہونے پر مجبور کرتا۔

''بریڈلے، تم یہاں انتظار کرو۔'' اس نے کہا۔ ''میں ابھی واپس آتا ہوں۔''

وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اترتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا اور باہر کا دروازہ کھول دیا۔

''ہاکر، ڈرائیور......'' وہ فوراً سیدھا ہوگیا۔

''جی، سر؟''

''جلدی سے پولیس اسٹیشن جاؤ اور فوراً کچھ افسران کو یہاں لے آؤ۔ بہتر ہے کہ ایک ایسا افسر ہو جو تالوں کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ ہم اس دروازے کو توڑ نہیں سکتے۔''

جب لیموزین تیز آواز کے ساتھ سڑک پر گرجتے ہوئے چلی گئی تو جونز آہستہ آہستہ سیڑھیاں دوبارہ چڑھنے لگا۔ بریڈلے ہال میں بے چینی سے اِدھر اُدھر پھرتا ہوا کرسیوں اور تصویروں کو سیدھا کر رہا تھا جو پہلے ہی درست جگہوں پر رکھی ہوئی تھیں۔

''یہ واقعی ایک سنگین معاملہ ہے، سر۔'' بوڑھا نوکر بولا۔ ''میں نے چابی کے سوراخ سے جھانکا ہے، سر۔ میں صرف اس کے سر کا اوپر والا حصہ دیکھ پا رہا تھا، جو بہت عجیب زاویے پر مڑا ہوا تھا......''

''کیا تمہیں ...... کیا تمہیں لگتا ہے کہ انہوں نے خود کو کوئی چوٹ پہنچائی ہوگی؟'' جونز نے پوچھا۔

''اگر چوٹ پہنچی ہے تو انہوں نے خود ہی پہنچائی ہے۔ آپ کو وہ اسٹڈی روم یاد ہے، سر...... وہاں کوئی کھڑکیاں نہیں ہیں، عام معنی میں؛ صرف چھت کے قریب لوہے کی سلاخوں والی چھوٹی کھڑکیاں ہیں، اور کوئی جاندار ان کے ذریعے اندر نہیں آسکتا۔ اور یہ دروازہ، سر...... اس کی صرف ایک ہی چابی تھی، اور وہ چابی مسٹر گرنی اپنی گھڑی کی چین کے ساتھ رکھتے تھے۔''

نیچے ہال میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ جونز نے بے چینی سے آواز دی، اور ایجنسی کے لوگ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اوپر آئے۔ سب سے پہلے لیفٹیننٹ جیمیسن آیا، پھر پولیس کے جاسوس اوٹول، پولیس مین ہیئر ہالٹر، اور آخر میں ایک پتلا، سرمئی آنکھوں والا مرد جو پورے شہر میں جان

Digest Novels .com

سکس کے نام سے جانا جاتا تھا، جو ایوننگ اسٹار نیوز کے مالک کا بیٹا تھا۔ ڈرائیور چپکے سے اس گروہ کے کنارے چل رہا تھا۔

''تو۔'' لیفٹیننٹ نے بھاری آواز میں پوچھا۔

''یہاں کیا مسئلہ ہے؟'' وہ جونز کے شاندار لباس سے کچھ مرعوب نظر آرہا تھا۔ سکس نے اس کے بارے میں سرگوشی کی کہ یہ سیلویسٹر، بوڑھے کروڑپتی گرنی کا بھتیجا ہے۔

جونز نے کہا۔ ''مجھے ڈر ہے کہ میرے چچا کے ساتھ کچھ ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا کہ پولیس کو فوراً اطلاع دینی چاہیے۔''

''آپ نے بالکل صحیح کیا، مسٹر جونز۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔ اس نے کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا اور اسے کھٹکھٹایا...... لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

''اس دروازے کو تو ٹینک کے بغیر توڑا نہیں جاسکتا۔ ہیلو، بیئر ہالٹر، تالے پر کام شروع کرو۔''

''ایک لمحہ انتظار کریں۔'' رپورٹر جان سکس نے اچانک کہا، اور ایک میگنیفائنگ گلاس نکالا۔ ''اگر ہم پہلے اس کا بغور جائزہ لیں، تو کیا خیال ہے؟ تالے کے ساتھ کسی نے چھیڑ چھاڑ نہیں کی ہے۔ یہ چابی سے کھولا اور بند کیا گیا ہے، معمول کے مطابق۔''

جیمیسن، جو ہر کیس کے تمام چھوٹے پہلوؤں کا خیال رکھتا تھا، اس وجہ سے شرمندہ ہوا کہ یہ بات اس کے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ اس نے نہایت غصے میں بیئر ہالٹر کو حکم دیا۔ ''کام جلدی شروع کرو۔''

پولیس مین کو دروازہ کھولنے میں دس منٹ کی محنت لگی۔

کمرے میں سڑاند کی گلی ہوئی بو تھی...... وہ خوف جو ہمیشہ موت کے قریب آنے پر محسوس ہوتا ہے۔ احتیاط سے پولیس کا چھوٹا سا گروہ کمرے میں داخل ہوا اور نقش کندہ کرسی پر پڑے ہوئے شخص کو دیکھا۔ وہ ساٹھ سال کا مرد تھا، پیٹ نکلا ہوا اور ہونٹ موٹے تھے۔ اسٹرک لینڈ گرنی کو کھانے پینے کی ہر چیز پسند تھی، اور اس کا چہرہ بھی کسی شوقین کھانے والے جیسا لگتا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی کراہت تھی، اور اس کے دائیں ہاتھ کی لٹکتی انگلیوں کے نیچے ایک ریوالور پڑا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ میز کے کنارے پر رکھا تھا اور اس میں کمرے کی چابی جکڑی ہوئی تھی۔ اس کی قیمتی ریشمی شرٹ کے اگلے حصے پر خشک خون کی تہ جمی ہوئی تھی۔

جیمیسن، جو تھوڑی دیر کے لیے اپنا غصہ بھول گیا تھا، دوبارہ ایک تجربہ کار پولیس افسر بن گیا۔

اس نے گرنی کے چہرے کو چھوا، دائیں بازو کو اٹھایا پھر اسے بھاری انداز میں چھوڑ دیا اور خون سے ڈوبی ہوئی شرٹ کو اپنی انگلیوں میں دبایا۔

''میں ڈاکٹر نہیں ہوں مگر میں دیکھ سکتا ہوں کہ یہ آدمی کم از کم تین گھنٹے پہلے مر چکا ہے۔ بتاؤ، تمہیں اس بارے میں کیا معلوم ہے؟'' اس نے اچانک کانپتے ہوئے بریڈلے سے سوال کیا۔

''ک...... کچھ نہیں، سر، سوائے اس کے جو میں نے مسٹر سیلویسٹر جونز کو بتایا تھا، سر۔''

''کیا بتایا تھا؟''

''آج صبح، مالک نے ملازموں کو چھٹی دے دی تھی مگر میں اپنے کمرے میں رہا کیونکہ میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ دوپہر کے وقت میں نے ان کے دروازے پر دستک دی تاکہ معلوم کروں کہ انہیں دوپہر کا کھانا چاہیے یا نہیں، تو انہوں نے مجھے سخت لہجے میں کہا کہ جہنم میں جاؤ۔ یہ آخری بار تھا جب میں نے ان کی آواز سنی۔ اس کے بعد میں نے دو بار دستک دی مگر کوئی جواب نہ آیا۔ پھر مسٹر سیلویسٹر آئے، اور انہوں نے آپ کو بلایا۔ مطالعہ گاہ کی صرف ایک چابی ہے، سر، اور...... اور مسٹر گرنی نے وہ اپنے ہاتھ میں لی ہوئی ہے۔''

''یہ کیسے ہوا کہ تمہیں گولی کی آواز نہیں سنائی دی؟''

''میرا کمرا نیچے ہے، اور درمیان میں کئی بند دروازے تھے۔''

لیفٹیننٹ نے ہنکارا بھرا، پھر جونز کی طرف دیکھا۔

''کیا تم اس میں کچھ اور اضافہ کرسکتے ہو؟''

''افسوس، میرے پاس کچھ اہم معلومات نہیں۔ میرے چچا اور میرے درمیان بہت اچھے تعلقات تھے۔ میں عموماً ہفتے میں دو دفعہ ان سے ملتا تھا...... پیر اور جمعے کو......''

''آج جمعرات ہے۔'' جیمیسن نے فوراً کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' جونز نے برہمی سے کہا۔ ''میں کل نیویورک جا رہا ہوں، اور میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے چچا اسٹرک لینڈ گرنی سے مل لوں۔ تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو...... کیا مجھ پر الزام لگا رہے ہو؟''

لیفٹیننٹ نے فوراً انکار کیا کہ اس کے ذہن میں ایسا کچھ تھا۔ ''مگر ہمیں ہر بات صاف کرنی ہوگی، اب تم بتاؤ، تم نے آج دوپہر کہاں وقت گزارا؟''

Digest Novels .com

"میں نے ایک بجے ہوٹل سینٹ ریجس چھوڑا جہاں میرے اپارٹمنٹس ہیں، اور پارک میں سیر کرتے ہوئے دو بج کر پندرہ منٹ پر پہنچا...... ہاں، مجھے یقین ہے کہ یہ دو بج کر پندرہ منٹ تھے، کیونکہ میری ملاقات مسز ڈیزی گریلس سے دو بج کر تیس منٹ پر تھی، جو ایک اداکارہ ہیں۔ ہم نائٹ کلب گئے اور چار بجے تک رقص کیا، پھر میں نے مسز گریلس کو پانچ بجے گھر چھوڑا، اور پھر سیدھا یہاں آیا۔ اس طرح میری ہر منٹ کی تفصیل موجود ہے۔"

"یہ سب ٹھیک لگ رہا ہے۔" جیمیسن نے کہا۔ اس نے اپنے تفتیشی ساتھی کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں سوال کیا۔

"اس میں کچھ بھی پیچیدہ نہیں۔" اوڈول نے کہا۔ "یہ ایک صاف اور سیدھا خودکشی کا کیس ہے۔ یہاں ایک تیس بور کا پستول ہے، جس میں سے ایک گولی چلائی گئی ہے۔ دروازہ بند تھا اور بغیر دھماکے کے یہاں داخل ہونے کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اور...... یہ سب سے آسان کیس ہے جو میں نے دیکھا ہے۔"

جیمیسن نے سکون کا سانس لیا۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اب مارٹی۔ کرینوز کے دفتر فون کرو، اور کسی آدمی کو بھیجنے کا کہو۔ میں بیئر ہالٹر کو یہاں چھوڑوں گا تاکہ وہ دیگر معاملات دیکھے۔ کیا بات ہے، مسٹر جونز؟ تمہارا چہرہ بہت سفید ہو گیا ہے۔"

خود کو صاف ستھرا رکھنے والا شخص سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے کافی صدمہ ہے، آپ جانتے ہیں۔" اس نے اعتراف کیا۔ "اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں نیچے انتظار کروں گا، اگر آپ کوئی سوال پوچھنا ہو۔"

"اس کے لیے بہت مشکل ہے۔" جیمیسن نے کہا، جب سیلویسٹر جونز کمرے سے باہر چلا گیا۔

جان سکس جو کمرے کا معائنہ کر رہا تھا، خاص طور پر میز اور فرش کا، اس نے کہا۔

"اوہ، کیا تم ایسا سوچتے ہو؟ وہ گرنی کا واحد رشتے دار ہے، مجھے...... سمجھ آ رہا ہے کہ اسے وہ سب کچھ وراثت میں ملے گا جو بوڑھے آدمی نے چھوڑا ہے۔"

لیفٹیننٹ نے جلدی سے سر اٹھایا...... وہ جان کی تیز فہمی کا بہت احترام کرتا تھا، اور اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا جس نے اس کے دماغ میں شک کی لہر دوڑا دی۔ "تمہیں نہیں لگتا کہ جونز نے یہ کیا؟" اس نے پوچھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"نہیں، مجھے نہیں لگتا۔ یہ خودکشی ہے، بالکل۔ یہاں وہ خود اپنے کمرے میں بند ہے اور پستول ہے...... یہ اس کا پستول ہے، کیونکہ تم اس کے نام کو دیکھ سکتے ہو کہ گن کے دستے پر اس کا نام لکھا ہے۔"

"میں نے دیکھا۔" جان نے خشک لہجے میں کہا۔

"تو پھر، تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

جان نے میز سے ایک کاغذ اٹھایا۔ اس پر لکھا تھا۔

"اسٹرک لینڈ گرنی...... 1822 میموتھ بلڈنگ۔" اور کچھ خستہ تحریر میں چند لائنیں درج تھیں، جو کوریو کمپنی آف امریکا سے مخاطب تھیں، اور ان میں ڈایاک کے سر کاٹنے والے خطرناک لوگوں کے استعمال ہونے والے ہتھیاروں کی قیمت طلب کی گئی تھی۔ اس خط میں اسی دن دوپہر کے وقت کی تاریخ درج تھی۔

"کیا یہ سب کچھ تمہیں سوچنے پر مجبور نہیں کرتا؟" جان نے سوال کیا۔

جیمیسن نے سر کھجا کر اسے دوبارہ پڑھا اور اُلجھن میں نظر آیا۔ "میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سے مجھے کچھ سمجھ آتا ہے۔" اس نے اعتراف کیا۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا کہ اس واردات میں ان ڈایاک کے لوگوں کا ہاتھ ہے۔"

"بالکل نہیں۔" جان کے کندھوں کا ہلکا سا جھکاؤ سرکاری پولیس کے لیے شدید نفرت کو ظاہر کر رہا تھا۔

"کیوں، لیفٹیننٹ، یہ خط بائیں ہاتھ سے لکھا گیا تھا!" اس نے بریڈلے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "مسٹر گرنی بائیں ہاتھ سے لکھتے تھے، کیا نہیں؟"

نوکر نے سر ہلایا۔

"تو پھر۔" جان نے فاتحانہ انداز میں کہا۔ "اگر مسٹر گرنی نے خودکشی کی تھی، تو وہ کیسے اپنے آپ کو گولی مارنے میں کامیاب ہوئے، پستول کو اپنے دائیں طرف گرا دیا، اور چابی اپنے بائیں ہاتھ سے اٹھائی؟ خودکشی؟ یہ قتل ہے، لیفٹیننٹ، آپ اس پر میری ایک سال کی تنخواہ مقرر سکتے ہیں!"

"قتل یا خودکشی؟"

اسٹار نیوز کے ذاتی دفتر میں، جان نے اپنا تجزیہ کچھ اس طرح پیش کیا۔

"میں نے جونز کی کہانی کی تصدیق کی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔" "اور سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا کہ اس نے کہا۔ سینٹ ریجس کے منیجر، مس ڈیزی گریلس، نائٹ کلب

کے ہیڈ ویٹر، اور اس کے اپنے ڈرائیور نے جونز کے متعلق دوپہر کے ہر لمحے کا حساب دیا۔ یہ ممکن ہے کہ بریڈلے، بوڑھے نوکر نے جرم کیا ہو، لیکن مجھے ایسا نہیں لگتا۔ وہ بہت نرم مزاج آدمی ہے۔ اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ کسی بھی جرم میں ملوث ہوسکتا ہے۔ لیفٹیننٹ جیمیسن نے اسے گرفتار کیا ہاہا، لیکن اگر آپ مجھے موقع دیں، تو میں ثابت کردوں گا کہ اس کا اس سے کچھ لینا دینا نہیں۔"

اسٹار نیوز کے ...... بوڑھے مالک سکس نے اپنے پاؤں ڈیسک کی سطح پر رکھے اور آسمان کی طرف دیکھا۔ "یہ اچھا مواد ہے۔" اس نے پسندیدگی سے کہا۔ "اور ایک شاندار کہانی بنے گی لیکن اختتام کیا ہے، جان؟ ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ قتل کس نے کیا...... اور تم کوئی جاسوس نہیں ہو۔"

جان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ "جرم کا پتا چلانا کوئی خفیہ ہنر نہیں ہے۔" اس نے احتجاج کیا۔ "جو بھی عقل اور صبر رکھتا ہو، وہ یہ کرسکتا ہے۔ مجھے ایک موقع دیں۔ جیمیسن اور پولیس مین جیسے بیوقوف کبھی قاتل کو نہیں پکڑسکیں گے۔ میں نے وہ چیز دیکھی تھی جو انہوں نے نہیں دیکھی۔ میں دوبارہ یہ معاملہ حل کرسکتا ہوں۔"

"تم تو باقاعدہ مشہور جاسوس شرلاک ہومز بن گئے ہو، کیا؟ اگر تم اس بات کا پتا لگاسکو کہ گرنی کو بند کمرے میں کس نے مارا، اور اس کے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا، تو تمہیں پولیس کمشنر بنانا چاہیے۔ ہم تمہاری کامیابی کا جشن منائیں گے جاؤ، یہ کام مکمل کرو۔"

جان نے خوش ہوکر سیلیوٹ کے انداز میں قدموں کو بھینچا اور کہا۔ "میں یہ کردکھاؤں گا۔" وہ خوشی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

گیارہ بج چکے تھے، اور وہ جونز کی کہانی کی تصدیق کرتے ہوئے دن بھر شہر بھر کے دورے کرنے سے تھک گیا تھا، لیکن ابھی بستر پر جانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ حقیقت میں، اس نے سوچا کہ وہ دوبارہ گرنی کے گھر جائے گا اور اس کے کمرے کی تفصیل سے تحقیقات کرے گا۔

ایک ٹیکسی سڑک کنارے کھڑی تھی۔ جان فوراً اس میں بیٹھا اور ڈرائیور کو مختصر اور واضح ہدایات دیں۔ ایک لمحے میں، وہ چمک دار روشنی والی سڑک پر رواں دواں تھا، اسٹرک لینڈ گرنی کے قاتل کی تلاش میں اپنے پہلے قدم پر۔

اپنی منزل سے تین بلاک دور، جان نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ ایک پولیس والا مقتول کے گھر کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، جان نے اس کے پاس جانے کے بجائے گلی کے پیچھے سے داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے دیوار پر چڑھنے میں صرف ایک لمحہ لیا اور اندھیرے میں اپنے راستے کا اندازہ لگاتے ہوئے کچن کی کھڑکی تک پہنچا۔ جان کے ہاتھ میں چمچ، چھٹی اور ایک الیکٹرک ٹارچ تھی، وہ جانتا تھا کہ ایک غلط قدم بھی سب کچھ برباد کرسکتا ہے، لیکن اس کا عزم اسے آگے بڑھنے کی طاقت دے رہا تھا۔

گھر کے احاطے میں مکمل اندھیرا تھا اس لیے جان نے ٹارچ استعمال کرنے کی حماقت نہیں کی، کیونکہ اسے خوف تھا کہ کہیں پولیس والا اس کی روشنی دیکھ نہ لے۔ اس لیے اپنے ہاتھ کے احساس پر انحصار کرتے ہوئے، اس نے ایک ہاتھ میں چمچ پکڑے ہوئے، کھڑکی کو تلاش کیا۔ جب اسے کھڑکی ملی، تو اس کی کمر میں اچانک سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ نیچے سے تین انچ کھلی تھی!

اس گھر میں کوئی نہ کوئی تھا۔ جان نے ایک لمحے کے لیے بھی شک نہیں کیا۔ اسے یقین تھا کہ یہ پولیس نہیں ہوسکتی، کیونکہ وہ سامنے کے دروازے کی چابی پہلے ہی حاصل کرچکی تھی۔ یہ یا تو قاتل ہوسکتا تھا جو اپنے جرم کے مقام پر واپس آیا تھا، یا پھر کوئی چور جو گرنی کی موت کی خبر سن کر وہاں آیا تھا اور کچھ فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کھڑکی کو کھولا اور اندر کود گیا۔

گھر میں خوفناک خاموشی تھی۔ جان نے کچن کی دیوار پر ہلکی سی روشنی ڈالی اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے دروازے تک پہنچا اور ڈائننگ روم میں جھانکا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ نوکر کے کمرے میں کوئی نہیں تھا؛ پہلی منزل پر کوئی نہیں تھا۔ کیا اس کمرے میں کوئی تھا جہاں اسٹرک لینڈ گرنی کی موت ہوئی تھی؟

بہت آہستہ، جان نے سیڑھیوں پر چڑھنا شروع کیا۔ پھر اچانک ہی اس نے اپنی سماعت پر زور دیا، تو اس نے ایک اسکرٹ کی سرسراہٹ اور ایک ڈری ہوئی عورت کی نازک سی آہٹ سنی۔ وہ دیوار کے ساتھ چھپ گیا اور انتظار کیا۔ اندھیرے میں امید کی ایک کرن روشن ہوئی، جان کی آنکھیں اسٹڈی کے دروازے کے سامنے خستہ حال بلوط کی لکڑی پر رک گئیں۔ سیڑھی ہل رہی تھی، جیسے سیڑھی کو پکڑنے والا شخص بے چین ہو۔ اور پھر ایک عورت کا ہاتھ نظر آیا...... پتلا سا، حیرت انگیز طور پر سفید ہاتھ جس نے چابی کو تالے میں ڈالا!

ایک ایک کرکے، جان نے سیڑھیاں چڑھنا شروع

Digest Novels .com

کیں۔ اس کا ہاتھ بجلی کے بٹن تک پہنچا، اور پھر اس نے ہال کو چمک دار روشنی سے بھر دیا۔ خوف کے مارے، عورت سیدھی ہوئی اور فوراً مڑی۔ اس کے نرم، روشن بال اس کے نازک گالوں پر گر رہے تھے، اور وہ خوب صورت گاؤن جو اس نے پہنا تھا، وہ پھٹ چکا تھا اور کھڑکی کی دہلیز اور دیوار پر چڑھنے کی وجہ سے داغ دار ہو گیا تھا۔ اس حیران کن لمحے میں بھی، جان نے اپنے دل میں اس کی خوب صورتی ۔۔ کو سراہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' اس نے سرگوشی کی۔

جان مسکرا کر بولا۔ ''میں بھی تم سے یہی سوال پوچھنے والا تھا۔''

''تم کون ہو؟'' اس نے دوبارہ تیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میرا نام جان عکس ہے، اور میں عارضی طور پر ایوننگ اسٹار نیوز کا رپورٹر ہوں۔ دیکھو۔'' اس نے اپنے ہاتھ سے بے پروا انداز میں اشارہ کیا۔ ''میں اس وقت ڈسٹرکٹ پولیس اسٹیشن پر تھا جب مسٹر گرنی کے قتل کی خبر پہنچی......''

''قتل،'' لڑکی نے سرگوشی کی، اور اس کا ہاتھ سینے پر جا پہنچا۔ ''قتل! میں نے سنا تھا، اخباروں میں لکھا تھا کہ یہ خودکشی تھی......''

''پہلے پولیس کو یہی لگا تھا۔'' جان نے آہ بھر کر کہا۔ ''وہ بہت کم دھیان سے کام کرتے ہیں۔ لیکن میں نے پتا کیا کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ کیا تم نے یہ جرم کیا ہے؟'' وہ اچانک اس کی طرف قدم بڑھا کر انگلی سے الزام لگاتے ہوئے بولا۔ لڑکی یکدم سیدھی ہوئی، اور اس کے دونوں گال سرخ ہو گئے۔

''میں؟'' اس نے کہا۔ ''تم پاگل ہو۔ میں ملڈرڈ گرنی ہوں...... اسٹرک لینڈ گرنی کی بیٹی!''

جان ہنستے ہوئے بولا۔ ''پیاری لڑکی! برائے کرم...... اگر تم نے صرف اتنا کہا ہوتا کہ تمہیں اس معاملے کا کچھ نہیں معلوم، تو شاید میں تم پر یقین کر لیتا۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سے معلوم ہے کہ مسٹر گرنی کنوارے تھے اور ان کا کوئی رشتے دار نہیں تھا سوائے ایک بھتیجے کے...... سلویسٹر جونز۔''

''یہ جھوٹ ہے...... جھوٹ!'' اس نے کہا۔ ''میری ماں برونیو میں ڈایاک لوگوں کے درمیان ایک برطانوی خاندان کی بیٹی تھی۔ مسٹر گرنی وہاں شکار کی مہم پر آئے تھے اور ان سے شادی کر لی تھی۔ وہ دونوں دس سال تک ساتھ رہے...... پھر اس نے اسے چھوڑ دیا۔ ماں نے کبھی اس کی تلاش ترک نہیں کی۔ وہ ایک سال پہلے سنگاپور میں فوت ہو گئیں...... اور وہ مجھے ہمیشہ کہتی رہیں کہ میں اسے ڈھونڈتی رہوں۔ میں نے گرنی کا پتا اس شہر میں دو دن پہلے لگایا۔ میں نے بزرگ بریڈلے سے ملاقات کی، جو بچپن میں برونیو میں میری دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔''

''تو پھر بریڈلے نے تالے کا نقش لیا اور وہ چابی تمہارے لیے بنوائی؟'' جان نے تھوڑی سی ذہانت دکھاتے ہوئے کہا۔

''اوہ!'' وہ دروازے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔

''کیا اس نے ایسا نہیں کیا؟'' اس کی نظریں جھک گئیں اور ایک آنکھ سے آنسو ٹپکا۔ ''...... ہاں۔''

جان نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑا۔ ''مس گرنی۔'' اس نے کہا۔ ''برائے کرم یہ نہ سوچو کہ میں بالکل بے رحم ہوں۔ یہ میرا کام ہے کہ میں پتا کروں کہ اس جرم کو کس نے کیا۔ مجھے نہیں لگتا کہ تم نے یہ کیا...... کوئی بھی عقل مند شخص آپ کو ایک لمحے کے لیے دیکھ کر یہ نہیں مان سکتا کہ آپ قتل کی مرتکب ہو سکتی ہیں......''

''میں...... میں نے واقعی نہیں کیا۔'' اس نے ٹوٹتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''لیکن، کیا تم نہیں دیکھتے کہ حالات کے لحاظ سے، یہ کیس میرے خلاف کچھ زیادہ ہی خراب نظر آ رہا ہے؟''

''قانون کی عدالتیں اور جیوری اس چیز کو مختلف انداز میں دیکھتے ہیں۔ جیسا کہ اس کیس میں ہے، تمہارے پاس بدلہ لینے کا ایک مقصد تھا...... تم وہ واحد ہستی ہو جو مسٹر گرنی کے علاوہ...... کم از کم ہماری معلومات کے مطابق...... اس دروازے کی چابی رکھتی تھیں۔ برائے کرم مت روؤ۔ کیا تم نہیں دیکھ سکتیں کہ میں تمہاری مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں...... تمہارے دفاع کا طریقہ ڈھونڈنے کی؟ کیا تمہیں کوئی اندازہ ہے کہ تمہارے...... تمہارے والد کو کس نے مارا؟''

اس نے کچھ دیر سوچا۔ ''مجھے بتاؤ۔'' جان نے اصرار کیا۔ ''چاہے تمہیں صرف ایک ہلکا سا شک ہی کیوں نہ ہو۔ ہمیں اس معاملے کی تہ تک پہنچنا ہے۔''

''جونز۔'' اس نے کہا۔

''جونز؟ میں نے اس کی ہر ایک منٹ کی تفصیل چیک کی ہے، دوپہر سے لے کر چھ بجے تک، جو وہ وقت ہے جب مسٹر گرنی آخری بار زندہ دکھائی دیے، اور جب پولیس یہاں

پہنچی۔ تمہیں کیا لگتا ہے کہ وہ مجرم ہے؟''

اب تک، ملڈرڈ گرنی نے مکمل طور پر خود کو سنبھال لیا تھا۔ جان نے اس کا بہت احترام کیا۔ وہ جانتا تھا کہ جس حالت میں وہ تھی، وہ زیادہ تر لڑکیوں میں جنونی کیفیت پیدا کر دیتی، مگر وہ خود کو مکمل طور پر قابو میں رکھے ہوئے تھی۔ اس کا وہ حیرت انگیز سفید ہاتھ جو چابی تھامے ہوئے تھا، ہلنا بند ہو چکا تھا۔ جب اس نے جواب دیا تو اس کی آواز صاف اور مدھم تھی۔

''میں الزام نہیں لگا رہی ہوں، مسٹر سکس۔ میں جونز کو ذاتی طور پر نہیں جانتی۔ لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو میرے والد کے قریب کر لیا تھا، یہاں تک کہ وہ وصیت میں واحد وارث کے طور پر نامزد ہوا...... ہر کسی سے سنا ہے، وہ شہر کا ایک عام آدمی ہے...... خود غرض، عیش و عشرت کے پیچھے دوڑنے والا شخص۔ وہ سینٹ ریجس میں رہتا ہے، ایک لیموزین لگژری گاڑی کا مالک ہے، پھر بھی وہ بہت زیادہ قرض دار ہے اور اس کا بینک بیلنس سو ڈالرز سے کم ہے۔ یقینی طور پر، یہ بات یہ ظاہر کرتی ہے کہ اس کی میرے والد کی موت میں دلچسپی ہو سکتی ہے۔''

''تم نے یہ سب کچھ کہاں سے سنا؟''

''بریڈلے سے۔'' اس نے چیلنج کرتے ہوئے کہا۔

''سمجھ گیا۔'' جان نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ ایک مقصد ہو سکتا ہے۔ اگر اس نے یہ کیا...... اب، مس گرنی، ایک آخری بات ہے جو میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں، اگر مجھے اجازت ہو۔''

''وہ کیا ہے؟''

''تم آج رات یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''میں وصیت ڈھونڈ رہی ہوں۔ جونز کو وہ پیسہ نہیں ملنا چاہیے؛ وہ تو اسے کلبوں میں اُڑا دے گا۔ میری ماں کے خاندان کے لوگ بے حد غریب ہیں۔ وہ ہمیشہ میری مدد کرتے رہے ہیں، اور میں چاہتی ہوں کہ وہ میرے والد کے پیسے سے آرام دہ زندگی گزاریں۔ مجھے اپنے لیے اس پیسے کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں جوان ہوں، اور کام کر سکتی ہوں۔'' اس نے اپنی خوب صورت بانہوں کو ایک چیلنج کے طور پر پھیلا دیا۔

جان نے چابی اُس سے لے لی۔ ''چلیں، ہم مطالعہ گاہ میں چلتے ہیں۔ تمہیں جو چاہیے وہ شاید وہاں مل جائے...... اور مجھے بھی۔''

اس نے چابی کو تالے میں ڈالا...... اور دروازہ کھلا ہوا پایا! اندر مکمل اندھیرا تھا۔ جان نے اپنی ٹارچ روشن کی اور دیواروں پر نظر ڈالی، پھر الیکٹرک سوئچ کو تلاش کیا۔ اس بار، جب اس نے سوئچ آن کیا، تو روشنی کے بجائے اسٹڈی ٹیبل پر لگا بلب چمک اٹھا۔

پھر ملڈرڈ گرنی چیخ اٹھی؛ ایک خون کو سرد کر دینے والی آواز اس بڑے، سیاہ گھر میں گونجی تھی۔ جان فوراً اس کے پاس دوڑا، اس کی انگلی کی طرف دیکھتے ہوئے۔ ایک آدمی قالین پر منہ کے بل گرا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے جدید فیشن کے تھے، اگرچہ کچھ جگہوں سے پھٹے ہوئے اور شکن زدہ تھے۔ اس کے سینے کے قریب قالین پر ایک گہرا سرخ دھبا چمک رہا تھا۔

جان گھٹنے ٹیک کر اس کے اوپر جھکا، اسے پلٹایا، اور سلویسٹر جونز کی مردہ، گھورتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا!

''انوسٹی گیشن۔''

جب جان سکس اس رات...... یا صبح کہہ سکتے ہیں، کیونکہ تقریباً چار بجے کا وقت تھا...... اپنے گھر پہنچا، وہ اپنے ڈیسک پر بیٹھا، کاغذ اور قلم لے کر، اور تین مشتبہ افراد کے خلاف موجود شواہد کا جائزہ لیا۔

پہلا۔ سلویسٹر جونز۔ اس کے پاس ایک مقصد تھا، کیونکہ کہا جا رہا تھا کہ وہ اسٹرک لینڈ گرنی کی دولت کا واحد وارث ہے۔ دوسری طرف، وہ شہر کے سب سے مہنگے ہوٹل میں رہتا تھا اور اس کے پاس کافی پیسہ تھا، حالانکہ اس کے بینک میں بیلنس نہیں تھا مگر اس کے خلاف کوئی ٹھوس شواہد نہیں تھے۔

دوسرا۔ بریڈلے، نوکر۔ اس کے پاس کوئی واضح مقصد نہیں تھا، حالانکہ وہ یہ جرم ملڈرڈ گرنی کے لیے کر سکتا تھا۔ سب سے مضبوط رشتہ جو اسے قتل کے ساتھ جوڑتا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ گرنی کی موت کے وقت گھر میں موجود واحد شخص تھا۔ اس حقیقت کا اعتراف اس نے سب کے سامنے کیا، حالانکہ وہ آسانی سے باہر جا کر اپنے آپ کو ایک معصوم ثابت کرنے والا بہانہ بنا سکتا تھا، یہ اس کے حق میں ایک اچھا پہلو تھا۔

تیسرا۔ ملڈرڈ گرنی۔ اس کا مقصد انتقام ہو سکتا تھا، حالانکہ وہ اس طرح کی لڑکی نہیں تھی جو اس قسم کے جذبات رکھتی ہو۔ تاہم، اس کی کہانی کے مطابق، اس کے پاس بوڑھے کروڑپتی سے نفرت کرنے کی بڑی وجہ تھی۔ یہ حقیقت کہ اس کے پاس کمرے کے دروازے کی چابی تھی، یقینی طور پر اس کے خلاف ایک سنگین ثبوت تھا۔

Digest Novels .com

جب وہ اس مقام پر پہنچا، جان نے کاغذ کو غصے میں پھاڑ دیا۔ اس نے کمرے کے ہر کونے کا جائزہ لیا تھا، مگر اسے کوئی ایسا سراغ نہیں ملا جو اس کی مدد کر سکے۔ اگر جونز نے گرنی کو مارا، تو پھر جونز کو کس نے مارا؟ اگر اس نے نہیں مارا، تو پھر کس نے؟ گرنی کے کمرے میں جونز کی لاش ملنے کے بعد، اور گرنی یا جونز کے قاتل کو پکڑنے کے لیے کوئی بھی ثبوت نہ ملنے پر، جان نے ملالارڈ کو مقتول کے گھر سے باہر نکال لیا۔ وہ اپنے والد کی وصیت نہیں ڈھونڈ پائی تھی، اس لیے دونوں مایوس ہو گئے تھے۔ لڑکی ایک معمولی ہوٹل میں رہ رہی تھی، اور اس نے جان سے یہ وعدہ کیا تھا کہ اگر کچھ اہم معلومات ملی تو وہ اسے فون کرے گی۔

اپنی کرسی پر پیچھے کی طرف جھک کر، آنکھیں بند کیے، جان سکس نے کوشش کی کہ جو تھوڑی بہت معلومات اس کے پاس ہیں، انہیں منطقی طور پر یکجا کر کے ایک مکمل تصویر بنا سکے۔ جاسوسی کے بڑے تفتیشی کرداروں کا جو نظریہ تھا...... کہ کوئی بھی انسان کمرے میں داخل ہو تو اپنی شناخت کا کوئی نہ کوئی نشان چھوڑ کر جاتا ہے...... جان نے اسے غلط پایا۔ گرنی کے کمرے میں ایک بھی سراغ نہیں تھا۔ اور ایسا کیوں ہوتا؟ ممکن ہے کہ قاتل بغیر کسی آواز کے گھر میں داخل ہوا ہو — اگر وہ گھر کے افراد میں سے نہیں تھا...... دھیرے دھیرے اوپر کی منزل پر چلا گیا، مطالعہ گاہ کمرے کا دروازہ کھولا، اور گرنی کو اس کی کرسی پر بیٹھے ہوئے مار ڈالا۔ قاتل کے لیے یہ انتہائی بدبختی کی بات ہوسکتی تھی کہ وہ کوئی ایسی چیز گرادیتا جو اس کی شناخت ظاہر کرتی، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ نہ بارش ہوئی تھی نہ برف باری، جو کہ قدموں کے نشانات چھوڑنے میں مددگار ثابت ہوسکتی تھی۔

☆☆☆

صبح ہونے پر، جان نے اس مسئلے کو عارضی طور پر چھوڑ دیا، نہا کر شیو کی، اور بغیر کسی کو جگائے گھر سے نکل آیا۔ اس نے شہر کے مرکز تک جانے کے لیے ایک گاڑی پکڑی اور رات بھر کھلنے والے ریسٹورنٹ میں ناشتا کیا۔ شہر میں مدھم اور سیاہ روشنی تھی...... ایک دھندلی اور غمگین صبح، جس میں دریا کی طرف سے آتی ہوئی دھند کا ایک غبار پھیل رہا تھا۔

جان نے ایک سگار جلایا، اور چونکہ اس کے پاس کرنے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا، وہ اسٹار نیوز دفتر کی طرف چل پڑا۔ دفتر کا کمرا خالی تھا سوائے ایک نیند میں ڈوبا شخص جو ایک کرسی پر سویا پڑا تھا۔ سکس کے قدموں کی آواز نے اسے بیدار کر دیا۔

”ہیلو، جان۔“ اس نے بیزاری سے کہا، اور سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟ اگر میں اس اخبار کے مالک کا بیٹا ہوتا، تو میں بالکل کام نہ کرتا......“ اور پھر وہ دوبارہ نیند کی حالت میں واپس چلا گیا۔

”اوہ، تم نہیں کرتے؟“ جان نے چبھتے ہوئے طنز کے ساتھ کہا۔ ”مجھے بھی پام بیچ ہوٹل، کروز شپ اور ناچنے کی محفلیں اتنی ہی پسند ہیں جتنی تمہیں، لیکن تم مجھے کام کرتا دیکھ رہے ہو، ہے نا......؟“

”تم بھی ایسا ہی کرتے، اگر تمہارے اوپر ذمے داری ہوتی۔“

”ویسے۔“ دوسرے آدمی نے اچانک جاگتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک پیغام آیا تھا تقریباً گیارہ بجے؛ وہ تمہاری ڈیسک پر پڑا ہے۔ یہ بریڈلے نے بھیجا ہے، وہ نوکر جو اس گرنی قتل کے معما میں گرفتار ہوا تھا۔ کیا وہ تمہارا دوست ہے؟“

جان نے سلوٹوں والا لفافہ اٹھایا جس پر اس کا نام لکھا تھا۔ ”یہ خط کون لایا؟“

”ایک غصہ ور آدمی...... شاید ایک گارڈ ہو، میں سمجھتا ہوں۔“ جان نے لفافہ پھاڑا اور پڑھا۔

محترم مسٹر سکس!

”شاید اس وصیت کا خاص پہلو آپ کو فوراً سمجھ میں آجائے گا۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ میرے دوست ہیں۔ آپ میرے اوپر ایک احسان کریں، جب آپ کو میری موت کی خبر ملے...... اور مجھے لگتا ہے کہ میرا انجام قریب ہے...... تو کیا آپ میری لاش کو Gustave Edmonson کی طرح دفن کروا دیں گے، جس نے ”The Psychology of the Working Classes“ کتاب لکھی تھی؟ آپ کی توجہ کا بہت شکریہ۔

احترام کے ساتھ

جیمز آر۔ بریڈلے۔“

جان نے اس خط کو دوبارہ پڑھا۔ اس کے لیے یہ اتنی پیچیدہ اور غیر مفہوم باتیں تھیں کہ یہ ایک بیکار پیغام محسوس ہوا۔ پھر خط میں دو لائنیں ایسی نظر آئیں جیسے وہ واضح طور پر نمایاں ہوں۔

”شاید اس خط کا خاص پہلو آپ کو فوراً سمجھ میں آجائے گا۔“ اور ”آپ کی توجہ کا بہت شکریہ۔“

Digest Novels .com

نرگسی آنکھوں والے بوڑھے نوکر نے اسے ایک خفیہ پیغام بھیجنے کی کوشش کی تھی! جان کو فرانس میں ایک مشہور لڑاکا دستے کے انٹیلی جنس سیکشن میں کام کرتے ہوئے کوڈز کا قیمتی تجربہ حاصل ہوا تھا۔ اس نے مختلف قسم کے خفیہ پیغامات پڑھنا سیکھا تھا۔ اس لیے، تھکا ہارا ہونے کے باوجود، وہ اپنے ڈیسک پر بیٹھا اور اس کوڈ کو حل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک گھنٹے کی محنت کے بعد، جان نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ کوڈ تھا، تو یہ اتنی ہوشیاری سے بنایا گیا تھا کہ وہ اسے حل نہیں کر پا رہا تھا۔ خط اتنا مختصر تھا کہ اس میں حل کرنے کا کوئی موقع نہیں تھا۔ گستاو ایڈمنسن اور اس کی کتاب کا ذکر بھی معاملے پر کوئی روشنی نہیں ڈالتا تھا۔ ''دی سائیکالوجی آف دی ورکنگ کلاسز'' اسٹار نیوز کی لائبریری میں تھی۔ جان نے اسے نکالا، مواد کا صفحہ پڑھا، اور کتاب کو تیز تیز پلٹ کر دیکھا، مگر اس میں اسے کوئی اشارہ نہیں ملا۔ یہ بہت بیزار کن اور بے جان تھا، اور یہ کہ یہ کتاب گرنی کے گھر کے دوہرے قتل سے کس طرح جڑی ہو سکتی تھی، یہ خیال غیر ممکن لگ رہا تھا۔

آٹھ بجے اس نے لیفٹیننٹ جیمیسن کو فون کیا۔

''کیا کچھ نیا ہوا ہے، لیفٹیننٹ — میں گرنی کیس کی بات کر رہا ہوں؟''

''نیا؟'' جیمیسن نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''میں کہوں گا کہ ہوا ہے۔ اب سنو، جان۔ میں یہ سب سے پہلے تمھیں بتا رہا ہوں کیونکہ تم نے ماضی میں میری مدد کی ہے اور ویسے بھی، میں چاہتا ہوں کہ تمہارے والد کو اس کا کریڈٹ ملے کہ تمہارے اخبار کو سب سے پہلے یہ خبر پہنچی۔ جیسے ہی میری بات ختم ہو گی، تم گرنی کے گھر آ جانا۔ میں وہاں پہنچ چکا ہوں گا جب تم آؤ گے۔''

''ٹھیک ہے۔ بتاؤ!''

''کل رات وہاں بڑی ہلچل مچی تھی۔ پولیس افسر ڈنی خاص ڈیوٹی پر اس جگہ کے سامنے تھا۔ وہ ایک اچھا، سنجیدہ آدمی ہے، اور اس نے قسم کھائی کہ وہ ساری رات گھر سے سو گز سے کم فاصلے پر تھا۔ ہر ایک یا دو گھنٹے بعد وہ گلی کے راستے سے گزرتا اور پیچھے سے سب کچھ دیکھتا۔ اس نے تین بج کر تیس منٹ تک نہ کوئی روشنی دیکھی اور نہ کوئی آواز سنی۔ اس وقت، ڈنی گرنی کے دروازے کے قریب کھڑا تھا، اور اس نے اندر سے ایک گولی کی آواز سنی۔ اس نے مدد کے لیے دروازہ کھٹکھٹایا، ایک کھڑکی توڑی اور اندر گھسا۔ اس نے اوپر روشنی دیکھی اور فوراً اوپر کی طرف دوڑ گیا۔ مطالعہ کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔''

''کھلا؟'' جان نے درمیان میں کہا۔ ''میں نے تو اسے بند کر کے تالا لگایا تھا؟''

''کیا؟''

''میں نے کہا تھا کہ میں نے اسے بند کر کے تالا لگایا تھا۔''

''میں نے بند کیا تھا، مگر وہ کھلا تھا، اور فرنیچر مکمل طور پر برباد ہو چکا تھا جیسے کوئی لڑائی ہوئی ہو......''

''کیا؟'' جان اب مکمل طور پر حیران ہو گیا۔ جب وہ صرف چند گھنٹے پہلے اس کمرے میں گیا تھا، سب کچھ بالکل ترتیب میں تھا۔ اور اب......

''میں نے کہا سب کچھ ٹوٹا ہوا تھا۔'' پولیس والے نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بدنصیب فون خراب ہے، اور کچھ بھی ٹھیک نہیں سنائی دے رہا۔ کرسیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، تصاویر دیواروں سے گری ہوئی تھیں...... کمرا بالکل برباد تھا۔''

''چلو، جلدی ختم کرو۔'' جان نے کہا۔ ''تم کوئی مختصر کہانی نہیں سنا رہے ہو جس کا اختتام اچھا ہو۔ میں تمام معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ اخبار میں دے سکوں۔''

جیمیسن کی کھنکتی ہوئی ہنسی سنائی دی۔ ''ہم نے اسٹڈی روم میں ایک مردہ آدمی پایا۔ تم ایک چالاک لڑکے ہو، اور اپنے آپ میں ایک اچھے جاسوس بھی ہو، لیکن میں کہتا ہوں تم نہیں بتا پاؤ گے کہ وہ کون تھا۔''

جان نے کہا۔ ''میرے پاس دس ڈالرز ہیں جو کہ میں بتا سکتا ہوں۔'' پولیس والے کے طنزیہ انداز پر فخر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''چلو، بتاؤ۔ کون تھا؟'' جان نے خود کو تیار کیا کہ اب جو آواز آئے گی وہ فون کے ذریعے گونجے گی۔

''سیلویسٹر جونز۔'' جان نے کہا۔

''اوہ نہیں۔'' جیمیسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم نے یہ سوچا تھا کہ میں احمق ہوں گا، جب میں نے تم سے یہ کہا تھا کہ یہ ڈایاک قبیلے کے لوگوں میں سے کوئی ہو سکتا ہے جس نے اسٹرک لینڈ گرنی کو مارا۔ تو تم نے سوچا کہ میں بے وقوف ہوں۔ پر تمھیں نہیں لگتا کہ میں تمھیں بیوقوف بنا رہا ہوں، بیٹے۔ پولیس افسر ڈنی نے گرنی کے کمرے میں ایک ڈایاک کو دیکھا، جس کے سینے میں گولی کا سوراخ تھا!''

Digest Novels.com

"پُراسرار پیغام۔"
اس غیر متوقع موڑ پر جان بالکل حیران رہ گیا اور جو کچھ اسے بتایا گیا تھا، وہ اپنی نیند میں مدہوش ساتھی کو سمجھانے لگا۔ اس پر وہ شخص فوراً چوکنا ہو کر اپنے ٹائپ رائٹر پر کہانی ٹائپ کرنے لگ گیا۔
"اچھا ہے کہ لیفٹیننٹ کو یہ کیس دیکھنے دو۔" جان نے مشورہ دیا۔ "وہ اس گرنی قتل کے معاملے میں دلچسپی رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس پر نظر رکھے۔ بہتر ہوگا کہ اسے فون کر کے بتا دو کہ کیا ہوا اور میں گھر جا رہا ہوں تاکہ حالات کا جائزہ لے سکوں۔"
جان کو خوش قسمتی سے زیادہ دیر نہیں لگی اور ٹیکسی مل گئی۔ پورے سفر کے دوران، وہ خود سے یہی سوال کرتا رہا کہ جونز کی لاش کہاں گئی؟ اس بار بار کے قتل کے پیچھے کون سی شریر طاقت چھپی ہوئی تھی؟ وہ اپنے والد کی باتوں کو یاد کرتا ہے۔ "جب تک کام مکمل نہ ہو جائے، کوئی جشن نہ مناؤ۔" والد، ہمیشہ کی طرح صحیح تھے۔ جو بھی اس معمے کو حل کرتا، وہ واقعی جشن کا حق دار تھا۔
بیس منٹ بعد وہ گرنی کے گھر پہنچا اور خود لیفٹیننٹ جیمیسن نے اس کا استقبال کیا۔
"اوپر آ کر اسٹڈی روم کو دیکھو۔" جیمیسن نے دعوت دی۔ "میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ مجھے اُلجھایا گیا ہے۔ یہ بھوری رنگت والا آدمی کہاں سے آ گیا، مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اب، اگر یہ جونز ہوتا...... جیسے تم نے اندازہ لگایا...... تو ہم ایک کہانی بنا لیتے جو حقائق سے میل کھاتی، تم جانتے ہو، لیکن وہ تو مر چکا......" اس نے اپنے کندھے جھکائے۔ "بریڈلے کو صرف ایک چابی کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ اسٹڈی روم کا دروازہ کھلا تھا، اور میں جانتا ہوں کہ میں نے اسے بند کیا تھا جب ہم یہاں سے نکلے۔"
جان نے سر ہلایا۔ اس نے خود ہی اس دروازے کو بند کیا تھا، ملڈرڈ کی چابی سے، صبح ایک بجے۔ کسی اور تیسری چابی کے سامنے آنے سے تسلی ہو رہی تھی کیونکہ اس سے لڑکی کے اوپر سے شک دور ہو گیا تھا۔ ایک بجے سے لے کر ساڑھے تین تک، تیسری چابی رکھنے والا شخص...... جو غالباً وہ قاتل تھا جسے ہم تلاش کر رہے تھے...... اس نے گھر میں داخل ہونے کے بعد یہ سب کیا۔ وہ کون تھا؟
جان اور پولیس لیفٹیننٹ سیڑھیاں چڑھے۔ ایک آدمی مطالعہ کے کمرے کے فرش پر گرا ہوا تھا، تقریباً اسی جگہ پر جہاں سیلویسٹر جونز اس وقت پڑا تھا جب جان نے اسے صبح کے وقت دیکھا تھا۔
اور یہ ایک ڈایاک قبیلے کا آدمی تھا، جسمانی طور پر بہت مضبوط، اس کے بازوؤں اور کندھوں پر ٹیٹو کے نشان تھے جو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ کسی سردار خاندان سے تھا۔ اس نے پانچ چاندی کی پاؤں کی انگوٹھیاں اور ایک موتی کا ہار زیور کے طور پر پہنا ہوا تھا، اور مغربی روایات کے مطابق ایک سستا اوورکوٹ بھی تھا۔ اس کے سر پر ایک خاص ڈایاک ٹوپی رکھی تھی، جس پر ہارن بل کے پَر لگے ہوئے تھے، مگر وہ کونے میں گرا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی تلوار تھی جس کا ہینڈل خوب صورتی سے کندہ کیا گیا تھا، ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی حملے کے انتظار میں تھا۔
جان اس کے قریب گھٹنے ٹیک کر بیٹھا، اس کی تیز نظریں اس کے جسم اور اس کے قریب کے فرش کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ وہی آدمی ہو جس نے اسٹرک لینڈ گرنی اور سیلویسٹر جونز دونوں کو مارا تھا۔ اگر یہ وہی شخص تھا، تو پھر اس کو کس نے مارا؟ یقیناً بریڈلے نہیں، جو جیل میں تھا۔ بہت کم امکان ہے کہ ملڈرڈ نے کیا ہو، کیونکہ وہ ملڈرڈ کو اس کے ہوٹل تک چھوڑ کر آیا تھا، جو یہاں سے ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ پھر یہ کوئی ایسا شخص تھا جس پر ابھی تک شبہ نہیں کیا گیا تھا۔
"تو پھر، تم اس بارے میں کیا سمجھتے ہو؟" جیمیسن نے پوچھا۔
جان اٹھا، کمرے کے پار چلا گیا؛ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی راستے پر جا رہا ہو جو لیفٹیننٹ کی نظروں سے پوشیدہ تھا۔ وہ چولھے کے سامنے رکا، جس میں مہینوں سے آگ نہیں جلائی گئی تھی، اس کا بغور جائزہ لیا، چمنی کو اوپر دیکھا، اور پھر واپس ڈایاک کے جسم کے پاس آ گیا۔
"میں نے کچھ چیزیں ڈھونڈی ہیں۔" اس نے کہا۔ "جو تم شاید نظر انداز کر گئے ہو۔ سب سے پہلے، یہاں کوئی لڑائی نہیں ہوئی۔ جو کچھ بھی توڑا پھوڑا گیا ہے، وہ غلط تاثر پیدا کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ اگر واقعی اس ڈایاک اور کسی ایسے شخص کے درمیان لڑائی ہوئی تھی جس میں اتنی طاقت تھی کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا، تو کیا تمہیں لگتا ہے کہ وہ ابھی بھی تلوار ہاتھ میں پکڑے ہوئے ہوتا؟ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ ڈایاک کمرے میں آیا، وہ پوری طرح تیار تھا، اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی قدم اٹھاتا، اسے گولی مار دی گئی۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ اگر لڑائی ہوئی ہوتی اور تمام فرنیچر برباد ہو گیا ہوتا، تو یہ ہلکی میز اور لیمپ بچا رہتا۔ نہیں، یہ جگہ ڈایاک

کو مارے جانے سے پہلے احتیاط سے تباہ کی گئی تھی۔"

جیمیسن نے آہستہ آواز میں کہا۔ "کیوں پہلے؟"

جان کی آواز میں طنز آ گیا۔ "کیا تم سوچتے ہو کہ کوئی اس جگہ سے گولی چلنے کے بعد، توڑ پھوڑ کر، اور ڈنی کے آنے سے پہلے فرار ہو سکتا تھا؟"

"یہ جگہ توڑنے کی ضرورت کیوں تھی؟"

"آہ، یہی سوال ہے۔ میرے خیال میں اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ قاتل کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس نے بے فکر ہو کر توڑ پھوڑ کی، تا کہ اسے تلاش کیا جا سکے۔"

"تو پھر وہ مایوس ہوا ہوگا۔" جیمیسن نے غراتی آواز میں کہا۔ "ہم نے ساری قیمتی چیزیں...... کاغذات اور پیسے...... پولیس اسٹیشن لے جا کر چھوڑ دی تھیں جب ہم یہاں سے گئے تھے۔"

جان نے خود کو ملامت کی۔ "میں واقعی دنیا کا سب سے بڑا جاسوس ہوں۔" اس نے خود سے کہا۔ "تو ملڈرڈ اور میں......" وہ اب ایسا سوچ رہا تھا...... "اس نے وہ سارا وقت ضائع کیا، جو کچھ ہم تلاش کر رہے تھے، وہ تو جیمیسن اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے گیا تھا۔ مجھے یہ بات پہلے ہی جان لینی چاہیے تھی۔"

"کیا کچھ اور ہے؟" جیمیسن نے پوچھا۔

"ہاں، اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ اب تم مجھے دس ڈالرز نہیں دے پاؤ گے۔"

"کیا مطلب ہے؟"

"تم نے یہ شرط لگائی تھی کہ ہمیں یہاں جونز کی لاش ملے گی۔"

"اور تم ایسا کرو گے۔" اس نے ڈایاک کے جسم کو ایک طرف گھمایا۔ "اس خون کے دھبے کو دیکھو۔ یہ اس وحشی کے زخم سے نہیں آ سکتا، کیونکہ یہ بہت نیچے ہے۔ اس کمرے میں مسٹر ڈایاک سے پہلے کسی اور کو مارا گیا تھا۔ یہاں اور چولھے کے درمیان خون کے دو قطرے ہیں۔ میں نے چمنی کو اوپر سے دیکھا اور کچھ نظر آیا۔ میں شرط لگاتا ہوں کہ تم جونز کا جسم وہاں اندر پھنسا ہوا پاؤ گے۔"

جیمیسن، ڈیلیکو اوڈول، اور دو پیٹرول مین چولھے کی طرف دوڑ پڑے۔ دس سیکنڈ میں انہوں نے جان کے کہے گئے کی سچائی کو ثابت کر دکھایا، اور سیاہ مٹی سے سیاہ، مڑا ہوا جسم، جو کہ جونز کا تھا، ڈایاک کے جسم کے ساتھ پڑا ہوا تھا۔

انہوں نے جان کو اس سے کہیں زیادہ عزت کے ساتھ دیکھا جتنا پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"میں تمہیں سلام کرتا ہوں، جان۔" لیفٹیننٹ نے تسلیم کیا۔ "اب مجھے بتاؤ کہ یہ کس نے کیا۔ میں اس کیس میں ناکام نہیں ہونا چاہتا۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔" جیمیسن نے شکایت کی۔

"نہیں، میں کچھ نہیں چھپا رہا۔ حقیقت میں، مجھے اتنی معلومات نہیں ہیں کہ تمہاری مدد کر سکوں مگر میں امید کرتا ہوں کہ آج دوپہر تک کچھ اور پتا چل جائے گا۔ جب میں پتا کر لوں گا، تو میں تمہیں بتا دوں گا۔ تم اس پر شرط لگا سکتے ہو۔ میں کسی بھی طرح سے اپنی شہرت بنانا نہیں چاہتا۔ مجھے بس اپنے والد کے ساتھ مضبوط تعلق رکھنا ہے۔ وہ ہمیشہ میرے ہنر کو زیادہ بہتر نہیں سمجھتے تھے، اور میں انہیں یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ وہ غلط تھے۔"

"ٹھیک ہے۔" جیمیسن نے سکون سے کہا۔ "مگر خدا کے لیے، جیسے ہی کچھ نئے شواہد ملیں، مجھے بتا دینا۔"

"یقیناً۔" جان نے ہال میں فون استعمال کیا اور اخبار کو کال کی۔ اس کے والد دفتر میں تھے، اور وہ فوراً ہی گرنی کیس کے نئے موڑ کی خبر سن کر فوراً لائن پر آ گئے تھے۔

انہوں نے خاموشی سے سنا، پھر پوچھا۔

"کیا تمہارے پاس کوئی سراغ ہے؟"

جان نے احتیاط سے کہا۔ "شاید ہاں اور شاید نہیں۔ میں ابھی کچھ چیزوں کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔"

"کیلر نے مجھے بتایا کہ تمہیں بریڈلے کی جانب سے ایک خفیہ پیغام ملا تھا۔ کیا تم نے اس کا مطلب سمجھا؟"

"نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کوئی پیغام نہیں ہو سکتا، اور مجھے امید ہے کہ جلد ہی اس کا کوئی دوسرا حصہ مل جائے گا۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا، میں اپنے کچھ خیالات کو عملی جامہ پہنانے جا رہا ہوں۔ ویسے، والد محترم، لیفٹیننٹ جیمیسن چاہتا ہے کہ آپ اس کی مدد کریں جب تک کچھ نئے سراغ نہ ملیں۔"

"بالکل۔" جان نے فون بند کر دیا۔ اس کا ارادہ ملڈرڈ کے پاس جانے کا تھا، اور اس سے یہ معلوم کرنے کا تھا کہ آیا وہ کسی ڈایاک قبیلے کے آدمی کو اپنے نوکر کے طور پر ساتھ لے کر آئی تھی، اور کیا وہ اس کے جھگڑے میں شامل ہو کر قتل ہو گیا۔ یہ بات بہت ممکن لگتی تھی۔ وہ شاید گرنی اور جونز کو مار چکا تھا لیکن جان یہ نہیں سمجھ سکا کہ پھر اسے کس نے مارا۔

Digest Novels .com

ملڈرڈ کے ہوٹل پر تھوڑی دیر سے جانا چاہیے۔ یہ سوچتے ہوئے کہ وہ بہت دیر سے سوئی تھی، اس لیے یہ ممکن تھا کہ وہ ابھی تک جاگ نہ پائی ہو۔ تو جان نے گھر چھوڑا اور چھوٹے ٹاؤن ہوٹل کی طرف چلنے کا فیصلہ کیا۔

سورج نے دھند کو دریا کے کنارے تک دھکیل دیا تھا، اور کھلے میں ہوا بہت خوشگوار تھی، خاص طور پر جب وہ گرنی کے گھر کی خوفناک فضا میں سانس لے چکا تھا۔ جان نے اپنے کندھے جھٹکے اور تیز قدموں سے چلنا شروع کیا، وہ اس ورزش کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اسے ایک دھچکا لگا جب اس نے ملڈرڈ کے ہوٹل میں پوچھا اور معلوم ہوا کہ وہ ایک گھنٹا پہلے جا چکی تھی۔

''آپ مسٹر سکس ہیں؟'' کلرک نے معلومات کے بعد پوچھا۔

''ہاں۔''

''اچھا، اس نے آپ کے لیے ایک پیغام چھوڑا تھا۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ آپ یہاں جلد آ جائیں گے۔''

''جاتے جاتے،'' اس نے کہا تھا 'کہ فوراً 2738 فلپس اسٹریٹ آ جائے۔' مجھے لگتا ہے یہ بہت ضروری ہے۔''

جان فوراً سڑک پر دوڑتے ہوئے باہر نکلا، ایک ٹیکسی روکی اور ڈرائیور کو فلپس اسٹریٹ کے ایڈریس پر تیز رفتاری سے لے جانے کا حکم دیا۔ اس اچانک تبدیلی کا مطلب پہلے سے کچھ سوچنا فضول تھا...... سوائے اس کے کہ یہ ملڈرڈ کے لیے کوئی پریشانی کا باعث ہو سکتا تھا۔

وہ اپنے مقام تک غیر معمولی تیز رفتاری سے پہنچے۔ جان نے ڈرائیور کو رقم دی اور تقریباً تین سیکنڈ میں دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا تھا، اور وہ اندر چلا گیا۔

اوپر کی منزل سے ملڈرڈ کی آواز خوف اور احتجاج کے ساتھ سنائی دی۔ جان تیز قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔ جب وہ سیڑھیاں چڑھ کر لینڈنگ پر پہنچا، تو اس نے .... ایک لمبے، کالی داڑھی والے آدمی کی بانہوں میں ملڈرڈ کو لڑتے ہوئے دیکھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کے اندر غصے اور جذبات کا طوفان اُمڈ آیا۔ اس نے صرف ایک بار اسے دیکھا تھا، لیکن اس کی خوب صورتی اور حوصلے نے اس کا دل جیت لیا تھا۔

لڑکی نے اسے دیکھا، اس کا نام پکارا، جب کہ حملہ آور اسے پیچھے پھینک کر دروازے کی طرف مڑ گیا۔

جان خاموشی سے ایک جانور کی طرح آگے بڑھا۔ وہ دوسرے آدمی سے چھوٹا تھا، لیکن اس کے حملے کی شدت اس فرق کو پورا کر رہی تھی۔ اس کے مکّے کالی داڑھی والے پر برسے، جو چوڑا اور مضبوط تھا۔ جان کے مکّے نے اس کے سر کو دیوار میں اس طاقت سے ٹکرایا کہ ایک کمزور آدمی ہوتا تو بے ہوش ہو جاتا۔

اس کے بجائے، ایسا لگا کہ اس نے کالی داڑھی والے کو مزید مشتعل کر دیا۔ اس نے جان کو کمر سے پکڑا اور اپنے گھنے چہرے کو اس کے سینے میں دبا دیا۔ مگر جان نے تیز کہنیوں اور مکّے سے اسے روکا۔ اسے سمجھ میں آ گیا کہ قریب سے لڑنے کا اس کے پاس کم موقع ہے۔ اس کی واحد بچت اس میں تھی کہ وہ اس کے بندر جیسے بازوؤں سے دور رہے۔

وہ آدمی پیچھے ہٹ گیا، سانسیں لیتے ہوئے، پھر اپنے بائیں کندھے کے نیچے سر جھکا کر دوبارہ حملہ آور ہوا۔ جان نے پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگائی مگر اس کا پاؤں پھسل گیا، اور داڑھی والا اس کے اوپر گر گیا جس سے وہ چکرا گیا۔ جان فوراً گھوم کر اس کے اوپر پہنچا، اور اس کی گردن کے پٹھوں میں اپنی انگلیاں گاڑ دیں۔ اس دباؤ نے اس کی سانس روک دی۔ وہ ہانپتے ہوئے، ہوا میں ہاتھ مارنے لگا۔

ملڈرڈ اس کے پاس دوڑی آئی۔ ''جلدی، جلدی۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''ہمیں یہاں سے نکلنا ہوگا۔''

اس نے اوپر کی طرف دیکھا، اور اس کی آنکھوں میں وہ پرانی چمک واپس آ گئی۔ اس کے کندھے پر اس کا ہاتھ پڑا، اور وہ اس لمس سے چونک گیا۔

''مجھے لگتا ہے کہ پہلے اس لڑکے کو پولیس کے حوالے کر دیں۔'' اس نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ چند مکّے اس کی سزا کے لیے کافی نہیں۔''

''نہیں، نہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ چلو۔'' پھر جان اٹھا، اور داڑھی والے کو حقارت سے دیکھتے ہوئے ملڈرڈ کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

ایک بار پھر سورج کی روشنی میں باہر آ کر، اس کی حیرت بڑھتی چلی گئی۔

''کیا آپ مجھے اس کا مطلب بتا سکتی ہیں، مس گرنی؟'' اس نے درخواست کی۔ ''ہر قدم مزید مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ ہم نے جونز کو آج صبح ایک بجے آپ کے والد کے مطالعے کے کمرے میں مردہ پایا۔ تین بج کر تیس منٹ پر ڈیوٹی پر موجود افسر نے گولی کی آواز سنی، گھر میں داخل ہوا، کمرا بکھرا ہوا پایا، اور ایک بڑا ڈایاک قبیلے کا آدمی مردہ پڑا

تھا۔ جونز کی لاش چمنی میں دبی ہوئی تھی۔ کیا آپ اس ڈایاک کو جانتی ہیں؟ آپ اس خالی گھر میں کیا کر رہی تھیں؟ اور وہ داڑھی والا آدمی کون تھا؟''

لڑکی نے سوچا۔ ڈایاک شاید تاما اِنگ تھا، جس نے کبھی وعدہ کیا تھا کہ وہ ایک دن میرے والد سے بدلہ لے گا۔ وہ اپنے لوگوں سے مختلف تھا...... چپ چپ، ہاں، مگر دل سے شر پسند۔ ہاں، وہ واحد شخص ہے جسے میں یاد کر سکتی ہوں جو ان سالوں میں اپنے دشمن کی تلاش میں رہا۔

''یہ گھر میری ماں کا تھا، مسٹر سکس۔ وہ داڑھی والا آدمی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اس سے بچنا چاہتی تھی، اور یہاں آئی تھی، یہ سوچ کر کہ میں نے اسے پیچھے چھوڑ دیا ہے مگر وہ میرے پیچھے آ گیا، زبردستی اندر آیا اور مجھے پکڑ لیا۔''

''کیوں؟''

''اس نے...... اس نے کہا کہ وہ ایک جاسوس ہے، اور مجھے اسٹرک لینڈ گرنی کے قتل میں گرفتار کرنا چاہتا ہے!''

''شکوک و شبہات۔''

جان کا دل اچانک خوف سے دھڑکنے لگا۔ پولیس کو اسٹرک لینڈ گرنی کی بیٹی کے بارے میں اطلاع کیسے ملی؟ اگر پولیس کو یہ معلوم تھا، اور یہ پتا چل گیا کہ ملڈرڈ نے گرنی سے نفرت کیوں کی، تو اس کی گرفتاری چند گھنٹوں کا معاملہ تھا۔ اب یہ جاسوس انسان...... جان نے اپنی آنکھیں چند لمحوں کے لیے بند کیں، ان باتوں کو ذہن میں رکھ کر یاد کرنے کی کوشش کی۔ جاسوس؟ یہ تو بلیک ایلن تھا، جو ایک مقامی شہرت والا گن مین تھا! بلاشبہ، کوئی ایسا شخص تھا جو چاہتا تھا کہ ملڈرڈ گرنی کو راستے سے ہٹایا جائے، اور وہ شخص، سکس کے خیال میں، وہی قاتل تھا جسے وہ تلاش کر رہا تھا۔

ملڈرڈ کو ایک بات بتا کر، جان دوبارہ واپس گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ اگر بلیک ایلن پر دباؤ ڈالا جائے، تو وہ بتا سکتا تھا کہ اسے کس نے ملازمت پر رکھا تھا، جان نے اسے گھر اس لیے چھوڑا تھا کیونکہ وہ اور لڑکی دونوں یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ ایک جاسوس ہے۔ اب وہ اسے تلاش کرنے کے لیے بے چین تھا لیکن ایلن، جان کے مُکّے سے تھک چکا تھا، اور غائب ہو چکا تھا۔

جان نے لڑکی کو صورتِ حال بتائی، اور دونوں مل کر ملڈرڈ کے ہوٹل واپس گئے۔ جان لابی میں بیٹھا رہا جب تک کہ ملڈرڈ نے اپنا سامان پیک نہیں کر لیا۔ پھر اس نے ایک ٹیکسی کرائے پر لی اور اسے شہر کے ایک بالکل مختلف علاقے کے ہوٹل میں لے آیا۔ اس سے ایلن کا گروہ کچھ وقت کے لیے ان کا پیچھا نہیں کر سکتا تھا۔

جان...... دوبارہ کام پر واپس آیا، تو اس کا دماغ بریڈلے کے بھیجے گئے ممکنہ خفیہ پیغام پر سوچ رہا تھا۔ اس کی کیا ضرورت تھی؟ ...... بریڈلے اسے آسانی سے بلا کر جو کچھ چاہتا، بتا سکتا تھا۔ کسی خفیہ پیغام کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

اس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی کہ وہ اس اُلجھن کو حل کرے اور یہ پتا لگائے کہ اسٹرک لینڈ گرنی، جونز اور ڈایاک کو کس نے مارا۔ اگرچہ اس کی مقامی پولیس ٹیم کے بارے میں زیادہ اچھی رائے نہیں تھی، لیکن اس نے تسلیم کیا کہ کبھی کبھار وہ صرف مسلسل محنت سے سچائی تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور وہ بہت فکرمند تھا کہ ان کی اندھی تگ و دو میں وہ ملڈرڈ گرنی کو گرفتار کر لیں گے۔ حالانکہ جان کو پورا یقین تھا کہ اس نے جرم نہیں کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ پولیس کو قائل کرنا زیادہ مشکل ہوگا۔ اس کے علاوہ، اگر وہ اسٹرک لینڈ گرنی کے قاتل کو پکڑ لے، تو ملڈرڈ پر کیے گئے حملے ختم ہو جائیں گے۔

digest library.com

جان 5th اسٹریٹ پر رک گیا تا کہ وہ ایک ایسی گاڑی کا انتظار کر سکے جو اسے شہر کے مرکز میں جیل لے جائے جہاں بریڈلے کو قید کیا گیا تھا۔ جب وہ انتظار کر رہا تھا، اسی دوران ایک چمکتی ہوئی رولس رائس لیموزین گاڑی سڑک کے کنارے آ رکی۔ ہاکر، سلویسٹر جونز کا ڈرائیور، اپنی چھوٹی خون آلود آنکھوں سے جان کو دیکھتے ہوئے گاڑی سے نکلا۔

''مسٹر جان سکس، سر، کیا آپ ہیں؟'' ہاکر نے نہایت عاجزی سے پوچھا۔ ''میں تھوڑی مشکل میں ہوں، سر، اور کل آپ کو مسٹر گرنی کے گھر دیکھ کر اور آپ کی صلاحیتوں کی اتنی تعریف سنی...... معاف کیجیے گا، سر...... میں آپ سے کچھ مشورہ لینے آیا ہوں۔''

''ضرور...... ضرور......'' جان نے خوش دلی سے کہا۔

''کیا کوئی ایسی جگہ ہے جہاں میں آپ کو لے جا سکوں، سر؟''

''میں تو جیل جا رہا ہوں......''

''جیل؟''

''مسٹر گرنی کے نوکر، بریڈلے سے ملنے۔''

ہاکر، ڈرائیور نے منافقانہ انداز میں سر ہلایا۔ ''یہ سوچ کر کہ وہ اپنے مالک اپنے آقا کو مار ڈالے گا۔ یہ تقریباً ناقابلِ یقین ہے۔''

''کیا تم یقین کرتے ہو؟''

''بالکل۔ وہ واحد شخص تھا جو اس وقت گھر میں تھا لیکن آپ جیل جا رہے ہیں، جناب۔ اگر آپ میرے ساتھ سیٹ پر بیٹھیں گے، تو میں راستے میں اپنی بات واضح کر سکتا ہوں۔''

جان پھرتی سے ہاکر کے ساتھ پر بیٹھا، اور بڑی گاڑی خاموشی سے مطمئن انداز میں دوڑ پڑی۔

''یہ ایک بہت عجیب سی صورتِ حال ہے، سر۔'' ڈرائیور نے شروع کیا۔ ''دیکھیں، میں جونز خاندان کے ساتھ کئی سالوں سے کام کر رہا ہوں۔ جب مسٹر سلویسٹر جونز نے خود سے کام شروع کیا، تو میں ان کا ڈرائیور بن گیا...... کیونکہ ان کا کاروبار چھوٹا تھا، آپ سمجھتے ہیں نا؟ وہ مجھ سے بہت خوش تھے، اگر میں یہ کہوں کہ جب ان کے خاندان کے وارث کا انتقال ہوا، تو انہوں نے ایک وصیت کی جس میں اپنی ساری جائداد مجھے دے دی۔''

جان نے شک بھری نظریں ہاکر پر ڈالی، جس نے لمحے بھر کے لیے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں، پھر سڑک کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

''بات یہ ہے، سر۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''کہ مسٹر سلویسٹر جونز کے پاس حقیقتاً کچھ نہیں بچا۔ ان کا بینک بیلنس تقریباً کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ گاڑی اور ان کی دیگر ذاتی چیزیں ان کے قرض دہندگان کو دینے کے لیے فروخت کرنی پڑیں گی۔ یہ بہت افسوسناک ہے کہ وہ کتنی مشکل سے جیتے تھے، سر۔''

''یہ آپ کے لیے مشکل ہوگا۔'' جان نے کہا۔

''لیکن آپ مجھے یہ کیوں بتا رہے ہیں؟''

''مجھے وکیلوں پر اعتماد نہیں ہے اور مجھے کسی سے بات کرنی تھی۔ یہ ہے وہ عجیب بات، سر۔'' ڈرائیور نے گاڑی ایک موڑ پر گھمائی اور ٹریفک کے پیچیدہ راستوں میں اس مہارت سے گزر گیا کہ اس کی چالاکی کی تعریف کی جا سکتی تھی۔ ''میں نے سنا ہے کہ میرے مالک سلویسٹر جونز کو مسٹر گرنی کی ساری جائداد وراثت میں ملی ہے۔ کئی بار مسٹر جونز نے مجھے اپنی توقعات کے بارے میں بتایا۔ تو، قدرتی طور پر، مجھے وہ رقم ملنے کی توقع ہے جو انہیں ملنی چاہیے تھی۔''

وہ جیل کی خوفناک اور سیاہ دیواروں کے قریب پہنچ چکے تھے، اور رولس رائس گاڑی گیٹ کے سامنے رک گئی۔ جان نیچے اترا، لیکن ایک لمحے کے لیے ہچکچایا، ایک پاؤں رننگ بورڈ پر رکھا۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا، وہ ہاکر کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''جیسے ہی مجھے وقت ملے گا، میں تم سے ملنے آؤں گا۔''

''آپ مجھے سینٹ ریجس گیراج میں تلاش کر سکتے ہیں سر۔''

جان کی آنکھوں نے چھوٹی، خون آلود آنکھوں کو معنی خیز انداز میں دیکھا۔ ''اور آپ۔'' اس نے مزید کہا۔ ''میرے لیے کچھ کر سکتے ہیں۔''

جان بے پروا انداز میں سر ہلاتے ہوئے وارڈن کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

یہ بالکل ضروری تھا کہ جان جیل کے وارڈن کو جانتا ہو۔ اتنا ہی ضروری کہ وارڈن بھی ایک اخبار نویس اور شہر کے ایک بہت بااثر آدمی کے بیٹے کی مدد کر کے خوش ہو۔ جب جان نے بریڈلے سے بات کرنے کی درخواست کی، تو وارڈن...... یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ ایک عام انٹرویو ہوگا...... راضی ہو گیا اور خود بریڈلے کے سیل تک لے آیا۔

وہ غمگین سا آدمی بائبل پڑھ رہا تھا، لیکن جب جان اندر آیا تو اس نے بائبل نیچے رکھی اور کھڑا ہو گیا۔ اس میں کچھ ایسا دکھ تھا، جیسے وہ ایک پرانا، بیزار کھلونا ہو جسے کمرے کے ایک کونے میں پھینک دیا گیا ہو...... جان کو اس پر بہت ترس آیا۔ اس نے ایک یا دو باتیں کیں کہ اسے افسوس ہے کہ وہ وہاں ہے۔ بریڈلے نے شکرگزار ہو کر جواب دیا۔

وارڈن مروتاً اتنی دوری پر تھا کہ وہ آواز سن نہ سکے۔ جان نے کہا۔ ''میں نے وہ پیغام وصول کیا جو تم نے بھیجا تھا، لیکن میں کچھ سمجھ نہیں سکا، اس لیے میں یہاں آیا ہوں کہ سب کچھ تمہاری زبانی سن سکوں۔''

بریڈلے نے اس کی طرف کچھ الجھی ہوئی سی نظر سے دیکھا۔ ''م...... میں...... نہیں جانتا کہ آپ کیا بات کر رہے ہیں، سر؟''

''کوئی راز یا ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جان نے بے صبری سے کہا۔ ''میں اس معاملے کو حل کرنے میں مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں یہاں نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ اور لوگ یہاں ہونے چاہیے تھے۔ سب سے زیادہ میں ملڈرڈ گرنی کی مدد کرنا چاہتا ہوں!''

اس نے اپنا چہرہ بریڈلے کے قریب کیا اور اس جملے کو انتہائی زور دے کر کہا۔

بریڈلے کا چہرہ جھک گیا، اس کی نیلی آنکھیں پھیل

Digest Novels .com

گئیں۔ ’’بریڈلے، تم نہیں سمجھتے؟‘‘ جان نے سرگوشی کی۔ ’’میں اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہت ممکن ہے کہ پولیس جلد ہی اس کے بارے میں سنے۔ جو کچھ بھی تم جانتے ہو، مجھے بتاؤ۔ یہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔‘‘

بریڈلے نے پلنگ پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو مروڑا۔ ’’میں کچھ نہیں جانتا، مسٹر سکس، میں خدا کی قسم کھاتا ہوں، مجھے کچھ علم نہیں! سوائے اس کے کہ میں نے اس کے اسٹڈی روم کے دروازے کے تالے کا نقشہ اس کے لیے بنایا تھا۔ میں نے پوری دوپہر سوتے ہوئے گزاری، اور مجھے نہیں پتا کہ اُس وقت کیا ہوا۔‘‘

’’کیا مسٹر گرنی نے واقعی ملازموں کو چھٹی دی تھی، یا تم نے؟‘‘

’’اُس نے دی تھی۔‘‘

’’کیوں؟‘‘

’’میں نے اسے بتایا تھا کہ ملڈرڈ گھر آ رہی ہے۔ وہ ڈرا ہوا تھا کہ وہ کوئی ہنگامہ کرے گی اور ملازم اسے سنیں گے۔‘‘

’’وہ پیغام جو تم نے مجھے بھیجا تھا، اس کا کیا مطلب تھا؟‘‘

’’میں نے آپ کو کوئی پیغام نہیں بھیجا، سر۔‘‘

جان مکمل طور پر غصے سے بھرا ہوا دروازے کی طرف مڑ گیا۔ وہ یہ نہیں سمجھ سکا کہ اگر بریڈلے نے واقعی پیغام بھیجا تھا تو وہ اس سے کیوں انکار کر رہا تھا۔ اگر اس نے نہیں بھیجا تو پھر یہ پیغام کس نے بھیجا تھا، اور کیوں اس پر بریڈلے کا نام تھا؟ جان نے اپنے نوٹ پیڈ کو جیب سے نکالا اور اسے بریڈلے کے سامنے رکھ دیا۔

’’اس پر چند لائنیں لکھو۔‘‘ اس نے حکم دیا۔ ’’اور اپنے نام کے ساتھ دستخط کرو۔ میں اِس کا اُس خط سے موازنہ کرنا چاہتا ہوں جو مجھے آج صبح ملا تھا۔‘‘

بریڈلے نے جیسے ہی جان کا حکم سنا، ویسا ہی کیا۔ وہ اتنا تھکا ہوا نظر آ رہا تھا کہ اس کی مزاحمت کرنے کی طاقت ختم ہو چکی تھی۔ جان نے نوٹ پیڈ جیب میں ڈالا، خوشی خوشی الوداع کہا اور وارڈن کے ساتھ کوریڈور میں چلا گیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ ایک بھول بھلیوں میں ہو، جو شدت سے منزل تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو، مگر ہر بار وہ پہلے سے بھی زیادہ دور جا رہا ہو۔ اس کا ابتدائی مقصد، اپنے والد کی نظر میں مقام حاصل کرنا تھا اور دوسرا مقصد ملڈرڈ کو سیاہ سائے سے بچانا تھا۔

XXXXXXXXXXXXXXXXXX

پھانسی

جیلر نے کال کوٹھری کا دروازہ کھول کر ملکھا سنگھ کو بتایا۔ ’’سب تیاریاں مکمل ہیں۔ تم کو کل صبح آٹھ بجے پھانسی دے دی جائے گی۔‘‘

ملکھا سنگھ نے یہ سُن کر زوردار قہقہہ لگایا۔ ’’کیسے دو گے؟ میں تو گیارہ بجے سے پہلے سو کر ہی نہیں اٹھتا۔‘‘

ذاتی مسئلہ

سردار سورن سنگھ بیوی کے ہمراہ نیویارک کے اسٹار ہوٹل کی ساتویں منزل پر مقیم تھے۔ رات کے دو بجے انہوں نے ہوٹل کے منیجر کو فون کیا۔ ’’جلدی میرے کمرے میں آؤ..... میرا بیوی سے سخت جھگڑا ہوا ہے اور وہ خودکشی پر تلی ہوئی ہے......‘‘

’’سر! یہ آپ کا ذاتی مسئلہ ہے۔‘‘ منیجر کی غنودہ آواز آئی۔ ’’آپ خود حل کریں۔ ہوٹل کی انتظامیہ کچھ نہیں کر سکتی۔‘‘

’’ابے! انتظامیہ کے بچے!‘‘ سردار جی نے دانت پیس کر کہا۔ ’’جلدی آؤ۔ یہ ذاتی نہیں ہوٹل کی دیکھ بھال میں غفلت کا معاملہ ہے۔ کھڑکی کی کنڈیوں میں بُری طرح زنگ لگا ہوا ہے..... وہ کسی طرح نہیں کھل رہیں۔ دیر ہوئی تو کہیں وہ عورت اپنا ارادہ نہ بدل لے۔‘‘

حیدرآباد سے علی زاہد کی پریشانی

XXXXXXXXXXXXXXXXXX

جان فوراً اسٹار نیوز کے دفتر کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق چل رہا تھا اور کسی نے خاص طور پر اس کی طرف دھیان نہیں دیا جب وہ اپنی ڈیسک پر پہنچا۔ وہ خط جو اسے صبح موصول ہوا تھا، پیپر ویٹ کے نیچے دبا تھا، اور ایک اور خط اس کے ساتھ پڑا تھا۔ یہ بغیر دستخط کے تھا اور صرف یہ الفاظ لکھے تھے۔ ’’صفحہ نمبر بیالیس، پیراگراف تین۔‘‘

اس نے پہلا خط کھولا اور دوبارہ پڑھا۔ ’’شاید اس کی خصوصیت آپ کو فوراً محسوس ہو جائے گی۔ اگر آپ میرے لیے ایک احسان کریں، جب آپ میری موت کی خبر سنیں ...... اور مجھے لگتا ہے کہ انجام قریب ہے ...... کیا آپ میری لاش کو گستاو ایڈمنسن کی طرح ٹھکانے لگا دیں گے، جس نے 'The Psychology of the

Digest Novels .com

'Working Classes' لکھی؟"

جان مسکرایا۔ دوسرا نوٹ پہلے نوٹ کے بنائے ہوئے معما کو اتنے سادہ طریقے سے حل کر دیتا تھا۔ اس کا پیغام دینے والا یہ چاہتا تھا کہ وہ مطلوبہ کتاب کا صفحہ نمبر بیالیس، پیراگراف تین پڑھے۔ اس نے ایک آفس بوائے کو بلایا اور اسے کتاب لانے کا کہا۔ وہ کتاب جو اس نے صبح دیکھی تھی وہ لائبریری واپس جا چکی تھی۔

پھر اس نے دونوں نوٹس کو سامنے رکھا۔ دوسرے نوٹ کی مختصر نوعیت کے باوجود، یہ واضح تھا کہ دونوں کی تحریر ایک ہی ہاتھ کی ہے پھر جان نے وہ کاغذ نکالا جس پر اس نے بریڈلے سے لکھوایا تھا۔ وہ بھی پہلے دونوں نوٹس کی طرح تھا!

بوڑھے نوکر نے اس نوٹس سے انکار کیوں کیا تھا؟

آفس بوائے کچھ دیر بعد ایڈمنسن کی کتاب کے ساتھ واپس آیا۔ جان نے اس کتاب کو تیزی سے پکڑا اور صفحہ نمبر بیالیس کھول لیا۔ پیراگراف نمبر تین میں اسے یہ لکھا ہوا ملا۔

"سب سے اہم گھریلو ملازم، ڈرائیور ہوتا ہے، اور یہ نفسیاتی مطالعے کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے۔ وہ عام طور پر دوسرے ملازمین سے ذہنی طور پر ایک قدم آگے ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں، وہ زیادہ قیمتی یا زیادہ خطرناک بن سکتا ہے، اس کی شخصیت کے مطابق۔ مجھے بہت واضح طور پر مسٹر فارکس ورتھ لی کے قتل کا واقعہ یاد آتا ہے جو اُن کے ڈرائیور کے ہاتھوں ہوا تھا......"

جان نے کتاب کو خوشی کے ساتھ نیچے پھینک دیا اور کہا۔ "ہاکر!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "ہاکر، ڈرائیور!"

وہ خط جان کے دماغ میں پلنے والے مبہم شبہات کو واضح کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن آخر کار، ڈرائیور کو تینوں قتل سے جوڑنے کے لیے ثبوت کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر، سیاہ سایہ ملڈرڈ گرنی کے اوپر ابھی بھی باقی رہتا۔

جانے سے پہلے، جان اپنے والد کے دفتر میں رکا۔ بزرگ شخص نے اپنی چیئر پر پیچھے جھک کر اپنے بیٹے کو دیکھا۔

"تو پھر، بیٹے۔" اس نے خوشی سے پوچھا۔ "شرلاک ہومز کا کام کیسا جا رہا ہے؟"

جان اپنے والد کے ساتھ ڈیسک پر بیٹھا اور ان کی طرف مسکرا کر کہا۔ "اگر آپ کو لگتا ہے کہ میں نے وقت ضائع کیا ہے، تو آپ کا اندازہ غلط ہے، والد محترم۔ وہ انکشاف جو ہمیں جونز اور تاما اینگ کے قتل کے بارے میں ملا ہے، اس کیس پر میں نے جتنا وقت گزارا ہے، وہ اس کے قابل ہے، ہے نا؟"

"بے شک۔ ایک سگار لے لو، اور تمہاری تنخواہ میں ایک ڈالر فی ہفتے کا اضافہ کر دیا ہے۔ لیکن مجھے اس کیس کے جاسوسی پہلو میں دلچسپی ہے...... تمہارے جرائم کے معاملے کرنے کا طریقہ کار کیا ہے۔ کیا تم نے آج کچھ نتیجہ اخذ کیا ہے؟"

اپنے والد کے مذاق کی پروا کیے بغیر، جان اپنے پاؤں ہلاتے ہوئے بیٹھا رہا، اس کی نظریں کچھ کاغذوں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے اوپر دیکھ کر، سیدھا دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔

"ہاں، میں نے کچھ نتیجہ اخذ کیا ہے، والد محترم، اور اگر یہ زیادہ نہ ہو تو میں آپ سے ایک وضاحت چاہوں گا۔ آپ نے وہ دو نوٹس مجھے کیوں بھیجے اور بریڈلے کا نام کیوں دستخط کیا؟"

"اور یہ کیسے جانا کہ میں اس واقعے سے جُڑا ہوا ہوں؟"

"آپ کی ڈیسک پر بریڈلے کا ایک پرانا خط ہے، اور دوسرے کاغذ پر اس کے ہاتھ کی نقل کی گئی ہے۔ آپ کچھ حد تک ہینڈ رائٹنگ کے ماہر ہو، تو یہ سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں تھی مگر اصل مقصد کیا تھا؟"

بزرگ شخص نے اپنا سگار پھینک دیا اور ہنسے۔

"بیٹے، تم اس پر اتنا اچھا کام کر رہے ہو کہ میں نے سوچا تمہاری مدد کروں لیکن تمہیں اُلجھن میں بھی رکھوں۔ میں نے سوچا تھا کہ تم میرے اسی تھوڑے سے سراغ کو سمجھ لو گے لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہیں یہ پتا چلے کہ میں نے یہ کاغذ چھوڑا تھا۔ کیا تم نے بریڈلے کو دیکھا؟"

"جی ہاں۔ وہ بوڑھا آدمی بہت پریشان تھا جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس کے پیغام کا کیا مطلب تھا۔ اسے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں کیا بات کر رہا تھا۔"

اسٹار نیوز کے مالک نے ہنس کر کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ میرے ذہن میں کوئی شک نہیں ہے کہ وہ اس معاملے میں ملوث نہیں ہے۔ جب سب کچھ صاف ہو جائے گا، تو میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اب، میں چاہتا ہوں کہ تم باہر جا کر ہاکر ڈرائیور کی جانچ پڑتال کرو۔ بلاشبہ اس کے پاس مضبوط بہانہ ہوگا۔ جب مجھے پتا چلا کہ اس کے پاس ایک لاکھ ڈالرز سے زیادہ کا بینک بیلنس ہے تو مجھے ہاکر پر شک ہوا۔ یہ ثبوت کافی تھا کہ وہ ایک معمولی ڈرائیور نہیں ہے۔ جتنا مجھے معلوم

ہے، اس کا نہ تو گرنی یا جونز کو مارنے کا کوئی مقصد تھا۔"

"ہاں، اس کا مقصد تھا۔" جان نے کہا۔ پھر اس نے وہ کہانی دہرانا شروع کی جو ہاکر نے اسے ایک گھنٹا پہلے سنائی تھی۔ "اب، میں نے اس کے لیے ایک منصوبہ بنایا ہے تاکہ ہم اسے بے خبری میں پکڑ سکیں۔ اگر آپ میرے ساتھ تعاون کریں گے، تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم یہ کرسکتے ہیں۔"

جب اس نے اپنی وضاحت مکمل کی، بزرگ سکس نے سیٹی بجائی۔ "یہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ میں اپنے حصے کا کام شروع کردیتا ہوں۔ اب، تم جا کر اس کے ہر لمحے کی جانچ پڑتال کرو۔"

جان نے ہدایات کے مطابق کام کیا لیکن جب اس نے اپنی تحقیقات مکمل کی، تو وہ اسی خالی دیوار کا سامنا کررہا تھا جو اسے جونز کے دن کی جانچ پڑتال کے دوران ملی تھی۔

سینٹ ریجس کے دوسرے ڈرائیورز نے ہاکر کے ساتھ پوکر کھیلا تھا جب تک کہ جونز نے اسے نہیں بلایا تھا۔ وہ وقت ایک بجنے سے دس منٹ پہلے تھا، اور گاڑی پانچ منٹ بعد گیراج سے نکال دی گئی۔ اس دن دوپہر کو پارک میں ڈیوٹی پر موجود ٹریفک افسر کو یاد تھا کہ اس نے رولس رائس کو تقریباً ایک بج کر پندرہ منٹ پر دیکھا تھا۔ وہ مسٹر جونز کو ذاتی طور پر جانتا تھا، اور اس صاحب نے رک کر اسے کچھ سگار دیے تھے۔ اس وقت کو یاد رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ جونز نے اس سے کہا تھا کہ اس کی گھڑی رک گئی تھی اور گاڑی کی گھڑی بھی خراب ہوگئی ہے۔ وہ ڈرائیور کی بے پروائی پر ناراض تھا کہ یہ کیسے ہوگیا۔

جونز کی گرل فرینڈ، مس ڈیزی گریلس نے اپنی بات دوبارہ دہرائی کہ جونز دو بج کر تیس منٹ پر پہنچا تھا، اور ڈرائیور اس کے ساتھ تھا۔ وہ ہاکر کو دوبارہ چار بجے تک نہیں دیکھ پائی جب وہ ان کے پاس ہوٹل واپس آیا۔ تاہم، ہوٹل کے سامنے والے پوکر روم کے منیجر نے بتایا کہ ہاکر...... جو اس جگہ کا پرانا گاہک تھا۔ اس نے تین بجے ایک ٹیبل لی تھی اور چار بجے کے قریب تک نہیں نکلا تھا۔ اس سے اس کا وقت اسی طرح حساب میں آگیا جیسے سلویسٹر جونز کا وقت آیا تھا۔

جان اس پر پریشان ہوگیا۔ وہ یقین کررہا تھا کہ کچھ ایسا ہے جو بالکل سامنے نظر آرہا ہے اور... اسے دیکھنا چاہیے تھا وہ اسے ہاکر کو پکڑنے میں مدد دیتا۔ اور اچانک، اس کے دماغ میں خیال آیا۔ کیوں اس نے پہلے اس کے بارے میں نہیں سوچا؟ یہ پہلے کی طرح واضح تھا جیسے اب ہے۔

اس نے ملاڈرڈ گرنی کو فون کیا اور اپنا منصوبہ اس کے سامنے رکھا۔ لڑکی...... جو مکمل طور پر اس پر بھروسا کرنے لگی تھی...... ہر طرح سے اس کا ساتھ دینے پر رضامند ہوگئی۔

پھر جان نے اسٹار نیوز کے دفتر میں ایک چھوٹی سی ملاقات کے بعد، سینٹ ریجس گیراج میں ہاکر سے ملاقات کی۔ وہ جان کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔" جان نے کہا۔ "میں مشکل میں ہوں۔ اگر میرے والد کو یہ پتا چل گیا کہ میں اسٹاک مارکیٹ کے مسئلے میں پھنس چکا ہوں، تو وہ مجھے گھر سے نکال دیں گے۔ فطری بات ہے کہ میں ان کے پیسوں کے وراثت میں ملنے کے امکانات کو ضائع کرنے کا خواہش مند نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ابھی کچھ مدد کی ضرورت ہے۔"

"تم میرے پاس کیوں آئے؟"

"کیونکہ تم میری مدد کرسکتے ہو۔"

ہاکر فکرمند ہوگیا، ایک کاغذ کو مروڑتے ہوئے، اس کی خفیہ نگاہیں فرش پر تھیں۔ وہ جان کی ذہنی صلاحیت کا مطالعہ کررہا تھا، اور یہ بھی جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ کہاں تک جائے گا۔ آخرکار، اس نے اپنے کندھے جھکائے۔ "مجھے نہیں معلوم تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

جان نے اپنی کرسی کو تھوڑا قریب کیا۔ "ہاں، تمہیں معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے پاس کیتھیڈرل نیشنل بینک میں ایک لاکھ ڈالرز ہیں۔ مجھے اس میں سے کچھ رقم چاہیے۔"

"کیا تم کوئی وجہ بتا سکتے ہو کہ میں تمہیں یہ کیوں دوں؟"

ہاکر نے اپنی چاپلوسی والی حالت چھوڑ دی اور پُراعتماد انداز میں بات کی۔

"اس کی کئی وجوہات ہیں، لیکن ایک خاص وجہ ہے جو تمہیں دلچسپ لگے گی۔" ڈرائیور کی خون آلود آنکھیں تنگ ہوگئیں، اور اس کی انگلیاں بے چینی سے کرسی کے کونے پر مچلنے لگیں۔

"کیا ہے؟"

"تمہارا دفاع۔" جان نے احتیاط سے وضاحت دی۔ "ظاہر ہے میرے پاس وہ سب کچھ ہے جو پولیس کو مطلوب ہوسکتا ہے۔ پولیس اسے جیسا ہے ویسا قبول کرلے گی۔ لیکن تم ایک بج کر پندرہ منٹ، جب ٹریفک پولیس والا تمہیں پارک میں دیکھتا ہے، اور دو بج کر تیس منٹ، جب تم

digest library.com

نے جونز کو مس گریلس کے اپارٹمنٹ تک پہنچایا۔ اس کے بعد، ان دو گھنٹوں کے دوران تم کیا کر رہے تھے؟''

ہاکر غصے سے کھڑا ہو گیا اور تیز آواز میں چلّا اٹھا، لیکن جان نے اپنی کرسی پر ہی آرام سے بیٹھے ہوئے جواب دیا۔ ''ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟''

آہ، اب بلی باہر آ گئی! جان نے حرکت نہیں کی مگر اس کے چہرے کے پٹھے ڈھیلے ہو گئے اور اس نے گہری خاموش سانس لی۔

''پندرہ ہزار ڈالرز۔''

''یہ بہت مہنگا سودا ہے۔''

''اوہ، بہت۔'' جان نے خود اعتمادی سے کہا۔

''اور اس کے بدلے میں مجھے کیا ملے گا؟''

''اگر پولیس بھی اس کھوئے ہوئے گھنٹے کے بارے میں سوچے، تو وہ تمہیں ایک لمحے میں پکڑ لیں گے۔ تمہارے پاس گرنی کے پیسے حاصل کرنے کا موقع ہے۔ صرف دو رکاوٹیں ہیں۔ پہلی وہ ہے جس کا میں نے ابھی ذکر کیا؛ دوسری گرنی کی بیٹی ہے۔ وہ شہر میں ہے۔''

اسے امید تھی کہ ڈرائیور، ہاکر حیران ہو جائے گا لیکن ہاکر صرف غصے میں آیا اور کہا۔ ''مجھے پتا ہے۔''

''تمہیں پتا ہے؟ تو تم اس کا کیا کرو گے؟''

ہاکر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم مجھ سے پیسے لینے کی امید رکھتے ہو، تو تمہیں خود کچھ مشورے دینے ہوں گے۔''

''میں اس احمق جیمیسن کی توجہ تم سے مکمل طور پر ہٹوا سکتا ہوں۔'' جان نے کہا۔ ''یعنی، اگر مجھے پیسے ملیں۔''

''اور یہ گرنی کی بیٹی کا کیا کریں؟''

جان نے ہاکر کو بے پروائی سے دیکھا۔ ''صرف ایک ہی کام ہے جو کرنا ہوگا، ہے نا؟''

''ہاں۔'' ڈرائیور نے مایوسی سے کہا۔ ''ہمیں اُسے راستے سے ہٹانا ہوگا۔''

''ہم؟''

''ہاں، تم بھی۔ تم مجھ پر بھروسا نہیں کرتے، اور میں تم پر نہیں کرتا۔ اب تک سب کچھ ٹھیک ہے۔ سب برابر ہے، اور کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن اگر ہم یہ کام ساتھ کریں گے، تو کوئی بھی دوسرے کو دھوکا نہیں دے سکے گا۔''

جان کو جھوٹ سے فطری طور پر نفرت تھی لیکن اس پیشے کے بے رحم تقاضوں نے اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا۔ ڈیوٹی پر جھوٹ بولنا بھی بھی ایک ناپسندیدہ ضرورت ہوتی ہے...... اور یہ ملڈرڈ کے لیے تھا۔

''کیا تم یہ کرو گے؟'' ہاکر نے پوچھا۔

''اور میں پندرہ ہزار ڈالرز لے سکوں گا؟''

''یقیناً۔''

''ٹھیک ہے۔'' جان نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ جب تمہیں پتا تھا کہ وہ شہر میں ہے، تو تم نے خود کچھ کیوں نہیں کیا۔''

ہاکر نے غصے میں کہا۔ ''میں نے بلیک ایلن کو اس کا پتا چلانے کے لیے بھیجا تھا، لیکن کسی نے اس کے معاملے میں مداخلت کی اور ایلن کو اچھی طرح پیٹ دیا۔ لڑکی بچ کر نکل گئی، اور وہ کہیں چھپتی پھر رہی ہے۔ ہمیں پہلے اسے ڈھونڈنا ہوگا۔''

''میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں ہے۔''

''تمہیں پتا ہے؟''

''یقیناً۔ تم مجھے کس قسم کا رپورٹر سمجھتے ہو؟ میں اس کیس میں سب کا پیچھا کر رہا ہوں، شروع سے آخر تک۔ میرا منصوبہ یہ ہے۔ کیا تم جانتے ہو کہ 2738 فلپس اسٹریٹ کہاں ہے؟''

ہاکر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ گھر گرنی کی بیوی کا تھا، اور اب، ظاہر ہے، بیٹی کا ہے۔ میں اسے جھوٹے بہانے کے ذریعے وہاں لے آؤں گا، اور پھر — اچھا، ان باتوں پر بات کرنا خوشگوار نہیں ہے۔''

''کتنے بجے تمہیں وہاں پہنچنا ہے؟'' ہاکر نے پوچھا۔

اسی دوران ہال میں ہلکے سے قدموں کی آواز سنائی دی۔

''اخبار فروش۔'' ایک بچکانا آواز آئی۔ ''ایوننگ اسٹار نیوز۔''

''بارہ بجے؛ ٹھیک وقت پر۔'' جان نے جلدی سے کہا اور دروازہ کھولا۔ اخبار فروش بچے نے مڑا ہوا اخبار اندر پھینکا، جسے جان نے ہاکر کو دے دیا۔

''بارہ بجے، یاد رکھنا۔'' اور سیڑھیاں اترتے ہوئے غائب ہو گیا۔

جان سڑک پر چلتے ہوئے دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ ڈرائیور، ہاکر حیرانی سے اپنے مالی بحران کے بارے میں بڑی بڑی سیاہ سرخیوں والے اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔

''کیتھیڈرل نیشنل بینک نے اپنے دروازے بند کر دیے۔ افسران کی لوٹ مار کی اطلاع۔ قرض دہندگان کو

Digest Novels.com

ایک ڈالر بھی نہیں ملے گا۔"

"قاتل کا انکشاف۔"

جان نے اسٹار نیوز کے دفتر فون کیا، پتا چلا کہ اس کے والد گھر جا چکے ہیں، وہ فوراً وہاں پہنچ گیا۔ رات کا کھانا بہت پہلے سرو کیا جا چکا تھا، اور اس کی والدہ اور بہنیں تھیٹر جا چکی تھیں۔ گھر کا مالک اپنے کمرے میں لباس بدل رہا تھا۔ جان فوراً اوپر گیا۔

"تو پھر۔" اسٹار نیوز کے مالک نے پوچھا، جب وہ اپنی جیکٹ جھاڑ کر ایک کرسی پر رکھ رہا تھا۔ "تمہارا شاندار منصوبہ کیسے کامیاب رہا؟"

"بہت کامیاب۔ مجھے لگتا ہے کہ ہم نے اُسے جال میں پھنسا لیا ہے۔ اپنے بیٹے کو دیکھو، پرانے جنگجو۔ وہ ایک مجرم ہے۔ میں نے ہاکر کے ساتھ ایک سازش کی...... اور یہ میری اپنی تجویز تھی...... کہ ہم ملڈرڈ گرنی کو راستے سے ہٹا دیں۔ وہ آج رات بارہ بجے 2738 فلپس اسٹریٹ پر مجھ سے ملے گا۔ میں نے لڑکی کو وہاں بلانے کا ارادہ کیا ہے۔ خدایا! وہ کتنا پکا اور حساب کتاب کرنے والا شیطان ہے۔"

"وہ واحد اسٹار نیوز کا نسخہ جو میں نے پرنٹ کیا تھا، جو کیتھیڈرل نیشنل بینک کی ناکامی کے بارے میں تھا، اس کا کیا ہوا؟"

"یہ اسی وقت پہنچا دیا گیا تھا، جیسے ہی میں نکلا۔" جان ہنستے ہوئے بولا۔ "اور اگر مجھے انسان کی فطرت کا کچھ پتا ہو، تو یہ آخری زوردار دھچکا ہوگا جو ہاکر کو نتائج کی پروا کیے بغیر بے قابو کر دے گا۔ وہ غصے میں بات کرے گا اور بے قابو زبان دنیا کے تمام جاسوسوں سے زیادہ مجرموں کی تباہی کا سبب بنی ہے۔"

بزرگ سکس نے اپنے بال برش کیے اور اپنی واسکٹ اٹھالی۔ "بیٹا یہ ایک چالاک خیال تھا، لیکن میں چاہوں گا کہ وہ کاغذ واپس لے لیا جائے۔ بینک پہلے کی طرح مستحکم ہے، لیکن اگر وہ جعلی نوٹس کبھی صدر کی نظر میں آ گیا، تو مجھے ایک ہرجانے کے دعوے میں مدعا بننا پڑے گا۔ بہرحال، یہ ایک اچھے مقصد کے لیے ہے، اس لیے میں اس بارے میں پریشان نہیں ہوں گا۔ کیا تم نے ملڈرڈ گرنی کو سب کچھ سمجھا دیا ہے؟"

"ہاں۔"

"اسے تم پر مکمل اعتماد ہے، بیٹے۔ میں جانتا ہوں کہ تم کوئی انڈر ورلڈ کے جوان نہیں ہو، لیکن وہ ایک سادہ سی لڑکی ہے۔ خیال رکھنا۔"

جان کے گالوں پر سرخی آ گئی، اور اس نے اپنے والد کو بے چین نظروں سے دیکھا۔ خاموشی چھا گئی، اور وہ بیٹھ گیا، اپنے ننھے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں چھپائے ہوئے۔ بزرگ سکس نے اسے غور سے دیکھا اور اپنے کالر کو درست کرنے کی کوشش کی۔

"کیا تم...... آہ...... اُس سے محبت کرتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"ہاں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، یہ کیس میرے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے؟ میں کوئی تجربہ کار جاسوس نہیں ہوں...... نہ ہی مجھے اس خودغرض، لالچی گرنی، جونز، اور ڈایاک کو پکڑنے میں دلچسپی ہے۔ میری یہ کوشش سب کچھ اس لڑکی کے لیے ہے، جس سے میں دل کی گہرائیوں سے محبت کرتا ہوں۔ میں صرف چاہتا ہوں کہ اس پر سے وہ سیاہ سایہ یا الزام ہٹ جائے، جو اس پر ڈالا گیا ہے۔"

مسٹر سکس نے کپڑے تبدیل کر لیے تھے۔ جان نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی، اپنی ٹوپی اور دستانے اٹھائے، اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"دس بجے ہیں۔" اس نے ایک عجیب سی پُرسکون آواز میں کہا۔ "اگر تم تیار ہو تو میں بھی تیار ہوں۔"

دونوں نیچے اُترے۔ سکس کی لیموزین باہر کھڑی تھی۔ جب وہ ڈرائنگ روم پہنچے، تو اچانک جان کے دماغ میں ایک خیال آیا۔

"میرے خیال میں ہمیں ایک ساتھ نہیں جانا چاہیے، بابا۔ ہاکر کوئی معمولی ڈرائیور نہیں ہے۔ عام طور پر، وہ بہت ہوشیار اور چالاک ہے، وہ اس گھر کو دیکھے گا اور پتا لگائے گا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ آپ گاڑی میں جاؤ، تھوڑی دیر شہر میں گھومو، پھر جیمیسن، اوتول اور ہیئر ہالٹر کو لے آؤ۔ انہوں نے اس معاملے کی ابتدا دیکھی تھی، اور یہ مناسب ہوگا کہ وہ اس کا اختتام بھی دیکھیں۔ میں ملڈرڈ سے فلپس اسٹریٹ کے ایڈریس کے قریب ملوں گا۔ پولیس کو پچھلے راستے سے اندر آنے دینا، اور یہ دیکھنا کہ ہاکر انہیں نہ دیکھے۔"

"بالکل، بیٹے۔" بزرگ سکس نے کہا۔ اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ محبت سے پکڑا۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں، سمجھے؟ ہر قدم پر۔ اور اگر ضرورت پڑی، تو مجھے نہیں لگتا کہ میں اتنا بُرا اسسر بنوں گا۔" وہ ہنسا، اپنا ہاتھ چھوڑا، اور دروازہ اس کے بھاری جسم کے پیچھے بند ہو گیا۔

چند منٹ بعد، جان بھی باہر نکل آیا۔ وہ ملڈرڈ سے

Digest Novels .com

فلپس اسٹریٹ کے گھر سے چند بلاک دور ملا۔ اس کے خوب صورت نرم گاؤن میں، جس کی گردن اور کندھوں پر نیلے رنگ کی ربن کی لکیریں تھیں، وہ اتنی جوان اور پیاری لگ رہی تھی کہ جان کا دل بے چین ہو گیا۔

’’مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں ہو۔‘‘ اس نے سرگوشی کی۔

’’مجھے ڈر تھا کہ کچھ ایسا ہوگا جو تمہیں روک دے گا۔‘‘

’’کوئی بھی ہمیں نہیں روک سکتا...... وہ!‘‘ وہ دھیرے سے بولی۔ پھر کہا۔ ’’کیا ہم اب اندر جائیں؟‘‘

’’جی ہاں، ہمیں اندر جانا چاہیے۔‘‘ کیونکہ ہاکر کے آنے کا وقت قریب تھا۔ ملڈرڈ کے پاس اس جگہ کی چابی تھی۔ وہ مدھم، پرانی طرز کے پچھلے کمرے میں داخل ہوئے، جہاں انہیں اپنی نگرانی کرنی تھی۔ اگر دونوں اکیلے ہوتے، تو یہ انتظار تھوڑا رومانیت بھرا ہوتا...... شاید کچھ ہولناک سا...... لیکن ساتھ ہونے کی وجہ سے سب کچھ مختلف تھا۔ وہ دونوں اس لمحے کسی انسان کا شکار کرنے والے جذبات سے بھرے ہوئے تھے، ایک ایسا جذبہ جو کسی اور تجربے سے نہیں مل سکتا تھا۔

آخرکار، کونے کے گرجا گھر کی بڑی گھڑی نے بارہ بجے کی بارہ دھڑکنیں سنائیں۔ ان کی گونج ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ سامنے کے دروازے کے کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔ جان نے جلدی سے ڈائننگ روم میں جھانکا اور لیفٹیننٹ جیمیسن کی تسلی دینے والی سرگوشی سنی۔

اب مرکزی کردار کے داخل ہونے کے لیے اسٹیج تیار ہو چکا تھا۔ جان نے اٹھ کر کمرے کا دروازہ کھولا تاکہ ہاکر کو اندر آنے دے۔

ہاکر شراب کے نشے سے سرخ ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ اس نے ہمت کو بڑھانے کے لیے بہت سی شراب پی تھی، اور بس اتنا ہوا کہ اس کے گالوں میں سرخی اور زبان میں بھاری پن آ گیا۔

’’جب میں نے دیکھا کہ یہ جگہ کتنی اندھیری ہے، تو مجھے لگا کہ شاید تم نے مجھے دھوکا دے دیا ہے۔‘‘ وہ غرایا۔

’’کیا تم یہ سوچ رہے تھے کہ میں اسے چرچ کی طرح روشن کر کے رکھوں گا؟‘‘ جان نے چڑتے ہوئے کہا۔

’’خیر۔‘‘ جان نے معمولی انداز میں کہا۔ ’’یہاں مس گرنی ہیں جو اس معاملے پر تم سے بات کرنے آئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے وہ پندرہ ہزار ڈالرملیں گے، ہے نا؟‘‘

ہاکر نے اپنی جیب سے اسٹار نیوز کا نسخہ نکالا اور جان کے سامنے پھینک دیا۔ ’’یہ دیکھو۔‘‘ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے کہا۔ ’’میں فقیر ہو گیا ہوں...... میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ جب مجھے گرنی کا پیسہ وراثت میں ملے گا، تو تمہاری رقم دوگنا کر دوں گا۔‘‘

’’تمہارا کیا مطلب ہے؟‘‘ لڑکی نے پوچھا۔ ہاکر نے اپنی سرخ آنکھوں سے اسے گھورا۔

’’میرے پاس کیتھیڈرل بینک میں ایک لاکھ ڈالرز تھے...... وہ پیسہ جو جونز اور میں نے بوڑھے بیوقوفوں جیسے معروف لوگوں سے بلیک میل کر کے نکالا تھا۔ اب وہ بینک بند ہو گیا، اور اس نے میرا سارا پیسہ لے لیا۔ لیکن میں گرنی کا پیسہ حاصل کروں گا...... جب تم راستے سے ہٹ جاؤ گی...... کیا میں نہیں، جان؟ تو ہم تمہیں بہت احترام کے ساتھ ہٹانے والے ہیں۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آیا میں جان پر اعتماد کر سکتا ہوں یا نہیں، لیکن میرا حوصلہ ٹوٹ چکا تھا، اور میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے ہم دونوں تمہیں مار ڈالیں گے...... جیسے جونز، گرنی، اور ڈایاک کو مارا گیا تھا۔‘‘

اس نے اپنے پیچھے کی پاکٹ میں سے ہتھیار نکالنے کی کوشش کی۔ اس کی انگلیاں جیسے ہی اس کے پستول کے دستے پر پہنچیں، جان فوراً آگے بڑھا، اور اس کے دائیں مکّے نے ہاکر کے منہ پر ضرب لگائی۔ ہاکر پیچھے لڑکھڑایا، خون بہتے لبوں سے گالی نکلی۔ اس سے پہلے ہاکر اپنی حالت کو سنبھال پاتا، ڈائننگ روم کا دروازہ کھلا اور بند ہوا، اور جیمیسن اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ نیلے کوٹ اور چمکتے بٹنوں نے ہاکر کو فوراً ہوشیار کر دیا۔ وہ اردگرد گھوم کر ایک پھنسے ہوئے جنگلی جانور کی طرح دیکھنے لگا۔ اس کے خون سے رنگے چہرے پر ایک جان لیوا خوف ظاہر ہو رہا تھا۔

’’اس کا کیا مطلب ہے؟‘‘ ہاکر نے پوچھا۔

’’اس کا مطلب ہے کہ ہم نے اسٹرک لینڈ گرنی کے قاتل کو پکڑ لیا ہے۔‘‘ پولیس لیفٹیننٹ نے زور دے کر کہا۔ ’’تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تم ہمیں دھوکا نہیں دے سکے، چاہے تم جتنے ہوشیار کیوں نہ ہو۔‘‘

’’میں نے گرنی کو نہیں مارا، خدا کی قسم، میں نے نہیں مارا!‘‘

’’نہیں؟ پھر کس نے مارا؟‘‘

’’جونز نے۔ اس نے سب کچھ پلان کیا تھا اور خود ہی اسے عمل میں لایا۔ میں نے صرف اس کے دفاع میں مدد کی تھی، بس۔ اس کی گرل فرینڈ سے ملاقات ڈیزی گریلس کے ساتھ...... پارک میں سیر...... اور سب کچھ اس نے وقت کو چھپانے کے لیے کیا تھا۔ جو حساب کی چیز کسی نے بھی

Digest Novels .com

محسوس نہیں کی، وہ ایک بج کر پندرہ منٹ کے درمیان تھی، جب پارک میں ٹریفک افسر نے ہمیں پہچانا، اور دو بج کر تیس منٹ کے درمیان جب جونز مس گریس کے اپارٹمنٹ گیا۔ اس نے لمبے کوٹ اور ڈھیلی ٹوپی سے خود کو چھپایا، اپنے آپ کو کالک سے سیاہ کیا، اور زیرِ زمین راستے سے اندر داخل ہو گیا۔''

''اس کے پاس بوڑھے کے کمرے کی چابی تھی۔ اس نے اندر آ کر دروازہ کھولا۔ چند ہی لفظوں کا تبادلہ ہوا، پھر جونز نے خودکار ہتھیار سے اسے مار ڈالا، جس میں سائلنسر لگا ہوا تھا۔''

''کیوں؟ بوڑھے گرنی نے اسے پہلے سے کافی پیسے دیے ہوئے تھے۔''

''یہ گرنی کی بیٹی تھی۔ جونز نے سنا کہ وہ شہر میں ہے۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ بوڑھے نے صلح کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور وہ جانتا تھا کہ اسے فوراً کچھ کرنا ہوگا تاکہ وصیت میں تبدیلی نہ آئے۔''

''پھر تم نے جونز کو مارا۔'' جیمیسن نے الزام لگایا، اس کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

جان ہنسا۔ ''تم دوبارہ غلط ہو، لیفٹیننٹ۔ اس نے جونز کو نہیں مارا۔''

پولیس افسر نے غصے میں کہا۔ ''تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟''

جان نے ہاکر کے سکڑے ہوئے جسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جونز کو ڈایاک سے پہلے مارا گیا تھا۔ مجھے اس لیے پتا ہے کہ میں اس کمرے میں تھا اور اس کی لاش ملی۔ وہ ایک کافی بڑا آدمی تھا...... کم از کم سترہ پاؤنڈ وزن ہوگا۔ کیا تم یہ سوچتے ہو کہ ہاکر نے اس لاش کو اٹھایا اور چمنی میں اسی طرح دھکیل دیا جیسے ہم نے اسے پایا؟ ایسا کرنے کے لیے ایک بہت طاقتور آدمی کی ضرورت تھی، اور ایک ایسا آدمی جو اپنے جرائم چھپانے کا کافی قدیم طریقہ استعمال کرتا تھا۔ میرا اندازہ ہے کہ ڈایاک قبیلے کے تاما اینگ نے مسٹر جونز کو مارا، اور پھر ہاکر نے ڈایاک کو ختم کیا۔ کیا میں صحیح ہوں، ہاکر؟''

ہاکر نے اس کی طرف ایک زہر آلود نظر ڈالی لیکن ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے سوچا کہ اپنے آپ کو بچانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ وہ سب کچھ صاف صاف بتا دے۔

''میں نے ڈایاک کو مارا، لیکن یہ دفاعی قدم تھا۔'' اس نے کھنکھار کر کہا۔ ''اس نے جونز کو مارا تھا، اور خود کو چھپا لیا تھا...... مجھے نہیں معلوم کہاں۔ وہ شاید جونز کو گرنی سمجھ بیٹھا، جس سے وہ نفرت کرتا تھا، اور پھر خوفزدہ ہو کر لاش کو چمنی میں چھپایا۔ میں جونز کے پیچھے گھر آیا تھا۔ جب وہ باہر نہیں آیا تو میں اندر چلا گیا۔ ڈایاک میری طرف آیا اپنی قاتل چھری کے ساتھ — اس لیے میں نے اسے گولی مار دی۔ یہ قتل نہیں ہے، لیفٹیننٹ۔ تم میرے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔''

جیمیسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''شاید نہیں، لیکن تم بگڑے ہوئے شخص ہو، ہاکر...... ایک بگڑے شخص...... تمہارے دل میں اتنی گندگی ہے جتنی گرنی میں تھی۔ لیکن تم نے اس کی بیٹی کو مارنے کی سازش کی، اور تم نے کئی معروف لوگوں کو بلیک میل کرنے کا اعتراف کیا ہے، تو اگر تم اس چھوٹے ڈایاک کو مارنے کی سزا سے بچ گئے، تو تمہیں ان دوسرے الزامات کے لیے سزا ملے گی۔ اونول، اسے لے جاؤ۔ گاڑی باہر انتظار کر رہی ہے۔''

ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگنے کی آواز آئی۔ ہاکر نے جان کو قتل کرنے والی نگاہ سے دیکھا اور ڈیٹیکٹو کے ساتھ باہر چلا گیا۔

لیفٹیننٹ جیمیسن نے اپنے موٹے، گیلے ہاتھ رگڑے۔ ''خیر، مجھے خوشی ہے کہ ہم نے یہ کافی ہوشیاری سے کیا، ہے نا، مسٹر...... تمہیں پتا ہے، تھوڑی دیر کے لیے مجھے تشویش ہوئی تھی...... اور......''

جان نے مسکراہٹ کو دبایا۔ ملڈرڈ کے کپڑوں کی تہوں کے پیچھے، وہ لڑکی کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھا، اور ایک عجیب سا سکون اور اطمینان کا احساس اس کے دل میں چھا گیا تھا۔ اسے مجرم کو پکڑنے کا خاص طور پر کوئی کریڈٹ نہیں چاہیے تھا۔ وہ جو چاہتا تھا، اس میں کامیاب ہو چکا تھا۔ بس اتنا ہی کافی تھا۔

''ہاں، کافی ہوشیاری سے۔'' جیمیسن نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''اوہ، ہاں۔'' جان نے مڑتے ہوئے جواب دیا۔ ''اس شہر کی پولیس کو بیوقوف نہیں بنایا جا سکتا، اور کل اسٹار نیوز اخبار میں پولیس لیفٹیننٹ جیمیسن کو تمام حق کے ساتھ کریڈٹ دیا جائے گا۔ اور اب، ملڈرڈ...... ارے...... مس گرنی......''

ملڈرڈ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں اور مضبوط ہو گیا۔ ''مجھے ملڈرڈ کہو...... جب تک تم چاہو۔'' اس نے سرگوشی کی۔

❖❖❖

دہر

حسام بٹ

اڑتیسویں قسط

کامیابی اسی کو ملتی ہے جو ثابت قدم اور مستقل مزاجی سے اپنی منزل کی جانب گامزن رہتا ہے۔ وقت کی ایک بے رحم، سفاک کروٹ نے اس کے جیون میں بھی زہر گھول دیا تھا۔ ناکردہ جرم کی پاداش میں اس کا لڑکپن اور جوانی قید و بند کی صعوبتوں کی نذر ہوگئیں۔ زمانہ اسیری نے ایک طرف اس کے دل و دماغ پر صدمات کے ان مٹ نقوش چھوڑے تو دوسری جانب اس نے علم و ہنر کا بحرِ بے کنار اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔ اس نے آزاد عملی میدان میں قدم رکھا تو نت نئے دشمنوں سے اس کا سابقہ پڑا۔ جلد ہی اس پر منکشف ہوا کہ خالق نے اسے زمینی خداؤں کی سرکوبی کے لیے تخلیق کیا ہے۔ مقصد حیات واضح ہوا تو اس نے خود کو منشائے قدرت کے سامنے سرنگوں کردیا۔ اس کارزار فنا و بقا کی اس جدوجہد میں ایک دل نشیں مہ جبیں اس کی رفیق سفر ٹھہری۔ اپنے اطراف میں پھیلی شوریدہ لہروں کو برداشت کرتے ہوئے اس کا سفر جاری تھا جہاں یہودیوں کا سازشی ذہن دنیا پر حکمرانی کا اپنا خواب شرمندۂ تعبیر کرنا چاہتا تھا۔

چند لمحوں میں زندگی بدل دینے والے عیار ذہنوں کی جولانیاں

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

جاسم کا تعلق ایک متوسط طبقے سے تھا۔ لڑکپن میں قدم رکھنا قیامتِ صغریٰ کا پیغام بر ثابت ہوا۔ اس کے والد قاسم باری نے محلے کے غنڈوں کے خلاف پولیس کی مدد کی تو یہ چھوٹی سی فیملی طوفان کی زد میں آ گئی۔ ایک رات اسی گینگ کے چند لوگوں نے گھر میں گھس کر جاسم کی والدہ اور والد پر قاتلانہ حملہ کردیا جس میں ماں ہلاک ہوگئی اور شدید زخمی باپ کو پرائیویٹ اسپتال پہنچا دیا گیا۔ قاسم کا علاج شروع کرنے کے لیے پانچ لاکھ کی ضرورت تھی۔ جاسم نے مدد کے لیے اپنے اکلوتے ماموں جلیل کی طرف دیکھا۔ جلیل نے اس شرط پر رقم کا انتظام کردیا کہ جاسم کو ایک ناکردہ جرم کی پاداش میں کچھ عرصے کے لیے جیل جانا پڑے گا۔ جاسم کے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس نے ماموں کی بات مان لی۔ اپنے باپ کی زندگی بچانے کے لیے وہ تیرہ سال کی عمر میں آٹھ سال کے لیے جیل چلا گیا۔ قید و بند کی اس زندگی میں دو افراد نے اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک چھٹا ہوا بدمعاش مراد علی تھا جسے سب دادا کہتے تھے۔ دوسرا کارل مارکس کا پیروکار ایک صحافی انور بیگ تھا جو کامریڈ کہلاتا تھا۔ دادا اور کامریڈ ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن دونوں ہی کی جاسم پر گہری نگاہ تھی۔ وہ جاسم کی بپتا سے واقف تھے اس لیے وہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق اس کی ذہنی اور جسمانی تربیت میں لگ گئے۔ کامریڈ نے جاسم کی زبان کو تلوار اور دادا نے اس کے ہاتھ پاؤں کو موت کی للکار بنا دیا۔ دادا نے اپنے بندوں کے ذریعے پتا لگالیا تھا کہ جاسم کے والدین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے پیچھے راجو نامی ایک گینگسٹر کا ہاتھ ہے اور یہ بھی کہ جلیل ماموں نے جاسم کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس نے پانچ لاکھ اپنی جیب میں ڈالے اور قاسم باری کو مرنے کے لیے چھوڑ کر کہیں غائب ہوگیا تھا۔ دادا اتنا طاقتور بدمعاش تھا کہ وہ جیل میں بیٹھ کر بھی باہر کے معاملات کو چلاتا رہتا تھا۔ جلیل تو منظر سے ہٹ چکا تھا لیکن راجو تک پہنچنے کے لیے دادا نے جاسم کی مدد کی۔ اسے اپنے معتمدِ خاص کامل کے ساتھ چند گھنٹے کے لیے جیل سے باہر بھیجا۔ جاسم نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے راجو کو زندگی بھر کے لیے وہیل چیئر کا محتاج بنا دیا۔ دادا کا جیل سے باہر جانا لگا رہتا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی میں شرکت کرنے گیا تو اس کے ایک دیرینہ دشمن شعیب چاچا نے اسے اور اس کی بیٹی و بیوی کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ دادا کی موت نے جاسم کو حد درجہ افسردہ کردیا۔ بہر حال وہ اپنی سزا پوری کرنے کے بعد جیل سے باہر آیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ اب وہ ایک تربیت یافتہ کڑیل جوان تھا اور اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کرنا تھا اور اسی آغاز پر ایک مہ جبیں سے

digestlibrary.com
Digest Novels

اس کا تعارف ہو گیا۔ ناجیہ ایک پروڈکشن ہاؤس میں ایسوسی ایٹ پروڈیوسر تھی۔ وہ جاسم کی فائٹنگ اسکلز سے حد درجہ متاثر ہوئی اور اس نے جاسم کو رنگ و نور کی دنیا سے روشناس کرا دیا۔ جاسم کو پتا چلا کہ شعیب چاچا معاشرے میں ایک کامیاب ایکسپورٹر کی حیثیت سے عزت کی زندگی گزار رہا ہے لیکن درپردہ وہ ڈرگز، ناجائز اسلحہ، انسانی اعضا کی فروخت اور نو عمر لڑکیوں کے اغوا جیسے مذموم کاموں میں ملوث ہے۔ اس مکروہ کاروبار میں بعض بااثر افراد اس کے ساتھ ہیں اور اسے بین الاقوامی کارٹلز کا تعاون بھی حاصل ہے۔ دونوں دوستوں نے مضبوط منصوبہ بندی سے شعیب چاچا کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔ دوسری سمت جاسم کا شوبز کا کام بھی جاری تھا اور اسے چند روز کے بعد ایک سیریل کی شوٹ کے لیے استنبول جانا تھا اس سے پہلے اس نے راجو کو بھی حسرت ناک موت سے ہمکنار کیا تھا۔ یہ سنسنی خیز ہنگامے چل رہے تھے کہ کسی ڈیوڈ نامی شخص نے بڑے پُراسرار انداز میں جاسم سے رابطہ کیا اور اسے اپنے کسی ری ایلیٹی ٹی وی شو، بھاری معاوضے پر شرکت کی دعوت دی۔ یہ وہی وقت تھا جب جاسم اپنے یونٹ کے ساتھ استنبول جانے والا تھا۔ ڈیوڈ کا رویہ انتہائی پُراسرار اور خطرناک تھا کہ فوری طور پر یہی سمجھ میں آیا کہ کوئی مخالف پروڈیوسر ڈیوڈ بن کر جاسم کو اپنے ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے لیکن جلد ہی جاسم کو اندازہ ہو گیا کہ ڈیوڈ ایک انتہائی طاقتور اور بااختیار شخص ہے۔ ڈیوڈ نے ناجیہ کو اغوا کر کے جاسم کو اپنے ری ایلیٹی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے مجبور کر دیا۔ دونوں کی ملاقات استنبول میں طے ہو گئی۔ جاسم کا پروڈیوسر تمام حالات سے بہ خوبی آگاہ تھا۔ اس نے اپنے سیریل میں جاسم کا رول ایک دوسرے کردار حمیم کو دیا اور جاسم کو یونٹ کے ساتھ استنبول روانہ کر دیا۔ پروڈیوسر سرمد صدیقی ناجیہ کے باپ غفار داؤد کا دوست تھا اس لیے صدیقی کی نظر میں اپنے سیریل سے زیادہ ناجیہ کی زندگی اور اس کی محفوظ واپسی کی اہمیت تھی۔ ڈیوڈ نے جاسم کو ہدایت کی تھی کہ جب وہ استنبول میں ری ایلیٹی ٹی وی کے کنٹریکٹ پر دستخط کر دے گا تو اس کی دوست ناجیہ کو رہا کر دیا جائے گا۔ ڈیوڈ کا وہ ری ایلیٹی ٹی وی ایک میگا پروجیکٹ تھا جس کی تمام تر شوٹنگ پُراسرار سرزمین مصر میں ہونے والی تھی۔ ڈیوڈ کی ہدایت کے مطابق، جاسم کو استنبول پہنچ کر اس کے خاص آدمی بن عرفات سے ملاقات کرنا تھی۔ جاسم استنبول کے ایک معروف مقام گلاٹا برج کے نیچے بنے ہوئے زینان نامی ایک یونانی ریسٹورنٹ میں پہنچ گیا جہاں بن عرفات ماسٹر شیف کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ بن عرفات نے جاسم کے خون سے مذکورہ کنٹریکٹ پر دستخط کرا لیے اور وعدے کے مطابق، اسے ناجیہ کی رہائی کی خوش خبری سنا دی۔ جاسم نے فون پر ناجیہ سے بات کر کے اس امر کی تسلی کر لی کہ وہ بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ چکی ہے۔ اب وہ محفوظ سائڈ پر تھا لہٰذا اس نے ڈیوڈ کے پروجیکٹ میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ڈیوڈ نے بن عرفات کے توسط سے جاسم کو ڈناٹسیل کر کے ایک کروز شپ پر پہنچا دیا۔ جب جاسم کی آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے بحری جہاز پر پایا۔ بعدازاں ڈیوڈ نے ایک مرتبہ پھر جاسم سے پراسرار انداز میں سیلولر رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ کروز شپ استنبول سے مصر کی بندرگاہ، پورٹ سعید تک جائے گا۔ پھر اس کے آدمی جاسم کو پورٹ سعید سے بہ ذریعہ جیپ قاہرہ پہنچا دیں گے جہاں پر اس ری ایلیٹی ٹی وی کی افتتاحی تقریب کا انعقاد کیا جائے گا۔ ڈیوڈ نے ری ایلیٹی ٹی وی کی شوٹنگ سے پہلے ہی جاسم کے ساتھ شکار اور شکاری کا جو کھیل شروع کر دیا تھا، جاسم اسے انجوائے کرنے کے لیے ذہنی اور جسمانی طور پر پوری طرح تیار تھا۔ ڈیوڈ کی ہوشیاری کے سبب جاسم اس کا کھیل سمجھنے سے قاصر تھا۔ ڈیوڈ نے ہر ٹیم کو بریف کر دیا تھا۔ مصر کے حرم سے انہیں ایک صندوق حاصل کرنا تھا۔ جاسم کی مدد ایک جن زادی کر رہی تھی۔ کچھ ممبران زندگی کی بازی ہار چکے تھے اور باقی ہارنے والے تھے۔ جاسم کا رخ استنبول کی جانب تھا۔ دورانِ سفر انکشاف ہوتا ہے کہ ان کا جہاز ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ جاسم اس صورتِ حال سے نمٹنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے اپنی خفیہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ہائی جیکرز کو زیر کرتے ہوئے صورتِ حال کو اپنے قابو میں کر لیا تھا۔ ہائی جیکرز کا ٹارگٹ استنبول کے جسٹس طلال حسنی تھے۔ جن سے وہ اپنی مرضی کا فیصلہ لینا چاہتے تھے۔ استنبول میں جاسم کا جسٹس حسنی سے بہت گہرا تعلق بن گیا تھا۔ جاسم ان کے بیٹے کو بھی بازیاب کرا چکا تھا اور اپنے دشمنوں کو بھی ایسا سبق دیا تھا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھتے۔ سلور کوئین کی ہدایت پر ڈیوڈ کو اب جاسم کے خلاف حتمی کارروائی کرنی تھی کیونکہ جاسم ان لوگوں کے خلاف بہت کچھ کر چکا تھا۔ ڈیوڈ اور حواری اب جاسم کا تعاقب کرتے ہوئے جسٹس حسنی کے ولا تک پہنچ چکے تھے۔ جاسم نے پہلے ہی سے تمام منصوبہ ترتیب دیا اور ڈیوڈ کے کارندوں سے معرکہ آرائی کے بعد وہاں سے نکل جاتا ہے۔ ترکی سے نکل کے جاسم کی کارروائیاں جاری تھیں۔ اس نے اسرائیلی ٹیم کے ٹولے کو زبردست زک پہنچائی تھی۔ یہ سب ٹیلی پورٹیشن کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔ اشتار نے بھی ہر بُرے لمحے میں اس کی مدد کی۔ وہ ایخیل کے ساتھ شپ پر سوار تھا۔ اسرائیلی اس کوشش میں تھے کہ کسی بھی طرح جاسم کو اپنے قابو کر لیں۔ اس کے لیے وہ پُراسرار علوم کی ماہر براخا کو استعمال کر رہے تھے۔ اب تک جاسم اس کے ہر حملے کو ناکام بناتا آیا تھا۔ براخا اپنی حکمتِ عملی سے ایخیل اور جاسم کو کروز شپ پر لے آئی تھی۔ یہاں پہنچ کر براخا اپنے ارادے میں کامیاب ہو گئی۔ جاسم کے ساتھ خوب معرکہ ہوا اور ایخیل ماری گئی۔ یہ صدمہ جاسم کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے براخا اور اس کی ٹیم کو مار کے اپنا انتقام لے لیا۔ اب اس کی منزل مشرقِ وسطیٰ تھی۔ اسرائیل کو زک پہنچانا اس کا مشن تھا۔ فلسطینیوں کے لیے اس کی جان بھی حاضر تھی۔ ابو باقر اس کے مددگار تھے۔ بلوما کے والد اشکار کا انتقال ہو گیا تھا۔ جاسم کو اپنے مشن کے ساتھ بلوما کو بھی وقت دینا تھا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ایک منصوبہ انسان بناتا ہے اور ایک منصوبہ مالکِ کائنات نے ابتدائے آفرینش کے وقت عالمِ ارواح میں، ازل سے ابد تک پیدا ہونے والے انسانوں کے حوالے سے بنا رکھا ہے جسے خالق کا پروگرام یا انسان کا مقدر کہا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں منصوبے آفاقی ترازو میں ہم پلڑا ہو جائیں تو انسان کی کامیابی یقینی ٹھہرتی ہے۔ بصورتِ دیگر، ہوتا وہی ہے جو رب تعالیٰ کا منصوبہ ہوتا ہے اور مزے کی بات یہ کہ اللہ اپنے پروگرام کو انسان ہی کے توسط سے پایۂ تکمیل تک پہنچاتا ہے، چاہے انسان کو پسند ہو یا نہ ہو۔

اس وقت ہوٹل کانٹی نینٹل کے احاطے میں جاسم بھی کچھ اسی نوعیت کی صورتِ حال کا شکار تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پہلے ”ایریا۔ ففٹی ون“ کے ابتدائی حصے میں رکھے ہوئے ایک زنگ آلود اور تباہ حال کنٹینر کے اندر ایشار کی زبانی ٹوناف کی تخلیق اور صیہونیوں کے مذموم مقاصد کی کہانی سن تو لی تھی لیکن سچی بات یہ کہ اسے اس کہانی پر یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اسے کوئی سائی فائی (سائنس فکشن) اسٹوری ہی سمجھا تھا لیکن اس سائی فائی اسٹوری کا مرکزی کردار ”ٹوناف“ اس وقت نہ صرف جاسم کی نگاہ کے سامنے زندہ سلامت موجود تھا بلکہ وہ زندہ انسانوں کے مانند گاڑی سے نکل کر ہوٹل کانٹی نینٹل کے داخلی دروازے کی جانب بڑے اعتماد کے ساتھ پیش قدمی بھی کر رہا تھا۔

ٹوناف تیکنیکی اعتبار سے ایک ”ایلین“ تھا جسے زمین پر موجود ایک سائنسی لیبارٹری میں حیرت انگیز تجربے کے نتیجے میں تخلیق کیا گیا تھا۔ دیکھنے میں وہ عام ایلینز یعنی خلائی مخلوق سے بہت مختلف تھا۔ وہ انسان اور حیوان کی ملی جلی شباہت کا مالک تھا لیکن طاقت، ذہانت اور کارکردگی میں وہ انسان اور جانور سے کئی گنا زیادہ تھا۔ یہ تفصیلات ایشار کی فراہم کردہ تھیں۔ اس میں کس حد تک حقیقت تھی، اس کا پتا چلنے کا وقت آ گیا تھا۔

ٹوناف کو ”ڈراپ“ کرنے والی عظیم الجثہ گاڑی وہاں سے جا چکی تھی۔ مذکورہ کار کے اندر ڈرائیور کے علاوہ اور کتنے افراد موجود تھے، اس بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ایک تو وہ گاڑی جتنے فاصلے پر آ کر رکی تھی، وہاں سے اس کے اندر جھانکنا ممکن نہیں تھا۔ علاوہ ازیں اس کے شیشے بھی اندھے تھے یعنی وہ ٹنٹڈ گلاس والی کار تھی۔

”اس جانگلوس نے آدھی رات کے وقت سن گلاسز کیوں لگا رکھے ہیں؟“ ہیری نے ڈری سہمی آواز میں پوچھا۔ ”میں نے اس سے ملتا جلتا ایک ولن بروس لی کی کسی مووی میں دیکھا تھا۔ وہ ایک قدآور شخص تھا اور اس......“

”تم بروس لی کی مووی ”گیم آف ڈیتھ“ کی بات کر رہے ہو نا......“ جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”اس مووی میں کریم عبدالجبار نامی ایک آرٹسٹ نے ولن کا رول کیا تھا۔“

”ہاں، ہاں...... وہی......“ ہیری جلدی سے بولا۔ ”اس نے بھی ایسا ہی چشمہ پہن رکھا تھا۔“

”اس مووی کے اسکرپٹ کے مطابق کریم عبدالجبار کو آنکھوں کی ایک خطرناک بیماری تھی جس کی وجہ سے وہ ہر قسم کی روشنی سے بچنے کے لیے ہمہ وقت سن گلاسز کا استعمال کیا کرتا تھا۔“ جاسم نے کہا۔ ”لیکن میرے خیال میں ٹوناف نے نائٹ وژن گلاسز لگا رکھے ہیں جو اینٹی ڈارک آئی لینس کی طرح اسے اندھیرے میں دیکھنے میں مدد دیتے ہوں گے۔“

”تم ٹوناف کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتے ہو......؟“ ہیری نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

”وہ اس لیے کہ ٹوناف صیہونیوں کی تخلیق ہے اور میں اس قوم کے دماغ کا پھوڑا بن چکا ہوں لہٰذا مجھے ان کی سرگرمیوں کے حوالے سے اپ ڈیٹ رہنا پڑتا ہے۔“ جاسم نے معتدل انداز میں کہا۔ ”ٹوناف اور اس کے ”خالقوں“ پر ہم پھر کبھی تفصیلی گفتگو کریں گے۔ ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ کیا وہ گن تمہارے پاس ہی ہے جو میں نے دوپہر میں تمہیں دی تھی؟“

”ہاں، وہ میرے پاس ہے۔“

”کیا تم نے اس کا کلپ چیک کیا تھا؟“

”یس، باس!“ ہیری نے جواب دیا۔ ”کلپ میں تین بلٹ موجود ہیں۔“

”جب تک تمہاری جان پر نہ بن آئے تم گن استعمال نہیں کرو گے۔“

”بالکل، مجھے تمہاری یہ نصیحت اچھی طرح یاد ہے۔“

آج دوپہر میں ”مشن کیپ ملباطا“ پر روانہ ہونے سے پہلے جاسم نے وہ گن یہ کہہ کر ہیری کو دی تھی کہ اس کی موجودگی میں وہ خود کو پُراعتماد اور محفوظ محسوس کرے گا۔ مذکورہ گن صبح والے صحرائی معرکے میں مالِ غنیمت کے طور پر جاسم کے ہاتھ لگی تھی۔

”گاڑی کو لاک کرو اور میرے ساتھ آؤ......“ جاسم نے نیم تحکمانہ انداز میں کہا۔

”ٹوبان! کیا ہمارے ایکشن میں آنے کا وقت آن

Digest Novels .com

پہنچا ہے؟''

''میرے ساتھ رہو گے تو ایکشن سے جان چھڑانا مشکل ہو جائے گی ہیری!'' جاسم نے پہلی فلائٹ سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ ''آرام اور سکون تمہارے لیے قصے کہانیوں کی صورت اختیار کرلیں گے......''

''اتنا تو بتادو کہ ٹوناف یہاں کیا کرنے آیا ہے؟'' ہیری نے گاڑی لاک کرنے کے بعد جاسم کے ساتھ چلتے ہوئے استفسار کیا۔

''مجھے اور میرے دوست بصارت امین کو قتل کرنے!'' جاسم نے بے دھڑک جواب دیا۔

''اوہ......'' ہیری ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر سرسری انداز میں پوچھا۔ ''ثوبان! کیا تمہیں ڈر محسوس نہیں ہو رہا؟''

''بالکل نہیں!'' جاسم نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ ''میں نے جب سے آنکھ کھولی ہے، موت کو اپنا ہم رکاب پایا ہے۔ میں ... کمسنی سے ذرا سا بھی خوف زدہ نہیں ہوں۔ میں نے اسے اپنی زندگی کا لازمی جزو تسلیم کر لیا ہے۔ البتہ......'' وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''اگر تمہیں ڈر لگ رہا ہے تو میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ تم چاہو تو واپس جا سکتے ہو۔ میں تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گا۔''

''ثوبان!'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔ ''کشتیاں جلانے اور سر سے کفن باندھ لینے کے بعد پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا جاتا۔ جب تم میرے ساتھ ہو تو پھر ڈر کیسا۔ یہودی ہم دونوں کے ایک جیسے دشمن ہیں اس لیے ہم مل کر ٹوناف کا مقابلہ کریں گے......نتائج کی پروا کیے بغیر!''

''گڈ......'' جاسم نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ''اپنی رفتار کو ذرا بڑھاؤ ہیری۔ تم کو ٹوناف سے دو قدم آگے رہنا ہے اور مجھے اس سے دو قدم پیچھے۔''

''تمہارے ذہن میں کیا چل رہا ہے......؟''

''واک تھرو گیٹ میں سے گزرنے سے پہلے تم اپنی کسی حرکت سے ٹوناف کو غصہ دلاؤ گے!'' جاسم نے توانا لہجے میں کہا۔ ''وہ فوراً اشتعال میں آجائے گا اور جنگلی انداز میں تم پر حملہ آور ہوگا۔ تم خود کو بچاتے ہوئے اندر کی جانب دوڑ لگا دینا۔ ٹوناف سکیورٹی کی پروا کیے بغیر تمہارے پیچھے لپکے گا اور میں اس کے تعاقب میں موجود رہوں گا۔''

''ہوٹل کے اندر داخل ہونے کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا؟''

''تم زینے پھلانگتے ہوئے آنا فانا ہوٹل کے تھرڈ فلور پر پہنچو گے اور کمرا نمبر تین ہزار تین میں چلے جاؤ گے۔'' جاسم نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''تم وہاں پہلے بھی جا چکے ہو......''

''ہاں، مجھے یاد ہے۔'' ہیری نے کہا۔ ''اس کمرے میں تمہارا دوست بصارت امین ٹھہرا ہوا ہے۔ میں نے تمہارے ایما پر مریا کو اس کے پاس چھوڑا تھا لیکن......'' لمحاتی توقف کے بعد اس نے اُلجھن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

''ٹوناف تو بصارت امین کی جان لینے اس ہوٹل میں آیا ہے پھر میں اس کمرے میں محفوظ کیسے رہوں گا؟''

''ہیری! ایک بات ذہن میں بٹھالو کہ بصارت امین کو ہماری مدد کی ضرورت نہیں ہے۔'' جاسم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''وہ ٹوناف سے نمٹنے میں ہماری مدد کرنے والا ہے۔ صرف ایک ٹوناف ہی نہیں، اس ہوٹل کے ایک میٹنگ روم میں ہمارے پانچ دشمن کسی خطرناک کھیل کی منصوبہ بندی میں مصروف ہیں۔ علاوہ ازیں مجھے اور بصارت امین کو چھاپنے کے لیے اس وقت موساد کے پانچ تربیت یافتہ سفاک ایجنٹ بھی ہوٹل کے اندرونی اور بیرونی ماحول پر عقابی نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔''

''یہ سب کچھ کسی اسپائی مووی کی طرح لگ رہا ہے۔'' ہیری نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے بالکل یقین نہیں آرہا ثوبان!''

''لیکن یہ کوئی جیمس بانڈ ڈبل او سیون کی مووی ہے اور نہ ہی ٹام کروز کا مشن امپاسبل۔ حقیقی زندگی میں یہ ضروری نہیں کہ ہر بار جیت ہیرو ہی کے حصے میں آئے۔ یہاں کے ولن، ہیرو کو صحیح معنوں میں ٹف ٹائم دیتے ہیں۔'' جاسم نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا پھر اچانک پوچھ لیا۔ ''ہیری، تمہاری فیملی میں اور کون کون ہے؟''

''کوئی نہیں!'' اس نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''کوشش کر رہا ہوں کہ مریا سے شادی کر کے اپنی فیملی کی شروعات کروں۔''

''اللہ مریا کے حال پر رحم فرمائے......'' جاسم نے کہا۔

''ثوبان! اس کا کیا مطلب ہوا؟'' ہیری نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

''اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ ہے کہ ہم واک تھرو

گیٹ کے نزدیک پہنچ رہے ہیں۔'' جاسم نے اس کے سوال کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''اب تمہیں فوراً اپنی پوزیشن سنبھال لینا چاہیے۔''

''اوکے باس!'' ہیری نے مضبوط لہجے میں کہا۔

آج دوپہر سے اب تک ہیری نے جاسم کو اِن ڈور اور آؤٹ ڈور محاذ پر جس طرح ''معروفِ عمل'' دیکھا تھا، اس کی اس بے مثال کارکردگی نے اسے جاسم کا فین بنا دیا تھا۔ اس نے جاسم کو اپنا گرو مان لیا تھا اسی لیے وہ اسے ''باس'' کہہ کر پکارنے لگا تھا۔ جاسم نے اس طرزِ تخاطب پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ بھی اس مختصر سی مدت میں ہیری کو دل سے پسند کرنے لگا تھا۔

جاسم کی ہدایت کے مطابق، ہیری، تیزی سے آگے بڑھا اور ٹوناف سے پہلے وہ واک تھرو گیٹ کے پہلو میں پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ہی وہ میکانکی انداز میں پلٹا اور ایک انتہائی بے ہودہ حرکت کر ڈالی۔

ہیری اور ٹوناف کے درمیان بہ مشکل پانچ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ ہیری کے یکا یک رک جانے پر ٹوناف کے پاؤں کو بھی بریک لگ گئے تھے۔ ہیری نے اپنے داہنے ہاتھ کی انگلیوں کو مٹھی کی شکل دی پھر ان میں سے درمیانی انگلی کو کھڑا کرنے کے بعد اپنی مٹھی کو ایک پنچ مارنے والے انداز میں ایک جھٹکے سے اوپر اٹھا دیا۔

ہیری کی یہ عامیانہ حرکت کسی بے زبان گالی سے کم نہیں تھی اور یہ وقت کی عین ضرورت بھی تھی۔ وہ غضب ناک انداز میں ہیری کی جانب بڑھا اور اس پر ایک خطرناک وار کیا لیکن ہیری اسے بھڑکانے کے فوراً بعد واک تھرو گیٹ کے پہلو سے ہوٹل کے اندرونی حصے کی جانب دوڑ لگا چکا تھا۔ واک تھرو گیٹ کے اندر سے گزرنا خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ اس نے اپنے لباس میں ایک گن چھپا رکھی تھی۔

ٹوناف کی طاقت کا پہلا مظاہرہ جاسم کے لیے حیران کن تھا۔ ٹوناف نے ہیری کو مارنے کے لیے اپنا جو ہاتھ اٹھایا تھا، وہ کسی وزنی ہتھوڑے کے مانند جا کر واک تھرو گیٹ کے فریم پر لگا۔ وہ سیکیورٹی ڈور اس نوعیت کے طوفانی تھپڑ کھانے کا عادی نہیں تھا چنانچہ ٹوناف کا مُکا کھا کر وہ، کسی جڑ سے اکھڑے ہوئے درخت کے مانند ایک جانب رکوع کی حالت میں جھک گیا۔ اس ہنگامی صورتِ حال نے ہوٹل کے گارڈز کو ہائی الرٹ کر دیا۔ وہ ٹوناف کو پکڑنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑ پڑے اور ٹوناف، ہیری کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے کسی بے چین روح کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔

اس افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جاسم بھی ہوٹل کے اندر داخل ہوگیا۔ احتیاطاً اس نے اپنی گردن کو ایسے زاویے پر جھکا لیا تھا کہ سیکیورٹی کیمراز اس کی صورت کو رجسٹر نہ کرسکیں۔ وہ بہ آسانی ہوٹل کے ریسیپشن پر پہنچ گیا۔

چند لمحے پہلے واک تھرو گیٹ پر جو ناخوشگوار واقعہ پیش آیا تھا اس نے ہوٹل کی سیکیورٹی اور دیگر عملے کو حواس باختہ کر دیا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ فوری طور پر کیا جائے۔

''کمرا نمبر تھری ڈبل زیرو تھری کنیکٹ کر دیں!'' جاسم نے ریسیپشن پر موجود، ڈری سہمی حسینہ سے درخواست کی۔

''ریسیپشنسٹ نے اپنے سامنے رکھے لیپ ٹاپ پر چیک کرنے کے بعد جواب دیا۔ ''سر! آپ کا بتایا ہوا روم اس وقت خالی ہے۔''

جاسم کے ذہن کو ہلکی قوت کا ایک جھٹکا لگا۔ ''مگر وہاں تو میرے ایک دوست مسٹر بصارت امین ٹھہرے ہوئے تھے......'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں انہی سے ملنا آیا ہوں۔ انہوں نے مجھے گیارہ بجے کا وقت دیا تھا۔''

''مسٹر بصارت امین چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔'' ریسیپشنسٹ نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔ ''آئی ایم سوری سر......''

''انہوں نے کتنے بجے چیک آؤٹ کیا ہے؟'' جاسم نے پوچھا۔

''ایک گھنٹا پہلے۔'' ریسیپشنسٹ نے بتایا۔ ''لگ بھگ دس بجے سر!''

جاسم سے بات کرتے ہوئے ریسیپشنسٹ مضطرب نظر سے اِدھر اُدھر بھی دیکھ رہی تھی۔ وہاں پیدا ہونے والی ابتری نے ہر کسی کو پریشان کر دیا تھا۔ ریسیپشنسٹ کے دوٹوک جواب کے بعد جاسم کے لیے مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ سو، وہ یہ سوچتے ہوئے ایک طرف بڑھ گیا۔

''راشد ظاہری نے اپنے دوسرے خط میں، ہوٹل کانٹی نینٹل کے میٹنگ روم میں، پانچ یہودیوں کی فلسطینیوں کے خلاف ہونے والی میٹنگ کا ذکر کیا تھا اور اس سے اگلے یعنی تیسرے خط میں اس نے جاسم کو بتایا تھا کہ وہ بااثر

Digest Novels .com

امریکی نیل ہار پر کمرا نمبر تین ہزار سات میں قیام پذیر ہے اور اسی کی قیادت میں رات گیارہ بجے اس میٹنگ روم میں غزہ اور ویسٹ بینک میں بسنے والے فلسطینیوں کی نسل کشی کی بھیانک منصوبہ بندی ہونے والی تھی۔ اسی خط میں ظاہری نے موساد کے پانچ ایجنٹس کی وہاں موجودگی کا ذکر بھی کیا تھا اور آخر میں ایک معنی خیز سوالیہ جملہ بھی تحریر کیا تھا۔ ''ثوبان! تم کیا کہتے ہو...... کیا یہ بدبخت موساد والے کسی ایسے شخص کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اس وقت ہوٹل کے اندر موجود ہی نہیں؟''

اس وقت جاسم کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ ہوٹل کے اندر موجود نہ ہونے سے ظاہری کی کیا مراد تھی مگر اب وہ جان چکا تھا کہ ہوٹل کے ریکارڈ کے مطابق ظاہری ایک گھنٹا پہلے وہاں سے رخصت ہو گیا تھا۔

''تو کیا مجھے اکیلے ہی اس مشن کو انجام دینا ہے؟'' جاسم نے اپنے آپ سے سوال کیا ''اور ہیری کا کیا جسے میں نے ظاہری کے پاس کمرا نمبر تین ہزار تین میں بھیجا ہے اور...... وہ عفریت ٹوناف بھی اس کے تعاقب میں ہے......''

اس سوچ نے جاسم کو حد درجہ متفکر کر دیا۔ بے ساختہ اس کے قدم زینے کی جانب بڑھ گئے۔ وہ بالائی منازل تک پہنچانے والے زینے سے چند گز کے فاصلے پر تھا کہ فرسٹ فلور پر فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ یہ کوئی اکا دکا گولی چلنے کا معاملہ نہیں تھا بلکہ مسلسل گولی باری ہو رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر وہ فرسٹ فلور کے متاثرہ حصے کی طرف دوڑ گیا۔

فرسٹ فلور پر ہر سمت سرخ رنگ کی حکمرانی تھی۔ کوئی ریسٹورنٹ ہو، کیفے ٹیریا ہو یا پھر کافی شاپ، دروازے، کھڑکیاں، دیواریں، چھت اور فرنیچر سب پر سرخ رنگ غالب تھا۔ دروازوں اور دیواروں کو خوب صورت منقش ٹائلز سے سجایا گیا تھا۔ یہ آرائش و زیبائش خالصتاً قدیم اور روایتی عربی طرز پر کی گئی تھی۔ دروازوں پر لگی ٹائلز قیمتی لکڑی سے تیار کی گئی تھیں اور انہیں شاید ٹائلز کہنا مناسب نہیں تھا۔ وہ دراصل فن چوب کاری کا اعلیٰ نمونہ تھا۔

جلد ہی جاسم نے فائرنگ کے ماخذ و مخرج کا پتا لگا لیا۔ وہ بھیانک آواز ایک میٹنگ روم کے اندر سے ابھر رہی تھی۔ مذکورہ میٹنگ روم، کانفرنس ہال کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ فوراً سے پیشتر وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی میٹنگ روم تھا جہاں امریکا سے تعلق رکھنے والا ایک بااثر اور طاقتور شخص چار یہودیوں کے ساتھ ایک خوں ریز کھیل کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ نیل ہار پر خصوصاً اسی مقصد کے لیے امریکا سے یہاں پہنچا تھا۔

''اتنی محفوظ اور اہم میٹنگ کے دوران میں ایسی شدید فائرنگ......'' جاسم نے اُلجھن بھرے انداز میں سوچا۔ ''یہ قرین عقل نہیں لگتا۔ وہ پانچوں ایک دوسرے کو تو گولیوں کا نشانہ نہیں بنا سکتے۔ تو کیا کوئی چھٹا بھی اس میٹنگ روم کے اندر موجود ہے جو ان پانچوں یہودیوں کا دشمن ہے......''

اس خیال کے ساتھ ہی جاسم کے ذہن میں راشد ظاہری کا چہرہ روشن ہو گیا۔ اس نے دو تین بار بڑے کھلے الفاظ میں کہا تھا۔ ''آج رات ہوٹل کانٹی نینٹل میں بہت زیادہ مزہ آنے والا ہے۔''

جاسم نے راشد ظاہری اور اس کے خونیں مزے کو اس میٹنگ روم تک محدود رہنے دیا اور تھرڈ فلور کی جانب دوڑ لگا دی جہاں ہیری کو اس کی اشد ضرورت تھی۔

''تو تم آ گئے......''

ایک مانوس آواز جاسم کی سماعت سے ٹکرائی تو اس کے دوڑتے ہوئے قدم یکایک رک گئے۔ ابھی وہ اس زینے تک پہنچ نہیں پایا تھا جو اسے کانٹی نینٹل کے تھرڈ فلور تک لے جا سکتا تھا، اس نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا۔

فائرنگ زدہ میٹنگ روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے ظاہری باہر نکل رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آٹومیٹک گن تھی۔ جاسم سے نگاہ ملی تو ظاہری نے وہ گن اس کی جانب ا[illegible]ل دی۔

فوراً سے پیشتر جاسم نے اس خطرناک گن کو کیچ کر لیا۔ راشد ظاہری معنی خیز انداز میں، زیرلب مسکرایا اور چپ چاپ ایک جانب بڑھ گیا۔

جاسم نے دیکھا، ہوٹل کی سیکیورٹی سے تعلق رکھنے والے دو مستعد اور مسلح افراد ہنگامی حالت میں متاثرہ میٹنگ روم کی سمت لپکے تھے۔ وہ ظاہری کے پاس سے گزرے تو ان میں سے کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ظاہری ان کی نگاہ کے فریم میں نہیں آیا تھا۔

وہ دونوں مسلح گارڈز اگرچہ راشد ظاہری کو دیکھ نہیں پائے تھے۔ وہ اپنی کسی بھی حیرت انگیز اور فوق البشر صلاحیت کے طفیل ان کے لیے نادیدہ یا غیر مرئی ہو گیا تھا لیکن میٹنگ روم کے اندر کا خوں چکاں نظارہ ان کے ہوش اُڑانے [illegible]

ہو[illegible]ل کے بالائی حصے سے آنے والی توڑ پھوڑ کی دہشت ناک آوازوں نے جاسم کے قدموں میں بجلی سی بھر [illegible]

دی۔ وہ دو دو، تین تین زینے پھلانگتے ہوئے تھرڈ فلور پر پہنچ گیا اور پھر وہاں کے خونیں مناظر نے اسے گہری تشویش میں مبتلا کر دیا۔

روم نمبر تین ہزار تین کا داخلی دروازہ اپنی تباہی اور بربادی کی خاموش داستان سنا رہا تھا اور چوکھٹ سے اُکھڑے ہوئے اسی ٹوٹے پھوٹے دروازے کے نزدیک دو سیکیورٹی گارڈز انتہائی غیظی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ وہ زندہ تھے یا اگلے جہان جانے والی فلائٹ پر سوار ہو چکے تھے، اس بارے میں سرِدست وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ ایک بات تو پکی تھی کہ ان دونوں گارڈز کو اس عبرت ناک انجام تک پہنچانے کا ذمّے دار صرف اور صرف ٹوناف ہی تھا۔

جاسم نے ہیری کو بصارت امین (راشد ظاہری) کے پاس پہنچنے کی تاکید کی تھی اور ظاہری اسی کمرے میں قیام پذیر تھا جس کے سامنے اس وقت جاسم کھڑا تھا۔ ظاہری کو جاسم نے صحیح سلامت ہوٹل کے فرسٹ فلور پر دیکھ لیا تھا مگر ہیری ان لمحات میں کن ہولناک کیفیات سے گزر رہا ہوگا، اس کا درست اندازہ قائم کرنے کے لیے روم نمبر تھری ڈبل زیرو تھری کے اندر جانا ضروری تھا۔ سو، جاسم گن بہ دست نہایت ہی احتیاط کے ساتھ، کسی بیوہ کے اُجڑے ہوئے سہاگ کے مانند دکھائی دینے والے اس دروازے سے گزر گیا۔

ہوٹل کانٹی نینٹل کے ریکارڈ کے مطابق، راشد ظاہری کم و بیش سوا گھنٹا پہلے چیک آؤٹ کر چکا تھا لیکن جاسم آنکھوں دیکھی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ اس نے ابھی چند لمحے پہلے ظاہری کو اس میٹنگ روم سے برآمد ہوتے دیکھا تھا جہاں پانچ خارش زدہ یہودی فلسطین کے مسلمانوں، خصوصاً غزہ اور ویسٹ بینک میں بسنے والے فلسطینی سرفروش مجاہدوں کی نسل کشی کی منصوبہ بندی میں مصروف تھے لیکن ظاہری نے ان سب کی ”شافی“ نس بند کر دی...

کمرے کے اندر روشنی تھی مگر وہاں چھائی پُراسرار خاموشی یہی بتا رہی تھی کہ اس روم میں کوئی ... ور ... نہیں ہے۔ اس تاثر نے جاسم کو تشویش ... ڈال دیا۔ اس کی معلومات کے مطابق، مذکورہ کمرے میں آج صبح راشد ظاہری چیک اِن ہوا تھا۔ اگر ریسپشنسٹ کی بات پر بھروسا کر بھی لیا جائے کہ ظاہری نے دس بجے رات چیک آؤٹ کیا تھا تو کم از کم ہیری کو تو اِدھر ہی ہونا چاہیے تھا۔ جاسم نے اپنی آنکھوں سے ظاہری کو فرسٹ فلور والے میٹنگ روم سے نکلتے دیکھ لیا تھا لہٰذا وہ اس کے لیے فکرمند نہیں تھا۔ جاسم کی پریشانی کا اصل سبب ہیری تھا۔ اسی بے یقینی کی کیفیت میں جاسم کے ذہن میں ایک خدشے نے سر اٹھایا۔ ”کہیں ٹوناف نے ہیری کو بھی ٹھکانے تو نہیں لگا دیا تھا؟“

وہ محتاط قدموں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ ظاہری کی دی ہوئی گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ واش روم کے نزدیک پہنچا تو ایک مانوس آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ نہایت ہی سست رفتار سے، پانی گرنے کی مخصوص آواز تھی۔ شاید واش روم کا کوئی نل آدھا ادھورا کھلا رہ گیا تھا لیکن اچنبھے میں ڈال دینے والی بات یہ تھی کہ جب جاسم نے اسی کمرے میں قدم رکھا تھا تو اسے یہ آواز سنائی نہیں دی تھی۔ اس سے فوری طور پر یہی سمجھ میں آ رہا تھا کہ کوئی پہلے سے واش روم کے اندر موجود تھا اور اس نے اپنی ضرورت کے تحت وہ نل ابھی کھولا تھا۔

”اندر کون ہو سکتا ہے......“ ایک خیال سوال بن کر بجلی کے کوندے کے مانند اس کے ذہن میں چمکا۔ ”وہ ظاہری تو ہو نہیں سکتا......“ اس کے ذہن نے ترنت جواب دیا۔ ”پھر کون......؟“ ذہن سوال کرنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ ”ہیری یا ٹوناف......؟“

اس مرتبہ کچھ ایسا ہوا کہ جاسم کا ذہن اپنی ساری چوکڑی اور چوکسی بھول گیا۔ قبل اس کے کہ ذہن ہیری یا ٹوناف میں سے کسی ایک کے نام کا انتخاب کرتا، جاسم کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کسی چیختے اور چنگھاڑتے ہوئے ”ریلوے انجن“ نے عقب سے اسے ٹکر مار دی ہو......

اس متوقع ریلوے انجن اور جاسم کی پیٹھ کے درمیان ہونے والا وہ تصادم اتنا قیامت خیز اور خوف ناک تھا کہ وہ توپ میں سے نکلے ہوئے کسی گولے کے مانند، ہشتی ڈگری پر پرواز کرتے ہوئے سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ یہ ستم بالائے ستم ایسی صورتِ حال تھی۔ دوسرا تصادم پہلے سے کچھ کم تھا۔ دیوار کو ”بوسہ“ دینے کے بعد جاسم کا بدن کمرے کے فرش پر ”چاروں خانے چت“ والی پوزیشن میں گرا اور اسی وقت جاسم کی نگاہ اس ظلم پرور اور ستم ایجاد پر پڑی جس نے اسے بقول کسے...... زمین چاٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ کوئی ریلوے انجن یا کوئی بپھرا ہوا سانڈ نہیں بلکہ ٹوناف تھا۔ نر ریچھ اور عورت کے اختلاط سے جنم لینے والا ایک عجیب الخلقت جاندار جس سے آج پہلی بار جاسم کا سابقہ پڑا تھا۔

اس اندھادھند ڈبل ٹکراؤ کے نتیجے میں ظاہری کی دی ہوئی وہ آٹومیٹک گن جاسم کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کہاں جا پڑی تھی۔ اب وہ نہتا تھا اور سردست کسرہ بھی کیونکہ چاہے عارضی طور پر ہی سہی لیکن ٹوناف فتح کے مقام پر کھڑا تھا۔ زیروزبر کا یہ واہیات کھیل جاسم کے لیے قابلِ قبول نہیں تھا۔ سو، وہ اپنی جسمانی تکالیف کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے بیدار مغز اور جواں عزم کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

ٹوناف کسی وحشی درندے کی طرح اس پر حملہ آور ہوا۔ جاسم نے اس کے وار کو حوصلہ مندی سے روکا مگر ٹوناف کے ہاتھ پاؤں کسی ہائی اسپیڈ برقی مشین کے مانند کام کر رہے تھے۔ جاسم نے بہ صد کوشش اس کے تین بھرپور حملوں کو روکا۔ ٹوناف کی حرکات وسکنات میں تمیز کرنا ممکن نہیں تھا۔ جاسم کو کاؤنٹر اٹیک کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔ اگر وہ ٹوناف کے طوفانی حملوں کو روک پا رہا تھا تو یہ بھی اس کے لیے فوز الکبیر سے کم نہیں تھا۔

جاسم کو مجبوراً ڈیفنس موڈ پر آنا پڑ گیا تھا۔ وہ ٹوناف نامی اس پاگل ریچھ کے مدِمقابل ٹکا ہوا تھا تو یہ بھی بڑی بات تھی۔ اسی شاطر بچاؤ کے دوران میں جاسم کو ٹوناف پر حملہ کرنے کا ایک موقع مل گیا۔ اس نے ٹوناف کے کندھے اور سر کے درمیان گیپ دیکھ کر ایک فولادی راؤنڈ ہاؤس کک اس کی گردن پر جڑ دی۔

جاسم کے اس کارگر وار کے نتیجے میں ٹوناف ایک لمحے کے لیے ڈگمگایا لیکن اگلے ہی لمحے وہ سنبھل گیا اور کسی بدمست ہاتھی کے مانند وہ جاسم پر چڑھ دوڑا۔ ٹوناف کی کوشش تھی کہ وہ جاسم کو اپنے پاؤں تلے روند کر اس کی چٹنی بنا ڈالے۔ وہ ارنے بھینسے کی طرح وار پر وار کیے جا رہا تھا۔ جاسم نے اس کی گردن پر جو کک رسید کی تھی، ٹوناف اسے فراموش کرنے کو آمادہ نہیں تھا۔ ان لمحات میں وہ ایک غصیل گینڈا بن گیا تھا، اپنے شکار کو ٹھنڈا کیے بغیر اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو سکتا تھا۔ ہیری نے تو اسے محض انگلی دکھائی تھی اور وہ زخمی سانپ کے مثل اس کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں چلا آیا تھا۔ ہیری کے مقابلے میں جاسم نے تو گویا اس کی گردن کو نشانہ بنا کر کوئی قابلِ تعزیر جرم کر ڈالا تھا چنانچہ وہ تادیب کا باب بند کر کے جاسم پر تابڑتوڑ تعزیزی حملے کیے جا رہا تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ جاسم کو اس بات کا عملی احساس ہوا کہ رب تعالیٰ نے واقعتاً ہر سوا سیر کے لیے ڈیڑھ سیر پیدا کر رکھا ہے۔ اگر دیانت داری سے کام لیا جائے تو فی الوقت حقیقت یہی تھی کہ جاسم کا اس پر کوئی بس نہیں چل رہا تھا۔ ٹوناف ہر لحاظ سے اس پر بھاری پڑ رہا تھا۔ جاسم کو دل سے تسلیم کرنا پڑا کہ ایشار نے ٹوناف کے حوالے سے اسے کوئی سانی فانی اسٹوری نہیں سنائی تھی۔ وہ بدبخت اپنی تمام تر حیوانی صلاحیتوں کے ساتھ ایک زندہ حقیقت تھا اور جاسم کو مردہ حقیقت بنانے کے لیے وہ کسی غفلت یا سستی سے کام نہیں [illegible] رہا تھا۔

اسی ''مارا ماری'' میں ایک موقع پر ٹوناف، جاسم نے اس قدر نزدیک آ گیا کہ جاسم نے اپنی دو انگلیوں سے وکٹری سائن بنا کر اس کی چشمہ بردار آنکھوں پر ایک دھانسو قسم کا وار کیا۔ اگر جاسم کے مدِمقابل کوئی عام انسان ہوتا تو اس مہلک حملے کے نتیجے میں اس کا اندھا ہو جانا لازم ٹھہرتا مگر ٹوناف کوئی عام انسان کیا، وہ تو سرے سے انسان تھا ہی نہیں۔ سو، جاسم کو اس جسارت کی بھاری قیمت چکانا پڑی اور اس کے حلق سے اذیت بھری آواز خارج ہوئی۔

جاسم کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس نے اپنی دو انگلیوں کو کسی سنگی دیوار کے اندر گھسانے کی احمقانہ کوشش کی ہو۔ تکلیف کی شدت نے اسے اپنا مضروب ہاتھ جھٹکنے پر مجبور کر دیا۔ جاسم کی اس لمحاتی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹوناف کسی جانی دشمن کے انداز میں آگے بڑھا اور اس نے ریچھ والا پھا ڈال کر جاسم کو اوپر اٹھایا اور پھر پوری قوت کے ساتھ اسے واش روم کے دروازے پر دے مارا۔

یہ وہی واش روم تھا جس کے اندر تھوڑی دیر پہلے جاسم نے پانی گرنے کی آواز سنی تھی۔ جاسم کسی لانچنگ پیڈ سے فائر کیے جانے والے کروز میزائل کے مانند جا کر سیدھا واش روم کے دروازے پر لگا اور مذکورہ دروازے کا حشرنشر کرنے کے بعد واش روم کے فرش پر، دور تک پھسلتا چلا گیا۔

اس دوران میں ٹوناف نے جاسم کو سوچنے کا اتنا موقع بھی نہیں دیا تھا کہ وہ خود کو ٹیلی پورٹ کر کے اس ناگہانی اُفتاد سے نجات حاصل کر پاتا یا شاید اس نے خود ہی اس آپشن پر جانا مناسب نہیں سمجھا تھا کیونکہ اس اقدام سے بزدلی اور پسپائی کی ناگوار بُو آتی تھی۔

مگر پھر پلک جھپکتے میں کمرا نمبر تین ہزار تین کے اندرونی حالات میں ایک ڈرامائی تبدیلی رونما ہوئی۔ قبل اس کے کہ جاسم خود کو سمیٹ کر اٹھنے کی کوشش کرتا، دو مسلح افراد دوڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ان دونوں کا تعلق ہوٹل کانٹی نینٹل کے سیکیورٹی اسٹاف سے تھا۔ انہوں نے کمرے

digest library.com

کے داخلی دروازے پر اپنے دو ساتھیوں کو بے ہوش پڑے دیکھا تو ان کا دماغ گھوم گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ ٹوناف کی ٹانگوں کو نشانہ بناتے ہوئے فائرنگ کرنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹوناف کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ نمودار ہوئی اور وہ ''دھڑام'' سے زمین بوس ہو گیا۔

''یہ تو اب اٹھنے کے قابل نہیں رہا......'' ایک گارڈ نے فاتحانہ انداز میں کہا۔

دوسرا الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ ''مگر وہ بدمعاش کہیں نظر نہیں آ رہا جس نے واک تھرو گیٹ کے پاس اس جنگلی کو غصہ دلایا تھا۔''

''کمانڈ اینڈ کنٹرول روم میں بیٹھے ہوئے آپریٹر نے بتایا ہے کہ وہ بندہ روم نمبر تھری ڈبل زیرو سیون کے اندر داخل ہوا تھا، پھر اسے کمرے سے باہر نکلتے نہیں دیکھا گیا۔'' پہلے نے کہا۔ ''لیکن ہوٹل کا بیرونی ماحول دکھانے والے سی سی ٹی وی کیمراز کے مطابق مذکورہ نامعلوم نوجوان ایک پیلی فیاٹ میں بیٹھ کر کہیں چلا گیا ہے۔''

اِدھر اس سیکیورٹی گارڈ کی بات ختم ہوئی، اُدھر ٹوناف گھائل درندے کی طرح غراتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر وہ آندھی اور طوفان کی رفتار سے ان سیکیورٹی گارڈز پر حملہ آور ہوا۔

جاسم کو اپنے پارٹنر ہیری کی خیریت سے آگاہی حاصل ہو گئی تھی اور راشد ظاہری کے لیے وہ فکرمند تھا ہی نہیں۔ سو، فوری طور پر ذہن میں آنے والی جیوگرافک لوکیشن کو اس نے زیرِ لب دہرایا، ٹوناف پر لعنت بھیجی اور آنکھیں بند کر کے کی نوٹ کا ٹریگر دبا دیا۔

''ج عتی ظوم لحظیم عن فوادر......''

☆☆☆

آج کا پورا دن ڈینئل کارمی کے لیے حد درجہ تھکا دینے والا گزرا تھا۔ اس کی عمر ستر سے متجاوز تھی اور صحت کو بھی تسلی بخش نہیں کہا جا سکتا تھا، تاہم ابلیسی معاملات میں اس کا دماغ خوب چلتا تھا۔ جب وہ کسی دجالی منصوبے پر گفتگو کر رہا ہوتا تھا تو اس کی آواز کسی نوجوان کی طرح کراری اور لہجہ دبنگ ہوتا تھا۔ ان لمحات میں کہیں سے بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ ستر کا ہندسہ عبور کر چکا ہے۔

تین، چار سال پہلے تک ڈینئل کارمی کو اتنا زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار اپنی تینتیس رکنی مجلسِ شوریٰ کا اجلاس بلایا کرتا تھا جس میں تازہ ترین امور پر بات چیت کرنے کے علاوہ مستقبل قریب کے حوالے سے اہم فیصلے بھی کیے جاتے تھے۔ نیچے سے اوپر تک کسی بھی خاص و عام میں اس کے فیصلوں کے خلاف جانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ ہیڈ آف اسٹیٹ وزیراعظم ہو یا پھر سپریم رینکنگ اینڈ اسپریچوئل اتھارٹی فار جوڈاازم کے سفارڈی اور اس کے نازی ربی صاحبان، سب کو کارمی کی جاری کردہ ہدایات پر عمل کرنا پڑتا تھا کیونکہ وہ کارمی کو اپنا گرو اور دجال کو سچا نمائندہ تسلیم کرتے تھے۔

لیکن...... پہلے جاسم اور پھر ثوبان (جاسم) نے اس کی زندگی میں ایک بھونچال کھڑا کر دیا تھا۔ اب اسے آئے دن، مختلف نوعیت کے اُلجھیڑوں اور بکھیڑوں کو نمٹانے کے لیے حد سے زیادہ مصروف رہنا پڑتا تھا۔ ریٹائرڈ لائف میں انسان کے پاس کوئی نہ کوئی مصروفیت تو ہونا ہی چاہیے۔ اس سے ہاتھ پاؤں اور دوسرے جسمانی نظام اپنا کام بہ طریق احسن سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ اس طبی اصول کے تحت، جاسم نے اسے گویا ایک ''اولڈ ایج ٹانک'' فراہم کر دیا تھا۔

اس وقت یروشلم میں رات کا لگ بھگ ایک بج رہا تھا یعنی نو اکتوبر کی تاریخ لگ چکی تھی اور یہ سوموار کا آغاز تھا۔ ڈینئل کارمی سونے کے لیے اپنے آرام دہ بیڈ پر لیٹ چکا تھا اور اس نے اپنے سیل فون کو چارجنگ پر لگانے کے بعد آف کر دیا تھا۔ وہ نیند کی وادی میں قدم رکھنے ہی والا تھا کہ دروازے پر ہلکی دستک ہوئی۔

اس کے کمرائے خاص سے ملحقہ چھوٹے کمرے میں کارمی کا دستِ راست اور خادمِ خاص یافو رہتا تھا۔ یافو کی عمر ساٹھ کے قریب قریب تھی۔ وہ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا باقاعدہ ممبر نہیں تھا لیکن مجلسِ مذکور کے تمام ارکان یافو کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور اسے ڈینئل کارمی کا ہم راز اور یارِ غار سمجھتے تھے۔

دستک کے جواب میں ڈینئل کارمی اٹھ کر بیٹھ گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یافو! آ جاؤ۔ میں جاگ رہا ہوں......''

اگلے ہی لمحے یافو کمرے کے اندر تھا۔ اس کے ہاتھ میں سیل فون نظر آ رہا تھا۔ کارمی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بہ صد احترام بولا۔

''میکنو بادا (مینیجر) سے دانیال کی کال ہے۔ آپ کا نمبر آف آ رہا تھا اس لیے دانیال نے مجھ سے رابطہ کیا ہے۔ وہاں کے معاملات خراب ہو گئے ہیں اسی لیے وہ ہنگامی بنیادوں پر فوراً آپ سے بات کرنا چاہتا ہے......''

''ڈینئل!'' کو عربی میں ''دانیال'' کہا جاتا ہے لیکن

Digest Novels .com

چونکہ دجال لعنتی کے فرنٹ مین کارمی کے لیے "ڈینئل" کا لفظ پہلے سے استعمال کیا جا رہا ہے اس لیے "میٹنجز آپریشن" کو لیڈ کرنے والے شخص کا ذکر "دانیال" کے نام سے ہو رہا ہے تاکہ ان دونوں بدتمیز افراد میں تمیز کرنا آسان ہو جائے۔

اس دوران میں ڈینئل کارمی بستر چھوڑ کر ایک آرام دہ کرسی پر براجمان ہو چکا تھا۔ اس نے یافو کے ہاتھ سے سیل فون لے لیا اور اُسے وہیں بیٹھنے کا اشارہ کرنے کے بعد دانیال سے کہا۔

"میں سن رہا ہوں۔ کم سے کم وقت اور الفاظ کا استعمال کر کے مجھے بتاؤ، اب کون سی ایمرجنسی آن پڑی ہے......؟"

آئندہ پانچ منٹ میں دانیال نے موثر اور جامع الفاظ میں، ڈینئل کارمی کو، تھوڑی دیر پہلے ہیتھنجز کے کانٹی نینٹل ہوٹل میں پیش آنے والے خونریز اور ہنگامہ خیز واقعے سے آگاہ کر دیا۔ یہ گویا...... ایک ٹیم لیڈر کی حیثیت سے دانیال کا اعترافِ شکست تھا۔

"آج صبح تمہاری رپورٹ کے مطابق، برلن سے آنے والے راشد ظاہری اور پتا نہیں، کہاں سے ہم پر مصیبت بن کر نازل ہونے والے ثوبان نے تمہاری ٹیم کے چار افراد کو ہلاک اور ایک کو شدید زخمی کر دیا تھا۔" ڈینئل کارمی نے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ "صبح تم نے مجھے یقین دلایا تھا کہ آج کی تاریخ میں ظاہری اور ثوبان کا قصہ تمام کرنے کے بعد وہ پُراسرار چابی حاصل کر لی جائے گی اور اب تم اپنی ناکامی کی ایک نئی کہانی کے ساتھ میری نیند خراب کرنے آ گئے ہو۔ میں اس سے کیا سمجھوں۔ کیا یہ ذمے داری میں کسی اور کو سونپ دوں......؟"

"ہد مالتو! میں اپنی کمزور کارکردگی کا اعتراف کرتا ہوں۔" دانیال نے ندامت بھرے لہجے میں کہا۔ "لیکن یہاں پر جو کچھ ہوا، وہ سمجھ سے بالاتر ہے۔ ایسا لگتا ہے، ان دونوں بدمعاشوں کو ہمارے منصوبے کا علم تھا۔"

"یہ تو اور بھی تشویشناک بلکہ شرمناک بات ہے دانیال کہ تمہاری منصوبہ بندی اُن پر کھل گئی......" ڈینئل کارمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "جس وقت وہ دونوں بدبخت اس ہلاکت خیز کارروائی میں مصروف تھے تو موساد کے ایجنٹس کیا کر رہے تھے۔ تم نے بتایا ہے کہ وہ پانچوں بھی کتے بلیوں کی طرح مارے گئے ہیں۔ ان کی کڑی تربیت اور پیشہ ورانہ مہارت کہاں دھری جانے چلی گئی تھی......؟"

دانیال کی حالیہ رپورٹ نے ڈینئل کارمی کی طبیعت مکدّر کر دی تھی۔ دانیال، کارمی سے کہنا چاہتا تھا کہ محترم آپ میری بات سمجھ نہیں رہے ہیں لیکن ایسا کہنے کی اس میں ہمت تھی اور نہ ہی اس کی زبان میں سکت۔ سو، اس نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"میٹوبادا! شاید میں یہاں کی صورتِ حال ٹھیک سے آپ کو بتا نہیں پایا ہوں۔ دراصل......" وہ لمحے بھر کے لیے رکا پھر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "کانٹی نینٹل ہوٹل کے اندر ہونے والے ہمارے بندوں اور ہوٹل کے سیکورٹی گارڈز کی ہلاکتوں میں ثوبان کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ بے چارہ تو خود ٹوناف کے ہاتھوں اس بُری طرح پٹا ہے کہ کئی روز تک بستر پر پڑا رہے گا۔ میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ ہوٹل کے سیکورٹی گارڈز پر ٹوناف نے ہاتھ صاف کیا ہے کیونکہ وہ اسے روکنے اور پکڑنے کی سعی کر رہے تھے اور جہاں تک امریکا سے آئے ہوئے ہمارے مہمان نیل بار پر، اسرائیل سے آئے ہوئے چار معزز اکابرین اور موساد کے پانچ ایجنٹس کی اموات کا تعلق ہے تو......" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

"یہ اکیلے راشد ظاہری کا کام ہے......"

"ایک منٹ......!" ڈینئل کارمی نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "تمہارے بیان کے مطابق، راشد ظاہری رات دس بجے ہوٹل سے چیک آؤٹ ہو گیا تھا اور یہ ناخوش گوار واقعات کم و بیش گیارہ بجے وقوع پذیر ہوئے ہیں، پھر ان میں ظاہری کا ہاتھ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میٹوبادا! راشد ظاہری کے چیک آؤٹ کی کہانی ہوٹل کے ریکارڈ کی زبانی ہے۔" دانیال نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "اسے نہ تو ہم نے ہوٹل سے باہر نکلتے دیکھا ہے اور نہ ہی سی سی ٹی وی کیمراز میں ایسی کوئی ریکارڈنگ موجود ہے۔ میں نے خود چیک کر لیا ہے۔"

"اور ثوبان کے بارے میں کیا کہتے ہو......؟"

"اس کی انٹری اور ایگزٹ بھی کہیں نہیں مل رہا۔" دانیال نے جواب دیا۔ "البتہ، ہوٹل کے مختلف اندرونی حصوں میں اس کی موجودگی کے آثار ملے ہیں۔ ٹوناف اور ثوبان کے درمیان ہونے والا معرکہ بھی ایک ٹھوس حقیقت ہے۔ حاصل معلومات کے مطابق وہ زینے کے راستے تھرڈ فلور پر واقع کمرا نمبر تین ہزار تین میں داخل ہوا تھا۔ یہ وہی کمرا ہے جہاں رات دس بجے تک راشد ظاہری ٹھہرا ہوا تھا۔ حالانکہ ظاہری نے ہمارے گھائل بندے سے کمرا نمبر

Digest Novels .com

کے حوالے سے غلط بیانی کی تھی کیونکہ ہوٹل کانٹی نینٹل میں صرف تین فلور ہیں۔ لہٰذا کمرا نمبر سات ہزار سات کا وجود ممکن نہیں ہے۔ بادیُ النظر میں یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ ثوبان، ظاہری سے ملنے وہاں گیا تھا اور بدقسمتی سے اس کا ٹکراؤ ٹوناف سے ہوگیا اور ٹوناف نے اس کی ہڈی پسلی ایک کردی لیکن مجھے اس سوال کا جواب نہیں مل رہا کہ ثوبان اور ظاہری ہوٹل سے باہر کیسے نکلے......''

''دانیال! تم اس نوجوان کو بھول رہے ہو جس کے غصہ دلانے پر ٹوناف نے اس کا تعاقب کیا تھا......'' ڈینئل کارمی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس نامعلوم بندے کا کوئی اتا پتا کیوں نہیں مل رہا۔ ہوٹل کے سامنے اور اندر جب اسے کئی مقامات پر دیکھا گیا ہے تو پھر اس کا ہوٹل سے نکلنا ریکارڈ کیوں نہیں ہوسکا۔ وہ کون تھا؟ اس نے ٹوناف کے ساتھ وہ بے ہودہ حرکت کیوں کی اور سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر وہ پہلی فلائٹ تک کیسے پہنچ گیا......؟''

''ہز ماسٹو! میں نے بہت سوچا ہے مگر اس حوالے سے میرا دماغ بالکل کام نہیں کررہا......'' دانیال نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگ کوئی جادو وغیرہ جانتے ہیں......''

''دانیال! تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' ڈینئل کارمی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''اس وقت تمہارا دماغ ٹھیک سے کام نہیں کررہا۔''

''مجھے ایک موقع اور دیں......'' دانیال نے منت ریز آواز میں کہا۔ ''راشد ظاہری نے ہوٹل بکنگ کے لیے اپنا پاسپورٹ یا کوئی اور آئی ڈی لازمی استعمال کی ہوگی۔ ہوٹل والوں سے اس کا ریکارڈ مل جائے گا۔ اسی طرح اس اجنبی نوجوان کی پہلی فلائٹ کا سراغ بھی لگایا جاسکتا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ......''

''اس قسم کے بلند بانگ وعدے اور دعوے تم پہلے بھی کرچکے ہو۔'' کارمی نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''جب تک تمہیں میرے پوچھے گئے تمام سوالات کے جواب نہیں مل جاتے، مجھے ڈسٹرب نہیں کرنا......''

''جی...... جی میخوبادا!'' دانیال نے مسکینیت بھرے لہجے میں کہا۔

''اور تم اپنے بچے کچھے لوگوں کے ساتھ فی الفور ہوٹل کانٹی نینٹل سے دور ہوجاؤ۔'' ڈینئل کارمی نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''مجھے جب تمہاری ضرورت ہوگی تو میں خود تم سے رابطہ کرلوں گا۔''

پھر دوسری جانب سے دانیال کا جواب سنے بغیر کارمی نے لائن کاٹ دی اور سیل فون یافو کی طرف بڑھاتے ہوئے بیزار کن لہجے میں کہا۔

''دانیال جیسے لوگ ہمارے مشن پر ایک ناگوار بوجھ کی طرح ہیں۔ ان کم بختوں سے ایک کام بھی ڈھنگ سے نہیں ہوتا......''

''میخوبادا! آپ آرام کریں۔'' یافو اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''ٹینجر والا ہمارا مشن صد فیصد ناکام بھی نہیں رہا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ثوبان اور ظاہری ہمارے ہاتھ نہیں لگے لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمارے ٹوناف نے ثوبان کی ٹھکائی کرکے اس پر اپنی برتری ثابت کردی ہے۔ اگر ثوبان، مہدی (علیہ السلام) کی سپاہ کا سپاہی ہے تو ہمارے دجال مسیحا کے جاں نثار ٹوناف نے اسے زیر کرکے یہ ثابت کردیا ہے کہ بالآخر جیت ہماری ہی ہوگی۔ عیسائیوں کے مسیحا عیسیٰ (علیہ السلام) اور مسلمانوں کے مسیحا مہدی (علیہ السلام)...... ہمارے مسیحا دجال کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوجائیں گے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں......؟''

''نہیں!'' ڈینئل کارمی نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو یافو۔ تم بھی میری ہی طرح سوچتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں ثوبان اور ٹوناف کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نالائق دانیال نے میری نیند اُڑا دی ہے۔''

یافو نے ڈینئل کارمی کے حکم کی تعمیل کردی۔

''یافو......!'' کارمی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ تو میں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں کہ کچھ عرصہ پہلے ٹوناف ایریا۔ ففٹی ون کے ڈپارٹمنٹ آف ریسرچ سے فرار ہوگیا تھا۔ ٹیسٹ ٹریننگ کے دوران میں اس نے غصے میں آکر ایک ڈاکٹر کو شدید زخمی کردیا تھا۔ اس کی گمشدگی کے بعد ہم نے یہ سمجھ لیا تھا کہ باغی ٹوناف جاکر جاسم سے مل گیا ہے اور ہمارے خلاف وہ جاسم کے ہاتھ مضبوط کررہا ہے لیکن جلد ہی ہمارا یہ خیال اس وقت غلط نکلا جب ایریا۔ ففٹی ون کی سرچ ٹیم نے ٹوناف کو نیواڈا کے صحرا میں ڈھونڈ نکالا تھا۔ بعدازاں ٹوناف کو اس جیسے دیگر ایلینز کے ساتھ برمودا ٹرائی اینگل کے نزدیک، بحر اوقیانوس کے گہرے پانیوں میں موجود ہماری ایک آبدوز میں شفٹ کردیا گیا تھا۔ ہمارا منصوبہ تو یہی تھا کہ ہمارے دجال مسیحا کی آمد سے پہلے ان ایلینز کو ایک سپاہ کی صورت منظرِ عام پر لایا جائے گا۔ اس

Digest Novels .com

منصوبے میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ بس، صرف ٹوناف کو قبل ازوقت میں نے ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلالیا ہے اور وہ مقصد ہے ثوبان کی سرکوبی اور خاتمہ۔ اس مشن میں ٹوناف کی کارکردگی کو چیک کرنے کا موقع بھی ملے گا۔ تم سوچ رہے ہوگے کہ ٹوناف ایریا۔ ففٹی ون سے بھاگا کیوں تھا اور کیا وہ اب دوبارہ بھی فرار ہونے کی کوشش کرسکتا ہے......؟"

ڈینئل کارمی نے اپنا بیان ادھورا چھوڑ کر یافو کی طرف دیکھا تو یافو نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔

"جی بالکل!" یافو نے اثبات میں گردن ہلائی اور کہا۔"ٹوناف اپنے مزاج کے لحاظ سے بے حد غصیل اور خودسر ہے۔ ڈاکٹر کی کسی بات پر اسے طیش آگیا تھا اور اس نے بلاسوچے سمجھے اس ڈاکٹر پر حملہ کردیا تھا۔"

"ہاں......ایسا ہی ہوا تھا!" ڈینئل کارمی نے معنی خیز انداز میں کہا۔"لیکن تم اس کے غصے میں آنے کی اصل وجہ نہیں جانتے ہو......"

"واقعی میں نہیں جانتا۔" یافو نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔"میں تو اسے ٹوناف کا بھڑکیلا مزاج ہی سمجھ رہا ہوں بدھالتو......"

"ایریا۔ ففٹی ون میں ایک ریسرچ ڈاکٹر شولا تھی۔ شولا انتہائی پُرکشش اور خوب صورت عورت ہے۔" کارمی نے معتدل انداز میں کہا۔"جس مرد ڈاکٹر پر ٹوناف نے حملہ کیا تھا، وہ ڈاکٹر شولا کے بہت قریب تھا۔ ان دونوں ڈاکٹرز میں گہری پسندیدگی اور دوستی تھی اور ان کا یہ پیار بھرا رشتہ ٹوناف کو زہر لگتا تھا کیونکہ وہ خود ڈاکٹر شولا پر فریفتہ ہوگیا تھا۔ وہ کسی اور کو شولا کے ساتھ گھلتے ملتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔"

"اوہ......!" یافو ایک گہری اور تشویش بھری سانس خارج کرکے رہ گیا اور پوچھا۔"میخو باد! اگر ٹوناف، ڈاکٹر شولا کا اتنا ہی دیوانہ ہے تو اسے شولا سے دور کرکے یہاں لانے کا فیصلہ کوئی بہت بڑی مصیبت بھی کھڑی کرسکتا ہے۔ عاشق کے دماغ اور سوچ کا کوئی بھروسا نہیں ہوتا۔ اگر وہ کسی کو رقیب سمجھ لے تو پھر اس بندے کا اللہ ہی حافظ ہے اور اگر کسی عاشق کو اس کے معشوق سے دور کردیا جائے تو پھر زندگی کے عملی میدان میں اس سے اچھی کارکردگی کی امید نہیں رکھی جاسکتی اور ٹوناف تو پوری طرح انسان ہے اور نہ ہی مکمل جانور۔ یہ غصے میں آکر کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اسی موضوع پر ہالی ووڈ نے "کنگ کانگ" نام کی ایک مووی بھی بنائی ہے جس میں، ایک گوریلے اور ایک حسین وجمیل عورت کی محبت کی شدت کو دکھایا گیا ہے۔ جب اس گوریلے کی محبوبہ کو اس سے جدا کردیا جاتا ہے تو وہ گوریلا غیظ و غضب کا طوفان بن کر پورے شہر کو تہس نہس کردیتا ہے۔"

"کسی حیوان کو کسی انسان سے ہوجانے والی اس جنونی محبت کی نزاکت اور باریکی کو میں نے نظرانداز نہیں کیا۔" ڈینئل کارمی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ "برموداٹرائی اینگل کے نزدیک بحراوقیانوس کی گہرائی میں قیام پذیر اس عظیم الجثہ آبدوز میں سے صرف ٹوناف ہی کو باہر نہیں لایا گیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر شولا بھی آئی ہے۔ آج کل ٹوناف اپنے روزوشب شولا کی رنگینیوں اور دل نشیں معیت میں گزار رہا ہے۔ شولا کی قربت اور صحبت میں ٹوناف ایک دم شانت رہتا ہے۔ شولا بڑی ذہانت سے اسے کنٹرول کررہی ہے۔ یوں سمجھ لو کہ ٹوناف پوری طرح شولا کے قابو اور اختیار میں ہے۔ وہ دونوں ہر جگہ ایک ساتھ جاتے ہیں۔ ہوٹل کانٹی نینٹل پر شولا ہی نے ٹوناف کو ڈراپ آف اور پک اپ دیا تھا۔"

"اگر ڈاکٹر شولا نے ٹوناف کے غصے اور جارحیت پر مکمل قابو پالیا ہے تو پھر وہ ہوٹل کانٹی نینٹل کے واک تھرو گیٹ پر اس اجنبی نوجوان کی عامیانہ حرکت پر آپے سے باہر کیوں ہوگیا تھا؟" یافو نے ایک اہم سوال کیا۔"آپ کی دانیال کے ساتھ ہونے والی سیلولر گفتگو نے مجھے میخنجرا میں پیش آنے والے اس تازہ ترین واقعے سے آگاہ کیا ہے۔"

"میں نے دانیال کی کہانی چپ چاپ سن لی ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے، وہ پوری حقیقت سے آگاہ نہیں ہے۔" کارمی نے معتدل انداز میں کہا۔"یہ درست ہے کہ اس نامعلوم نوجوان کی غیراخلاقی حرکت نے ٹوناف کا موڈ آف کردیا تھا لیکن ٹوناف اس کے تعاقب میں نہیں، بلکہ ثوبان کی "مرمت" کی خاطر کمرا نمبر تین ہزار تین کی جانب لپکا تھا کیونکہ ڈاکٹر شولا کی ہدایات کے مطابق، اسے اسی کمرے میں پہنچنا تھا جہاں ثوبان اور ظاہری ایک ساتھ اسے مل جاتے۔ شولا نے ٹوناف کو اچھی طرح سمجھادیا تھا کہ ثوبان کو عبرت ناک موت دینے کے بعد ظاہری کو زخمی حالت میں اٹھا کر اپنے ساتھ لانا ہے تاکہ اس کے دماغ سے یہ معلوم کیا جاسکے کہ ہمارے دشمنوں کی طرف آخر چل کیا رہا ہے۔ باقی جہاں تک اس واہیات جوان کی بات ہے تو......" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے تھما پھر ان الفاظ میں اضافہ کردیا۔

"اگر ٹوناف کا شکار وہ جوان ہوتا تو وہ اسے زینے

digest library.com

تک پہنچنے سے پہلے ہی دبوچ کر اس کا کام تمام کر دیتا کیونکہ ٹوناف کے دوڑنے کی رفتار ایک صحت مند گھوڑے سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ ٹوناف کا ہدف چونکہ ثوبان تھا اس لیے وہ سیدھا اسی کے پاس پہنچا تھا مگر یہاں پر ایک نکتہ قابلِ غور ہے۔''

ڈینئل کارمی پُرمعنی انداز میں رکا تو یافو پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کون سا نکتہ عالی جاہ؟''

''اس نکتے کے بھی دو رخ ہیں۔'' ڈینئل کارمی نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کچھ عرصہ تک ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ ثوبان ٹیلی پورٹیشن کی سائنس سے واقف ہے اور وہ جب چاہے، خود کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے مگر مرحوم میڈم براخا کی محنت کے نتیجے میں یہ پتا چلا کہ ثوبان اس روحانی صلاحیت کا حامل نہیں ہے بلکہ کوئی اور ہستی اسے ٹیلی پورٹ کرنے میں مدد دیتی ہے اور یہی وہ دو رخ ہیں جن کا میں نے تذکرہ کیا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے دو چار گہری سانسیں لیں پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''نکتہ نمبر ایک...... اگر ثوبان ٹیلی پورٹیشن کا ماہر ہوتا تو ٹوناف سے اپنی درگت بنوانے کے بجائے وہ پہلی فرصت میں ہوٹل کے اس کمرے سے خود کو کہیں اور ٹیلی پورٹ کر لیتا۔ نکتہ نمبر دو...... ثوبان اور ظاہری کے ہوٹل سے باہر جانے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ راشد ظاہری درحقیقت ٹیلی پورٹر ہے۔ اسی نے ثوبان اور اس نامعلوم نوجوان کو اپنی اس صلاحیت کی مدد سے ٹیلی پورٹ کیا ہے۔''

''محترم! آپ کی بات سمجھ میں آ رہی ہے۔'' ڈینئل کارمی کے معتمدِ خاص یافو نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ''اس بے ہودہ نوجوان کے بارے میں تو معلوم ہو گیا کہ وہ کسی پبلک فلائٹ میں بیٹھ کر وہاں سے فرار ہوا ہے لیکن ظاہری نے ثوبان کو کہاں پہنچایا ہے، اس کی کوئی خیر خبر کسی کو معلوم نہیں۔''

''بہت جلد سب معلوم ہو جائے گا یافو......'' کارمی نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ڈاکٹر شولا بہت سمجھ دار اور تجربہ کار عورت ہے۔ وہ تندرست و توانا اور سرکش ٹوناف کو کسی ریس کے گھوڑے کی طرح اس انداز میں سرپٹ دوڑائے گی کہ ثوبان جہاں بھی ہوگا، ٹوناف اس کے سر پر پہنچ جائے گا۔ ٹوناف عملی میدان میں ابھی تجرباتی دور سے گزر رہا ہے۔ جیسے جیسے اس کی ذات سے منسوب صلاحیتیں ہمارے سامنے کھلتی جائیں گی، ہم اسی کی روشنی میں اس کے لیے نئے نئے کام نکالتے رہیں گے اور ایک دن......'' وہ لمحے بھر کے لیے متوقف ہوا پھر بات کے تسلسل کو جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''وہ دن دور نہیں جب ابوالانبیا (سیدنا ابراہیم علیہ السلام) کے کیے گئے صدیوں پہلے فیصلے کے مطابق بنی اسرائیل کو پروموسڈ لینڈ (کنعان) مکمل طور پر حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بعد ہی ہم گریٹر اسرائیل کا قیام عمل میں لا سکیں گے۔''

سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے حکم سے، اپنے دونوں بیٹوں کی آئندہ نسلوں کے لیے اس کرۂ ارض کے دو علاقے منتخب کر دیے تھے۔ یعنی بنی اسماعیل کے لیے جزیرہ نما عرب (حجازِ مقدس) اور بنی اسرائیل کے لیے وادیٔ کنعان۔ اسی وادی کو پروموسڈ لینڈ بھی کہا جاتا ہے۔ وادیٔ کنعان کو عرفِ عام میں مشرقِ وسطیٰ کا ''برصغیر'' بھی کہہ سکتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ علاقہ ''فینیشیا'' کہلاتا تھا۔ فینیشیا یا کنعان میں شامل ممالک کے نام کچھ اس طرح ہیں...... لبنان، شام، اردن اور فلسطین۔ بعدازاں سیدنا داؤد علیہ السلام کے زمانے میں، سلطنت داؤدی کی سرحدوں میں وسعت پیدا ہوئی اور بعض قریبی ملکوں کی کچھ زمین بھی اس سلطنت کا حصہ بن گئی جیسا کہ مصر، عراق اور سعودی عرب یعنی وادی حجازِ مقدس۔

''اپنے مسیحا کی خوشنودی کی خاطر ہم ہر قیمت پر ''دی ڈیوڈ کنگڈم'' قائم کر کے رہیں گے۔'' یافو نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''ثوبان یا کوئی دوسرا تیسرا ہمارے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔''

''بے شک! ہم اپنے کام کو تکمیل تک پہنچا کر ہی دم لیں گے۔'' ڈینئل کارمی نے چٹانی لہجے میں یافو کی بات کو تقویت دی۔ ''چاہے اس کے لیے ہمیں اپنے دشمنوں کا ناک میں دم کیوں نہ کرنا پڑے......''

یافو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ ایک یافو ہی کیا، گریٹر اسرائیل کا قیام ہر صیہونی (اشکنے نازی یہودی) کا دیرینہ خواب تھا۔ دنیا میں ایسا کوئی شخص موجود نہیں جو اپنے خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے دیکھ کر خوش نہ ہو......

☆☆☆

زین باقر نے فون پر بات کرتے ہوئے حسنیہ عرف بلوما کو یقین دلایا تھا کہ ثوبان آج رات بارہ سے ایک بجے کے درمیان اس کے پاس پہنچ جائے گا۔ ٹیمپز اور یروشلم کے مقامی وقت میں ایک گھنٹے کا فرق ہے چنانچہ جاسم نے ہوٹل کانٹی نینٹل کے روم نمبر تھری ڈبل زیرو تھری سے کم و بیش

رات بارہ بجے نادیدہ اُڑان بھری تو اس وقت یروشلم میں لگ بھگ رات کا ایک بج رہا تھا۔ جاسم نے آنکھ کھولی تو وہ جوکش کوارٹر یروشلم میں واقع عبدالرحمن عرف اشکار کے گھر کے صحن میں محفوظ لینڈنگ کر چکا تھا۔

عبدالرحمن اب اس دنیا میں باقی نہیں رہا تھا۔ حسنیہ کے دل و دماغ پر جو قیامت گزری تھی، اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ عبدالرحمن کی طویل بیماری کے پیشِ نظر حسنیہ ذہنی طور پر اس کی ابدی جدائی کے لیے پوری طرح تیار ہو چکی تھی مگر دلی معاملات میں بھلا دماغ کی کہاں چلتی ہے۔ ''باپ بیٹی'' کی محبت کو صحیح معنوں میں کوئی باپ یا پھر کوئی بیٹی ہی سمجھ سکتی ہے۔

آس پڑوس سے ماتم پُرسی کے لیے آنے والے لوگوں کے سامنے حسنیہ نے اپنے صبر کے بند کو کھلنے نہیں دیا تھا۔ زین باقر کی معیت میں بھی اس نے خاموش آنسو بہانے پر ہی اکتفا کیا تھا لیکن جب جاسم سے اس کا سامنا ہوا تو اسے اپنے جذبات پر اختیار نہ رہا۔ وہ کمان سے نکلے ہوئے کسی تیر کے مانند آکر جاسم کے سینے میں پیوست ہو گئی۔

ان بوجھل اور جگر پاش لمحات میں تعزیتی کلمات بے اثر اور بے وقعت ہو کر رہ گئے تھے۔ جاسم نے اپنے تئیں اسے دلاسا دینے کے لیے ہر ممکنہ زبانی کوشش کر کے دیکھ لی لیکن اس کا پُرسہ کسی کام نہ آیا۔ وہاں کچھ ایسا معاملہ بن گیا تھا کہ بقول کسے...... مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی......

دو روز پہلے خود جاسم بھی ایسی ہی کرب ناک صورت حال سے گزرا تھا۔ آمنہ کی دائمی جدائی کا زخم ابھی تر و تازہ تھا۔ کسی، دل سے قریب اپنے کے ہمیشہ کے لیے بچھڑنے کا دکھ کیا ہوتا ہے، اس دل چیر احساس سے جاسم بہ خوبی آشنا تھا۔ سو، اس نے حسنیہ کو کرب و بلا کی کیفیت سے باہر لانے کے لیے اپنی زبان پر تالا ڈالا اور ہاتھوں کو اس مشن پر لگا دیا۔ چند منٹ کے بعد حسنیہ کی حالت قابو میں آگئی اور اب وہ دونوں سٹنگ روم میں، ایک دوسرے کے رُوبرو بیٹھے تھے۔

''حسنیہ! تمہارے گھر میں کوئی میڈیکل کٹ ہے؟'' حسنیہ کے نارمل ہو جانے کے بعد جاسم نے معتدل انداز میں پوچھا۔

''کیوں، کیا ہوا......؟'' حسنیہ نے تشویش بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم میڈیکل کٹ کا کیوں پوچھ رہے ہو۔ سب خیریت تو ہے نا......؟''

جاسم نے اپنے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں (انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی) کو جھٹکتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں اپنے ہاتھ کے اس حصے میں تکلیف محسوس کر رہا ہوں۔''

جاسم نے ہوٹل کانٹی نینٹل کے کمرا نمبر تین ہزار تین میں مذکورہ دو انگلیوں کا وکٹری سائن بناتے ہوئے ٹوناف کی آنکھیں پھوڑنے کی جو کوشش کی تھی، وہ اسے خاصی مہنگی پڑی تھی۔ ویسے تو اس کا پورا بدن ہی پھوڑے کے مانند دکھ رہا تھا لیکن ان دو انگلیوں کا معاملہ خاصا سیریس تھا۔

حسنیہ نے جاسم کے مضروب ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ان دو انگلیوں کا طبی معائنہ کیا اور فکرمندی سے بولی۔ ''ان انگلیوں کی جڑوں میں اچھی خاصی سوجن نظر آرہی ہے۔ کیا تم انہیں اپنی مرضی سے بلا تکلیف حرکت دے سکتے ہو؟''

''ہاں!'' جاسم نے اثبات میں جواب دیا اور حسنیہ کے پوچھنے کے مطابق کر کے بھی دکھا دیا۔ اس کے بعد کہا۔ ''دونوں انگلیوں کے جوڑ حرکت تو کر رہے ہیں مگر تکلیف اپنی جگہ موجود ہے۔''

''میں بس یہ تسلی کرنا چاہ رہی تھی کہ خدانخواستہ کوئی فریکچر تو نہیں ہے۔'' وہ ایک گہری اطمینان بخش سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''اللہ کا شکر ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اگر ان انگلیوں میں فریکچر ہوتا تو انہیں حرکت دینے پر تمہاری چیخیں نکل جاتیں......'' اس نے لحاتی توقف کیا پھر جاسم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

''ثوبان! مجھے بتاؤ، یہ چوٹ تمہیں کیسے لگی ہے؟''

''ایک جنگلی انسان نما جانور ٹوناف نے میری یہ دونوں انگلیاں بُری طرح ٹھوک دی ہیں۔'' جاسم نے جواب دیا۔ ''اگر تمہارے گھر میں کوئی میڈیکل کٹ ہے تو وہ لے آؤ۔ پہلے ان انگلیوں کا ٹریٹ منٹ ہونا چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں بھی کی جاسکتی ہیں۔''

''او کے......'' حسنیہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اضطراری لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی آئی......''

دو منٹ کے اندر وہ ایک میڈیکل باکس کے ساتھ واپس آئی پھر کسی ماہر نرس کی طرح وہ جاسم کی انگلیوں کو فوری طبی امداد دینے میں جُت گئی۔

اسی دوران میں جاسم کے سیل فون میں تھرتھراہٹ جاگ اٹھی۔ اس نے اپنی جیب سے سیل فون نکالنے کے بعد اس کے ڈسپلے پر نگاہ ڈالی تو ہیری کی کال تھی۔

''ہیری! تم اس وقت کہاں ہو؟'' جاسم نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''اور مجھے اپنی خیریت کے

Digest Novels .com

بارے میں بھی بتاؤ......"

"میں خیریت کے ساتھ اپنے اپارٹمنٹ میں ہوں۔" ہیری نے بتایا۔ "تم ٹھیک ہونا......؟"

"ہاں، میں بھی ٹھیک ہوں۔" جاسم نے سرسری لہجے میں جواب دیا اور پوچھا۔ "تم ہوٹل کانٹی نینٹل سے باہر کیسے نکلے تھے۔ کیا اس ٹوناف بدمعاش نے تمہیں کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا......؟"

"نہیں...... بالکل نہیں!" ہیری نے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "جب میں ہوٹل کے تھرڈ فلور پر پہنچا تو کمرا نمبر تین ہزار تین کے بجائے کمرا نمبر تین ہزار سات کے دروازے پر مجھے تمہارا دوست بصارت امین کھڑا دکھائی دیا۔ وہ فوراً مجھے اپنے کمرے یعنی تین ہزار سات کے اندر لے گیا اور توانا لہجے میں کہا۔ "ہیری! تم یہاں پر ہر لحاظ سے محفوظ ہو۔ تم اس کمرے سے باہر نکلنے کی غلطی نہیں کرنا۔ میں چند منٹ میں واپس آتا ہوں۔"

"کمرا نمبر تین ہزار سات میں تو امریکی مہمان نیل ہارپر قیام پذیر تھا جو اس وقت فرسٹ فلور پر واقع ایک میٹنگ روم میں چار یہودیوں کے ساتھ فلسطینی مسلمانوں کے خلاف کوئی گھناؤنی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔" جاسم نے اُلجھن زدہ انداز میں کہا۔ "خیر، تم مجھے بتاؤ کہ بصارت امین کب واپس آیا تھا اور کیا اسی نے تمہیں ہوٹل سے باہر پہنچایا تھا؟"

"ہاں، بالکل......" ہیری نے ہیجان بھری آواز میں بتایا۔ "بصارت امین کے جاتے ہی میں نے ہوٹل کے زیریں حصے میں شدید نوعیت کی فائرنگ کی آوازیں سنی اور پھر وہ واپس آگیا۔ میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ تمہارے دوست نے جانے اور آنے کے لیے کمرے کا دروازہ استعمال نہیں کیا تھا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کوئی جادو وغیرہ جانتا ہے لیکن اس کے سامنے میری زبان جیسے پتھر کی ہوگئی تھی۔ بس، میں اس کی سنتا رہا اور "ہاں" میں منڈی ہلاتا رہا۔" وہ اپنی سانس کو درست کرنے کے لیے تھما پھر ان الفاظ میں بات مکمل کردی۔

"بصارت امین نے مجھ سے کہا کہ میری پہلی فیاٹ دشمنوں کی نظر میں آگئی ہے لہٰذا پہلی فرصت میں اس سے چھٹکارا حاصل کر کے کوئی نئی گاڑی خرید لوں۔ پھر اس نے مجھے ہدایت کی کہ کم از کم ایک گھنٹے کے بعد میں تمہیں کال کر کے تمہاری خیریت دریافت کرلوں۔ اس کے بعد آئندہ دو روز تک میں تم سے رابطے میں نہیں رہوں گا کیونکہ تم کسی اہم مشن پر ہو۔ میں نے اس کی ہر بات پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ اس نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے میرا ہاتھ مانگا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے مجھ سے کہا، آنکھیں بند کرلو۔ میں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کر دی۔ اگلے ہی لمحے اس نے حکم دیا، آنکھیں کھول لو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں...... میں اپنی فیاٹ کے پہلو میں کھڑا تھا اور بصارت امین کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے ڈرے سہمے انداز میں گاڑی کا اسٹیئرنگ سنبھالا اور اسے بحیرۂ روم کے ساحل پر چھوڑ کر ایک ٹیکسی پکڑی اور اپنے گھر آگیا۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تمہارا وہ دوست بصارت امین کوئی انسان ہے یا کوئی جن اور یا پھر کوئی جادوگر......؟"

ہیری کی رپورٹ سے جاسم نے یہ تو اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ راشد ظاہری ایک ایسا منجھا ہوا ٹیلی پورٹر تھا جو اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بہ آسانی ٹیلی پورٹ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھا۔

"بصارت امین کی شخصیت پر میں اُس وقت روشنی ڈالوں گا جب ہماری ملاقات ہوگی۔" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر سوال کیا۔ "کیا وہ پہلی فیاٹ تمہارے نام پر رجسٹرڈ تھی؟"

"نہیں!" ہیری نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"ویری گڈ......" جاسم نے ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ "آج سہ پہر کے بعد سے تم ایک دولت مند نوجوان بن چکے ہو لہٰذا اپنے لیے کوئی اچھی سی گاڑی خرید لو اور مریا کا بہت زیادہ خیال رکھنا۔ وہ تمہیں ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ بس، تھوڑی کھسکی ہوئی ہے۔"

"ہاں، میں یہ جانتا ہوں۔" ہیری نے کہا اور پوچھا۔ "ہم کب اور کہاں ملاقات کر رہے ہیں؟"

"اِن شاء اللہ...... بہت جلد۔" جاسم نے جواب دیا۔ "میں تمہیں ملاقات کی جگہ اور وقت کے بارے میں بتا دوں گا۔"

الوداعی کلمات کے بعد ان کے درمیان قائم سیلولر رابطہ موقوف ہوگیا۔ جاسم نے سیل فون کو واپس اپنی جیب میں رکھ لیا۔

اس دوران میں حسنیہ نے جاسم کی متاثرہ انگلیوں کی مناسب مرہم پٹی کردی تھی۔ حسنیہ نے اس سے فون ٹاک کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور میڈیکل کٹ کو بند کرتے ہوئے کہا۔

"ثوبان! میں نے تمہاری مضروب انگلیوں پر ایک خاص قسم کا زوداثر بام لگا کر ڈریسنگ کردی ہے۔ مجھے یقین

Digest Novels .com

ہے، صبح تک ورم اتر جائے گا یا بہت کم ہو جائے گا۔ اگر درد قابلِ برداشت نہیں تو میں تمہیں کوئی پین کلر دے دیتی ہوں۔"

"میں درد کش دوا کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔" جاسم نے معتدل انداز میں کہا پھر ایک فوری خیال کے تحت اضافہ کر دیا۔ "البتہ، اگر تم میری ایک بات مان لو تو مجھے خوشی ہوگی۔"

قبرستان میں زین باقر نے جاسم کو بتایا تھا کہ بلو یعنی حسنیہ نے دوپہر کے بعد سے اب تک کچھ نہیں کھایا۔ اگر جاسم دل سے سعی کرے گا تو وہ ضرور کچھ کھا لے گی۔ اس وقت جاسم وہی کوشش کرنے جا رہا تھا۔

"میں تمہاری خوشی کی خاطر ہر بات مان لوں گی۔" حسنیہ نے جاسم کے چہرے پر نگاہ گاڑ کر گہری سنجیدگی سے سوال کیا۔ "بولو...... میں تمہارے لیے کیا کروں؟"

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" جاسم نے کہا۔ "اگر گھر میں کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ۔"

"ابھی لائی......" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جاسم نے دو گھنٹے پہلے "سینچریز" کے مون شاپنگ مال میں واقع فوڈ کورٹ میں ہیری کے ساتھ بیٹھ کر پیٹ پوجا کی تھی۔ واقعتاً اسے ذرا سی بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہ سب اس نے حسنیہ کو کچھ کھلانے کی غرض سے کیا تھا۔ اس بہانے وہ کھانے سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔

دس منٹ کے اندر حسنیہ نے جاسم کے سامنے ٹیبل پر کھانا چن دیا اور خود ٹیبل کی دوسری طرف صوفے پر بیٹھ گئی۔ یہ وہی ٹیبل تھی جس پر گزشتہ روز دوپہر میں اس نے اپنے بابا عبدالرحمن عرف اشکار کو کھانا کھلایا تھا۔ حسنیہ کا بابا اس دنیا سے رخصت ہو چکا تھا اور اس کی جگہ پر اس وقت جاسم براجمان تھا۔ موت اور زندگی کا کھیل ایسا ہی تڑپانے، رُلانے اور سمجھ میں نہ آنے والا ہوتا ہے۔

"مجھے اکیلے کھانا اچھا نہیں لگتا حسنیہ!" جاسم نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ "تمہیں بھی میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"مجھے ایک ذرا سی بھی بھوک نہیں ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، تم میرا ساتھ نہیں دو گی؟"

"ایسی بات نہیں ہے ثوبان......" وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"دراصل، مجھے کھانے کی حاجت نہیں ہے۔" وہ اپنے تئیں وضاحت کرتے ہوئے بولی۔

"انسان کو کبھی کبھار اپنی ضرورت اور حاجت کے بغیر بھی کوئی کام کر لینا چاہیے۔" جاسم نے اس کی غزالی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "کسی دوسرے کی خاطر......"

"تم بہت ضدی ہو......" وہ اپنے ہونٹوں پر پھیکی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولی۔ "میں جانتی ہوں، اگر میں نے تمہاری بات نہیں مانی تو تمہاری خوشی کافور ہو جائے گی۔ اس کے بعد تم کھانے سے ہاتھ کھینچ لو گے......"

جاسم نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "بہت کم وقت میں تم میرے بارے میں بہت کچھ جاننے لگی ہو۔"

"کیا کروں......" وہ جاسم کے چہرے پر نگاہ جما کر بولی۔ "ماہرِ علمِ طبقات الارض جو ہوں۔ میں نے مٹی کے اندر گھس کر اس کی پرتوں کے اسرار و رموز سے آگاہی حاصل کرنے کی خاطر ہی جیالوجی میں پی ایچ ڈی کیا ہے اور...... انسان بھی مٹی کا ایک کھلونا ہی تو ہے ثوبان......"

حسنیہ کا پُرمغز استدلال جاسم کو پسند آیا۔ اس نے نظر بھر کر ستائشی انداز میں اسے دیکھا اور صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم بیک وقت حسین اور ذہین ہو حسنیہ......"

"شکریہ ثوبان......" وہ اضطراری لہجے میں بولی۔ اپنی تعریف سن کر اس کا چہرہ گل گوں ہو گیا تھا۔ "تو کھانا شروع کریں......" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ہاں...... کیوں نہیں...... ضرور......" جاسم نے توانا لہجے میں کہا۔ "کھانے کو انتظار کروانا توہینِ رزق ہے۔"

حسنیہ نے آج ایک عظیم صدمہ جھیلا تھا۔ جاسم اسے ماتمی کیفیت سے باہر لانے کے لیے ہی وہ تکنیک آزما رہا تھا۔ یہ حسنیہ کے صبر اور برداشت کا اعجاز تھا کہ اس نے اپنے حواس کو معطل اور اعصاب کو مختل نہیں ہونے دیا تھا۔ جاسم کو ماننا پڑا کہ حسنیہ کے بارے میں زین باقر کی رائے صد فیصد درست تھی۔ وہ واقعی ایک بہادر، ہمت والی اور پختہ ذہن لڑکی تھی۔

"میں نے تمہاری بات مان کر تمہیں خوش کر دیا ہے ثوبان!" حسنیہ نے کھانے کا عمل جاری رکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "زین انکل نے مجھے بتایا تھا کہ تم کسی کا ادھار نہیں رکھتے ہو......؟"

"ہاں...... میں کوشش تو کرتا ہوں کہ حساب بے باق رہے۔" جاسم نے الجھن زدہ لہجے میں کہا۔ "لیکن میں سمجھ نہیں پایا کہ اس سے تمہاری مراد کیا ہے؟"

"میں نے تمہاری مان لی، تم بھی میری مان لو......" وہ غیر واضح انداز میں بولی۔ "حساب برابر ہو جائے گا۔ کیا کہتے ہو......؟"

"ہاں، ٹھیک ہے......" جاسم نے محتاط انداز میں کہا۔ "بولو، مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"میں تمہارے بارے میں سب کچھ جاننا چاہتی ہوں۔" وہ ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔

"اپنے حوالے سے سب کچھ تو میں خود بھی نہیں جانتا حسنیہ!" جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اور اگر تمہارے اس تجسس کے پیچھے میری نادیدہ اڑان والا معاملہ کارفرما ہے تو اس سلسلے میں، میں اپنی پوزیشن کلیئر کر چکا ہوں۔ یہ سب اسی روحانی ہستی کے توسط سے ممکن ہو پاتا ہے جو گاہے بگاہے تم لوگوں کی بھی راہنمائی کرتی ہے۔"

"ٹیلی پورٹیشن کے ایشو کو سردست ایک طرف رکھ دو۔" وہ ٹھوس انداز میں بولی۔ "باقی سب بتاؤ۔"

حسنیہ نے جاسم کے لیے فرار کا راستہ نہیں چھوڑا تھا۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میرا تعلق پاکستان کے شہر کراچی سے ہے۔"

اس نے اپنے ذہن میں موجود "ایڈیٹر ایپ" بہ الفاظ دیگر "مدیر کی قینچی" کا استعمال کرتے ہوئے اپنے حسب منشا حسنیہ کو ایک قابل ہضم کہانی سنا دی۔ اس داستان میں درجنوں کردار ایک ترتیب کے ساتھ سجے ہوئے تھے۔ اس دوران میں جاسم نے حسنیہ کے ہاتھوں پر بھی گہری نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ وہ خدانخواستہ اس کے لقمے تو نہیں گن رہا تھا۔ اس "نگرانی" کا مقصد صرف یہ تھا کہ اسے معلوم ہو، حسنیہ مناسب مقدار میں کھانا کھا رہی ہے یا نہیں۔

جاسم خاموش ہوا تو حسنیہ نے فوراً سوال داغ دیا۔ "یہ ماریا کون ہے؟"

"ماریا کا تعلق بھی پاکستان ہی سے ہے۔" جاسم نے بتایا۔ "وہ میری بہت پرانی دوست ہے۔ اس نے یورپ کے ایک ملک سے چینی طریقۂ علاج "ایکوپنکچر اور ایکوپریشر" کی تعلیم حاصل کی ہے اور آج کل کراچی میں اپنا کلینک چلا رہی ہے۔ کافی عرصے سے وہ مجھ سے خفا ہے اس لیے ہمارے درمیان کوئی رابطہ نہیں ہے۔"

حسنیہ کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔ اس نے جاسم سے ماریا کی خفگی کا سبب جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور معتدل انداز میں استفسار کیا۔ "آمنہ کے بارے میں بتاؤ......؟"

جاسم کی سنائی ہوئی کتھا میں دو درجن سے زیادہ لڑکیاں آئی تھیں لیکن حسنیہ نے ان میں سے صرف ماریا (ناجیہ) اور آمنہ (اولگا) ہی کو شارٹ لسٹ کیا تھا حالانکہ ان میں ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار حسینہ تھی مگر حسنیہ کی سوئی دو لڑکیوں پر ہی اٹکی تھی۔ عورت کے پاس حواس خمسہ کے علاوہ خصوصاً دوسری عورت کے لیے اور کتنی اور کیسی کیسی حسیات ہیں، ان کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

"آمنہ کا پرانا نام اولگا تھا اور وہ یوکرین سے تعلق رکھتی تھی۔" جاسم نے جواب دیا۔ "اولگا نظریاتی طور پر ایتھیسٹ تھی لیکن میرے ساتھ رہتے ہوئے وہ اسلام کی حقانیت سے روشناس ہوئی اور اس نے ہمارا مذہب قبول کر لیا یعنی وہ مسلمان ہو گئی۔ میں نے ہی اس کا نام "آمنہ" رکھا تھا۔"

"تم آمنہ کا ذکر کرتے ہوئے مسلسل ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کر رہے ہو ثوبان؟" حسنیہ نے چونکتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔

"کیونکہ آمنہ اب اس دنیا میں موجود نہیں ہے۔" جاسم نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

حسنیہ کو حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ "ثوبان...... یہ تم...... کیا کہہ رہے ہو......؟"

"وہی جو تم نے میری زبان سے سنا ہے۔" جاسم نے بوجھل لہجے میں کہا۔ "دو روز پہلے یعنی سات اکتوبر کے دن ایک درندے صیہونی ڈینئل کارمی کے حکم پر آمنہ کو بڑی بیدردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور وہ بھی صرف اس لیے کہ دجال کی اولاد واقعی ڈینئل کارمی کا خیال ہے کہ الاقصیٰ فلڈ یا "بلیک سیٹر ڈے" میں میرا ہاتھ ہے۔ حماس نے میری مدد اور تعاون سے وہ ائر اینڈ گراؤنڈ اسٹرائیک کی تھی۔ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے، دو روز پہلے آمنہ شہید کی میت کو لحد میں اتارا ہے۔ اس کی تربت آباد دنیا سے ہزاروں کلومیٹرز دور، بحر اوقیانوس کے آخری جنوبی کنارے کے نزدیک واقع ایک گمنام جزیرے "گوڈل آئی لینڈ" میں ہے۔ ذرا تصور کرو حسنیہ......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گھائل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"عام طور پر لوگ شہادت کی خواہش دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں اور اس ملحد اولگا کا نصیب دیکھو...... اِدھر اس نے دائرۂ اسلام میں قدم رکھا،

اُدھر اس نے آمنہ کی حیثیت سے شہید کا رتبہ پالیا...... سبحان اللہ!''

حسنیہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ میبل کی دوسری طرف جاسم والے صوفے پر، اس کے نزدیک آ کر بیٹھی اور اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں تھامنے کے بعد اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔

''آئی ایم سوری ثوبان...... آمنہ کی موت کا سن کر مجھے بہت افسوس ہوا ہے لیکن اس افسوس کے اندر پچھتاوا نہیں بلکہ ایک فخر چھپا ہوا ہے۔ پتا نہیں، انسان موت سے زندگی بھر اتنا خوف زدہ کیوں رہتا ہے۔ موت تو رب تعالیٰ سے ملاقات کا ایک وسیلہ ہے اور ایک شہید سے اللہ کی ملاقات کس قدر شاندار اور مثالی ہو سکتی ہے، اس کا اندازہ لگانا تو دور کی بات، میرے خیال میں اس کا تصور بھی محال ہے۔ بہرکیف...... تمہارا دکھ میرے دکھ سے کسی بھی طرح کم نہیں ہے۔ اب ایک بات پوری وضاحت کے ساتھ میری سمجھ میں آ گئی ہے......''

''کون سی بات؟'' جاسم نے چونکتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

''یہی کہ...... تمہیں ڈینئل کارمی کی تلاش کیوں ہے۔'' حسنیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''تم کسی کا ادھار رکھنے کے عادی نہیں ہو۔ تم نے بابا کو بھی بتایا تھا کہ ڈینئل کارمی نے تم پر بہت زیادہ قرض چڑھا رکھا ہے۔ تم وہ حساب بے باق کرنا چاہتے ہو۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہی ثوبان؟''

''نہیں...... تمہارا اندازہ درست ہے۔'' جاسم نے جواب دیا۔ ''کسی کا قرض سر پر سوار رہے تو میری راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔''

''میں تمہیں ڈینئل کارمی تک پہنچا سکتی ہوں ثوبان!'' حسنیہ نے انکشاف انگیز لہجے میں کہا۔

''کک...... کیا......؟'' جاسم نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیسے...... کیا واقعی تم ایسا کر سکتی ہو حسنیہ......؟''

''ہاں!'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے کنکشنز اور کانٹیکٹس کو استعمال کر کے یہ پتا لگا سکتی ہوں کہ وہ کب اور کتنی دیر کے لیے اپنی ناقابلِ تسخیر رہائش گاہ سے باہر آئے گا اور کہاں جائے گا۔ تم اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنا مقصد حاصل کر سکتے ہو کیونکہ ماؤنٹ زائن والی اس حصار کشیدہ عمارت تک رسائی ناممکن کی حد تک مشکل کام ہے۔''

''تم یہ کام کب تک کر سکتی ہو......؟'' جاسم نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے حسنیہ......''

''کم از کم ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔''

''چار پُراسرار چابیوں والے مشن کو میں کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک مکمل کر لوں گا۔'' جاسم نے کہا۔ ''اس کے بعد میں آگے نکل جاؤں گا۔ کیا تم ایک آدھ روز میں ڈینئل کے بارے میں معلومات حاصل نہیں کر سکتی ہو؟''

''نہیں۔'' حسنیہ نے جاسم کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سپاٹ آواز میں کہا۔ ''اگر ڈینئل کارمی کو عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے سے زیادہ ضروری تمہارا کہیں آگے نکل جانا ہے تو پھر میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں۔ تم اپنی مرضی کے مالک ہو......''

جاسم نے یہ محسوس کر لیا کہ حسنیہ اسے زیادہ دن تک اپنے پاس روکنے کی خواہش مند تھی۔ اس نے تنہائی میں حسنیہ کے ساتھ جتنا وقت بھی گزارا تھا، اس کے نتیجے میں جاسم کو بہ خوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ حسنیہ اس کی ذات میں گہری دلچسپی لے رہی تھی اور یہ دلچسپی پسندیدگی سے کہیں بڑھ کر تھی۔ آج دوپہر میں یعنی گزشتہ روز دن میں جاسم دوسری چابی حسنیہ کے حوالے کرنے اس کے پاس آیا تھا تو اس نے حسنیہ کے رویّے میں اپنے لیے چاہت اور محبت کے جذبات کو بہت نمایاں دیکھا تھا۔ وہ اوپر سے جتنی خاموش طبع اور بھولی بھالی نظر آتی تھی، حقیقت میں وہ اس کے بالعکس ثابت ہو رہی تھی۔

''میں ضدی اور اپنی مرضی کا مالک ضرور ہوں حسنیہ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ میں مختلف معاملات کی ترجیحات کو ہمیشہ ذہن میں رکھتا ہوں۔'' جاسم نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ ''تم ڈینئل کارمی کو ٹریس کرنے کی کوشش فوری طور پر شروع کر دو۔ میں اس مقصد کے لیے چند دن مزید یروشلم میں ٹھہر جاؤں گا۔''

''شکریہ ثوبان......'' وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔ ''انکل زین بھی کچھ عرصے کے لیے یروشلم سے باہر چلے گئے ہیں۔ اگر تم میرے آس پاس موجود رہو گے تو اس سے میری ہمت اور ڈھارس بندھی رہے گی۔''

''ٹھیک ہے......'' جاسم نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

''جب سے تم نے مجھے بتایا ہے کہ تمہارا تعلق پاکستان سے ہے، میں خاصی فکرمند ہو گئی ہوں۔'' حسنیہ نے کہا۔

''میرے پاکستانی ہونے سے تمہاری فکرمندی کا کیا

Digest Novels .com

واسطہ ہے؟" جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں سوال کیا۔

حسنیہ نے ایک بوجھل سانس خارج کی اور کہا۔ "کم و بیش دو سال کے بعد تم لوگوں کو ایک کڑے امتحان سے گزرنا پڑے گا۔"

واضح رہے کہ جاسم اور حسنیہ کے درمیان ہونے والی وہ گفتگو اکتوبر دو ہزار تئیس کا واقعہ ہے۔ اس تناظر میں حسنیہ کا اشارہ موجودہ یعنی دو ہزار پچیس کی جانب تھا۔

"کیسا کڑا امتحان؟" جاسم نے پوچھا۔

"کیا تم نے ابراہم اکارڈز کا نام سنا ہے؟"

جاسم نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں — یہ چیز میرے لیے بالکل اجنبی ہے۔ مجھے بتاؤ، "ابراہم اکارڈز" کیا ہے؟"

"ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے دورِ حکومت ((2017-21 میں ایک بل پاس کرایا تھا جو ابراہم اکارڈز (میثاقِ ابراہیمی) کہلاتا ہے۔" حسنیہ نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ "ٹرمپ نے اسے پیس پروسس (امن کی کوشش) کا نام دیا تھا۔ یہ بل دو ہزار بیس میں پاس ہوا تھا۔ دو ہزار اکیس میں ٹرمپ صدارتی الیکشن ہار گیا اور اس کی جگہ جو بائیڈن نے لے لی۔ یہ بندہ دو ہزار پچیس تک امریکا کا صدر رہے گا۔ میرے ذرائع کے مطابق، جو بائیڈن اپنے دورِ حکومت کے آخری حصے میں یا پھر اس کے بعد آنے والا صدر "ابراہم اکارڈز" کے نفاذ کے لیے عملی جدوجہد شروع کر دے گا۔ باقی جہاں تک میں نے تمہارے ملک کا ذکر کیا ہے —" وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوئی، پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"ابراہم اکارڈز دیگر اسلامی ممالک کی بہ نسبت پاکستان، خصوصاً وہاں کی عوام کو سب سے زیادہ متاثر کرے گا۔"

"رکو —" جاسم نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "باقی تفصیل بعد میں۔ پہلے مجھے بتاؤ، ابراہم اکارڈز ہے کیا؟"

"ابراہم اکارڈز دراصل امریکا بہادر کی جانب سے تمام اسلامی ممالک کے لیے ایک حکم نما درخواست ہے کہ وہ اسرائیل کو ایک آزاد اور خودمختار ریاست نہ صرف تسلیم کر لیں بلکہ اس کے ساتھ دوستانہ سفارتی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات بھی استوار کریں۔ اس مہم کے جواب میں کئی ایک اسلامی ممالک نے امریکا کے اس حکم پر لبیک کہہ دیا ہے۔ دو ڈھائی سال میں تمہارے ملک پاکستان کی باری بھی آنے والی ہے۔"

"پاکستان، اسرائیل کو تسلیم کر لے، اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا —" جاسم نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "ہمارے ملک کی تاریخ میں ایسے نڈر اور دبنگ لیڈر بھی گزرے ہیں جنہوں نے ڈنکے کی چوٹ پر کھلے الفاظ میں اسرائیل کی ریاست کو ناجائز کہا ہے اور اسے کسی بھی قیمت پر تسلیم نہ کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ ان بہادر افراد میں سے چند ایک کو میں بھی جانتی ہوں۔" حسنیہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "اسرائیل کے قیام کے صرف چار ماہ بعد ان میں سے ایک شخصیت کو قتل کرنے کے لیے اس کی حادثاتی موت کا ڈراما رچایا گیا، دوسرے شخص کو انیس سو اناسی میں تختہ دار پر پہنچا دیا گیا اور تیسرا انسان گزشتہ پانچ ماہ سے ناکردہ جرائم کے الزام میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہے۔ تم نے کہا کہ اسرائیل کو تسلیم کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا تو میری ایک بات ذہن نشین کر لو ٹوبان —" اس نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر سرسراتی ہوئی آواز میں اضافہ کر دیا۔ "جب کوئی فرد یا کوئی قوم اور یا پھر کوئی ملک دیدہ و دانستہ یا حادثاتی طور پر بے کسی، لاچاری اور نارسائی کے گرداب میں گھر جائے تو تب صرف سوال ہی اٹھتے ہیں اور ان کا جواب کسی کے پاس نہیں ہوتا۔"

حسنیہ نے دو سال پہلے جاسم سے جو انتہائی حساس گفتگو کی تھی، آج وہ سب سچ ثابت ہو چکا ہے۔ اس وقت پاکستان کے سیاسی، سماجی اور مذہبی حلقوں میں میثاقِ ابراہیمی (ابراہم اکارڈز) بڑی شدومد سے زیرِ بحث ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے دوسری بار امریکا کا صدر منتخب ہونے پر اپنی اس اسرائیل نواز مہم میں نئی روح پھونک دی ہے۔ اس بات کا فیصلہ وقت کو کرنا ہے کہ کیا ہم واقعتاً ایک بے بس، لاچار اور نارسا قوم ہیں یا —

حسنیہ کی تلخ وضاحت نے جاسم کو لاجواب کر دیا تھا۔ جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے سرسری انداز میں کہا۔ "رات کے تین بج رہے ہیں۔ اب تمہیں سو جانا چاہیے۔"

"میرے سر میں شدید قسم کا درد ہو رہا ہے۔" حسنیہ نے کہا۔ "ایسے میں نیند کہاں سے آئے گی۔"

"اگر تمہیں کوئی دقت نہ ہو تو میں تمہارا سر دبا دیتا ہوں۔" جاسم نے اپنائیت بھرے انداز میں کہا۔

حسنیہ نے ایک لمحہ سوچا۔ "کوئی دقت نہیں ہے —" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے سر کو جاسم کے زانو پر رکھا اور صوفے پر دونوں ٹانگیں پسارنے کے بعد ان الفاظ میں

Digest Novels .com

اضافہ کردیا۔ ''ٹھیک ہے، دبادو......''

جاسم نے اس کی پیشانی کو ایک ہاتھ سے تھام لیا اور دوسرے ہاتھ کی وردکش انگلیوں سے سجے ہوئے انداز میں مساج کرنے میں مصروف ہوگیا۔

''ثوبان! کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے......'' تھوڑی دیر کے بعد حسنیہ نے بوجھل آواز میں استفسار کیا۔ ''ہرمجدون میں کتنا وقت باقی ہے؟''

''ہرمجدون......'' جاسم نے اُلجھن زدہ لہجے میں کہا۔

''میں ''آرماگیڈن'' کی بات کررہی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''عربی میں اس معرکے کو ''ہرمجدون'' کہا جاتا ہے۔''

''اوہ اچھا......'' جاسم نے کہا۔ ''یہ تو اس دنیا کی آخری اور سب سے بڑی ''ورلڈوار'' کے بارے میں ہے، جب نیکی اور بدی کی تمام قوتیں ایک دوسرے کے مدِمقابل صف آرا ہوں گی......''

''ہاں، ہاں...... میں اسی کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔'' حسنیہ نے نحیف آواز میں کہا۔

''میں اس حوالے سے وثوق کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' جاسم صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''مجھے بس اتنا پتا ہے کہ آرماگیڈن، ججمنٹ ڈے (قیامت) سے پہلے کی آخری جنگ ہے۔''

''اچھا، ٹھیک ہے۔'' حسنیہ نے خمار آلود لہجے میں کہا اور کروٹ بدل کر اپنا منہ جاسم کے پیٹ کے ساتھ لگا دیا۔

حسنیہ کی سانسوں کی حدت کو وہ بڑی وضاحت کے ساتھ محسوس کررہا تھا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے کوئی تپتا ہوا ریگ زار اس کے پڑوس میں آبسا ہو۔ حسنیہ کی سانسوں کی تپش اسے خطِ استوا کی یاد دلا رہی تھی جہاں پر سورج پورا سال آگ برساتا رہتا ہے۔ اس نے حسنیہ کو ڈسٹرب نہیں کیا اور خود ڈسٹرب ہوکر اس کی ''خدمت'' میں جُتا رہا۔

حسنیہ سب کچھ سمجھنے کے باوجود بھی ناسمجھی کی اداکاری کرتی رہی۔ اس کی ناآسودہ پیاسی جوانی دشت وصحرا میں بھٹکتے ہوئے گزر رہی تھی۔ جاسم کی شکل میں ابر کا ایک ٹکڑا اس پر سایہ فگن ہوگیا تھا گویا اس کی تشنگی کی رخصت کا وقت آگیا تھا۔ وہ چپ چاپ دم سادھے اُن کیف آور اور روح افزا لمحات سے سرشار ہوکر کسی اور ہی نامانوس، ہوشربا اور سحر آگیں جہان میں گم ہوگئی۔

اس رات وہ گھٹا ایسی ٹوٹ کر برسی کہ حسنیہ کے کوہ و دمن کو سیراب کرگئی۔

☆☆☆

سپیدۂ سحر نمودار ہوچکا تھا۔

یہ دمشق کی ایک فرحت بخش اور سہانی صبح تھی۔ زین باقر کے فراہم کردہ جیوگرافک۔ کوآرڈی نیٹس کے مطابق جاسم ایک نادیدہ اُڑان بھر کر دمشق کی عظیم الشان مسجد ''الجامع الاموی'' کے صحن میں محفوظ لینڈنگ کرچکا تھا۔ اس وقت صبح کے کم وبیش ساڑھے چھ بجے تھے۔ نمازِ فجر کی ادائی کے لیے آنے والے مسلمان اپنا فریضہ ادا کرنے کے بعد واپس جاچکے تھے اور کچھ جارہے تھے۔ جاسم مسجد کے صحن میں، ایک منارے کے زیرِ سایہ کھڑا یہ خوش نظر اور روح پرور منظر دیکھ رہا تھا کہ ایک مانوس آواز نے اسے چونکا دیا۔ بے ساختہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔

''السلام علیکم......'' کے الفاظ نے اسے پیچھے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی نگاہ کے سامنے ایک پستہ قامت باریش شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔ مذکورہ شخص فربہ بدن کا مالک تھا۔ اس کی عمر کا درست اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔ بہرکیف، وہ ساٹھ سے تو اوپر ہی کا تھا۔

''وعلیکم السلام!'' جاسم نے خوش اخلاقی سے اس کے سلام کا جواب دیا۔

''میرا نام نظام الدین احمد زنگی ہے۔'' وہ مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں بالکل درست پن لوکیشن فراہم کی گئی تھی۔ تینتیس درجہ، تیس دقیقہ، اکتالیس ثانیہ شمال اور چھتیس درجہ، اٹھارہ دقیقہ، چوبیس ثانیہ مشرق۔'' وہ زین باقر کے بتائے ہوئے جیوگرافک۔ کوآرڈی نیٹس کو دہرانے کے بعد معنی خیز انداز میں گویا ہوا۔ ''جس منار کے نیچے اس وقت تم کھڑے ہو، اس کی اہمیت اور افادیت کا تعلق مسلمانوں کے درخشاں اور رخشندہ مستقبل سے ہے۔ خیر...... تم آؤ میرے ساتھ!''

پُرجوش مصافحہ ہوچکا تھا۔ جاسم نے نگاہ اٹھا کر متذکرہ بالا منار کی طرف دیکھا اور اس نورانی چہرے والے بزرگ نظام الدین احمد زنگی کے پیچھے چل پڑا۔

نظام الدین احمد زندگی عظیم جامع مسجد دمشق کا پیش امام تھا۔ یہ مسجد دمشق کے قدیم شہر میں واقع ہے اور اسے دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی مسجد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ مسلمانوں کی دینی اور جذباتی وابستگی کے لحاظ سے مسجد الحرام، مسجد النبوی اور مسجد الاقصیٰ کے بعد چوتھا نمبر مسجد الاموی کا ہے۔ خلافت بنوامیہ کے دور میں جب چھٹے خلیفہ الولید اول ابن عبدالمالک نے شام کو فتح کیا تو اس مسجد کی توسیع، اس کے عظیم الشان گنبد کی تعمیر اور دیگر تزئین و

Digest Novels .com

آرائش کے سلسلے میں دل کھول کر پیسا خرچ کیا تھا۔ اسی نسبت سے اس قدیم اور یادگار عبادت گاہ کو ''الجامع الاموی'' کہا جاتا ہے۔

مسجد کے کشادہ صحن سے گزرتے ہوئے پیش امام صاحب نے جاسم سے پوچھا۔ ''خاصے فریش نظر آ رہے ہو۔ رات کیسی گزری؟''

اب تک کی اس لمحاتی ملاقات میں جاسم کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ نظام الدین زنگی کوئی پہنچا ہوا گیانی ہے۔ سو کسی ہچکچاہٹ کے بغیر اس نے جواب دیا۔

''بہت عمدہ......شاندار......''

''زبردست......'' پیش امام نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''میں نے نورالدین زنگی کے بارے میں کافی کچھ پڑھ رکھا ہے۔'' جاسم نے معتدل انداز میں کہا اور پوچھا۔ ''لگ بھگ نو صدیاں پہلے کے امیرِ دمشق نورالدین زنگی سے آپ کا کوئی رشتہ نکلتا ہے؟''

''بالکل......'' پیش امام نے زور دے کر کہا۔ ''ہمارا شجرۂ نسب انہی گورنرِ دمشق نورالدین محمود زنگی سے ملتا ہے۔ وہ سچے عاشقِ رسولؐ تھے۔ اگر تم نے اس عظیم شخص کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے تو تمہیں مسجدِ نبوی والا واقعہ بھی یاد ہوگا۔''

''ہاں، یاد ہے۔'' پیش امام کی تقلید میں قدم اٹھاتے ہوئے جاسم نے جواب دیا۔ ''ایک رات عالمِ رویا میں زنگی صاحب کو رسول اللہ ﷺ کا دیدار نصیب ہوا۔ آں سرور ﷺ نے نورالدین سے کہا کہ دو عیسائی عبادت گزار مسلمانوں کے بھیس میں مسجدِ نبوی کے نزدیک ایک جھونپڑی میں ڈیرا جمائے بیٹھے ہیں۔ وہ زیرِ زمین سرنگ لگا کر، پیارے نبی ﷺ کا جسدِ اطہر، روضہ مبارک سے نکال لے جانا چاہتے ہیں...... آنکھ کھلتے ہی نورالدین زنگی نے فی الفور ایک مسلح دستہ مدینہ کی جانب روانہ کر دیا۔ ان سازشی عیسائیوں کو عبرت ناک سزائے موت دینے کے بعد زنگی صاحب کے حکم پر حضور ﷺ کے روضۂ اقدس کی چاروں جانب زیرِ زمین ایک ایسی سیسا پلائی ہوئی ناقابلِ تسخیر دیوار کھینچ دی گئی تھی جس کو عبور کرنا، توڑنا یا کاٹنا ناممکن تھا۔''

''ہمیں اپنے جدِ امجد نورالدین محمود زنگی پر فخر ہے۔'' پیش امام صاحب نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ان کی یہ شدید خواہش تھی کہ بیت المقدس کو عیسائیوں کے قبضے سے آزاد کرائیں۔ اس حوالے سے انہوں نے مسجدِ اقصیٰ کے لیے ایک بیش بہا اور عالی شان چوبی منبر بھی تیار کروا لیا تھا لیکن زندگی نے بے وفائی کر دی اور یہ سعادت ان کے حصے میں نہ آسکی۔'' وہ سانس ہموار کرنے کی خاطر متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں بات مکمل کر دی۔

''بعد ازاں سلطان صلاح الدین ایوبی نے یروشلم کو فتح کر لیا۔ اس موقع پر نورالدین زنگی کی اہلیہ اور ان کی صاحب زادی نے وہ بے مثال منبر عظیم فاتح صلاح الدین ایوبی کے حوالے کر دیا تھا۔''

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے اور باتیں کرتے ہوئے صحن عبور کرنے کے بعد ایک کمرے میں آگئے۔ نظام الدین زنگی نے مذکورہ کمرے میں جاسم کے لیے ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ دونوں قالین پوش فرش پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ پیش امام صاحب نے خوشبودار قہوے کے ساتھ کھجور، بادام اور جو کی آمیزش سے تیار شدہ سوئٹ ڈش جاسم کی خدمت میں پیش کی اور کہا۔

''تمہارے روز و شب مار دھاڑ اور بھاگ دوڑ میں گزرتے ہیں۔ یہ میٹھا تمہیں بہت توانائی بخشے گا۔''

''حضرت! اگر اجازت ہو تو ایک سوال کر سکتا ہوں۔'' جاسم نے مؤدبانہ انداز میں کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں...... ضرور!'' اس نے شفقت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن اس سے پہلے میں وہ امانت تمہارے سپرد کرنا چاہوں گا جس کے لیے تم یہاں آئے ہو......''

آئندہ ایک منٹ کے اندر نظام الدین زنگی نے تیسری پُراسرار چابی جاسم کے حوالے کر دی پھر دوبارہ اس کے سامنے براجمان ہونے کے بعد کہا۔

''اب پوچھو، جو بھی پوچھنا چاہتے ہو......''

''آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ میں مسجد کے جس منار کے نیچے کھڑا ہوں، وہ مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔'' جاسم نے ناشتا جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس منار کے بارے میں کچھ بتائیں۔ الحمدللہ! میں ایک مسلمان ہوں اور دوسرے مسلمانوں کی طرح مجھے بھی اپنے مستقبل کی بہت فکر ہے۔''

''ہر مومن کا مستقبل صحیح معنوں میں اس کی آخرت ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ امتِ مرحومہ کی اکثریت دنیا کمانے کی تگ و دو میں لگی ہوئی ہے۔'' پیش امام صاحب نے کڑوے لہجے میں جواب دیا۔ ''بہرحال، جس مقام پر ہم نے مصافحہ کیا، وہ اس مسجد کا شرقی منار ہے اور اس منار کی عظمت کا اندازہ تم اس بات سے لگا سکتے ہو کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول اس کے نزدیک ہوگا۔''

Digest Novels .com

جاسم نے ظہورِ مہدی، خروجِ دجال اور نزولِ عیسیٰ کے بارے میں بہت کچھ سن اور پڑھ رکھا تھا۔ پیش امام کے انکشاف نے اس کے تجسس کو آگ کے مانند بھڑکا دیا۔ وہ منت ریز لہجے میں بولا۔

''قبلہ! مجھے اس بارے میں تفصیلاً بتائیں۔''

''سیمیٹک ریلیجنز (ادیانِ ابراہیمی یعنی اسلام، عیسائیت اور یہودیت) سے تعلق رکھنے والے سوا چار ارب انسان اس وقت امام مہدی علیہ السلام کی آمد کے منتظر ہیں۔'' نظام الدین احمد زنگی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ ان سب کو اپنے اپنے مسیحا کا انتظار ہے اور یہ سلسلہ مہدی علیہ السلام سے آغاز ہو کر سیدنا عیسیٰ علیہ السلام پر اختتام پذیر ہوگا۔''

لحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری اور بوجھل سانس خارج کی۔ جاسم ہمہ تن گوش خاموش بیٹھا رہا۔ امام صاحب نے اپنی وضاحت کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آخری زمانے میں، اہلِ بیت کے سلسلۂ امامیہ کے بارھویں اور آخری امام مہدی علیہ السلام کا ظہور مدینہ سے مشرق میں واقع ایک علاقے خراسان سے ہوگا۔ کسی عرب ملک کے بادشاہ کی وفات پر، اس کے بیٹوں میں اقتدار کے حصول کی خاطر لڑائی ہو رہی ہوگی۔ امام مہدی اس قضیے کو ختم کریں گے۔ اس موقع پر ان کی شناخت ہو جائے گی۔ مسلمانوں کی اکثریت انہیں اپنا مسیحا تسلیم کر لے گی۔'' پیش امام ایک بار پھر تھما۔ گہری نظر سے جاسم کو گھورا اور سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے بعد یہود کے مسیحا دجال کا خروج ہوگا۔ دجال کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے عیسائیوں کے مسیحا عیسیٰ علیہ السلام کا نزول نمازِ فجر کے وقت اس مسجد کے شرقی منار کے قریب ہوگا۔ نمازِ فجر کی اقامت ہو چکی ہوگی اور مہدی علیہ السلام امامت کے لیے جائے نماز پر کھڑے ہو چکے ہوں گے۔ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کی آمد پر امام مہدی مصلے سے ہٹ جائیں گے اور عیسیٰ ابنِ مریم کو امامت کی دعوت دیں گے لیکن مسیح علیہ السلام امام مہدی ہی کو نماز پڑھانے کے لیے کہیں گے۔ اس کے بعد آنے والے دنوں میں سب کچھ بہت تیزی سے ہوتا چلا جائے گا جیسا کہ......'' وہ ایک لمحے کے لیے متوقف ہوا پھر ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''سیدنا عیسیٰ علیہ السلام صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیے کو موقوف کر دیں گے۔ تمام لوگوں کو اسلام کی دعوت دیں گے۔ ان کے زمانے میں اللہ اسلام کے علاوہ تمام ملتوں کو مٹا دیں گے۔ وہ دجال لعنتی کو جہنم واصل کریں گے۔ ان کے دور میں امن و امان کی حکمرانی ہو گی۔ وہ چالیس سال تک اس زمین پر موجود رہیں گے پھر ان کی طبعی موت واقع ہو جائے گی۔ مسلمان ان کی نماز جنازہ پڑھیں گے اور انہیں عین اسلامی طریقے سے سپردِ خاک کر دیا جائے گا۔''

''بے حد معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہوں گا۔'' جاسم نے بہ صد احترام کہا۔ ''مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ ان تین کرداروں کے ظہور، خروج اور نزول سے انکاری ہے۔ ان کے مطابق، یہ سب افسانہ ہے۔ ان واقعات کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تینوں مذاہب کے مُلّاؤں نے اپنی اپنی قوم کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا رکھا ہے۔''

''ہر انسان کو اپنے انداز میں سوچنے اور اپنی ایک رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔'' نظام الدین احمد زنگی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''غلط اور صحیح کا فیصلہ وقت کو کرنا ہوتا ہے اور مناسب وقت آنے پر حقیقت اور افسانہ ایک دوسرے سے الگ کھڑے دکھائی دیں گے...... خیر!'' وہ رکا، نظر بھر کر جاسم کی طرف دیکھا اور سپاٹ آواز میں کہا۔

''تم کمرے کا دروازہ بند کر دو تا کہ میں بھی اپنا وعدہ پورا کر سکوں......''

جاسم نے پیش امام سے یہ نہیں پوچھا کہ وہ کون سا وعدہ پورا کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ کسی سحر زدہ انسان کی طرح اپنی جگہ سے اٹھا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا پھر اس نے جیسے ہی کمرے کا دروازہ بند کیا، باہر کہیں نزدیک ہی ایک ساعت شکن دھماکا ہوا۔

وہ دھماکا اتنا زوردار اور قیامت خیز تھا کہ مسجد کے در و دیوار لرز کر رہ گئے تھے۔ بے ساختہ اس نے پلٹ کر دیکھا تو دوسرا دھماکا اس کے دماغ میں ہوا۔ اس کی آنکھوں نے جو دیکھا۔ وہ فوق الیقین تھا۔ آنِ واحد میں نظام الدین احمد زنگی کی جگہ کسی اور نے لے لی تھی......

دھماکوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان لمحات میں جاسم اپنی زندگی کے ایک ایسے انوکھے تجربے سے گزر رہا تھا جس نے اس کے رگ و ریشے میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ خوفناک دھماکے دمشق کے گلی کوچوں میں ہو رہے تھے یا کسی نے اس کی سوچ پر ایٹم بم گرا دیا تھا......

حیرت و تجسس کی تہ میں چھپی اس
داستان کے باقی واقعات اگلے ماہ پڑھیے

Digest Novels .com

ضرررساں

عائشہ نصیر

بعض اوقات ضرر رساں چیزوں کا خاتمہ بھی ضروری ہوتا ہے... ایک ایسی ہی کہانی... جس کے کردار کافی عرصے سے نقصان کا باعث بن رہے تھے... جانوروں اور انسانوں کے مابین بھی ایک رشتہ ہوتا ہے... جسے کوئی سمجھ پاتا ہے اور کوئی سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا... گرتے پڑتے... مار کھاتے ہوئے ان کے اندر بھی انتقام کے جذبے بیدار ہو کے طاقتور بن چکے تھے...

مغربی معاشرے میں پھیلی اچھائیوں اور برائیوں کی ایک جھلک دکھلاتی تحریر

رائے نے بجری والے پارکنگ لاٹ میں گاڑی روکی، گیس اسٹیشن کی کافی کا ایک گھونٹ لیا، اور جانوروں کی پناہ گاہ کی سرخ اینٹوں والی عمارت کو گھورنے لگا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ اگلے ہفتے نہ تو کوئی دوپہر کی شفٹ ہوگی، نہ ہی راتوں کو ڈیوٹی اور نہ ہی جانوروں کو بچانے کا کام۔

کیونکہ وہ ریٹائر ہو جائے گا۔ رائے ان ریٹائر ہونے والوں کی طرح نہیں تھا جو ناراض ہو کر نوکری چھوڑتے ہیں۔ وہ شکر گزار تھا۔

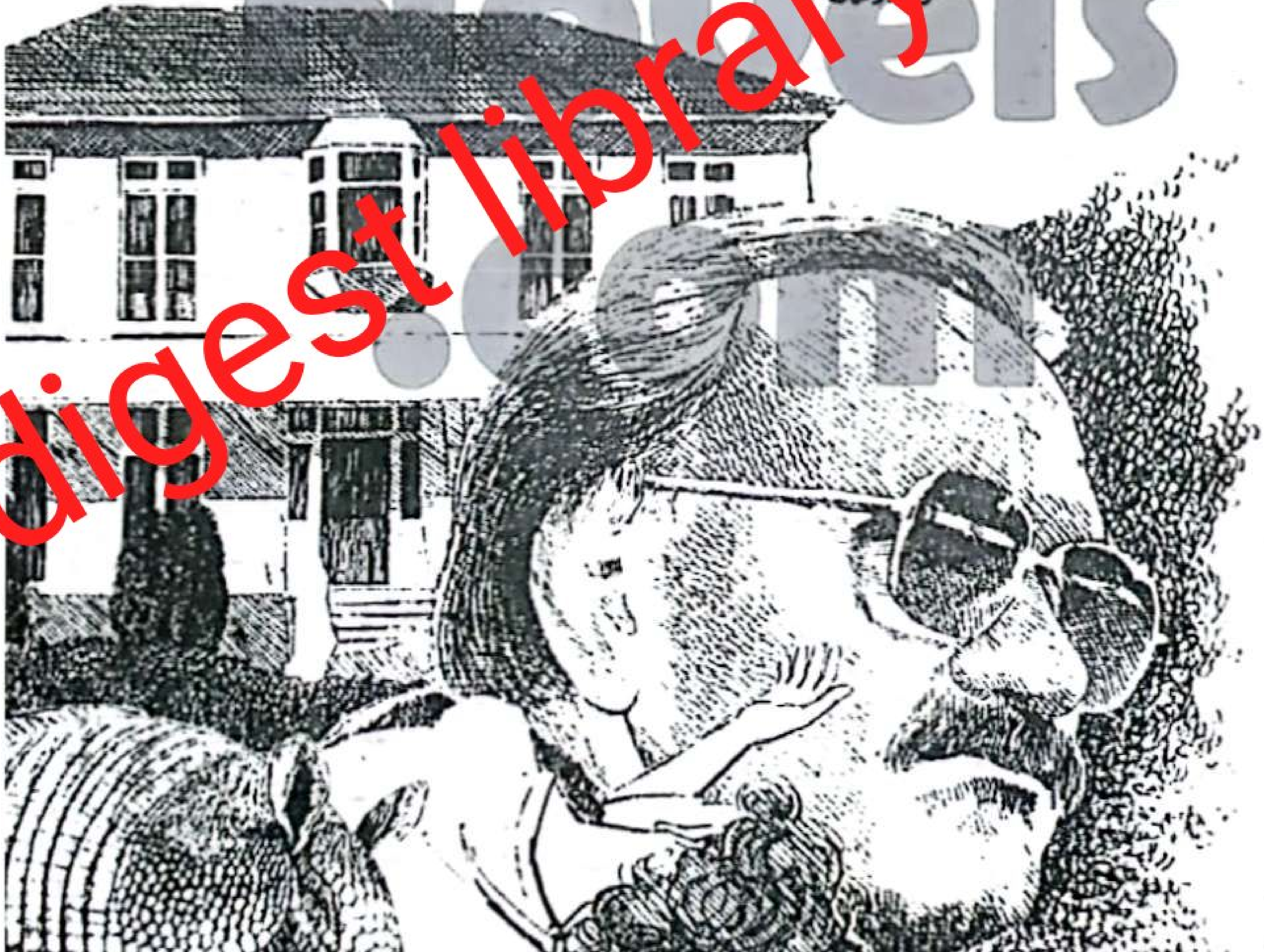

Digest Novels
digest library.com

ویتنام سے واپس آنے کے بعد، جانوروں کو قابو میں لانے والی یہ ملازمت بالکل وہی تھی جس کی اسے ضرورت تھی۔ ایک موقع، جان بچانے کا، نہ کہ جان لینے کا۔

مگر اب اس کا جسم جواب دے رہا تھا، اور وہ چاہتا تھا کہ یہ آخری دن عزت کے ساتھ گزر جائیں۔

اس نے اپنی ریسکیو کی ہوئی گریٹ ڈین نسل کی کُتیا کو دیکھا، جو مسافر سیٹ پر بیٹھی تھی، اور مسکرا دیا۔ ''چلو اندر چلیں، اچھی لڑکی۔''

لولو نے بھونک کر جواب دیا، اور رائے نے ٹرک سے اتر کر زمین پر قدم رکھا۔

زمین پر قدم رکھتے ہی اس کے جسم میں درد کی لہر دوڑ گئی۔ کراہتے ہوئے، اس نے اپنی ڈیوٹی بیلٹ کو کچھ اس طرح ایڈجسٹ کیا کہ بیلٹ پر لٹکا ہوا بیٹ اسٹک اور پستول اس کے خراب کولہے پر دباؤ نہ ڈالیں اور عمارت کی طرف چل پڑا۔

لولو اس کے قدموں کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

رائے امید کر رہا تھا کہ آج کا دن پُرسکون گزرے۔ شاید وہ چند لائسنس کی خلاف ورزیوں پر چالان کرے، کوئی آوارہ کُتا پکڑے، یا کچھ ویکسین لگائے۔ زیادہ ہنگامہ نہ ہو تاکہ وہ اور لولو وقت پر گھر پہنچ کر کولمبو کے پرانے شوز دیکھ سکیں۔

رائے نے پنجرے سے گزرتے ہوئے کُتوں کو ہاتھ ہلایا پھر دفتر کی طرف گیا تاکہ ڈسپیچر پولین، سے چیک اِن کرے...... جو لگ بھگ رائے جتنی ہی بوڑھی تھی۔

اپنے بکھرے بالوں اور بھاری آواز کے ساتھ وہ اسے امریکن کامیڈین فلس ڈلر کی یاد دلاتی تھی۔

وہ اپنے ڈیسک پر تھی، کمپیوٹر کے پاس سگریٹوں کا پیکٹ رکھا تھا اور اسکرین پر سولٹیئر گیم کھلی ہوئی تھی۔

''صبح بخیر، پولین۔''

''رائے۔'' اس نے چیونگم چباتے ہوئے کہا، نظریں کمپیوٹر اسکرین پر ہی جمی ہوئی تھیں۔

پولین کے ڈیسک کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے تمباکو، اسپیئرمنٹ اور سستے پرفیوم کی ملی جلی خوشبو کا ایک جھونکا سا آیا تھا۔

لولو کو چھینک آئی اور اس نے ناک پر پنجہ مارا۔

''تمہاری کتیا ٹھیک ہے، رائے؟''

''یہ بالکل ٹھیک ہے۔'' رائے نے لولو کا کان کھجاتے ہوئے کہا۔ ''ہے نا لڑکی؟''

لولو نے خوشی سے بھونک کر جواب دیا۔

رائے میز کی طرف بڑھا جہاں ریڈیو رکھے جاتے تھے۔ اس نے چارجنگ اسٹیشن سے ایک ریڈیو اٹھایا۔

پھر وہ اسٹوریج لاکر میں گیا اور وہاں سے ایک بے ہوش کرنے والی گن اور ایک رائفل نکال لی۔

وہ اپنا..... ٹرک لوڈ کر رہا تھا جب پولین نے ریڈیو پر آواز دی۔

''آر ماڈیلو بائے ملی وینڈل۔''

''آہ......'' اس نے یہ سنتے ہی ایک سرد آہ بھری۔ وہ جانتا تھا کہ فیلڈ سروس کس نے بلائی تھی۔ ایک جھگڑالو، بوڑھی عورت، ملی وینڈل۔

بدقسمتی سے، ان کا دائرۂ اختیار ملی کی جائداد تک تھا، جو مارننگ نامی ایک چھوٹے سے قصبے میں اسمتھ کاؤنٹی کے کنارے پر واقع تھا۔

رائے کو وہاں تقریباً ہر ہفتے ایک بار جانا پڑتا تھا مگر آج وہ ملی وینڈل کے ''پاگل پن'' سے بچنا چاہتا تھا۔

اس نے پولین کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنا ٹرک لوڈ کرنا جاری رکھا، یہ امید کرتے ہوئے کہ شاید اگر وہ کافی دیر تک انتظار کرے تو کوئی دوسرا افسر جواب دے دے۔

''میں جانتی ہوں تم سن رہے ہو، رائے۔'' پولین نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمہیں ریڈیو اٹھاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔''

رائے نے کراہتے ہوئے بالآخر واکی ٹاکی پر جواب دیا۔

''ابھی یہاں چند چیزیں نمٹانی ہیں۔'' اس نے جھوٹ بولا۔

''کیا ناش یہ کال نہیں لے سکتا؟''

''ناش کاؤنٹی کے دوسرے سرے پر ایک بدبودار جانور سے نمٹ رہا ہے۔''

رائے نے کوئی اور حل سوچنے کی کوشش کی، کوئی ایسا راستہ جو اسے مارننگ جانے سے بچا لے۔ لیکن اس کے پاس کوئی راستہ نہیں تھا۔

''رائے؟'' پولین نے دوبارہ پکارا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی کہا۔

پولین نے اسے پتا بتایا، حالانکہ رائے کو یاد تھا کہ کہاں جانا ہے۔

مگر یہ پروٹوکول تھا، اور پولین پروٹوکول کی بہت پابند تھی...... جب تک کہ بات ریڈیو پر بات کرنے، سولٹیئر کھیلنے یا باتھ روم میں سگریٹ پینے کی نہ ہو۔

Digest Novels .com

"چلو، لولو۔" رائے نے کہا۔ "چلتے ہیں دیکھتے ہیں کہ للی کے آرماڈیلو نے اب کیا اودھم مچایا ہے۔"

لولو نے ہمیشہ کی طرح بھونک کر جواب دیا، پھر ٹرک میں چھلانگ لگا کر سیٹ پر سے پھسلتی ہوئی مسافر سیٹ پر جا بیٹھی۔

رائے نے راستے میں ہارڈ ویئر اسٹور سے کچھ سامان خریدا اور پھر مشرق کی طرف روانہ ہوگیا۔

شاپنگ سینٹرز اور چھوٹے قصبے رفتہ رفتہ ٹریلر پارکس اور کھلے میدانوں میں بدلنے لگے، جن کے بیچ بیچ میں کہیں کہیں بل بورڈز نظر آتے تھے...... تازہ ترین بل بورڈ ٹیکساس روز فیسٹیول کے بارے میں تھا۔

یہ سالانہ تقریب ٹائلر میں منعقد ہوتی تھی، جس میں ایک پریڈ، باغبانی کا مقابلہ، اور ایک فیسٹیول کوئین کا انتخاب شامل ہوتا تھا۔ کئی دہائیاں پہلے للی وینڈل فیسٹیول کوئین بنی تھی۔

ان تمام سالوں کے بعد بھی، وہ اب بھی ایسے برتاؤ کرتی تھی جیسے یہ اعزاز اسے کسی خاص سلوک کا حق دار بناتا ہو۔

للی کی واحد اچھی بات اس کا شوہر، اسٹین تھا۔ رائے اکثر ہالیڈیز پر بار میں اسٹین کے ساتھ بیئر پیتا تھا۔ اسٹین بھی رائے کی طرح ٹوٹا پھوٹا تھا...... ہر بار کوئی ٹانکا لگا ہوا یا کوئی نیل زدہ زخم لے کر آتا۔

اسٹین ایک اچھا آدمی تھا۔ شاید للی جیسی عورت سے شادی کرنا اس کی بڑی بھول تھی۔ لیکن ہر کسی کو اپنی قسمت کا بوجھ اٹھانا پڑتا ہے اور للی وینڈل اسٹین کا بوجھ معلوم ہوتی تھی۔

رائے نے دور ہی سے وینڈل جائداد کا سائن بورڈ دیکھ لیا۔

آخری بار جب وہ للی کی کسی شکایت پر آیا تھا، تو اس نے اس پر باغبانی کے آلات سے حملہ کردیا تھا۔

رائے نے موڑ کاٹا اور لمبی کچی سڑک پر دومنزلہ مکان کی طرف بڑھا۔

خوب صورت نقش و نگار اور باریک تراش خراش نے مکان کو وکٹورین طرز کا بنادیا تھا...... ایسا گھر جو عام طور پر مین اسٹریٹ پر دکھائی دیتا ہے، نہ کہ کسی سنسان علاقے کے بیچ۔

ایک بار بیئر پیتے ہوئے، اسٹین نے رائے کو بتایا تھا کہ للی یہ دعویٰ کرتی ہے کہ ان کا گھر ایک تاریخی ورثہ ہے، حالانکہ وہ نیشنل رجسٹر میں شامل نہیں تھا۔ للی نے ایک کانسی کی تختی بنوا کر دروازے کے پاس لگوائی تھی، جس پر یہ دعویٰ کندہ تھا۔

چرچ میں للی اپنی دوستوں کو بڑے فخر سے بتاتی تھی کہ ٹیکساس کی آزادی کا ہیرو اور سابق صدر سیم ہوسٹن نے ان کے گھر میں قیام کیا تھا۔

وہ اپنے پادری کو بھی قائل کرچکی تھی کہ موم بتیوں کی روشنی میں ہونے والے سالانہ دورے میں ان کا گھر شامل کیا جائے۔

لیکن للی اور اس کے جعلی تاریخی مکان کو ملنے والی یہ توجہ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی، کیونکہ جین جانسن نے سارا کھیل بگاڑ دیا تھا۔

جین جانسن، جو ایک اور سابقہ فیسٹیول کوئین اور للی کی حریف تھی، کا اصل تاریخی مکان مقامی اخبار کے "ہوم اینڈ اسٹائل" سیکشن میں نمایاں طور پر شائع ہوا تھا۔

رائے نے جب یہ تصور کیا کہ للی نے وہ خبر پڑھی ہوگی تو خوب ہنسا تھا۔ لیکن اسٹین نہیں ہنسا۔

اس دن وہ بس خالی نظروں سے رائے کو دیکھتا رہا تھا، جیسے کسی خوفناک یادداشت میں ڈوبا ہو، اور اپنی بیئر ایسے پی رہا تھا جیسے کسی بُری یاد کو بھولنا چاہتا ہو۔

گھر کے سامنے گاڑی روک کر اس نے تھوڑی دیر انتظار کیا، امید کرتے ہوئے کہ اس کا دوست گاڑی کے انجن کی گڑگڑاہٹ سن کر باہر نکل آئے، تاکہ اسے للی کا سامنا نہ کرنا پڑے مگر آج قسمت رائے کے ساتھ نہیں تھی۔

"چلو، اب جو ہونا ہے ہو جائے۔"

رائے نے انجن چلتا چھوڑا تاکہ لولو کے لیے اے سی چلتا رہے، اپنا ہیٹ پہنا اور گاڑی سے نیچے اتر آیا۔

چلتے وقت اس کے کولہے میں درد اٹھا، مگر اس نے اپنے لنگڑانے پر دھیان دیے بغیر پورچ کی طرف قدم بڑھا دیے۔

سامنے کا دروازہ کھلا تھا مگر اسٹورم ڈور بند تھا۔

للی سے بچنے کی آخری کوشش کرتے ہوئے رائے نے اپنی ٹوپی پیچھے سرکائی، ہاتھ آنکھوں کے اوپر رکھے اور کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش کی کہ شاید اسٹین نظر آجائے۔

اس کے دوست کی چھڑی دروازے کے قریب رکھی ہوئی تھی، مگر اسٹین وہاں موجود نہیں تھا۔

"لعنت۔" رائے نے ایک گہری سانس لی اور چند لمحے مزید پورچ پر کھڑا رہا، پھر ہمت کر کے دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا کہ اچانک اس نے اندر سے للی کی چیخ پکار سنی، وہ اسٹین کو سختی سے جھاڑ رہی تھی۔

رائے دروازے کے قریب ہوگیا۔ اس نے اپنے آلۂ سماعت کی آواز بڑھادی۔ مگر وہ صرف چند الفاظ سن سکا...... اور وہ بھی زیادہ تر گالیاں تھیں۔

رائے نے سوچا کہ یہاں سے چلا جائے۔

Digest Novels .com

پولیس کو کہہ سکتا تھا کہ کوئی گھر پر نہیں تھا۔
یہاں تک کہ جھوٹ بھی بول سکتا تھا کہ اس نے سروس کال مکمل کر دی ہے۔
مگر آخرکار اسے معلوم تھا کہ یہ سب بے کار ہوگا۔
ملی دوبارہ فون کرے گی، اور پھر اسے واپس آنا ہی پڑے گا۔
وہ دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے والا ہی تھا کہ ایک بھیانک آواز سن کر رک گیا۔
بھوواک، تھڈ، بھوواک...... کچھ ایسا جیسا باکسنگ رِنگ میں سنائی دیتا ہے۔
”یاخدا۔“ رائے نے منہ بنایا۔
کیا اسٹین آخرکار قابو کھو بیٹھا تھا اور ملی پر ہاتھ اٹھا دیا تھا؟
اسٹین ایسا آدمی نہیں لگتا تھا جو اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھائے۔
لیکن رائے نے کرائم چینل پر بہت شوز دیکھے تھے اور اچھے اچھے آدمیوں کو پاگل بیویوں کی وجہ سے آخری حد تک جاتے دیکھا تھا اور اس کے بعد سیدھی جیل کی سلاخیں۔
”ملی؟“ رائے نے پکارا۔ ”سب خیریت ہے اندر؟“
جب کوئی جواب نہ آیا تو رائے نے دروازہ کھینچا لیکن وہ مضبوطی سے فریم میں پھنسا رہا۔
خاموشی قائم رہی...... اور یہ خاموشی پہلے سنی گئی لڑائی سے زیادہ پریشان کن تھی۔ رائے کے ذہن میں ایک منظر ابھرا: ملی فرش پر پھیلی ہوئی، اسٹین اس کے زخمی جسم پر جھکا ہوا۔
لیکن جو چیخ سنائی دی، وہ ملی کی نہیں تھی۔ وہ اسٹین کی تھی۔
رائے نے اپنی ڈیوٹی بیلٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔
بیٹ اِسنک کھینچا۔ اسے شیشے کے دروازے کی طرف تانا۔ پیچھے ہٹ کر جھولا دیا۔ اور اسی لمحے ملی نمودار ہوئی۔
”بالآخر آ ہی گئے تم!“ ملی غرائی۔
بیٹ اِسنک اب بھی فضا میں تنی ہوئی تھی، رائے کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، وہ ملی کو گھورتا رہا۔
جہاں تک وہ دیکھ رہا تھا، ملی پر کوئی چوٹ یا زخم کے نشان نہیں تھے۔ اس نے ایک پیلا ایپرن پہنا ہوا تھا، جس کے نیچے اس کی عام سی سفید بٹن والی قمیص اور خاکی پینٹ تھی۔
اس کے بال، جو عام طور پر سختی سے بندھے ہوتے تھے، آج ڈھیلے پڑے تھے۔ ورنہ اس کی حالت عام دنوں جیسی ہی لگ رہی تھی۔
”بولتی کیوں بند ہوگئی، رائے؟“ ملی نے کہا۔
رائے نے اِسنک واپس اپنی بیلٹ میں رکھ دی۔ ”صبح بخیر، ملی۔“
”ایک گھنٹا ہو گیا ہے مجھے کال کیے ہوئے۔ کیا اسی سروس کے لیے میرے ٹیکس کے پیسے جاتے ہیں؟“
وہ اپنا ایپرن سیدھا کرنے لگی، اس کی انگلیوں پر خون کا ہلکا سا نشان تھا۔
رائے نے بھویں سکیڑ لیں۔ نہ کوئی کٹ، نہ کوئی پٹی، نہ کوئی اور چوٹ کا نشان۔ معاملہ سمجھ سے باہر تھا۔
رائے اسے گھورتا رہا، جبکہ ملی اپنی شکایتیں جاری رکھے ہوئے تھی۔
”تم لوگ جب جی چاہے آن ٹپکتے ہو! یہ کوئی اینمل پروٹیکشن ایجنسی ہے یا سرکاری خیرات کا تماشا؟ حد ہوگئی! دل کر رہا ہے سیدھا کاؤنٹی سپروائزر کے دفتر جا کر پوچھوں، تمہیں کھلی چھٹی کس نے دی!“
”اسٹین ٹھیک ہے؟“ رائے نے آخرکار پوچھا۔
ملی نے اسپرنگ کی چرچراہٹ کے ساتھ اسٹورم ڈور کو دھکیلا اور پورچ میں آگئی۔
”ارماڈیلو کے بارے میں فکر کرو، میرے نکمے شوہر کے بارے میں نہیں۔“
”پھر بھی، جو شور شرابا میں نے سنا، اس کے بعد اسٹین کی خیریت جاننا بہتر ہوگا۔“ رائے نے کہا۔
ملی کی آنکھیں تنگ ہوگئیں۔ ”کال اسٹین نے نہیں کی تھی، رائے۔“
ملی کا سوالوں سے بچنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔
اگر کوئی موضوع اسے پسند نہ آتا، تو وہ فوراً بات بدل دیتی تھی۔
لیکن آج رائے ایسا نہیں ہونے دے گا...... خاص طور پر جب اسٹین کی خیریت داؤ پر لگی ہو۔
”ملی، میں ضرور تمہارے آرماڈیلو کو بھی دیکھ لوں گا، لیکن پہلے اسٹین کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“
ملی کے جبڑے کی ایک رگ پھڑکی۔
اس نے اپنے باغ کی طرف دیکھا، جہاں غالباً آرماڈیلو نے پھر کوئی نقصان پہنچایا تھا۔
اگر ملی نے اس کی درخواست مسترد کر دی تو رائے سوچ رہا تھا کہ کیا اس کا کولہا اس وقت ساتھ دے گا جب وہ ملی کو دھکیل کر اندر زبردستی داخل ہوگا۔
خوش قسمتی سے ایسا کرنے کی نوبت نہیں آئی۔
ملی نے اس پر ایک سخت گھورتی نگاہ ڈالی اور زور سے چلّائی۔ ”اسٹین!“
فرش پر پیروں کے گھسٹنے کی آواز آئی۔

Digest Novels .com

دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ کھلا، اور اس کا دوست برآمدے میں آ کر ملی کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

اس نے اپنے بازو پر خون سے لت پت ایک برتن خشک کرنے والا تولیا لپیٹ رکھا تھا۔

رائے نے واضح طور پر اس کی آنکھوں سے جھلکتا خوف محسوس کیا۔

"صبح بخیر، رائے۔" اشین نے زبردستی مسکراتے ہوئے کہا۔

"اشین۔" رائے نے اپنے انگوٹھے بیلٹ میں پھنسائے۔ "یہ تو خاصا گہرا کٹ لگتا ہے۔ سب ٹھیک ہے، برادر؟"

اشین نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ملی نے بات کاٹ دی۔

"اس آدمی کا باورچی خانے میں کیا کام؟ تم یقین نہیں کرو گے کہ اس نے کیا کیا؟"

رائے نے ملی کی بات درمیان میں روک دی۔ "میں اشین سے سننا چاہتا ہوں۔"

اشین کی نظریں رائے اور ملی کے درمیان بھٹکنے لگیں، اور اس کا چہرہ شرمندگی سے سرخ ہو گیا۔

"تم تو جانتے ہو مجھے۔" اس نے بمشکل ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمیشہ خود کو کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا لیتا ہوں۔"

"اب کی بار کیا ہوا؟" رائے نے دباؤ ڈالا۔

"آدمی بمقابلہ خربوزہ۔" اشین نے پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ "خربوزے کو کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ ہاتھ سے پھسل گیا۔"

رائے نے دل میں سوچا کہ کچھ تو گڑبڑ ہے...... وہ خربوزہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

ملی نے بازو باندھ لیے۔

"اب اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہو، رائے......"

لیکن رائے کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

اس کے دل میں ایک عجیب سی کھٹک پیدا ہو گئی تھی...... وہی احساس جو اسے ویتنام میں گشت کے دوران حملے سے پہلے ہوا کرتا تھا۔

"شاید تمہیں ٹانکے لگوانے کی ضرورت ہو، میں تمہیں اسپتال لے جا سکتا ہوں۔" رائے نے پیشکش کی، اس امید میں کہ اشین سے تنہائی میں بات ہو جائے۔

"شکریہ۔" اشین نے کہا۔ "مگر کوئی ضرورت نہیں۔ بس ایک خراش ہے۔"

"اگر تم دونوں کا رومانس ختم ہو گیا ہو تو میرے باغ کو توجہ کی ضرورت ہے۔" ملی نے چڑ کر کہا۔

رائے نے مزید کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا، کوئی ایسی بات جو اشین کو اسپتال چلنے پر آمادہ کر دے مگر اشین پہلے ہی واپس اندر کی طرف پلٹ چکا تھا۔

اب ملی کے ساتھ اکیلا رہ کر اور کوئی چارہ نہ پا کر رائے اس کے پیچھے برآمدے سے نیچے اترا، اپنے ٹرک کے پاس سے گزرا۔

لولو نے پسنجر کھڑکی سے اس پر ہمدردی بھری نظر ڈالی۔

رائے نے دل ہی دل میں چاہا کہ وہ لولو کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر یہاں سے نکل جائے۔ مگر وہ چند قدموں کے فاصلے پر ملی کے باغ تک پہنچ گیا۔

ہر طرف ہری بھری گھاس تھی، جس میں گلابوں کی کیاریاں تھیں، اور ان میں خوشنما پھول کھلے تھے جو بہار میں اپنے عروج پر پہنچنے والے تھے۔

زمین نرم اور نم دکھائی دے رہی تھی ..... بالکل وہی امتزاج جو ملی کے آرماڈیلو کے لیے آئیڈیل تھا۔

"تو، مسئلہ کیا ہے؟" رائے نے عادتاً پوچھا۔

ملی کا چہرہ بگڑ گیا۔ "کیا تم اندھے ہو؟"

رائے تقریباً تھا بھی...... اس نے موٹے لینس اور کالے فریم والی عینک پہن رکھی تھی...... وہ قسم جسے فوجی "برتھ کنٹرول گلاسز" کہتے تھے کیونکہ وہ اتنی بدصورت ہوتی تھیں کہ کوئی عورت انہیں پہننے والے کے پاس بھی نہیں پھٹکتی تھی۔

جب وہ عینک اتارتا، تو ساری دنیا دُھندلی ہو جاتی۔

لیکن ابھی اس کی عینک آنکھوں پر تھی، اور وہ آرماڈیلو کی تباہ کاری بخوبی دیکھ سکتا تھا — ٹیکساس اور میکسیکو کے علاقوں میں پایا جانے والا یہ چھوٹا، خول دار جانور، جس کا جسم کسی قدیم زرہ بکتر کی طرح مضبوط پرتوں میں لپٹا ہوا، اپنی محدود جسامت کے باوجود زمین کھودنے اور لان اُجاڑنے میں خاصی مہارت رکھتا تھا۔

"اب دیکھ رہے ہو نا؟" ملی نے اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں مٹی ابھری ہوئی تھی...... تین سے چار انچ گہرے مخروطی گڑھے...... آرماڈیلو کی تازہ خوراک تلاش کرنے کی مہم کے نشانات۔

"کمبخت پھر میرے پھولوں کی کیاریوں کو برباد کر رہا ہے۔" ملی بڑبڑائی۔

"یہ واقعی افسوسناک بات ہے۔" رائے نے کہا، اور وہ واقعی دل سے کہہ رہا تھا۔ یہ پھول بہت خوب صورت تھے۔

Digest Novels .com

"مجھے تمہارے آنسو نہیں چاہئیں، بس تم اس کمبخت کو مار ڈالو۔" ملی نے سخت لہجے میں کہا۔

"جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا تھا ملی، میں اس چیز کو نہیں مار سکتا جسے میں دیکھ ہی نہ سکوں۔" رائے نے جواب دیا۔

جب بھی رائے ملی کے آرماڈیلو کے مسئلے پر آیا تھا، اسے کبھی وہ جانور ملا ہی نہیں۔ صرف اس کے نشانات ملے تھے۔

آج بھی صورت حال ویسی ہی تھی۔ اور اگر آرماڈیلو اس کے سامنے آ بھی جاتا، تو بھی وہ اسے نہیں مارتا۔

آرماڈیلو محض زندہ رہنے کی کوشش کر رہا تھا...... بالکل رائے کی طرح...... اور اسے مارنے سے ملی کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔

اسے پکڑ کر ہٹا دینا بھی فائدہ مند نہ ہوتا۔

ایسا کرنے پر بس کوئی دوسرا آرماڈیلو آ کر اس کی جگہ لے لیتا۔

ملی کا مسئلہ حل کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اس جانور کی خوراک کے ذخیرے پر حملہ کیا جائے...... یعنی کیڑوں کو ختم کیا جائے۔ یہی بات رائے نے اسے اپنی پچھلی آمد پر بھی سمجھائی تھی۔

اسی دن جب ملی نے اس پر لوہے کے پائپ سے حملہ کیا تھا۔ اس یاد نے رائے کو محتاط کر دیا۔

چوکنی نظر اطراف میں ڈالتے ہوئے اس یقینی بنایا کہ کوئی دوسرا پائپ ملی کے قریب نہ ہو۔

"کیا تم نے وہ کیڑے مار دوا آزمائی تھی جس کے بارے میں ہم نے بات کی تھی؟" رائے نے پوچھا۔

"کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے پاس اتنا وقت ہے کہ کسی زہریلے اسپرے کے اثر کا انتظار کروں؟" ملی نے جھنجلا کر کہا۔

"روز فیسٹیول بس ایک ہفتے بعد ہے، اور میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس سال کا باغبانی ایوارڈ جین جانسن کو نہیں جانے دوں گی۔"

ملی نے اپنے ایپرن کی جیب سے شاخیں کاٹنے والی قینچی نکالی۔

اس نے پہلے رائے پر لوہے کے پائپ سے حملہ کیا تھا، اب کیا قینچی کی باری تھی؟ رائے کا ہاتھ بے اختیار اپنے پستول کی طرف گیا۔ مگر ملی نے حملہ نہیں کیا۔

وہ سیدھی ایک گلاب کے پودے کی طرف گئی اور ایک مرجھایا ہوا پھول کاٹ دیا۔

"میرے آرماڈیلو کا مسئلہ حل کرو، رائے۔" ملی نے سرد لہجے میں کہا۔

رائے کے پاس ایک حل تھا...... وہی حل جو ملی کو پہلے بھی پسند نہیں آیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے ٹرک کی طرف بڑھا اور ہارڈ ویئر اسٹور سے لائی گئی کیڑے مار دوا نکال لی۔

لولو نے پسنجر نشست سے اسے غور سے دیکھا۔

وہ صرف یہی سوچتا رہا کہ ملی کو کیسے مزید صاف انداز میں سمجھائے کہ آرماڈیلو کے کھانے کا ذریعہ ختم کیے بغیر باغ کی کھدائی بند نہیں ہو سکتی۔

رائے نے ٹرک کا دروازہ بند کیا، لولو بھونکی۔ رائے کو یقین نہ تھا کہ یہ اتفاق کی بھونک تھی یا لولو کی طرف سے نیک تمناؤں کا اظہار تھا۔

وہ واپس باغ میں آیا، جہاں ملی اب بھی پودوں کی کانٹ چھانٹ میں مصروف تھی... کیڑے مار دوا کا ڈبا اس کے پاس رکھ دیا۔

"کچھ جانوروں کو واقعی ختم کرنا پڑتا ہے، ملی۔" رائے نے نرمی سے کہا۔ "لیکن تمہارا آرماڈیلو ان میں سے نہیں۔"

جب رائے اپنے ٹرک میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہوا تو اسٹین نے دوسری منزل کی کھڑکی سے اسے دیکھا، اس کی آنکھیں اب بھی خوفزدہ تھیں۔ رائے کے دل میں جو خلش اٹھ رہی تھی، وہ دوبارہ جاگی...... عین اسی لمحے زہریلی دوا کا ڈبا فضا میں اچھلا اور اس کے ٹرک کے بونٹ سے ٹکرا کر پھٹ گیا۔

☆☆☆

اگلے دن کام پر حالات سست تھے۔ رائے نے زیادہ تر وقت جانوروں کے پنجروں میں گزارا۔ چند کتوں کو نس بندی کے لیے لے جانا تھا، سو وہ انہیں اینیمل سرجری سینٹر لے گیا لیکن اس دوران اس کے ذہن میں اسٹین کا خیال گردش کرتا رہا۔

رائے نے سوچا کہ وہ اس کا حال چال پوچھ لے مگر اسٹین کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ گھر کے فون کا آپشن تھا لیکن رائے کو یقین نہیں تھا کہ ملی کے ہوتے ہوئے اسٹین کھل کر بات کر پائے گا۔ اس لیے اس نے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا، جانتے ہوئے کہ وہ ہفتے کی رات بار میں اسٹین سے مل لے گا۔

مگر رائے کی یہ امید غلط ثابت ہوئی۔

اسٹین اس رات بار میں آیا ہی نہیں اور رائے گھر لوٹ آیا۔ اس کا بٹوا ذرا ہلکا اور دل تھوڑا بھاری تھا...... اپنے دوست کی فکر میں مبتلا تھا۔

گھر آ کر وہ آرام دہ کرسی پر ڈھے گیا۔ لولو اس کے قدموں میں آ لیٹی۔ رائے نے وینڈل ہاؤس پر دوبارہ فون کرنے کا سوچا مگر پھر یہ خیال آیا کہ کہیں ملی کو رات گئے اس کا......

فون کرنا بُرا نہ لگے اور کوئی ہنگامہ نہ کھڑا ہو جائے، سو اس نے ارادہ ترک کر دیا۔ اس نے فون کو ایک طرف رکھ کر ریموٹ اٹھا لیا۔

کولمبو دیکھنے کا وقت نکل چکا تھا اور کرائم چینل کا ''مرڈر بائے مڈنائٹ'' شروع ہونے میں ابھی دیر تھی، لہٰذا اس نے اینیمل پلانیٹ لگا لیا...... ایک قسط جس میں آرماڈیلو پر بات ہو رہی تھی، اور اسے اس عجیب اتفاق پر ہنسی آگئی۔

اس نے سنا کہ کس طرح میزبان آرماڈیلو کے ہجرت کے انداز، خوراک کی عادات اور ان کی زرہ نما کھال کے بارے میں بتا رہا تھا، جس سے متاثر ہو کر ہتھیاروں کے ماہرین نے تحفظاتی مواد تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ خشک اور بے جان تبصرہ سن کر رائے نیند میں ڈوب گیا۔

کئی گھنٹے بعد رائے جاگا تو گردن اکڑی ہوئی تھی۔ اس نے گھڑی میں دیکھا...... آدھی رات گزر چکی تھی، اور اب بستر پر جانے کا وقت تھا۔ مگر ٹی وی بند کرنے کے بجائے اس نے چینل بدل کر کرائم چینل لگا دیا۔

چند لمحے لگے اسے سمجھنے میں کہ کیا ہو رہا ہے، کیونکہ پروگرام پہلے سے جاری تھا۔ یہ ایک اور گھریلو تشدد کا کیس تھا مگر اس بار متاثرہ شخص مرد تھا۔

''مردوں کو سکھایا جاتا ہے کہ عورت پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔'' قیدیوں کی وردی پہنے ایک آدمی، جس کا نام کلٹ تھا، ایک دھاتی میز کے پیچھے بیٹھا کہہ رہا تھا۔ ''میں پلٹ کر وار نہیں کر سکتا تھا۔ اور نہ ہی میں یہ سب روک سکتا تھا۔''

وہ بتا رہا تھا کہ کس طرح شرم کے مارے وہ پولیس کو بلانے سے ڈرتا رہا کہ لوگ کیا کہیں گے۔ جب اس نے ہمت کر کے مدد مانگنے کی کوشش کی، تو اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا گیا، حالانکہ اس کے جسم پر واضح چوٹیں تھیں۔

''کچھ غیرت پیدا کرو۔'' ایک پولیس والے نے کہا۔ ''اپنی عورت کو قابو نہیں کر سکتے؟''

دوسرے نے طنز کیا تھا۔ ''یہ تو بس ایک خراش ہے۔''

یہ الفاظ رائے کے ذہن میں گونجنے لگے۔ کیا اسٹین نے بھی یہی الفاظ نہیں کہے تھے؟

کلٹ نے مزید بتایا کہ نظام نے کس طرح اسے مایوس کیا، اور آخر کار وہ ٹوٹ گیا۔

رائے اسٹین کی نہ ختم ہونے والی چوٹوں، خراشوں اور اس کی خوفزدہ نظریں یاد کرتا رہا۔

کیا اسٹین بھی مار کھاتا تھا؟

رائے کے پیٹ میں ہونے والی کسک پھر سے لوٹ آئی۔ کم از کم اس بار وہ جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔

☆☆☆

رائے کے آخری دن دفتر میں معمول سے زیادہ لوگ موجود تھے، اور پولین غیر معمولی طور پر دوستانہ انداز میں پیش آ رہی تھی۔

وہ جانتا تھا کہ اس کی ریٹائرمنٹ کے موقع پر کوئی پارٹی پلان کی گئی ہے اور کل تک وہ اس کا بے چینی سے منتظر بھی تھا۔

مگر اسٹین کے بارے میں اپنی حالیہ دریافت نے اس کے سارے خیالات بدل دیے تھے۔ اب وہ بس اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس الجھن میں تھا کہ اسے کس بات پر یقین کرنا چاہیے۔

گزشتہ رات اسے پورا یقین تھا کہ اسٹین پر ظلم ہوتا ہے لیکن آج صبح یہ خیال کچھ بے تکا سا لگنے لگا تھا۔

اسٹین ایک سابقہ فوجی تھا، اور یہ سوچنا کہ للی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے، مضحکہ خیز لگتا تھا۔

پھر بھی، رائے نے اسٹین کی ڈری ڈری نظریں، اس کے زخم اور خراشیں خود دیکھی تھیں۔ اور پھر اس کے اندر کی بے چینی......

منطق اور وجدان میں جنگ جاری تھی، اور رائے کو سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کسے ترجیح دے۔

وہ ابھی اسی ادھیڑ بُن میں تھا جب اس کا ساتھی کارکن ناش اس کے قریب آیا۔ ناش کا گنجا سر فلورلائٹ میں چمک رہا تھا اور اس سے ایسی بدبو آ رہی تھی جیسے کسی نیولے کی۔

رائے نے ناگواری سے ناک چڑھائی۔

اس نے تمباکو کا ایک ڈبا نکالا۔ ''بڑا دن ہے آج تمہارے لیے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا۔ وہی عام سا کام۔'' رائے نے بے دلی سے جواب دیا۔

اس کا دماغ اب بھی اسٹین میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ ''سنو ناش، کبھی تمہیں للی وینڈل کے گھر پر سروس کال پر جانا پڑا؟''

''کون ایسا ہے جسے نہیں جانا پڑا ہو؟'' ناش نے کہا۔ ''تم جانتے ہو للی کو اپنے گلابوں کی کتنی فکر رہتی ہے۔''

''کبھی کچھ...... عجیب سا محسوس کیا؟'' رائے نے بات کرتے ہوئے رک کر سوچا کہ ناش کو کتنا بتانا چاہیے۔

''عجیب کیسے؟'' ناش نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''تم جانتے تو ہو، للی کے بارے میں۔'' اس نے مبہم انداز میں کہا۔

''وہ عورت تو ایک نمبر کی پاگل ہے اور ساتھ میں شدید

Digest Novels .com

غصے والی...... اگر تمہارا یہی مطلب ہے تو۔ ایک بار تو میں نے خود دیکھا، وہ اسٹین کے پیچھے بیلچہ لے کے بھاگ رہی تھی۔ بیلچہ سیدھا اس کی پشت پر مارا۔ اور وہ ایسے گرا جیسے ریت کی بوری۔“

رائے نے خود اپنے تجربات یاد کیے، جب ملی نے باغ کے پائپ اور زہریلے اسپرے کے ڈبے سے اس پر حملہ کیا تھا، اور اب اسے بخوبی اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر پر حالات کس طرح بگڑ سکتے ہیں۔

”بس یہی کچھ تھا؟“ رائے نے تجسس سے پوچھا کہ کہیں کچھ اور تو نہیں۔

”کیا یہی کافی نہیں؟“ ناش نے کہا۔

یہ رائے کے لیے کافی تھا۔

”یقیناً، یہ اسٹین کی سب سے بڑی غلطی ہے جو اس نے اس عورت سے شادی کی۔“ ناش نے بات جاری رکھی۔ ”لگتا ہے ہم سب کو اپنی اپنی صلیبیں اٹھانی پڑتی ہیں، اور اسٹین کی صلیب ملی ہے اور وہ بے چارہ۔“

رائے کے معدے میں مروڑ اٹھی وہ خود بھی یہی سوچ چکا تھا۔ کیا سب لوگ ملی کے رویے کو اسی طرح جواز فراہم کر رہے تھے؟ کہ یہ کسی نہ کسی طرح اسٹین کی اپنی غلطی ہے؟ اسے اسٹین سے بات کرنی تھی۔ آمنے سامنے۔ ملی سے دور رہ کر۔ اور اسے یہ ابھی کرنا تھا۔

رائے نے بریک روم کی طرف دیکھا۔ دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا، اندر جھنڈیاں اور غبارے نظر آرہے تھے۔ اسے اپنے ساتھی کارکنوں کو مایوس کرنے کا افسوس تھا لیکن ایک دوست مشکل میں تھا اور یہ زیادہ اہم تھا۔

خوش قسمتی سے رائے کو موقع مل گیا کہ وہ خوش اسلوبی سے کھسک جائے۔

”ملی وینڈل کی کال۔“ پولین نے پکارا، اس کی نظریں ناش پر تھیں، فون اب بھی کان سے لگا ہوا تھا۔

”شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر......“ ناش نے مسکرا کر کہا۔

”میں کرلوں گا۔“ رائے نے جلدی سے کہا۔

پولین نے چیونگم چبائی اور رائے کو گھور کر دیکھا۔

”یہ تمہاری نوکری کا آخری دن ہے۔ تمہیں اس کا لطف لینا چاہیے۔“

ناش نے بریک روم کی طرف دیکھا، پھر جھک کر سرگوشی کی۔ ”پولین نے چاکلیٹ کیک بنایا ہے۔“

”مجھے چاکلیٹ بہت پسند ہے۔“ رائے نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔ ”کیک تو بچا رہے گا، ہے نا؟ بس یہ ایک آخری سروس کال کرنے دو، یادگار کے طور پر۔“

ناش نے ناک بھوں چڑھائی۔ ”تمہیں یقین ہے، تم اسی قسم کی یادگار چاہتے ہو؟“

لولو، رائے کے ساتھ اس کی گاڑی تک آئی اور جلد ہی وہ ٹیکساس تھرٹی ون پر مشرق کی طرف جا رہے تھے۔

وہ ان ہی مضافاتی اسٹورز، چھوٹے کیبنوں، ٹریلر پارکس، کھلے میدانوں اور بل بورڈز کے پاس سے گزرے۔ اس بار رائے کی توجہ گلاب میلے کے اشتہار نے نہیں کھینچی بلکہ ایک بل بورڈ نے، جو گھریلو تشدد کے ہیلپ لائن کے بارے میں تھا۔ بل بورڈ پر دو مردوں کی تصویر تھی۔ ایک کا سر جھکا ہوا تھا، دوسرے نے اس کے کندھے پکڑے ہوئے تھے اور نیچے تحریر تھا:

اب دوست کی مدد کرنے کا وقت ہے۔

رائے نے سوچا، نجانے وہ کتنی بار اس بورڈ کے پاس سے یونہی بے دھیانی میں گزر چکا ہے، اور نجانے کتنے لوگ اور بھی اسے نظر انداز کر چکے ہیں۔ چند منٹ بعد، وہ وینڈل کے گھر کے راستے پر مڑ گیا۔ سڑک کے اختتام پر گاڑی روکی۔

ملی پورچ میں بیٹھی تھی، ہمیشہ کی طرح خاکی پینٹ، سفید بٹن والی قمیص، اور ایپرن میں...... اس بار خون سے پاک مگر اسٹین کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

رائے نے لولو کے لیے گاڑی میں اے سی چلتا چھوڑا اور خود گاڑی سے اترا۔ درد کی ایک تیز لہر اس کے کولہے میں اٹھی۔ اس نے دانت بھینچے، پسٹل کو ایڈجسٹ کیا، اور پھر ملی کی طرف بڑھ گیا۔

”رائے!“ ملی نے خوشی سے چیخ کر کہا۔ ”وہ باہر ہے۔ وہ آرماڈیلو...... اُدھر دیکھو۔“ اس نے اپنے باغ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسٹین میرے لیے اس پر نظر رکھ رہا ہے۔ ہے نا، اسٹین؟“

رائے نے مڑ کر دیکھا تو اسٹین باغ میں اپنی چھڑی کے سہارے کھڑا تھا۔ وہ تھکا ہوا لگ رہا تھا، چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس کے بازو پر ”خربوزہ واقعے“ کی وجہ سے پٹی بندھی ہوئی تھی اور گال پر تازہ چوٹ کا نشان تھا۔

رائے اس کی طرف چل دیا۔

”صبح بخیر۔“ اسٹین نے کہا مگر اس کی نظریں اب بھی ملی کے باغ پر جمی ہوئی تھیں۔

”رائے، سن رہے ہو، میں کیا کہہ رہی ہوں؟“ ملی نے آواز لگائی۔ ”آرماڈیلو...... اب تم اسے مار سکتے ہو۔“

رائے نے لی کی طرف پیٹھ کی اور ساری توجہ اسٹین پر مرکوز کر دی۔ ''سب ٹھیک ہے نا، دوست؟''

اسٹین کی اداس آنکھیں اس پر جم گئیں۔ ''کیوں نہیں ہوگا؟''

رائے کے پاس کئی وجوہات تھیں مگر یہ وقت ان پر بات کرنے کا نہیں تھا۔ خاص طور پر لی کے پاس کھڑے ہونے کی صورت میں۔

اس نے سوچا کہ کسی طرح اسٹین کو یہاں سے لے جانے کا بہانہ بنائے، ایسا کوئی طریقہ جو لی کو مشکوک نہ لگے۔

''لوگ آج شیلٹر میں میرے لیے ریٹائرمنٹ پارٹی کر رہے ہیں۔'' رائے نے اپنے ٹرک کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''چلو میرے ساتھ چلتے ہیں۔ کیک کھاتے ہیں۔ پھر شاید بعد میں ایک بیئر بھی پی لیں۔''

''پتا نہیں.....'' اسٹین نے لی کی طرف دیکھا، جو اَب برآمدے سے نیچے آ رہی تھی۔

''آرماڈیلو، رائے۔'' لی نے کہا، اس کی آواز سپاٹ تھی، خوشی غائب ہو چکی تھی۔

''میں اسے نہیں ماروں گا، لی۔''

''کیا مطلب کہ تم نہیں مارو گے؟'' اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ''تم نے ہی کہا تھا کہ جسے دیکھ نہ سکو اسے مار نہیں سکتے۔ تو آرماڈیلو تو سامنے ہے۔ اسٹین، اسے دکھاؤ۔''

اسٹین نے فرمانبرداری سے لی کے باغ کے ایک حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک بلی جتنا بڑا جانور آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ آرماڈیلو کی زرہ نما کھال، بھورے اور بھاری چھلکوں کے ساتھ، مٹی میں تقریباً چھپ سی گئی تھی۔

اس جانور نے سر اٹھایا، اس کی ننھی آنکھیں نیم وا تھیں۔ اس نے ہوا کو سونگھا اور پھر زمین کھودنے لگا۔

رائے وہیں کھڑا رہا۔

''اب سنو رائے، اور غور سے سنو۔ میں کبھی فیسٹیول کی کوئین تھی اور ٹیکساس اسٹیٹ بیوٹی پیجنٹ کے لیے جا رہی تھی۔ اس وقت میں نے اسٹین کے ساتھ بھاگ کر شادی کر لی۔ اس کی چمچماتی گاڑی اور کالج ڈگری دیکھ کر لگا تھا کہ وہ کہیں پہنچے گا۔ اور دیکھو، مجھے کہاں لے آیا۔'' اس نے حقارت سے اپنے گھر کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی اور میں پوری زندگی اس نقصان کو پورا کرنے کی کوشش کرتی رہی جو اس نے مجھ سے چھینا۔''

اس نے اپنے کندھے پیچھے کیے۔ ''یقین کر لو لوگ تب ضرور نوٹس لیں گے جب میں یہ گلابوں کا مقابلہ جیتوں گی۔ اور میں کسی جین جانسن جیسی عورت یا کسی بیوقوف آرماڈیلو کو یہ موقع چھیننے نہیں دوں گی۔''

لی نے اپنے بازو سینے پر لپیٹ لیے۔ ''بہتر ہے تم کچھ کرو، رائے۔ کیونکہ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو، خدا کی قسم، میں خود کچھ کر دکھاؤں گی۔''

''میں نے تو کیا تھا کچھ۔'' رائے نے تلخی سے کہا۔ ''ہر بار جب یہاں آیا تھا۔ یہ میرا قصور نہیں کہ تمہیں میری تدبیریں پسند نہیں آئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں کافی خون خرابا دیکھ لیا ہے۔ چاہے گلابوں کا میلہ ہو یا کچھ اور، میں اس آرماڈیلو کو نہیں ماروں گا۔ اس سے نجات پانے کا ایک انسان دوست طریقہ بھی ہے۔''

لی کا گلا اور پھر چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ آنکھیں وحشیوں کی طرح پھیل گئیں۔ اس نے مٹھیاں بھینچیں، ایک جنگلی چیخ ماری، اور رائے پر حملہ کر دیا۔

رائے پیچھے ہٹتے ہوئے لڑکھڑا گیا، اس کے خراب کولہے نے جواب دے دیا۔ اس نے ہاتھ ہلائے، توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

لولو کے بھونکنے کی آواز آئی، اور اسی لمحے رائے دھڑام سے زمین پر جا گرا۔ جسم میں درد کی ایک شدید لہر دوڑ گئی۔

رائے نے کروٹ لی، اپنے جسم کو سمیٹ کر کروٹ کے بل ہوا، اس طرح اس کا پستول سامنے آ گیا تھا۔

لی نے یہ دیکھتے ہی لپک کر جلدی سے وہ پستول ہولسٹر سے نکال لیا۔

''گن!'' رائے نے چیخ کر اسٹین کو خبردار کرنے کی کوشش کی۔

ایک فائر ہوا۔

مزید درد۔

رائے نے جلدی سے اپنے جسم کو ٹٹولا، زخم ڈھونڈنے کی کوشش کی، مگر درد اس کے خراب کولہے سے اٹھ رہا تھا۔

اس نے اپنے دوست کو دیکھا، جو اَب بھی کھڑا تھا، لی کو گھور رہا تھا۔

''نیچے ہو جاؤ؟'' رائے نے پھر چیخ کر کہا۔

مگر اسٹین نے حرکت نہ کی۔ وہ بس گھورتا رہا۔

اس کی آنکھوں میں خوف نہیں تھا بلکہ کوئی تاثر ہی نہیں تھا۔

ایک اور گولی چلی۔

Digest Novels .com

یہ نشانہ بھی خطا گیا۔

رائے نے زمین سے چمٹ کر خود کو بچانے کی کوشش کی۔

اس کے آلۂ سماعت میں سیٹیاں بج رہی تھیں مگر اس کے باوجود اسے لولو کے بھونکنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''یہ منحوس کُتا چپ کیوں نہیں ہوتا!'' ملی چلائی۔

اس نے رائے کے پستول کا رخ ٹرک کی طرف موڑ دیا۔

رائے کا جسم خوف سے سن ہو گیا۔ نہیں......لولو نہیں۔

اس نے خود کو ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل اٹھانے پر مجبور کیا، کھڑے ہونے کی کوشش کی۔

ملی نے گولی چلائی۔ یہ گولی کسی دھات سے ٹکرائی تھی۔

لولو کے سسکارنے کی آواز آئی۔

رائے کا دل خالی ہو گیا۔ ''لولو!'' وہ رو پڑا، بے تابی سے اس کی بھونکنے کی آواز سننے کی کوشش کرتا رہا۔

اس نے ٹرک کی طرف دیکھنے کی کوشش کی کہ کہیں لولو زخمی تو نہیں ہوئی، مگر ملی راستے میں حائل ہو گئی۔

اب ملی نے پستول کا رخ آرماڈیلو کی طرف کر دیا تھا۔

اس بار اسٹین حرکت کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ سخت ہو چکا تھا، آنکھوں کی ویرانی ختم ہو چکی تھی۔ اب ان میں غصہ تھا۔

وہ ملی کی طرف بڑھا، جو اب بھی آرماڈیلو پر دھیان مرکوز کیے ہوئے تھی۔

اسٹین نے اپنی چھڑی اٹھائی، مارنے کے لیے۔

ملی نے گولی چلائی۔

جھٹکے سے پیچھے ہٹی......اور زمین پر گر گئی۔

اسٹین اب بھی کھڑا تھا، چھڑی اٹھائے ہوئے، آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ تقریباً اتنی ہی بڑی جتنی ملی کے گلے میں نظر آنے والے گولی کے سوراخ کی۔

رائے حیرت سے باغ کی طرف دیکھنے لگا، اسی سمت جہاں ملی نے آخری گولی چلائی تھی۔

آرماڈیلو اب بھی زمین کھودنے میں مصروف تھا۔ سورج کی روشنی اس کے زرہ نما خول پر چمک رہی تھی، جس پر اب ایک سیاہ لکیر بن گئی تھی......گولی کے رگڑنے کا نشان، جو اس کی کھال سے ٹکرا کر واپس ملی کو جا لگی تھی۔

رائے نے ایک گہری سانس لی، وہ اٹھ کر لولو کی خیریت دریافت کرنے جانا چاہتا تھا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر اس کا کولہا ساتھ نہ دے سکا۔

اس نے لولو کو آواز دی، سیٹی بجانے کی کوشش کی، آنکھیں ٹرک پر مرکوز کیے رکھیں۔

''چلو بیٹی، آجاؤ۔'' وہ انتظار کرتا رہا، امید کرتا رہا، دعا کرتا رہا۔ اور جب لولو نے کھڑکی سے زور سے چھلانگ لگائی تو رائے نے سکون اور خوشی سے تقریباً رونا شروع کر دیا۔

اسٹین نے رائے کو اٹھنے میں مدد دی۔ ''ٹھیک ہو؟''

رائے نے اثبات میں سر ہلایا۔

دونوں نے ملی کی طرف دیکھا، جو زمین پر خون میں لت پت تڑپ رہی تھی، سانس لینے کے لیے جدوجہد کر رہی تھی۔

رائے نے ریڈیو کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ مدد کے لیے کال کرے، مگر اسٹین نے اس کا بازو پکڑ کر التجا کی۔

''پلیز، مت کرو۔''

رائے نے دوبارہ ملی کی طرف دیکھا۔

اس نے اسٹین کے بارے میں سوچا......کہ کیسے ملی نے اس کی زندگی جہنم بنا دی تھی۔

اور اگر بچ جاتی تو دوبارہ بنا دیتی۔

رائے نے اپنی زندگی میں کافی خون خرابا دیکھ لیا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ بعض اوقات کچھ ضرر رساں چیزوں کا خاتمہ ضروری ہوتا ہے، اور ملی بھی ان میں سے ایک تھی۔ اس نے ریڈیو چھوڑ دیا۔

اسٹین نے شکر گزار نظروں سے سر ہلایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔

راستے میں وہ نلکے کے پاس رکا، جھاڑیوں میں ہاتھ ڈالا، اور ایک چھوٹا سا دھاتی کنٹینر نکالا......

اسٹین نے ڈھکن کھولا، آرماڈیلو کے پاس گیا، اور مٹی پر کیڑوں کے گچھے بکھیر دیے۔

رائے یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

ملی کی ساری مصیبت...... آرماڈیلو......کو اسٹین دراصل خود کھانا دے کر باغ میں روکے رکھ رہا تھا۔

''انصاف کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں۔'' اسٹین نے کہا، جب وہ مزید کیڑے مٹی میں ڈال رہا تھا۔ ''اور یہ میرا انصاف تھا۔''

آرماڈیلو نے سر اٹھا کر اسٹین کی طرف دیکھا، اور رائے کو لگا جیسے اس شرارتی جانور نے مسکرا کر اسٹین کو شکریہ کہا ہو۔

❖❖❖

Digest Novels .com

بدلہ

عکسِ فاطمہ

محبت کرنے والے ایک دوسرے سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتے... مگر اچانک ہی وہ جدا ہو گئے... اس جدائی نے اس کے اندر بدلے کی آگ بھڑکا دی تھی...

انتقام لینے والے شخص کا چونکا دینے والا انجام......

جان بیری کو آغاز میں ہی مشکلات کا احساس ہونے لگا تھا اور وہ خوش تھا کہ دو خطوط اس نے پہلے سے ہی لکھ رکھے تھے ورنہ شاید خطوط کو پیر ڈاک کرنے کا موقع بھی نہ ملتا۔ مشکلات کا احساس اسے امیگریشن آفس میں ہوا تھا۔ امیگریشن آفیسر کا رویہ بظاہر معمول کے مطابق تھا لیکن جان بیری کچھ پُریقین نہیں تھا۔ اسے لگا جیسے آفیسر کا انداز معمول کے مطابق نہیں ہے بلکہ وہ جان بیری کو کھٹکنے والی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ آفیسر نے نیچے بیری کا نام پڑھا۔ وہاں جان

بیری لکھا تھا۔ ٹورسٹ کارڈ پر امیگریشن سے نکل کر جان بیری عام سے انداز میں چلنے لگا لیکن خود کو پلٹ کر دیکھنے سے باز نہ رکھ سکا۔ ڈیسک پر موجود امیگریشن آفیسر کی نگاہ بیری پر ہی تھی۔

بیری نے کسٹم سے سوٹ کیس اٹھایا اور سینٹ جوزف ائرپورٹ کے مرکزی حصے میں داخل ہوا۔ سب سے پہلے اس نے دونوں خطوط میل باکس کی نذر کیے۔

وہ اپنی بیوی نورما کے ساتھ ہنی مون پر تین سال پہلے کیریبین آیا تھا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا تھا، جان بیری نے ٹیکسی لی اور سیدھا وہیں گیا جہاں وہ پچھلی بار نورما کے ساتھ ٹھہرا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ مالک کا نام للل میکس تھا۔ وہ بیری کو پہچان گیا تھا۔ للل میکس نے گرمجوشی کے ساتھ ہاتھ ملایا۔

"تم بالکل نہیں بدلے۔" وہ بولا۔ "اور نورما کا کیا حال ہے؟"

"بدلتا کیسے؟ میں کوئی تیس سال بعد نہیں آیا ہوں...... نورما؟ اسے نہیں معلوم کہ میں یہاں ہوں۔" بیری نے کہا۔

"اسے نہیں معلوم......کیا مطلب ہوا؟"

"میں بتاؤں گا۔ پہلے ڈرنک کا بندوبست کرو اور سوٹ کیس سے میری جان چھڑاؤ۔"

"تمہارے لیے وہی کمرا حاضر ہے جہاں پہلے قیام کیا تھا۔" میکس نے سوٹ کیس اٹھایا اور بیری کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ سیڑھیوں کے ذریعے وہ بیری کو اوپر ایک بڑے کمرے میں لایا۔ وہ وہاں کا بہترین کمرا تھا۔ بیرونی مناظر سے لطف اندوز ہونے کے لیے کمرے میں ایک بالکونی بھی تھی جہاں سے کیریبین کی فرنچ اسٹیٹ کا چمک دار سفید محل نظر آتا تھا۔

"یہاں سے تمہاری تین سال پہلے کی یادوں کا اعادہ ہوگا۔" میکس مسکرایا۔

بیری آہستہ سے گھوما اور کمرے کا جائزہ لیا پھر بالکونی میں آگیا۔ وہ متنفر انداز میں سامنے صدارتی محل کو گھور رہا تھا جو اسے یاد آرہا تھا بلکہ یاد تھا۔ وہ بھولا کب تھا...... وہ یادیں خوش کن نہیں تھیں۔

میکس اپنے مہمان کے انداز سے الجھن کا شکار ہوگیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا۔ بیری بالکونی سے ہٹ کر ٹہلنے لگا۔

"تم سوال تو کرو گے کہ میں تواتر کے ساتھ خطوط میں سیاسی سوالات کیوں اٹھاتا رہا۔ میرا مطلب ایمل نیرائی کی سیاسی پیش قدمی سے ہے۔"

"تم نے لکھا تھا کہ تم نیرائی کے سیاسی کیریئر میں دلچسپی رکھتے ہو؟" میکس نے جواب دیا۔

"تمہیں حیرت نہیں ہوئی تھی کہ اس دلچسپی کا مقصد کیا ہے؟ نہیں، میرے خیال میں تمہیں حیرت نہیں ہوئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں کہ تم دوستوں کی سرگرمیوں پر سوالات اٹھانے والے آدمی نہیں ہوگے۔" بیری نے خود ہی جواب دیا اور میکس کے قریب بیٹھ گیا۔

"تمہیں یاد ہے وہ رات جب محل کے گارڈز میری بیوی کو گرفتار کرکے ہیڈ کوارٹر لے گئے تھے؟"

"ہاں، جب صدارتی قافلہ گزر رہا تھا تو نورما بروقت گاڑی نہیں روک سکی تھی اور گارڈز نے گرفتار کرلیا تھا۔" میکس نے جواب دیا۔

"ہم گھنٹوں اس کی تلاش میں سرگرداں پھرتے رہے اور جب ناکام واپس آئے تو وہ یہیں اس کمرے میں بستر پر تھی۔ وہ رو رہی تھی۔" بیری نے یاد دلایا۔

"ہاں، مجھے یاد ہے۔ ہم گارڈز کے پاس بھی گئے تھے۔ انہوں نے جواب دیا تھا کہ انہوں نے اس کو تھوڑی دیر بعد آزاد کردیا تھا۔"

بیری کے جبڑے بھنچ گئے۔

"میکس! نورما نے بتایا تھا کہ سب ٹھیک ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ صرف پریشان ہوگئی تھی لیکن حقیقت کچھ اور تھی جو چند ہفتوں بعد عیاں ہوئی۔ میکس! نورما کی بے حرمتی کی گئی تھی۔" بیری نے کہا۔

میکس کا منہ کھل گیا۔ "کیا کہہ رہے ہو؟"

"ٹھیک کہہ رہا ہوں۔" بیری کے چہرے پر اذیت تھی۔ "اور بے حرمتی کرنے والا نیرائی تھا جو اس وقت صدر نہیں بنا تھا اور محل کے گارڈز کا سربراہ تھا۔"

میکس نے دونوں ہاتھ اپنے لرزتے گھٹنوں پر رکھ دیے۔ "تو تم اس لیے واپس آئے ہو؟"

"میکس! میں نے انتظار کیا تھا۔ اس کو قتل کرنا میرے لیے کافی نہیں تھا۔ مرنا تو ہر کسی کو پڑتا ہے۔ یہاں تو بہت سے افراد حادثات میں مرجاتے ہیں۔ میں جب تمہیں خطوط لکھ رہا تھا تو تم نے بتایا تھا کہ نیرائی پریذیڈنٹ بننے کے لیے بھرپور کام کررہا ہے۔ میں نے سوچا یہ اچھا ہے۔ ایک خط میں تم نے مجھے بتایا تھا کہ افواہ گرم ہے کہ نیرائی اپنی پسندیدہ ترین لڑکی سے شادی کرنے والا ہے۔ میں نے سوچا یہ اور اچھی بات ہے۔ میں نے مزید انتظار کیا کہ وہ شادی کرلے، مزید اچھا ہوگا کہ صاحب اولاد بھی ہوجائے پھر میرا وقت شروع ہوگا۔ نیرائی کے پاس کھونے کے لیے بہت کچھ ہوگا۔" بیری

Digest Novels .com

نے مزید وضاحت کی۔

میکس اچھی طرح بیری کے ارادے کو سمجھ گیا تھا۔ اس نے سرگوشی کی۔

"میرے دوست، یہ پاگل پن ہے۔ تم اس کے قریب بھی نہیں جا سکتے۔ وہ یہاں صدر بن چکا ہے۔ اس کے دشمن بھی ہیں۔ سیکیورٹی کا انتظام سخت ہے۔" میکس نے خبردار کیا۔

"میں نے بھی خوامخواہ انتظار نہیں کیا۔ میں نے احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔" بیری نے کہا۔

"فرض کرو تمہیں پہچان لیا جاتا ہے۔ کوئی جا کر نیرائی کو بتاتا ہے کہ فلاں امریکی لڑکی کا شوہر واپس آ گیا ہے۔ سوچو ذرا یہ ممکن ہے کیونکہ بہت کم امریکی یہاں آتے ہیں۔ سیاسی غیر یقینی نے یہاں سیاحت کو برباد کر دیا ہے۔"

بیری سرد لہجہ اختیار کرتے ہوئے مسکرایا۔ "میکس! میں اس سے ملوں گا۔ مل کر جاؤں گا۔ میں نے دو خط لکھے تھے۔ وہ میں تمہارے پاس آنے سے پہلے ائرپورٹ پر ڈاک کے حوالے کر چکا ہوں۔ وہ خط مجھے محل میں پہنچا دیں گے۔ آمنے سامنے اس کے ساتھ میری ملاقات ہوگی۔"

"ناممکن...... یہ کیسے ہوگا؟"

"تم دیکھو گے۔" بیری نے کہا۔ "میں نے تین سال جھک نہیں ماری۔ بس اب اتنا وقت درکار ہے کہ وہ دونوں خطوط اس تک پہنچ جائیں۔ میرے خیال میں یہ کام کل تک ہو جائے گا۔ اس کے بعد آسانی ہے۔ ٹورسٹ کارڈ پر میں نے فرضی نام لکھا ہے۔"

بیری پھر بالکونی میں آ گیا۔ میکس بھی ساتھ تھا۔ بیری سفید محل کو گھور رہا تھا۔

"تم نے بڑا خطرہ مول لیا ہے۔" میکس نے کہا۔ "فرضی نام لکھنے سے کیا ہوگا...... اوہ نو۔" اس نے اشارہ کیا۔ "وہ دیکھو، تین باوردی سیکیورٹی اہلکار اسی طرف آ رہے ہیں۔"

بیری کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ اس نے نگاہ کا زاویہ تبدیل کیا۔ "کیسے......"

"میں بتا رہا ہوں، ان کا رخ میرے ہوٹل کی طرف ہے۔" میکس نے بیری کا بازو پکڑ کر اسے وہاں سے ہٹایا۔ "تمہیں ائرپورٹ پر شناخت کیا گیا ہے۔"

"ہاں، شاید۔" بیری نے کہا۔ "ایک امیگریشن آفیسر خاص طور پر میری جانب متوجہ تھا۔"

میکس نے آفیسر کا حلیہ معلوم کیا اور بولا۔ "اوہ گاڈ! وہ بیلارڈ تھا۔ پیلس گارڈ کا سابقہ کپتان۔"

"کیا وہ مجھے جانتا تھا؟"

"یقیناً، اس رات تمہاری بیوی سے متعلق ہم نے جن افراد سے بات کی تھی، ان میں بیلارڈ بھی شامل تھا۔ اس وقت وہ اداکاری کر رہا تھا کہ کچھ نہیں جانتا جبکہ تمہاری بیوی اس لمحے ہیڈ کوارٹر میں تھی۔ اب بیلارڈ امیگریشن میں پریذیڈنٹ کے لیے آنکھوں اور کانوں کا کردار سرانجام دے رہا ہے۔ نیرائی کو کسی ممکنہ خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے وہ وہاں ہے۔"

بیری کا چہرہ اُتر گیا۔

"میکس میرا سوٹ کیس چھپا دو۔ میں عقب میں باغ کی سمت سے کہیں نکل جاتا ہوں۔"

"کہاں جاؤ گے؟" میکس نے ہاتھ ملتے ہوئے سوال کیا۔

خود جان بیری کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ہاتھ ہلا کر باہر چلا گیا۔

☆☆☆

ایک دن گزارنا تھا اور رات بھی۔ چھپنے کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ سینٹ جوزف ایک بڑا شہر تھا۔ ان گنت افراد تھے لیکن ان دنوں پولیس کی بڑی تعداد سڑکوں پر موجود رہتی تھی اور ان میں نیرائی کے پالتو کتے بھی خطرے کی بو سونگھتے پھرتے تھے۔ غیر ملکی چہرہ فوراً ہی نظر میں آتا تھا جس پر خصوصی نظر کرم کی جاتی تھی۔

بیری باغ کی دیوار چڑھ کر گلی میں اُتر گیا۔ گلی میں وہ بھاگا پھر چلنے لگا۔ بائیں جانب مڑ گیا۔ پھر محتاط انداز میں ایک سڑک پر نمودار ہوا جس کے اطراف میں دکانیں تھیں۔ کیا وہ ہوٹل میں جائے؟ اس نے خود سے سوال کیا اور اس امکان کو مسترد کر دیا۔ ہوٹلوں پر یقیناً نظر رکھی گئی ہوگی۔ چھپنے والی بات تھی۔ تھیٹر؟ لیکن تھیٹر دن ڈھلے کھلیں گے اور وہاں غیر ملکی بہت کم جاتے تھے۔

پھر کہاں...... کہاں جاؤں؟

وہ مرکزی سڑکوں پر جانے سے پرہیز کر رہا تھا۔ پیدل تھا، دونوں ہاتھ جیبوں میں تھے، چال میں میانہ روی تھی۔ ابھی اس نے ایک بلاک کا سفر بھی طے نہیں کیا تھا جب ایک براؤن کار کے پہیے چیخے۔ وہ کار کونے پر دو وردی پوش آدمیوں کے قریب رکی تھی۔ کار والوں نے ان سے کچھ کہا اور وہ دونوں تیز قدمی کے ساتھ مختلف سمتوں میں چل پڑے۔ بیری پھرتی سے قریبی چرچ میں داخل ہو گیا۔ چرچ خالی پڑا تھا۔ وہ ایک طرف بیٹھ کر کھڑکیوں سے جھانکنے لگا۔

"ڈیئر گاڈ! میں تھک گیا ہوں۔" وہ بڑبڑایا۔ "اور ابھی گرفت میں آئے بغیر پوری رات گزارنی ہے۔"

بصورتِ دیگر اس کا منصوبہ ناکام ہو جاتا۔ اچانک پورچ میں لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ اسے وہاں سے بھی فرار ہونا پڑا۔ اس نے ایک نیم سنسان سڑک پکڑ لی تھی۔ سورج پہاڑیوں کے عقب میں روپوش ہونا شروع ہو گیا تھا۔ تاریکی کا پرندہ پر پھیلا رہا تھا۔

دفعتاً ایک چیخ بلند ہوئی۔

''رک جاؤ۔ میں تمہیں کہہ رہا ہوں رکو......!''

بیری کے اعصاب تن گئے۔ ''مت رکنا'' اس نے خود سے کہا۔ ''نہ ہی بھاگنا ہے۔ پلٹ کر بھی نہیں دیکھنا اور نہ تیز چلنا'' خود پر قابو پانے کے لیے اسے شدید جدوجہد کرنی پڑی۔ کارنر قریب تھا۔

عقب میں پھر وارننگ بلند ہوئی اور وہ کونے سے مڑ گیا۔ مڑتے ہی اس نے بھاگنا شروع کر دیا۔ سڑک طویل نہیں تھی۔ جلد ہی اسے دوسرا کونا ملا۔ وہ دوسری سڑک پر آ گیا۔ اندھیرا پھیل گیا تھا۔ روشن سڑکوں کو نظرانداز کر کے وہ دھیمی چال سے چلتا رہا۔ تھکنے پر وہ رک جاتا تھا پھر چلنے لگتا۔ خطرہ گاڑیوں سے تھا۔ وہ ان سے تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی گزرتی۔ ہیڈ لائٹس کی وجہ سے وہ بروقت ہوشیار ہو کر حتی الامکان تیزی سے قریبی آڑ میں رک جاتا۔

آدھی رات ہو گئی۔ وہ شہر میں کھو گیا تھا۔ وہ بے خبر تھا کہ وہ کہاں پر ہے۔ بیری نے ایک تاریک مکان دیکھا جو بظاہر ویران تھا۔ وہ رک گیا۔ مکان کا جائزہ لیا۔ سُن گُن لینے کے بعد وہ ورانڈے میں چلا گیا۔ اس نے ساعت پر زور دیا، کوئی آواز نہیں تھی۔ ہچکچاتے ہوئے وہ آگے گیا اور دروازے پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ بند تھا۔

اس نے کھڑکی کو آزمایا...... پھر دوسری اور تیسری کھڑکی۔ مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ وہ عقب میں کچن کی کھڑکی پر آیا۔ خوشی سے دل دھڑکا۔ بیری نے دبا ڈالا تو پٹ کھل گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کھڑکی کی راہ کچن میں چلا گیا۔ روشنی کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ چاند کی روشنی میں کچن کا ایک حصہ دھندلا نظر آ رہا تھا۔ بیری نے بہ آسانی ماچس تلاش کر لی۔ دیا سلائی روشن کر کے وہ لابی میں چلا گیا اور صوفے پر گر گیا۔

''کیا وہ یہاں بھی تلاشی لیں گے؟'' یہ اس کے دماغ نے سوال کیا۔ ''ایک رات میں وہ ہر جگہ تلاشی نہیں لے سکتے۔''

وہ خود کو سمجھا رہا تھا کہ سونا نہیں ہے...... سونا نہیں ہے۔ یہی سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

☆☆☆

''اٹھو۔'' کسی نے ٹھوکر لگائی۔ لابی روشن تھی۔ کھڑکیاں بتا رہی تھیں کہ سورج طلوع ہو چکا ہے۔ کسی نے اس کا بازو پکڑا اور کھینچ کر کھڑا کر دیا۔ وہاں موجود افراد وردی میں تھے۔ ایک نے فرنچ میں کچھ کہا۔

جان بیری نے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا لیکن گھڑی بند تھی۔

''کیا وقت ہوا ہے؟'' اس نے استفسار کیا۔

''دس بج چکے ہیں۔'' ایک نے جواب دیا۔ ''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''دس بج چکے ہیں......!'' بیری کا دھیان خطوط کی طرف گیا۔ خط پہنچ گئے ہوں گے۔

''کہاں جانے کی بات کر رہے ہو؟'' بیری نے سوال کیا۔

''پیلس۔'' مختصر جواب آیا۔

بیری دل ہی دل میں مسکرایا اور انجان بن کر سوال کیا۔ ''محل میں میرا کیا کام ہے؟''

''صدر نے تمہاری ضیافت کا اہتمام کیا ہے۔'' ایک وردی پوش نے قہقہہ لگایا۔

''تم لوگ بڑے مہمان نواز ہو۔'' بیری نے بھولپن کا مظاہرہ کیا۔ اس بار کسی نے کچھ نہ کہا اور اسے لے کر چل دیے۔ باہر بیری کو براؤن کار میں بٹھایا گیا۔ انہوں نے اٹھانے کے بعد بیری کے ساتھ کوئی دھکم پیل نہیں کی تھی۔ ہتھیار تھے لیکن انہوں نے گن پر ہاتھ ڈالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

بیری کو حیرت ہوئی جب سفر بہت کم وقت میں اختتام پذیر ہو گیا۔ وہ گزشتہ رات غالباً ایک دائرے میں گھوم رہا تھا اور بے خبر تھا کہ وہ پیلس سے دور نہیں گیا تھا۔

''تمہاری حالت خراب ہے۔ تم پریذیڈنٹ کے مہمان ہو لہٰذا تمہارا حلیہ درست کرنا ضروری ہے۔''

'یہ اخلاق بلاجواز نہیں ہو سکتا۔' بیری نے سوچا۔ 'نئے کپڑوں کے بہانے شاید وہ اس کے شکن آلود گندے لباس میں ہتھیار چیک کرنا چاہتے ہیں۔ تاہم یہ کام تو وہ زبردستی بھی کر سکتے تھے۔'

بیری کو نیا لباس اور جوتے دیے گئے اور بہترین واش روم فراہم کیا گیا جہاں اس نے غسل کیا اور شیو کرنے کے بعد نیا نفیس لباس زیبِ تن کر کے باہر نکلا۔

''پریذیڈنٹ تمہارے منتظر ہیں۔''

سفید جگمگاتے کوریڈور میں جان بیری چل رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو وردی پوش تھے۔ پریذیڈنٹ کے چیمبر کے باہر ایک ڈیسک پڑی تھی۔ ڈیسک کے پیچھے ایک کرنل براجمان تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور بیری کو اشارہ کیا۔ وہ اندر داخل ہوا۔

ہلکی سی کلک کی آواز آئی اور دروازہ اس کے عقب میں بند ہوگیا۔ بڑے سے چیمبر میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ ائر کنڈیشن آن تھا۔ سینٹر میں مہاگنی کی چمک دار قیمتی ڈیسک رکھی تھی۔ ڈیسک کے عقب میں جو آدمی تھا اس نے اٹھ کر استقبالیہ اشارہ کیا۔ جان بیری کے دماغ میں تین سال پہلے کی کڑوی یادیں سانپ بن کر پھنکارنے لگیں۔ اس کی مٹھیاں از خود بھنچ گئیں۔ وہ آگے بڑھا۔

نیرائی نے ہاتھ نیچے کیا۔ ہاتھ واپس آیا تو اس میں پسٹل موجود تھا۔

”بیٹھ جایئے۔“ نیرائی نے اشارہ کیا۔

بیری نے خود پر قابو پایا اور سرخ رنگ کی چرمی کرسی پر بیٹھ گیا پھر بغور اس آدمی کو دیکھا جس سے وہ نفرت کرتا تھا۔ بیری اس کو اخبارات اور میگزینز میں دیکھ چکا تھا۔ نیرائی ایک بدشکل آدمی کا نام تھا لیکن یہاں بیری نے اس کی غیر معمولی جسامت دیکھی۔ وہ تنومند سانڈ کے مانند پلا ہوا تھا۔ بیری کا خون اُبل پڑا۔ نورما اس کی بیوی تو ایک نازک سا پھول تھی۔

”تمہارا خط مجھے ملا ہے۔“ اس نے ڈیسک کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک خط پڑا تھا۔ نیرائی نے خط کو بیرل سے کھنکھنایا۔

”کیا تم سمجھاؤ گے؟“

”تم سمجھ گئے ہو۔“ بیری نے جواب دیا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”ایک خط تم نے میری بیوی کو بھی لکھا ہے۔ اس میں تین سال پہلے تمہاری بیوی کے ساتھ ہونے والے حادثے کا ذکر کیا ہے۔“

”وہ حادثہ نہیں، جرم تھا...... مکروہ جرم۔“ بیری تڑخ اٹھا۔

”ہاں، تم نے میری بیوی کو اس رات کے بارے میں کچھ ایسی ہی تفصیل لکھی ہے۔ میری بیوی کو تم نے خط لکھتے وقت اعتراف کیا ہے کہ تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، صرف تمہاری بیوی کا بیان ہے۔ تمہیں ثبوت حاصل کرنے کی امید ہے لیکن ابھی تک اس سلسلے میں تمہیں کوئی کامیابی نہیں ملی ہے۔“

”ہاں، ایسا ہی ہے۔“ بیری نے اعتراف کیا۔

”تم نے میری بیوی کو بتایا ہے کہ اگر ثبوت تمہارے ہاتھ لگ گیا تو پہلی فرصت میں، میں تمہیں ٹھکانے لگاؤں گا۔“

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔“ بیری نے کہا۔

”تم نے ایک اور کام کیا۔“ نیرائی نے کہا۔ ”مجھے علم ہوا ہے کہ ثبوت تمہارے پاس ہے تو میں خطرے کو پہلے ہی ختم کردوں گا لہٰذا تم نے میری بیوی کو روزانہ فون کرنا شروع کردیا۔ مقصد یہ تھا کہ جس روز تم فون نہیں کروگے تو وہ سمجھ جائے گی کہ میں نے تمہیں اس دنیا سے روانہ کردیا ہے اور وجہ بھی میری بیوی سمجھ جائے گی۔“

”ہاں، ایسا ہی تھا۔“

”تم ضرورت سے زیادہ ہوشیار نکلے۔ مجھے بھی خط لکھ کر ان باتوں سے آگاہ کردیا کہ میں تمہیں ختم کرنے کی حماقت نہ کروں۔ اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟“ نیرائی نے سوال کیا۔

”میں بدلہ لوں گا۔ تمہیں ماردوں گا۔“ جان بیری نے جواب دیا۔

متحدہ عرب امارات میں مقیم
اردو قارئین کے لیے خوشخبری
جاسوسی ڈائجسٹ پبلیکیشنز کراچی (پاکستان) کے چاروں رسائل
جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ، ماہنامہ پاکیزہ اور ماہنامہ سرگزشت
ایک فون کال کے فاصلے پر
آپ کال کریں، مطلوبہ رسالہ آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔
اردو بک ورلڈ ایف زیڈ سی۔ بزنس سینٹر، شارجہ پبلشنگ سٹی فری زون، الزاہیہ، شیخ محمد بن زائد آر ڈی، ای 311 شارجہ
971504805734
URDU BOOKS WORLD FZC.
BUSINESS CENTRE
SHARJAH PUBLISHING CITY
FREE ZONE, AL ZAHIA,
SHEIKH MOHAMMED BIN ZAYED RD,
E311, SHARJAH, UNITED ARAB EMIRATES

نیرائی نے قہقہہ لگایا۔ ''واقعی...... ؟ مگر کیسے؟''

''تم ملک میں مختلف جگہوں پر جاتے ہو اور میں نے ایک رائفل خریدی ہے۔ خوب مشق بھی کی ہے۔ رائفل کی رینج زیادہ ہے۔ میں کہیں بھی دور سے تمہیں گولی ماردوں گا۔''

''وقت لگے گا۔'' نیرائی ہنسا۔

''میرے پاس کافی وقت ہے۔''

''تم یہاں سے باہر جاسکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔'' بیری نے کہا۔

اس مرتبہ نیرائی بہت زور سے ہنسا۔ اس کا پورا جسم ہل رہا تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تمہاری بیوی کیسی ہے؟''

''وہ اسپتال میں ہے۔ نفسیاتی اسپتال میں۔ وہ یہ بھی بھول گئی ہے کہ میں اس کا شوہر ہوں۔'' بیری نے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر غم کا سایہ تھا۔

''میرے پاس کئی قسم کے ماہرین ہیں۔'' نیرائی نے کہا۔ ''اگر میں نے تمہیں شوٹ نہ کیا تو ماہرین کے ذریعے زہر دلوا سکتا ہوں یا ایسا انجکشن لگوادوں گا کہ تم سب کچھ بھول جاؤ یا تم کو مکمل فالج کا شکار کروادوں...... کیا پسند کرو گے؟'' نیرائی نے سوال کیا۔

''تم ایسے خواب دیکھ سکتے ہو۔'' بیری نے کہا۔ جواب میں نیرائی نے فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

''تم ہوشیار نہیں احمق ہو...... بچے ہو۔''

''میں بچہ ہوں؟'' بیری کرسی سے اٹھا۔

''بیٹھ جاؤ احمق۔ میں ایسے ہی صدر نہیں بن گیا۔ کیا تم مجھ سے بڑے منصوبہ ساز ہو؟ تمہارا سارا پلان ایک نکتے کے گرد گھومتا ہے اور وہ یہ کہ میں اپنی بیوی سے بے حد پیار کرتا ہوں اور میں کبھی نہیں چاہوں گا کہ اس کو حقیقت کا علم ہو جس کے بعد میں اسے کھودوں۔ میں اسے اپنے قریب رکھنے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں۔ احمق! میں پریذیڈنٹ بن چکا ہوں۔ میری بیوی کیا سوچے گی، مجھے اس کی رتی بھر پروا نہیں ہے۔ اگر وہ مجھے چھوڑتی ہے تو مجھ سے شادی کرنے کے لیے سیکڑوں امیدوار ہیں۔ میں نے اس کے ساتھ شادی صرف ایک وجہ کے تحت رچائی تھی۔ اس کا بھائی میرے لیے ایک خطرناک سیاسی مدمقابل بنتا جارہا تھا۔''

بیری خاموشی سے واپس بیٹھ گیا۔

''تم فرضی نام سے یہاں آئے ہو۔ کوئی نہیں جانتا کہ بیری یہاں آیا ہوا ہے۔ فرضی نام کا جان ٹیری سرے سے یہاں ہے ہی نہیں چنانچہ جان ٹیری غائب ہوگا، کسی کے نوٹس میں نہیں آئے گا۔'' نیرائی نے پسٹل کا رخ بیری کے سینے کی طرف کیا۔

بیری پسٹل کو تک رہا تھا۔

''لیکن ذاتی طور پر مجھے تشدد اور ہنگامہ پسند نہیں ہے لہٰذا میرے بجائے یہ کام......'' نیرائی نے ایک بٹن دبایا۔ دروازہ کھلا اور وہی کرنل اندر آیا لیکن بیری کو شک ہوا کہ اس کا دماغ مغالطے میں ہے۔ شاید دروازہ بٹن دبانے سے پہلے ہی کھلنا شروع ہوگیا تھا۔

''تمہاری گن کرنل! گڈ، اسے استعمال کرنے کا وقت آگیا ہے۔'' نیرائی نے کہا۔

''یس مسٹر پریذیڈنٹ!'' کرنل نے ہولسٹر سے گن نکالی۔ سپاٹ چہرے کے ساتھ اس نے قدم اٹھائے۔ قبل اس کے کہ بیری کرسی سے اٹھتا، کرنل اچانک رک گیا اور رخ بدلا۔

''سر! آپ کی بیوی کا آرڈر ہے۔'' کرنل نے نیرائی کے دل کا نشانہ لیا اور فائر کردیا۔

سائلنسر کی وجہ سے کوئی دھماکا نہیں ہوا۔ معمولی آواز آئی تھی۔ نیرائی کے حلق سے آخری بار عجیب سی آواز نکلی پھر وہ آگے جھکا اور خاموشی سے سر میز کی چمکتی سطح پر رکھ دیا۔

ایک نازک بدن حسینہ چیمبر میں داخل ہوئی اور دروازہ بند کردیا۔ وہ ڈیسک کے قریب گئی۔ مردہ پریذیڈنٹ کو دیکھا اور گردن موڑ کر کرنل کو سر سے اشارہ کیا۔

''وکٹر! بہتر ہوگا کہ مائیکروفون وغیرہ کو ہٹادیا جائے۔'' لہجہ پُرسکون تھا۔

کرنل نے ڈیسک کی نچلی دراز کے نیچے سے کچھ نکالا پھر ڈیسک کو تھوڑا سا کھسکا کر فرش میں موجود سوراخ سے تار کھینچ لیے۔

اب حسینہ بیری کی طرف متوجہ ہوئی۔

''یہ کام ضروری تھا۔'' اس نے تاروں کی طرف اشارہ کیا۔ تصدیق کے لیے مجھے تمام گفتگو سننی تھی۔ تم سچے ہو۔ اب جاؤ اور بھول جاؤ کہ کبھی تم یہاں آئے تھے۔'' حسینہ کے چہرے پر تاسف کا مدھم سایہ تھا۔ ''میں تمہاری بیوی کے لیے بہت دکھی ہوں۔'' وہ بولی۔ ''کاش میں مزید کچھ کرسکتی۔''

''میں ممنون ہوں مسز نیرائی! دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔'' بیری نے کہا۔

نیرائی کی بیوی نے ہاتھ بلند کیا۔

''تھینکس...... اور میں فی الحال کسی کی بیوی نہیں ہوں۔''

❖❖❖

زیرِ تشدد

ماہ نور

مغرب ہو یا مشرق بنیادی ضروریاتِ زندگی یکساں ہی ہوتی ہیں... غربت ہر بچے کے لیے رنج و تکلیف کا باعث بنتی ہے... ایک ایسے ہی نوجوان کا قصہ... بچپن کی سیاہ پرچھائیاں اس کے ذہن و دل پر قبضہ کر چکی تھیں... رہائش اور رزق کے حصول نے اس کو وحشت ناک بنا دیا تھا...

مغربی معاشرے کی وہ جھلک جو بہت سی نگاہوں سے اوجھل ہے......

بھورے بالو! دلکش لڑکی ریور فرنٹ ریسٹورنٹ سے نکلی ... کے لیے وہ اجنبی تھی۔ وہ جوان تھی، عمر ... برس کے لگ بھگ ہوگی۔ حسن و جوانی ایسی تھی کہ کوئی بھی مرد اسیرِ زلف ہو کر شادی رچاتا، پھر ایک گھر بساتا... اور مستقبل اپنے بچوں کے ساتھ کھیل کر گزارتا۔

لیکن موریسن عرصہ قبل محبت، شادی اور اس قسم کے تصورات سے جان چھڑا چکا تھا۔ اِن معاملات سے اسے

کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

وہ لڑکی کے تعاقب میں تھا جو ریسٹورنٹ کے عقب سے گھوم کر پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہی تھی۔ سڑک پر لائٹس کی روشنی کم تھی۔ ایسا ہی حال پارکنگ کا تھا۔ وہاں لائٹس کی تعداد بہت کم تھی چنانچہ پارکنگ میں نیم اندھیرا تھا۔ لڑکی کو آخری وقت تک احساس نہیں ہوا تھا حتیٰ کہ موریسن اس کے سر پر پہنچ گیا۔ لڑکی کو موقع نہیں ملا اور موریسن کو مزاحمت نہ ملی۔ قصائی نما چھری لڑکی کے پیٹ میں یوں گئی جیسے کچن نائف نرم مکھن سے گزرتا ہے۔ دہشت اور تکلیف سے زیادہ لڑکی کو حیرت کا سامنا تھا۔ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر دہری ہوگئی۔ موریسن نے عقب سے ایک بازو ڈال کر اسے سنبھالا اور گھٹنا کمر پر رکھ کر اسے گرنے سے بچایا۔ اگلے وار میں موریسن نے لڑکی کا حلقوم تراش کر اس کی حیرت کا خاتمہ کر دیا۔

جو کچھ ہوا، آناً فاناً ہوا۔ گویا کوئی بہت آسان کام تھا جو سیکنڈوں میں انجام پذیر ہوا۔ کوئی چیخ نہ شور شرابا۔ موریسن نے سہارا ختم کیا اور لڑکی زمین بوس ہوگئی۔ چھری کے دھاری دار بلیڈ نے حسب توقع کام کیا تھا۔

اب وہ اکیلا تھا اور قدرے خوفزدہ۔ علاقے میں وہ پندرہ برس گزار چکا تھا۔ اس سے پہلے وہ یتیم خانے اور فوسٹر ہومز میں پلا تھا۔ وہاں سے بھاگا تو ایک بے اولاد جوڑے کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں میاں بیوی شرابی بھی تھے۔ دونوں اپنا ڈپریشن اور غصہ موریسن پر اتارتے تھے۔

وہ کم عمری میں ہی زندگی سے بیزار ہو گیا تھا اور ذہنی طور پر غیر متوازن بھی۔ وہ بے اولاد میاں بیوی سے بہ آسانی جان چھڑا کر بھاگ نکلا اور مزید بگڑتا چلا گیا۔ گھٹیا شراب وہ پانی کی طرح پیتا تھا۔ وہ غیر یقینی زندگی سے تنگ تھا، علاقے کی سڑکیں اسے ڈراتی تھیں، ان پڑھ آوارہ منش اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک وقت کا کھانا حاصل کرنے کے لیے اسے محنت کرنا پڑتی تھی، دوبارہ کھانے کا حصول غیر یقینی ہوتا تھا۔ رات کے وقت وہ کچھ بہتر ہو جاتا لیکن سڑکوں کے کونے اس کے لیے بھوت بن جاتے۔ اسے یاد نہیں تھا کہ پہلی مرتبہ قتل اس نے کیوں اور کیسے کیا۔ اتنا یاد تھا کہ اسے وقتی سکون ملا تھا۔ اس کے بس میں نہیں تھا، سب کچھ ختم کر دے، دنیا اُجاڑ دے۔ ڈپریشن اور فرسٹریشن قتل کے بعد کم ہوتا تھا۔ وجہ نامعلوم تھی۔ بعدازاں پھر وہی روز و شب۔ وہ جینے کے ہاتھوں مر چلا تھا اور یہ تکلیف دہ سفر یتیم خانے سے شروع ہوا تھا۔

شرابی بے اولاد جوڑا موریسن کو سنبھال سکتا تھا لیکن وہ ذہنی بگاڑ کا شکار تھے۔ اپنی تکلیف کم کرنے کے لیے وہ موریسن پر ستم کے پہاڑ توڑنے لگے اور وہ وہاں سے فرار ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھورے بال لہراتے رہتے۔

سڑکوں پر وہ خوفزدہ رہتا تھا۔ وہ خود کو آوارگی اور ٹھکانے کے بغیر غیر محفوظ سمجھتا تھا۔ مطمئن اور خوش باش لوگ اسے بُرے لگتے تھے۔ غیر یقینی کا غلبہ تھا۔

لیکن اس کے ذہن نے حل تلاش کر لیا تھا۔ غیر یقینی اور خوف کا خاتمہ ہونے والا تھا۔ خوف اور نہ رزق کی تلاش......

موریسن نے اسٹریٹ نمبر 82 کے گاربیج کین سے پرانے کپڑے تلاش کیے، خون آلود کپڑوں سے جان چھڑا کر اس نے وہ کپڑے پہن لیے۔ پتلون اور قمیص کئی جگہ سے پھٹے ہوئے تھے تاہم تن ڈھانپنے کے لیے کافی تھے۔ اس نے ایک سویٹر بھی ڈھونڈ لیا۔ چھری اس نے پتلون میں اڑسی اور اوپر سویٹر سے ڈھانپ لیا۔

اسے اپنے دوستوں کے پاس پریسٹن اسٹریٹ جانا تھا۔ وہ واحد لوگ تھے جن پر وہ بھروسا کرتا تھا۔ کوئی اور مل جاتا تو گڑبڑ کا امکان تھا۔ دنیا میں پاگلوں کی کمی نہیں تھی، کچھ بھی ہو سکتا تھا حتیٰ کہ پولیس فورس کی وہ کہانی بھی اسے معلوم تھی جس کے مطابق عمر رسیدہ مسٹر گرین کو چند بدمعاشوں نے فلٹون برج کے نیچے تشدد کا نشانہ بنایا تھا جبکہ ان بدمعاشوں میں ایک پولیس مین بھی تھا جو اس وقت آف ڈیوٹی تھا۔ وہ مسٹر گرین کے مانند تشدد کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تیزی سے پریسٹن اسٹریٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

''ہائے، موریسن!'' ڈیسک سارجنٹ نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ اس کی توجہ بکھرے ہوئے کاغذات پر تھی۔

''آج رات کی کیا کہانی ہے؟'' سارجنٹ نے سوال کیا۔

''میں تم لوگوں کا مسئلہ حل کرنے آیا ہوں۔''

''کیا مطلب ہے؟'' سارجنٹ نے بھویں اُچکائیں۔

''تم لوگ جسے تلاش کر رہے ہو، وہ میں ہی ہوں۔ میں وہ ''بلیڈ'' ہوں جس نے عورتوں، لڑکیوں کو ہلاک کیا ہے۔'' موریسن کا انداز قدرے فخریہ تھا۔

سارجنٹ انگڑائی لے کر کرسی پر نیم دراز ہو گیا۔

''تم بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟'' سارجنٹ نے موریسن

سے کہا اور کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں ڈیکٹیو کو تم سے بات کرنے کے لیے بلاتا ہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''شکریہ۔'' موریسن ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

یہ اسٹیشن اس کے لیے گھر کے مانند تھا۔ اسے یہاں کی روشنیاں، یہاں کی فضا پسند تھی۔ موریسن کے ساتھ ان کا رویہ دوستانہ تھا۔ تاہم وہ موریسن کو وہاں زیادہ آرام نہیں کرنے دیتے تھے اور اسے راتیں سڑکوں پر گزارنی پڑتی تھیں۔ اب وہ گرفتار ہوکر مستقل یہیں رہے گا۔ کھانے پینے کا مسئلہ بھی ختم ہوجائے گا۔ کم عقل نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اگر وہ ''بلیڈ'' (قاتل کی عرفیت) ثابت ہو گیا تو پھانسی بھی ہوسکتی ہے۔

''ہائے، موریسن!''

وہ مسکراتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ مخاطب کرنے والا ٹام پیٹرسن تھا۔ اس کی ٹائی کی گرہ ڈھیلی تھی اور قمیص پر شکنیں نظر آرہی تھیں۔

''آجاؤ، میں تمہیں کافی پلاتا ہوں لیکن تم زیادہ دیر یہاں نہیں رکو گے۔'' ٹام نے اسکواڈ روم کی طرف حرکت کی۔

چھوٹے سے بغیر کھڑکی کے اسکواڈ روم میں دس عدد ڈیسک موجود تھے۔ بلیٹن بورڈ پر کاغذات سرخ پنوں سے چپکائے گئے تھے۔ موریسن گزرتے ہوئے وہاں موجود ڈیٹکٹیوز کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کسی نے سر ہلایا اور کسی نے نظر انداز کیا۔

''ہم لوگ بہت مصروف ہیں۔'' ٹام نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''بلیڈ نامی مردود کی وجہ سے ہمیں اوور ٹائم کرنا پڑتا ہے۔ اخبارات میئر کو نشانہ بناتے ہیں، میئر کیپٹن کو اور کیپٹن ہم پر چڑھائی کرتا ہے۔''

''اسی لیے میں یہاں آیا ہوں۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

ٹام کے چہرے پر تھکن کے آثار ہلکے پڑ گئے۔ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ''تم نے کچھ دیکھا ہے؟''

''تم لوگ جس کی تلاش میں ہو، وہ میں ہی ہوں۔''

''کیا؟''

''میں ہی ''بلیڈ'' ہوں۔''

''اوہ گاڈ، موریسن!''

''یقین کرو، میں نے آج رات ایک قتل اور کیا ہے۔''

''تم تفریح کرنے آئے ہو؟''

''یہ مذاق نہیں ہے۔ میں نے اس لڑکی کو ریور فرنٹ ریسٹورنٹ کے پیچھے ہلاک کیا ہے۔ ابھی ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا۔ اب تک کسی نے باڈی دریافت بھی کر لی ہوگی۔''

ٹام کرسی پر پھر پیچھے چلا گیا۔

''کون تھی وہ؟''

''معلوم نہیں۔ بھورے بالوں والی جوان لڑکی تھی۔'' موریسن نے جواب دیا۔

''تم بھورے بالوں والی خواتین کو کیوں مارتے ہو؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ میں خود کو روک نہیں پاتا۔ تم مجھے روک سکتے ہو۔ تم مجھے لاک اَپ میں ڈالو گے تو یہ سلسلہ ختم ہوجائے گا۔''

''موریسن! بیٹھ جاؤ۔''

موریسن دھاتی ڈیسک کے ساتھ کرسی پر بیٹھ گیا۔

''تم یہ کیوں کر رہے ہو؟''

''میں کوشش کر رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ختم ہو اور تم لوگوں کی پریشانی بھی ختم ہونی چاہیے۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں میرے پاس تمہارے جیسے اعتراف جرم کرنے والے چار آدمی اور بھی آئے تھے؟''

''کیسے ممکن ہے؟ یہ تو میں کر رہا ہوں۔''

''یہ ہماری نیم پاگل سوسائٹی کا ایک حصہ ہے۔ جب بھی اس قسم کی وحشیانہ درندگی کا مظاہرہ ہوتا ہے، سیریل کلنگ ہوتی ہے تو کوئی نہ کوئی اٹھ کر چلا آتا ہے۔ بسا اوقات مقتول کا کوئی گھر والا ہی آکر اعتراف جرم کرتا ہے۔ ہمیں علم ہے کہ ایسے لوگ تنہا یا کسی ذہنی خلل کا شکار ہوتے ہیں۔ بظاہر وہ ٹھیک نظر آتے ہیں۔ ہمیں احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ مجھے اس قسم کے اعترافات سے نفرت ہے۔ ان نفسیاتی مریضوں کے ساتھ ہمیں وقت ضائع کرنا پڑتا ہے جبکہ اصل نفسیاتی کہیں اور اپنی کارروائی جاری رکھتا ہے لیکن موریسن، تم کیوں آئے ہو؟ آخر کیوں؟ ہمارا تمہارا واسطہ تو کسی معمولی جرم میں بھی اب تک نہیں پڑا۔ تمہیں ڈراما کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ تمہارے ساتھ پریشانیاں ہیں لیکن تم ان دوسرے.... پاگلوں سے الگ ہو جن سے چوبیس گھنٹوں میں میرا سابقہ پڑ چکا ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو۔ جب میں بتا رہا ہوں......''

Digest Novels .com

"نکلو یہاں سے۔" ٹام کی آواز بلند ہوگئی۔ وہاں موجود افراد نے چونک کر ان دونوں کو دیکھا۔

"میں معذرت کرتا ہوں۔ میں مدد کرنا چاہتا تھا۔" موریسن نے کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی۔ "میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ ایسا ہوتا تو مجھے پاگل خانے میں رکھا جاتا۔"

"ہاں، ایسا ہی ہوتا لیکن تمہارے لیے سڑکیں زیادہ بہتر ہیں۔"

"سڑکوں سے اسپتال بہتر ہیں۔" موریسن منمنایا۔

"دفع ہوجاؤ۔ اس سے پہلے کہ میں تمہیں باہر پھنکواؤں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔"

"پلیز، ایسا نہیں کرو۔ مجھے بند کردو۔ ساری زندگی کے لیے اندر کردو۔"

ٹام پیٹرسن نے دونوں ہاتھ میز پر رکھے۔

"تو یہ بات ہے۔ تم قید میں رہنا چاہتے ہو؟"

"یہ بہت ضروری ہے۔"

"کیوں؟"

موریسن نے لرزتے ہاتھوں سے کرسی کی پشت کو پکڑ لیا۔

"میں تھک گیا ہوں۔ میں خوفزدہ ہوں۔ عرصہ بیت گیا سڑکوں پر بھٹکتے ہوئے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ قید خانہ بہتر ثابت ہوگا؟" ٹام نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ہاں۔ ہر رات بستر میسر ہوگا، کھانا بھی۔ تم جانتے ہو باہر شیلٹرز میں کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں؟ وہاں تحفظ نہیں ہے۔ کئی لوگ مرتے مرتے بچے ہیں۔ کم از کم قید خانے میں گارڈز تو ہوں گے۔"

"موریسن یہ کوئی طریقہ نہیں ہے اور تم قید میں آنے کے لیے جھوٹ کیوں بول رہے ہو؟"

"میں کیا کرتا؟ یہاں رہنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں ہے۔" ٹام نے رخسار کھجایا۔

"میں نے سوچا تھا کہ تم لوگ میری بات سمجھو گے اسی لیے میں یہاں آیا تھا۔"

"تمہارا دماغ چل گیا ہے۔"

موریسن کا منہ لٹک گیا۔ وہ جانے کے لیے مڑا پھر رک گیا۔ اچانک اسے یاد آیا۔

"سنو۔" ٹام نے ٹھنڈی سانس لی۔ "اگر تمہیں ایک رات کے لیے اندر کردیا جائے۔ کیا خیال ہے؟"

"دیکھو۔" موریسن نے سویٹر اوپر کر کے پتلون میں اڑسی تیز دھاری دار چھری کی نمائش کی۔

"کیا کر رہے ہو؟" ٹام کھڑا ہوگیا۔ "اوہ گاڈ!" وہ ایک قدم پیچھے گیا۔ اس کی کرسی الٹ کر دیوار سے ٹکرائی۔ "یہ کیا ہے؟"

موریسن نے دستہ پکڑ کر چھری باہر نکالی۔

تھکا دینے والے طویل کام کے اثرات ٹام کی آنکھوں سے غائب ہوگئے۔ اس کی آنکھیں چھری کے بلیڈ پر جمی تھیں پھر نظریں وہاں سے ہٹ کر موریسن کے چہرے پر گئیں۔ منہ میں کڑواہٹ گھل گئی تھی۔

"چھوڑ دو اسے، پھینک دو۔" وہ چیخا۔

"کیا؟ میں......"

اطراف میں دیگر آوازیں بلند ہوئیں۔ وہاں موجود ڈیٹکٹیوز حرکت میں آگئے۔

"ڈراپ اٹ، موریسن!"

موریسن کی مٹھی کھل گئی۔ بلیڈ فرش سے ٹکرایا اور پھسل کر ایک طرف رک گیا۔

تین ڈیٹکٹیوز نے موریسن کو گھیرا ہوا تھا۔ وہ تینوں، موریسن اور ٹام خون آلود چھری کو یوں گھور رہے تھے جیسے وہ کوئی زخمی جانور ہو اور وہ جانور اچھل کر حملہ کرنے والا ہے۔

"اوہ گاڈ، موریسن...... وہ خون لگا ہے؟" اس نے جھک کر دو انگلیوں سے احتیاط کے ساتھ چھری اٹھائی۔ "یہ تمہیں کہاں سے ملی ہے؟"

"میں نے بتایا تھا...... میں نے بتایا تھا۔ میں نے اس لڑکی کو ہلاک کیا تھا۔"

ٹام نے موریسن کو گھورا۔ "تم نے دیکھا ہے۔ بتاؤ کیا دیکھا ہے۔ تم نے قاتل کو دیکھا ہے۔"

"میں نے بتایا تو ہے۔ میں......"

"تمہیں چھری کو اپنے پاس نہیں رکھنا تھا۔" ٹام کی آنکھوں میں غصہ تھا۔ "اس پر تمہاری انگلیوں کے نشان آگئے ہیں۔" اس نے چھری ڈیسک پر رکھ دی۔

"نہیں، نہیں۔" موریسن چیخا۔ "تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو۔"

"ہم سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تم سچ بول دو۔"

اچانک موریسن نے جھپٹ کر چھری اٹھالی۔ ایک ڈیٹکٹیو اسے قابو کرنے کے لیے لپکا لیکن اسے فرش کا منہ دیکھنا پڑا۔ موریسن نے جھکائی دی اور خود بھی ایک ڈیسک

Digest Novels .com

سے ٹکرایا۔

"پیچھے رہو۔" موریسن چلایا۔

"پاگل ہو گئے ہو؟ کچھ مت کرنا۔" موریسن کو وارننگ دی گئی۔

موریسن نے چھری ہوا میں لہرا کر ان سب کو دیکھا۔ وہ تناؤ کی کیفیت سے دوچار تھے۔ ماحول کا رنگ بدل گیا تھا۔

"میں نے مارا تھا۔" موریسن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ "میں یہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"چھری ایک طرف رکھ دو۔" ایک بار پھر اسے وارننگ دی گئی۔

موریسن نے ایک ڈیٹکٹیو کو گن نکالتے دیکھا۔ وہ بولا۔ "میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تم میرے دوست ہو اسی لیے میں یہاں آیا تھا۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کیس اب ختم ہو گیا ہے۔ مجھے گرفتار کر کے قید میں ڈال دو۔"

"بکواس بند کرو۔" ٹام نے کہا۔ "تم قاتل نہیں ہو۔"

"میں ہوں۔ جس "بلیڈ" کو تم تلاش کر رہے ہو، وہ میں ہی ہوں۔" موریسن نے بازو یوں پھیلائے جیسے پرندہ پر کھولتا ہے۔

اسکواڈ روم میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ موریسن نے دروازے پر ایک اور چہرہ دیکھا۔

"ایک اور باڈی ملی ہے۔" دروازے میں نظر آنے والے نے بلند آواز میں کہا۔

موریسن دوبارہ ٹام کی طرف متوجہ ہوا اور تب کوئی معاً اس کے پہلو سے ٹکرایا، چیخ و پکار کی آوازیں بلند ہوئیں۔ موریسن اور ٹکرانے والا دونوں نیچے گرے۔ موریسن نے کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اسے درد کا احساس ہوا۔ سر ڈیسک سے ٹکرایا تھا۔ اسے لگا جیسے ایک ہاتھ میں آگ سی لگی ہو۔ اس نے دیکھنے کی کوشش کی لیکن کوئی اس پر چھایا ہوا تھا۔ کوئی اس کے اوپر تھا جس نے موریسن کو قابو کیا ہوا تھا۔

موریسن تکلیف میں تھا۔ اس نے آزاد ہونے کے لیے زور لگایا لیکن اسے قابو کرنے والا زیادہ طاقتور تھا۔ چھری ابھی تک موریسن کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے تڑپ کر ہاتھ لہرایا۔

"پکڑو اسے۔" ایک آواز آئی۔

ایک اور آدمی اس پر آن پڑا۔ وہ اٹھتے اٹھتے گرا۔ کسی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ چھری کا پھل اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ مڑے ہوئے بازو میں سخت تکلیف ہوئی۔ پیٹ میں شعلہ سا بھڑکا۔ وہ سانس نہیں لے پا رہا تھا۔

"میں نے لے لیا ہے۔" کسی نے کہا۔ چھری ایک طرف جا کر گری تھی۔ دھینگا مشتی کم ہوئی۔

"کیا ہو رہا ہے یہاں؟" کسی نے سوال کیا۔

"سب کچھ ٹھیک ہے۔ ہم نے سنبھال لیا ہے۔" جواب دیا گیا۔ "صورتِ حال قابو میں ہے۔"

"باہر نکلو، ایک اور باڈی دریافت ہوئی ہے۔"

"کہاں؟"

"ریورفرنٹ ریسٹورنٹ کی پارکنگ میں۔"

"ہاں۔" موریسن نے بلند آواز میں بولنا چاہا لیکن اس کی سانس بحال نہیں ہو رہی تھی۔ وہ چاروں ہاتھ پیروں کے بل پر تھا، اٹھتے اٹھتے گرا۔ ایک ہاتھ پیٹ میں لگی آگ پر گیا۔

کسی نے اسے سہارا دیا۔

"موریسن! تم نے ریورفرنٹ پر کیا دیکھا تھا؟"

"کیا مجھے لاک اپ میں ڈالا جائے گا؟" اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اسکواڈ روم خالی تھا۔

"نہیں۔ وہ بلیڈ کی تلاش میں گئے ہیں۔"

موریسن کے چہرے پر اذیت اور اداسی تھی۔

"میں مدد کرنا چاہتا تھا۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "بلیڈ نہیں ملے گا۔ "بلیڈ" تمہارے سامنے ہے۔"

اچانک اس کی نظر پیٹ پر جمے ہوئے ہاتھ پر گئی۔ انگلیوں کے درمیان سے خون رس رہا تھا۔ "مجھے بند کر دو، مجھے سکون مل جائے گا، میں محفوظ رہوں گا۔"

پیٹ کی اذیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس نے ہاتھ ہٹایا تو خون کا فوارہ بلند ہوا۔ اس کی سانس رک گئی۔ سویٹر پر خون ہی خون تھا۔

"یہاں ایمرجنسی ہے۔" ٹام چلایا۔ اس نے موریسن کے پیٹ میں خطرناک زخم کو دیکھ لیا تھا۔ ٹام نے اسے سنبھال کر کرسی پر بٹھایا۔

"تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں پیرا میڈیک کو بلاتا ہوں۔ تم محفوظ رہو گے۔ آرام سے رہو گے۔ کہو گے تو لاک اپ میں رکھیں گے لیکن پہلے اسپتال جانا ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔" ٹام اسے ہر ممکن تسلی تشفی دے رہا تھا۔

موریسن کا سر ڈھلک گیا۔ وہ ہر قسم کے خوف سے آزاد ہو چکا تھا۔ وہ آرام اور حفاظت سے بے نیاز ہو گیا تھا۔

❖❖❖

Digest Novels .com

ہوس گر

مرزا عمران بیگ

وقت کے بے رحم ہاتھوں میں ایسے ہتھیار ہوتے ہیں جو نازک دل اور محبت کرنے والوں کو ایسا زخمی کرتے ہیں کہ وہ ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں... دوستی اور محبت دونوں بندھن میں جذبۂ وفا کا ہونا ضروری ہوتا ہے... ایک ایسی لڑکی کی کہانی جس کا دامن ہوس کے ہاتھوں چاک ہو چکا تھا... اس کی زندگی میں دوستی اور محبت دونوں نے دغابازی کی تھی...

ہمارے ملک کے محافظوں کی کارکردگی کا نرالا انداز......

---

digest library.com

صبح کا وقت تھا۔ اپنے علاقے کا طاقتور ترین شخص بیوروکریٹ فراز اپنے عالیشان بنگلے کے لان میں بیٹھا گرم گرم چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور ساتھ ہی ملک کے حالاتِ حاضرہ پر نظر رکھنے کے لیے اخبار کا مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ اسی دوران اس کا ایک ملازم حواس باختہ سا بھاگتا ہوا آیا اور اسے کچھ بتانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کی بات کی وضاحت نہیں کر پا رہے تھے۔ فراز نے اسے غصے میں جھڑک دیا تھا کہ یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا۔ جس کے بعد ملازم نے خود کو سنبھال کر اسے بتایا کہ نیہا بی بی بے ہوش ہیں۔ نیہا فراز کی اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ اٹھ کر اس کے کمرے کی جانب بھاگا۔ کمرے میں نیہا بے جان پڑی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا جبکہ دوسرے ہاتھ میں چھری تھی۔ یہ بات پہلی ہی نظر میں واضح ہو گئی تھی کہ اس نے ہاتھ کی رگ کاٹ کر خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

فراز کے بنگلے میں اچھے خاصے لوگ جمع تھے۔ جن میں ملازمین کے علاوہ پولیس والے بھی موجود تھے۔ انسپکٹر شہروز فراز کے ساتھ کھڑا تھا۔ سب انسپکٹر صدیقی نے آ کر اطلاع دی۔

"سر لڑکی اسپتال میں ہے اور ہوش میں آ چکی ہے۔"

"اس کا بیان ریکارڈ کروایا؟" شہروز نے سوال کیا۔

"جی ہاں...... اس کے بیان کے مطابق دو لڑکوں نے اسے پہلے جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا۔" صدیقی نے جواب دیا۔ "اور اس کے بعد بلیک میل کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"یہ...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔" صدیقی کی بات سن کر فراز نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہیں وہ لڑکے......؟"

"ابھی ان کے نام نہیں بتائے۔" صدیقی نے بتایا۔ "بمشکل اتنا ہی بتا سکی ہیں۔"

فراز پیچ و تاب کھانے لگا۔ ظاہر ہے نیہا اس کی بیٹی تھی۔ شہروز کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "ہمم۔ یہ سائبر کرائم کا کیس ہے۔ یہ کیس تو ایف آئی اے کو دیکھنا ہوگا۔"

فراز خان کا برداشت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ وہ شہروز کی بات سن کر غصے سے دہاڑنے لگا۔

"یہ کیس کہیں نہیں جائے گا۔ مجھے نہیں پتا۔ تم لوگوں کو کتنا پالتا ہوں میں۔ مجھے وہ دونوں لڑکے چاہئیں زندہ یا مردہ۔ کسی بھی حالت میں۔"

"ٹھیک ہے۔" فراز کی بات سن کر شہروز نے صدیقی سے کہا۔ "لڑکی کا موبائل ریکارڈ نکلواؤ۔ کس کس سے بات ہوتی رہی ہے۔ کال پر یا میسج وغیرہ پر۔ اور جن لوگوں سے بات ہوئی ہے۔ ان سب کا ریکارڈ بھی نکلواؤ۔"

"ٹھیک ہے سر۔" صدیقی نے مستعدی سے کہا اور چلا گیا۔ فراز سر پکڑ کر ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب کے ساتھ ساتھ اس کی توانائی بھی جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس کا دل و دماغ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ شہروز، شہزاد کو بلا کر مزید احکامات دینے لگا۔

شہزاد بھی فرمانبرداری سے سیلیوٹ کر کے چلا گیا۔ شہروز، فراز کے نزدیک آیا۔ فراز دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بڑبڑا رہا تھا۔ ''اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے خبر بھی نہیں۔ اپنی بیٹی کی طرف سے اتنا غافل تھا میں......''

''آپ بے فکر رہیں۔'' شہروز اسے تسلی دینے لگا۔ ''وہ جو کوئی بھی ہیں۔ جس کسی کی بھی اولاد ہیں، قانون سے نہیں بچ سکتے۔''

''اب بس باتیں نہ کرو۔'' شہروز کی بات سن کر فراز نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''جلدی ایکشن لو۔''

☆☆☆

ایس ایچ او صدیقی اپنے ماتحت اسٹاف کے ساتھ تھانے میں موجود تھا۔ صدیقی انہیں اپنی بھاگ دوڑ کے بارے میں بتا رہا تھا۔

''ہم ان دونوں کو ٹریس کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نادرا سے ان کی شناخت معلوم کروا رہے ہیں۔''

''کون ہیں وہ دونوں؟'' شہروز نے سوال کیا۔ ''کچھ معلوم ہوا؟''

''ان دونوں کے نام تک معلوم نہیں۔'' صدیقی نے مایوسی سے بتایا۔ ''نیہا نے بھی مزید کوئی بیان ریکارڈ نہیں کروایا۔''

''شاید اس کی طبیعت ابھی اس قابل نہیں۔ اس کی طبیعت بہتر ہو جائے تو اس سے ضرور بات کرنا۔'' شہروز نے تاکید کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جتنی جلدی ہو سکے ان دونوں کا کھوج لگاؤ...... اس معاملے کو تو لازمی حل کرنا ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' شاہانہ نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کسی عام آدمی کا نہیں بیوروکریٹ کا جو معاملہ ہے۔''

اسی وقت شہزاد اندر آیا۔ ''سر سی سی ٹی وی کیمروں کے ذریعے کچھ مشکوک لوگ سامنے آئے ہیں۔ ان کی شناخت کروائی جا رہی ہے۔''

''اس میں کوئی پیش رفت ہوئی۔'' شہروز نے سوال کیا۔

''ایک لڑکا ہے۔'' شہزاد نے بتانا شروع کیا۔ ''دلاور نام ہے اس کا۔ اس پر کچھ لوگوں نے اپنا شک ظاہر کیا ہے۔''

''کون ہے یہ لڑکا معلوم کرو۔'' شہروز نے کہا۔ ''بلکہ تھانے لاؤ اس کو۔ کچھ خاطر مدارات کرو۔''

''نیہا کا بوائے فرینڈ تھا۔'' شہزاد نے بتایا۔ ''اس سے تعلق ختم ہونے کے بعد سے اسے دھمکا تا رہتا تھا۔''

''بڑے لوگوں کی بیٹیوں کی بھی بڑی باتیں۔'' شہروز

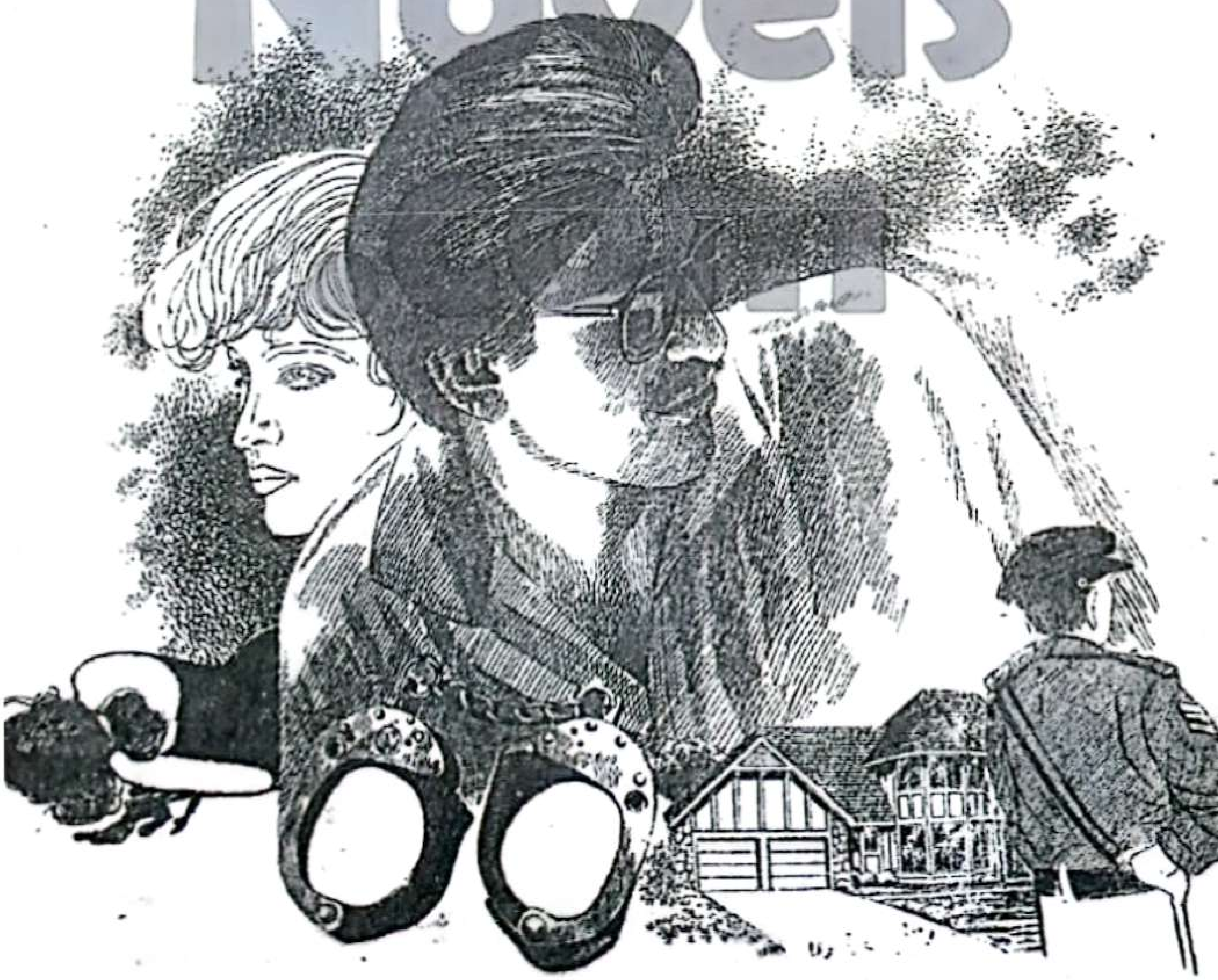

نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”بوائے فرینڈ۔“

”آپ کو کیوں بُرا لگ رہا ہے۔“ شاہانہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مجھے کیوں بُرا لگے گا۔“ شہروز نے شاہانہ کی طرف شوخی سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے کسی چیز کی کمی ہے کیا۔“

شہزاد موچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے مسکرانے لگا تو شہروز کو اپنے دیگر ماتحت کا خیال آیا تو خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”نیہا بی بی کی کال ہسٹری کا کیا رہا؟“

”سر وہ بھی دیکھی جا رہی ہے۔“ صدیقی نے جواب دیا۔ ”اس کے ذریعے بھی کچھ موبائل نمبرز کو نکلوایا جا رہا ہے۔“

”فی الوقت کسی اور کو پھنسوا کر کیس ختم کریں۔“ شاہانہ نے اپنی روایتی تجویز دی۔ ”کیوں اتنی خواری اٹھا رہے ہیں۔ ان مشکوک لڑکوں کو دیکھتے رہنا پھر بعد میں۔“

”نہیں۔ وہ لڑکی ان دونوں کو پہچانتی ہے۔“ شہروز نے اس سے اختلاف کیا اور پھر صدیقی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”خیر صدیقی۔ تم اس کیس کو دیکھو۔ اور میں تمہارے ساتھ سب انسپکٹر مائرہ فاطمہ کو لگا دیتا ہوں۔“

”مائرہ کو کیوں۔ میں کیوں نہیں۔“ شاہانہ نے کہا۔

”میں بھی اس میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔“

”بڑا کام کا موڈ بن رہا ہے۔“ شہروز نے کہا۔

”کبھی کبھار تو بنتا ہے۔“ شاہانہ نے بھی ڈھٹائی سے جواب دیا۔

ٹھیک ہے۔“ شہروز نے فوراً اس کی بات مانتے ہوئے کہا۔ ”لڑکی سے پوچھ کچھ سب انسپکٹر شاہانہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ تم اور صدیقی دونوں مل کر اس پر کام کرو۔ صدیقی، دلاور کو ٹریس کرو فوری۔“

”ٹھیک ہے سر۔“ صدیقی نے جواب دیا اور باہر نکل گیا۔

☆☆☆

سیٹھ فراز کا گھر تھا۔ صدیقی کے سامنے فراز خان بیٹھا تھا۔ کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو، بیٹی رشتہ ہی ایسا ہے کہ ایسے موقع پر بڑے سے بڑے آدمی کی کمر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس وقت وہ صوفے پر بے حال سا بیٹھا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی کروفر والا شخص ہے جس کے آگے بڑے بڑے لوگ پانی بھرتے نظر آتے تھے۔ اس وقت وہ صدیقی کو اپنی بیٹی کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا۔

”میری بیٹی ...... کچھ دن سے اُداس سی تھی۔ کبھی اچانک بے حد خوش ہو جاتی۔ لیکن زیادہ تر اداس ہی رہتی۔“

”موڈ میں بار بار تبدیلی کی کوئی وجہ؟“ صدیقی نے سوال کیا۔

”بد قسمتی سے میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔“ فراز نے تاسف سے کہا۔ ”یہی سوچ کر کہ......شاید کسی سہیلی سے کوئی ناراضی چل رہی تھی۔ کاش میں اس سے بات کر لیتا۔ اس کا دکھ سن لیتا۔ مجھے یاد ہے۔ کچھ دن پہلے ہی وہ ایسے ہی اداس سی تھی۔ تیار ہو کر گھر سے نکل رہی تھی......“

اس کے ساتھ اس کے سامنے اس دن کا منظر گھوم گیا۔

☆☆☆

نیہا تیار ہو کر سیڑھیوں سے اُتر رہی تھی۔ اس کا بیوروکریٹ باپ فراز لاؤنج میں بیٹھا تھا اور اس کے سامنے کچھ فائلیں بکھری تھیں جن میں وہ مغز ماری کر رہا تھا کہ اس کی نظر نیہا پر پڑی۔

”کہاں کا ارادہ ہے بیٹا۔“ فراز نے ایک فائل اٹھاتے ہوئے سوال کیا۔

”ایک دوست کے گھر......“ نیہا نے جواب دیا۔ اس کے لہجے میں ایک خاموش سی اُداسی نمایاں تھی۔ جسے فراز نے جانچ لیا تھا۔

”سب ٹھیک تو ہے نا......تمہاری طبیعت......“

”جی ڈیڈ...... میں ٹھیک ہوں۔“ نیہا جواب دیتے ہوئے باہر کی طرف جانے لگی۔

”دھیان رکھنا اپنا۔“ فراز نے اسے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ ”اگلے ماہ ہم یورپ جا رہے ہیں۔“

”یورپ۔“ نیہا جاتے جاتے رُک گئی اور پلٹ کر کچھ کہنا چاہا۔ ”لیکن......“

”بھئی تمہاری وہیں باقی اسٹڈیز ہوں گی۔“

فراز نے اس کی بات کو اپنے تئیں سمجھتے ہوئے فوری جواب دیا۔ نیہا نے کچھ سوچتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

”اچھا تو...... اس سی ایس ایس کے امتحان سے جان چھوٹ گئی۔“

”اتنی آسانی سے کہاں۔“ فراز مسکراتے ہوئے بولا۔ ”واپس آ کر سی ایس ایس کا امتحان بھی دینا ہے۔ آخر باپ کی سیٹ بھی تو سنبھالنی ہے نا۔“

”ٹھیک ہے ڈیڈ......جیسے آپ کی مرضی۔“ نیہا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا اور بغیر کسی تاثر کے چلی گئی۔ فراز نے اسے جاتا دیکھا اور پھر کچھ سوچ کر فائل میں

معروف ہوگیا۔

☆☆☆

فراز کسی سوچ میں گم بیٹھا بڑبڑا رہا تھا۔ ''لیکن اب...... ان سب باتوں کا اب کیا فائدہ؟''

اس کے سامنے موجود صدیقی نے اس کی سوچ میں خلل ڈالتے ہوئے کہا۔ ''ہوسکتا ہے آپ کی باتوں سے کوئی اشارہ مل جائے۔''

''مجھ سے سوال جواب چھوڑیں۔'' فراز نے بےزاری سے کہا۔ اسے ان سوالات سے چڑ سی ہونے لگی تھی۔

''آپ یہ بتائیں کہ آپ کی تفتیش کہاں تک پہنچی؟''

''تفتیش چل رہی ہے سر۔'' صدیقی نے متانت سے جواب دیا۔ ''اور آپ سے سوال جواب بھی تفتیش کا ہی حصہ ہیں۔''

''کب تک تفتیش چلتی رہے گی۔ کب تک یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔'' فراز نے غصے سے کہا۔ ''ابھی تک کوئی سرا ہاتھ نہیں آیا آپ لوگوں کے۔''

''سر اسی لیے کہہ رہا ہوں۔ نیہا میم سے بات کرنا بہت ضروری ہے۔'' صدیقی نے اسے سمجھایا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں۔'' فراز نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے سوالات سے وہ مزید ڈپریشن یا ذہنی دباؤ کا شکار نہ ہوجائے۔''

''آپ بےفکر رہیں۔ اس بات کا خیال رکھا جائے گا۔'' صدیقی نے کہا۔ ''سب انسپکٹر شاہانہ موقع محل دیکھ کر ہی کوئی بات کریں گی۔''

☆☆☆

سب انسپکٹر شاہانہ نیہا کے پاس اس کے بیڈروم میں موجود تھی۔ گھوم پھر کر اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کے کمرے میں رکھی کچھ کتابوں کو دیکھا۔ پھر ایک طرف موجود سی ڈیز کے ڈھیر کو دیکھا۔ یہاں ایک طرف لیپ ٹاپ بھی موجود تھا۔ شاہانہ ان تمام اشیاء سے نیہا کی دلچسپی کا اندازہ لگانا چاہ رہی تھی۔ وہ ایک نظر نیہا کی طرف دیکھتی رہی جو شاہانہ کی موجودگی اور اس کی حرکات وسکنات سے لاتعلق سی بیٹھی کسی ایک نکتے پر ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ شاہانہ نے اس کی جانب بڑھتے ہوئے سوال کیا۔

''اب کیسی طبیعت ہے؟''

''کافی بہتر ہے۔'' نیہا نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔ جیسے اسے اب احساس ہوا کہ شاہانہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''مجھے کچھ سوالات پوچھنے ہیں۔'' شاہانہ نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''امید ہے تم میرے ساتھ تعاون کروگی۔ مجھے پوری بات بتاؤ گی۔''

''جی پوچھیں۔'' نیہا نے کوفت سے جواب دیا۔

''ہمت تو نہیں...... لیکن کوشش کروں گی۔''

''مجھ سے کچھ چھپانا نہیں۔'' شاہانہ نے کہا۔

''اب رہا کیا ہے چھپانے کو۔ سب کچھ تو دنیا والوں کے سامنے آچکا ہے۔'' نیہا نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ کتنی ہی ماڈرن اور آزاد خیال سہی۔ لیکن تھی تو ایک لڑکی ہی نا۔ وہ ایک ایسی لڑکی جس کے باپ کو پورا ملک جانتا تھا۔

''دنیا والوں کو چھوڑو...... اپنی فکر کرو۔'' شاہانہ نے اس کے جذبات کو سمجھتے ہوئے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''تمہارے ساتھ یہ سب کیسے ہوا۔ اور کس نے کیا......؟''

نیہا خاموشی اور دکھ کے ساتھ شاہانہ کی طرف دیکھنے لگی۔

''بتاؤ...... کون ہیں یہ لوگ...... اور تم ان سے کیسے ملیں......؟'' شاہانہ نے اس پر زور دیتے ہوئے کہا۔ شاہانہ ایک کے بعد ایک سوال پوچھتی رہی۔ جبکہ نیہا اس کے سوالوں کے جواب میں خاموشی اختیار کیے ہوئے اپنے گزشتہ دنوں کی یاد میں گم ہوگئی۔

☆☆☆

نیہا کی یادوں کے ساتھ کہانی بھی اس کے گزرے ہوئے دن کے مناظر دکھانے لگی۔ ایک جگہ پارٹی چل رہی تھی۔ جس میں نوجوان لڑکے لڑکیاں شامل تھے۔ سب لوگ خوب ہلا گلا کررہے تھے۔ لمبی چوڑی باتیں کررہے تھے۔ سب ہی لوگ کسی نہ کسی نشے سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ کوئی سگریٹ پھونک رہا تھا۔ کوئی جام و مینا میں غوطے لگا رہا تھا۔ کوئی نشہ سونگھنے میں مدہوش تھا۔ نیہا بھی وہاں موجود تھی۔ لیکن نشے سے دور تھی۔ اس کے ہاتھ میں فقط جوس کا ایک گلاس تھا۔ وہ باقی لوگوں سے لاتعلق سی بیٹھی تھی۔

پارٹی میں موجود ایک لڑکا سب کو... شہر کے سب سے بڑے ہوٹل میں سالگرہ کی دعوت دے رہا تھا۔ وہیں ایک لڑکی اپنے دبئی جانے کا ذکر کرتی ہے۔ کسی کو لندن جانا تھا۔ کوئی اپنی آبائی حویلی میں کزن کی شادی میں جارہا تھا۔ غرض سب ایک سے بڑھ کر ایک بات کررہے تھے۔ اسی دوران ان سب کی نظر نیہا پر پڑی تو وہ سب اس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

Digest Novels .com

''لو یہ پھر گم ہو گئی۔ پتا نہیں اتنی اداس کیوں رہنے لگی ہے۔''

''یہ سب دلاور کی وجہ سے ہوا ہے۔ نہ یہ دلاور کی محبت میں پاگل ہوتی اور نہ آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔''

''کیوں...... دلاور نے ایسا کیا کر دیا۔ زندگی میں یہ معاملات تو چلتے رہتے ہیں۔''

''کیا مطلب...... اس نے دھوکا دیا ہے اس کو۔ دیکھو اس بے چاری کی حالت کیا ہو گئی ہے۔''

نیہا ان باتوں سے اکتا گئی تھی۔ وہ کر اٹھ کر دوسری طرف چلی گئی۔ اس کی ایک دوست فریحہ اس کے پیچھے آئی اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔

''کیا بات ہے۔'' فریحہ نے کہا۔ ''کب تک یونہی اداس بیٹھی رہوگی۔''

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' نیہا نے اعتماد سے جواب دینے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔

''بھول جاؤ پرانی باتوں کو۔'' فریحہ نے کہا۔ ''بلکہ اس کو تو بالکل نظر انداز کرو۔ جیسے وہ ہے ہی نہیں۔''

''وہ بار بار میرے سامنے کیوں آتا ہے۔'' نیہا نے آہستہ سے کہا۔

''چھوٹی سی دنیا ہے۔ لوگ سامنے آتے ہی رہتے ہیں۔'' فریحہ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''اب تم کیا منہ لٹکا کر بیٹھی رہوگی۔''

''اسے دیکھ کر میرا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ میں اپ سیٹ ہو جاتی ہوں۔'' نیہا نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی تو ہو۔ پھر بھی تم نے اسے بلالیا۔''

''یار...... اب ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر تعلق تو ختم نہیں کیے جاسکتے نا۔'' فریحہ نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔ ''آخر کو ہم کتنے پرانے دوست ہیں۔''

''تمہارے لیے یہ چھوٹی بات ہے؟'' نیہا نے غصے سے کہا۔

''اچھا اب ناراض تو نہ ہونا۔ اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔'' فریحہ نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے موڈ کو بدلنے کا پلان ہے میرے پاس۔''

''ہوگا کوئی بکواس پلان۔'' نیہا بیزاری سے بولی۔

''نہیں۔ بہت اچھا پلان ہے۔'' فریحہ نے کہا۔ ''ہم باہر چلتے ہیں۔ تمہیں ایک سرپرائز دینا ہے۔''

''کیسا سرپرائز؟'' نیہا نے پوچھا۔

''یہ تو دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔'' فریحہ نے اس کے سوال کا واضح جواب نہیں دیا اور دونوں وہاں سے باہر کی طرف جانے لگیں۔ اسی وقت ان دونوں کے راستے میں دلاور آ گیا اور نیہا کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔'' دلاور نے کہا۔

''لیکن مجھے نہیں کرنی۔'' نیہا نے اسے روکھا سا جواب دیا۔

''اس طرح مجھے نظر انداز نہ کرو۔'' دلاور نے اسے مناتے ہوئے کہا۔ ''وہ بھی ایک معمولی سی بات پر۔''

''معمولی سی بات۔'' نیہا نے ایک دم بھڑکتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے دوسری لڑکی سے فلرٹ کرنا، معمولی سی بات ہے......''

''ایسا نہیں ہے۔ تم غلط سمجھ رہی ہو۔'' دلاور اسے وضاحت دینے لگا۔ ''میں کون سا سیریس تھا اس کے ساتھ۔''

''لیکن میں سیریس ہوں۔'' نیہا نے اسے ٹکا سا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''اور اب میں تم سے بریک اپ کر چکی ہوں مسٹر۔ آئندہ میرے راستے میں نہ آنا۔''

نیہا اسے دھتکار کے آگے بڑھ گئی۔ فریحہ، دلاور کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''سمجھنے کی کوشش کرو دلاور۔ ابھی اسے اکیلا چھوڑ دو۔ تھوڑا نارمل ہونے دو۔''

''تم کیوں نہیں سمجھاتیں اسے۔'' دلاور نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔ ''الٹا مجھے سمجھا رہی ہو۔''

''کیا سمجھاؤں اسے۔'' فریحہ نے بھی غصے سے جواب دیا۔ ''تم نے غلطی تو کی ہے نا۔ اب کچھ سزا تو بھگتو اس کی۔ پچھتانا تو پڑے گا نا۔''

فریحہ بھی نیہا کے پیچھے جانے لگی۔ دلاور ان دونوں کو جاتا دیکھ کر دانت کچکچاتا ہوا بولا۔

''کیا سمجھتی ہے خود کو۔ بہت بڑے باپ کی اولاد ہے تو کچھ بھی۔ اس کو تو میں چھوڑوں گا نہیں۔ منہ دکھانے کے لائق نہیں رہے گی۔''

☆☆☆

فریحہ اور نیہا ایک شاپنگ مال کے باہر پارکنگ میں کھڑی تھیں۔ نیہا کے چہرے پر اب بھی غصے کے آثار نمایاں تھے۔ ساتھ ہی وہ بے زار بھی ہو رہی تھی۔ فریحہ اسے انتظار کرنے کا کہہ کر بار بار کسی کا فون نمبر ملا رہی تھی۔

''کون سا سرپرائز ہے تمہارا۔'' نیہا نے چڑتے ہوئے کہا۔ ''جو اتنی خواری کروا رہا ہے۔''

''آتا ہی ہوگا۔ صبر تو کرو۔'' فریحہ چہکتے ہوئے بولی۔

Digest Novels .com

اس کے کہنے کی دیر تھی کہ ایک کار آ کر رکی اور اس میں سے ایک وجیہہ صورت اور ہینڈسم لڑکا اترا۔

''ان سے ملو۔ یہ ہیں دلشاد۔'' فریحہ نے اٹھلاتے ہوئے تعارف کرایا۔ ''میرا دوست۔''

''ہیلو۔''

نیہا نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ اس کی شخصیت اس کے انداز و اطوار سے بہت متاثر ہو گئی تھی۔ دلشاد نے بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے ہیلو کہا۔

''دلشاد۔ یہ ہے میری سب سے اچھی دوست...... نیہا۔'' فریحہ نے نیہا کا تعارف کرایا۔

آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔'' دلشاد نے نیہا کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے بھی۔'' نیہا جو اسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی، اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیا کرتی ہیں آپ؟'' دلشاد نے پوچھا۔ شاید وہ بھی نیہا کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

''کچھ خاص نہیں۔'' نیہا نے جواب دیا۔ ''بس زندگی کو خوش رہ کر گزارنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

نیہا جو کچھ دیر پہلے اُداس اور زندگی سے بیزار تھی۔ اب اس میں اچانک دلشاد سے مل کر ایک تبدیلی سی آنے لگی۔ جیسے وہی تو اس کے خوابوں کا شہزادہ تھا۔ جس کی اسے تلاش تھی اور وہ بے وقوف دلاور جیسے احمق کے پیچھے پڑی تھی۔ اسے اپنے دکھ درد کا ساتھی سمجھ بیٹھی تھی۔ لیکن نیہا میں آنے والی اس اچانک تبدیلی کو فریحہ جانچ نہیں سکی تھی۔ وہ خوشگواری سے مداخلت کرتے ہوئے بولی۔

''اس کے اور میرے تمام مشاغل ایک ہی ہیں۔''

''تو مطلب میرے والے ہی مشاغل ہوئے نا۔'' دلشاد نے کہا۔ ''کیونکہ میرے اور فریحہ کے مشاغل بھی کافی حد ایک جیسے ہی ہیں۔''

''ہاں...... یہ تو ہے۔'' فریحہ چہکتے ہوئے بولی۔ ''کیا خیال ہے کہیں گھومنے چلیں۔''

''بلکہ پہلے کچھ اچھا سا کھاتے ہیں۔'' دلشاد نے تجویز دیتے ہوئے نیہا کو مخاطب کیا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے مس نیہا۔''

''کیوں نہیں......'' نیہا نے اس کی تجویز سے فوری اتفاق کیا۔

''تو پھر چلو۔ دیر کس بات کی ہے۔''

☆☆☆

تینوں ایک ریسٹوران میں بیٹھے تھے۔ آپس میں خوب باتیں چل رہی تھیں۔ نیہا ہر گزرتے لمحے کے ساتھ دلشاد سے متاثر ہوتی جا رہی تھی۔ جیسے اس کی باتوں میں کوئی جادو تھا۔ جو نیہا کو اپنے سحر میں جکڑتا جا رہا تھا۔ اب تو وہ فریحہ سے جلن بھی محسوس کرنے لگی تھی۔ نیہا اسے پانے کے بارے میں بتا رہی تھی۔

''مجھے تھیٹر اور موسیقی کا شروع ہی سے شوق رہا ہے۔''

''اسی شوق کی وجہ سے ہم دونوں کی دوستی بھی ہوئی۔'' فریحہ نے لقمہ دیا۔

''تمہارا تو اوڑھنا بچھونا ہی موسیقی ہے۔'' دلشاد نے فریحہ سے کہا۔

''بالکل۔'' فریحہ نے کہا۔ ''میری تو رگ رگ میں موسیقی سمائی ہوئی ہے۔''

''مطلب آپ دونوں کا فارغ وقت موسیقی میں ہی گزرتا ہے۔'' دلشاد نے کہا۔

''فریحہ کا تو کہہ سکتے ہو۔'' نیہا نے وضاحت کی۔ ''لیکن زمانے میں اور بھی غم ہیں موسیقی کے سوا...... مطلب میرے اور بھی مشاغل ہیں۔''

''مثلاً......'' دلشاد نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''کیا میں جان سکتا ہوں؟''

''ضرور......'' نیہا نے بتانا شروع کیا۔ ''مثلاً میں جم کرتی ہوں۔ تیراکی بھی کرتی ہوں اور کبھی کبھی گھڑ سواری بھی۔''

''زبردست۔'' دلشاد نے کہا۔ وہ بھی نیہا کی شخصیت اور اس کی سرگرمیوں سے متاثر ہو رہا تھا۔

''لیکن میری ان چیزوں سے جان جاتی ہے۔'' فریحہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کیوں......؟'' دلشاد نے تعجب سے پوچھا۔ ''تمہیں یہ چیزیں پسند نہیں؟''

''ایسا نہیں ہے۔ یہ سب اچھا تو لگتا ہے۔'' فریحہ نے کہا۔ ''لیکن محنت بھی بہت لگتی ہے۔''

''لیکن مجھے محنت کرنا اور فٹ رہنا اچھا لگتا ہے۔'' نیہا نے کہا۔

''مجھے بھی۔'' دلشاد نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''جم کے بغیر تو میرا گزارہ ہی نہیں ہوتا۔''

''شاید یہی تم دونوں کی اسمارٹنس کا راز بھی ہے۔'' فریحہ نے کہا۔

''تو اور کیا مشاغل ہیں آپ کے۔'' دلشاد نے فریحہ کی

Digest Novels.com

بات کو نظر انداز کرتے ہوئے نیہا سے بات جاری رکھی۔ ''مطلب پڑھتی بھی ہیں یا زندگی تفریح میں ہی گزار دیتی ہے۔''

''پڑھنا تو ضروری ہے۔'' نیہا نے کہا۔ ''ویسے بھی ڈیڈ پڑھائی کے لیے یورپ بھیجنا چاہتے ہیں۔''

''واؤ زبردست۔'' دلشاد نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے سوال کیا۔ ''آپ کے ڈیڈ کیا کرتے ہیں؟''

''ارے بھئی اس کے ڈیڈ بہت بڑے آفیسر ہیں۔'' فریحہ نے جواب دیا۔ ''بیوروکریٹ ہیں۔''

''کیا مطلب......؟'' دلشاد کی حیرت بڑھ گئی۔

''جی...... میں فراز خان کی بیٹی ہوں۔'' نیہا نے کہا۔

''اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ ان کی سیٹ سنبھالے۔'' فریحہ نے مزید بتایا۔

''اچھا۔'' دلشاد، نیہا کو حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

''آپ نے نہیں بتایا کہ آپ کیا کرتے ہیں۔'' نیہا نے سوال کیا۔

''ظاہر ہے کچھ نہ کچھ تو کرتا ہے نا۔'' دلشاد نے بتانا شروع کیا۔ ''بہت سے منصوبے ہیں زندگی میں۔ خاص طور پر کاروبار وغیرہ کے حوالے سے۔ ویسے میری زیادہ دلچسپی امپورٹ ایکسپورٹ کی طرف ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' نیہا نے کہا۔

''میرا تو ارادہ یہی ہے کہ دنیا کی مختلف مارکیٹوں کا احاطہ کیا جائے۔'' دلشاد اسے اپنے بڑے بڑے خوابوں کے بارے میں بتانے لگا۔ ''یورپ، چین، عرب ممالک، جنوب مشرقی ایشیا، وسطی ایشیا وغیرہ۔''

''یار تم لوگوں نے کیا فضول باتیں شروع کر دیں۔'' فریحہ نے بیزاری سے کہا۔ ''میں بور ہو رہی ہوں۔''

''تمہارے لیے تو فضول باتیں ہی ہوں گی۔'' نیہا نے کہا۔

''کیونکہ تم تو بس ایک تخلیقی موسیقار ہو۔'' دلشاد نے بھی اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تو میں ہوں۔'' فریحہ نے کروفر سے جواب دیا۔ ''خیر یہ بتاؤ آئس کریم کھانی ہے۔''

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔'' دلشاد فوراً بولا۔

فریحہ ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے بولی۔ ''ارے یار یہاں تو دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا۔ خیر میں ابھی آرڈر کر کے آتی ہوں۔''

فریحہ اٹھ کر گئی تھی اور جیسے نیہا ایسے ہی کسی موقع کی منتظر تھی۔ اس نے فوراً دلشاد کا فون نمبر مانگا۔ دلشاد خود بھی جیسے اسی انتظار میں تھا۔ اس سے پہلے کہ فریحہ واپس آتی، اس نے جلدی سے نیہا کو اپنا نمبر لکھوا دیا۔

☆☆☆

نیہا رات اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے بظاہر تو اپنے بال سلجھا رہی تھی لیکن درحقیقت اس وقت خود سے بھی بیگانہ تھی۔ دور کی کسی سوچ میں گم تھی۔ اسے دلاور نے دھوکا دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ بھی کئی اور لڑکیوں کو اپنی محبت کے جال میں پھنسا کر بے وقوف بنا رہا تھا۔ اس دلاور نے تو جیسے نیہا کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس نے اسے صرف الو ہی نہیں بنایا بلکہ اس کی انا کو ٹھیس بھی پہنچائی تھی۔ وہ نیہا فراز خان تھی۔ جسے کوئی مائی کا لعل دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایسے میں جب اس کی انا اور خودداری کو تکلیف ہوئی تھی۔ دلشاد کی آمد اور اس سے ملنا اس کے لیے کسی... بہار کے جھونکے سے کم نہ تھا۔ وہ اپنے سارے غم بھولنا چاہ رہی تھی۔ دلشاد کی صورت میں اسے اپنے غموں اور دکھوں کا مداوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ انجانے میں اس کی محبت میں مبتلا ہوتی چلی جا رہی تھی۔ نیہا انہی خوابوں اور خیالوں میں گم تھی کہ موبائل پر بجنے والی رنگ ٹون سے اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو اسے یقین ہی نہیں آیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکان اُبھر آئی۔ اس نے جلدی سے فون اٹینڈ کیا۔

''ہیلو......دلشاد......!''

دوسری طرف دلشاد ہی تھا۔ وہ جس کے بارے میں سوچ رہی تھی جس کے خواب دیکھ رہی تھی، وہ اچانک آواز کی صورت میں اس کے سامنے آ گیا تھا۔

''میں نے کہیں آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟'' دوسری طرف سے دلشاد کی آواز اُبھری۔

''ارے......ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔'' نیہا نے جلدی سے کہا۔

''رات کافی بیت چکی ہے۔'' بستر پر نیم دراز دلشاد نے جواب دیا۔ ''اس وقت لوگ سو جاتے ہیں اس لیے پوچھا کہ آپ کی نیند میں مخل تو نہیں ہوا۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' نیہا نے کہا۔ ''نیند میں خلل ڈالنے کے لیے نیند کا آنا بھی ضروری ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کی نیندیں ہی اڑ جاتی ہیں۔''

''ایسا کیا ہو گیا جو آپ ایسا کہہ رہی ہیں؟'' دلشاد نے

Digest Novels .com

digest library.com

تفکر سے پوچھا۔

"کچھ خاص نہیں۔" نیہا نے کہا۔ "بس ویسے ہی نہیں آرہی نیند۔"

"آپ بتانا نہیں چاہ رہیں لیکن مجھے کچھ بتایا تھا...... فریحہ نے۔" دلشاد نے کہا۔

"کس بارے میں......" نیہا نے پوچھا۔

"آپ کے بارے میں۔" دلشاد نے بتایا۔ "کہ بہت دکھی ہیں آپ۔"

"دکھی تھی۔" نیہا نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن شاید اب نہیں۔"

"کیوں...... کوئی خوشی مل گئی ہے کیا؟" دلشاد نے پوچھا۔

"ہاں...... ایسا ہی کچھ ہے۔" نیہا نے جواب دیا۔

"کوئی نیا دوست......؟" دلشاد نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے پھر سوال کیا۔

"جی ہاں......" نیہا نے مسکراتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

"جان سکتا ہوں کہ وہ کون ہے......؟" دلشاد کے سوالات ہی ختم نہیں ہو رہے تھے۔ وہ شاید نیہا کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہ رہا تھا۔ لیکن نیہا بھی اس سے بیزار نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بھی اپنے دل کی بات اسے سنانا چاہ رہی تھی۔

"بتادوں گی۔" نیہا نے کھڑکی کے قریب آتے ہوئے قدرے شوخی سے کہا۔ "لیکن وقت آنے پر......"

"اچھی بات ہے۔" دلشاد نے سنجیدگی سے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی سن کر زندگی میں آگے بڑھنا چاہیے۔ پرانی پریشانیوں اور دھوکوں کو پیچھے ہی چھوڑ دینا چاہیے۔"

"ہمم......" نیہا اس کی باتوں سے دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ "میں اب ایسا ہی سوچ رہی ہوں۔"

"کتنا ایک جیسا سوچتے ہیں نا ہم۔" دلشاد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"ہاں......" نیہا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "ایک بات پوچھوں۔"

"جی ضرور۔" دلشاد نے کہا۔

"فریحہ سے آپ کی دوستی......" نیہا نے جز بز ہوتے ہوئے سوال کیا۔ "مم میرا مطلب ہے کہ کب سے آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"فریحہ اور میں......" اس سوال پر دلشاد کے چہرے پر بیزاری سی آگئی۔ "ہم بس ایک دوسرے کو جانتے ہی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اور میں اچھے دوست نہیں بن سکتے۔"

"وہ کیوں......؟" نیہا نے تعجب سے پوچھا۔

"اچھے دوست ایسے ہی تو نہیں بن جاتے۔" جواب دیتے ہوئے دلشاد اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ "بلکہ اس کے لیے ذہنی ہم آہنگی کا ہونا بھی تو ضروری ہے نا۔"

"لیکن فریحہ تو آپ کے بارے میں بہت زیادہ...... میرا مطلب ہے کہ وہ آپ کو دوست سے کہیں زیادہ کچھ سمجھتی ہے۔"

نیہا نے مزید کریدنا چاہا۔ پہلے دلشاد اس کی دل کی بات جاننا چاہ رہا تھا اور اب نیہا۔ دونوں ہی ایک دوسرے کو کھوجنے میں لگے تھے۔ شاید عشق کی آگ نے دونوں ہی طرف اپنی چنگاری چھوڑ دی تھی جو کسی بھی وقت بھڑک کر شعلہ بننے کو تیار تھی۔ لیکن راستے میں فریحہ نام کی رکاوٹ حائل تھی۔ نیہا اسی کے حوالے سے دلشاد سے غیر محسوس انداز میں وضاحت طلب کر رہی تھی۔

"فریحہ کے سمجھنے سے کیا ہوتا ہے۔" دلشاد نے ناگواری سے کہا۔ "انڈر اسٹینڈنگ تو دونوں طرف سے ہونی چاہیے نا۔"

"ہمم...... بالکل صحیح کہا۔" نیہا نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نیہا کی دلی مراد بر آئی تھی۔ فریحہ نام کا کانٹا درمیان سے بہ آسانی نکالا جا سکتا تھا۔ وہ کسی خیال میں تھی کہ دلشاد کی آواز آئی۔

"اگر آپ بُرا نہ مانیں تو اب میں ایک بات کہوں؟"

نیہا نے کب اس کی بات کا برا ماننا تھا۔ اس کے مثبت جواب پر دلشاد نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایسا کچھ بھی فریحہ کے طرف سے تو محسوس نہیں کیا۔ جیسا آپ سے مل کر......"

دلشاد نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ لیکن نیہا کے بے تابی سے پوچھنے پر بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم اچھے دوست بن سکتے ہیں۔"

دوسری طرف سے نیہا نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے لبوں کی مسکان گہری ہو چکی تھی۔ اس کی خاموشی سے دلشاد شش و پنج میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"کیا آپ کو اچھا نہیں لگا......"

"میں یہ سوچ رہی ہوں کہ۔" نیہا نے کہنا شروع کیا۔

"ہم دونوں کے خیالات واقعی بہت ملتے ہیں۔"

"کیا آپ بھی یہی سمجھتی ہیں۔" دلشاد نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے آپ نے ایک نئے دوست کے بارے میں پوچھا تھا......" نیہا نے بتانا شروع کیا۔ "اور...... اور میں نے کہا تھا کہ وقت آنے پر بتا دوں گی۔ اور میرے خیال میں وہ مناسب وقت یہی ہے۔ وہ نئے دوست آپ ہی ہیں۔ جب سے آپ سے ملی ہوں۔ تب سے یہ لگ رہا ہے جیسے......"

نیہا کہتے کہتے رک گئی۔ وہ اپنی بات کہہ نہیں پا رہی تھی۔ لیکن وہ دونوں ایک دوسری کی باتوں کو بغیر کہے ہی سمجھ رہے تھے۔ ان دونوں کے دلوں میں جیسے گھنٹیاں سی بج رہی ہوں۔ آس پاس . . . کوئی دھیمے . . . سروں والی موسیقی چل رہی ہو۔ کوئی بہت ہی رومانوی سی موسیقی۔ کسی مدھم آبشار کی طرح۔ جہاں صرف وہ دونوں موجود تھے۔ کیونکہ اس کیفیت کو وہی دونوں محسوس کر سکتے تھے۔ اگلے دن سمندر کے کنارے ملنے کا وعدہ کیا گیا۔ جہاں اکثر پیمان عہد و وفا کیے جاتے ہیں۔ نیہا تکیے سے سر ٹکائے لیٹی تھی۔ دونوں کی باتیں ختم ہو چکی تھیں۔ فون بند ہو چکا تھا۔ لیکن نیہا کی مسکراہٹ برقرار تھی۔ لیکن کیا سب کچھ اتنا ہی اچھا تھا جتنا نیہا سوچ رہی تھی۔

☆☆☆

دوسری طرف دلشاد کمرے میں آیا جہاں اس کا ایک دوست سلمان پہلے سے موجود تھا۔

"بڑی دیر کر دی۔" سلمان نے پوچھا۔ "کس سے باتیں کر رہے تھے۔"

"لاٹری ہاتھ لگ گئی ہے۔" دلشاد خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "سمجھو نصیب کھل گئے میرے۔"

"خیر تو ہے۔" سلمان نے اشتیاق سے پوچھا۔ "بڑا خوش لگ رہا ہے میرا بھائی۔"

"کیوں نہ ہو......" دلشاد بیٹھتے ہوئے بولا۔ "آج ایک ایسی بندی ملی ہے۔ لگتا ہے جیسے میرے لیے ہی بنی ہو۔"

"ابے کوئی نئی بندی مل گئی کیا۔" سلمان نے تشویش سے کہا۔ "اور وہ پرانی والی کا کیا ہوا؟"

"وہ فریحہ......" دلشاد منہ بنا کر بولا۔ "وہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"مطلب کہ کوئی بڑا ہاتھ مارا ہے میرے بھائی نے۔" سلمان اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔

"ابے ہاں نا......" دلشاد نے اکڑتے ہوئے کہا۔

"ایک بہت بڑے افسر کی بیٹی ہے۔"

"اچھا......" سلمان نے فکرمندی سے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "ابے کہیں خود ہی نہ پھنس جانا پیار محبت کے چکر میں۔"

"میں کیوں پھنسوں گا۔" دلشاد نے کہا۔ "محبت کی ہے کوئی جرم نہیں۔"

"اچھا جی۔" سلمان نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ۔ شادی تک بات پہنچی یا تم نے ایسا کچھ کہا۔"

"دوستی کی شروعات تو ہو گئی ہے۔" دلشاد نے بتایا۔ "آہستہ آہستہ منزل بھی مل جائے گی۔"

"بس اب تو دیر نہ کر......" سلمان نے بے صبری سے کہا۔

"بس بس صبر کر اور سوجا سکون سے۔" دلشاد نے اپنے بستر پر لیٹتے ہوئے کہا۔ "بہت جلد وارے نیارے ہونے والے ہیں ہمارے۔"

☆☆☆

نیہا اپنے کمرے میں خوب تک سک سے تیار ہو رہی تھی۔ اس کے موبائل پر کال آئی تو نیہا نے مسکراتے ہوئے فون اٹھایا اور دیکھے بغیر ہی شوخی سے ہیلو کہتے ہوئے فون اٹینڈ کیا لیکن دوسری طرف فریحہ تھی جو . . . آج کے پلان یا ملنے کا پوچھ رہی تھی لیکن نیہا کا اس سے ملنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"نہیں فریحہ یار آج تو کوئی پلان نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرا موڈ ہے۔" نیہا نے بہانہ بناتے ہوئے کہا۔

"کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا۔" فریحہ نے پوچھا۔

"نہیں نا۔ پریشانی کس بات کی۔" نیہا نے کہا۔ "تم بھی گھر پر ہی آرام کرو۔ میں تمہیں کال کر کے آتی ہوں تمہاری طرف۔ تم گھر پر ہی ہونا۔"

"ہاں...... میں گھر پر ہی ہوں۔" فریحہ نے جواب دیا۔

نیہا نے کال منقطع کر دی۔ اس کے بعد اس نے مسکراتے ہوئے اپنے سراپا کا جائزہ لیا اور کمرے سے نکل کر لاؤنج سے گزر رہی تھی کہ اس کے سامنے فراز آ گیا۔

"کہاں کی روانگی ہے۔" فراز نے پوچھا۔

"بس ویسے ہی دوستوں کی طرف جا رہی ہوں۔" نیہا نے خوشی سے کہا۔

"آج بہت خوش لگ رہی ہو۔" فراز نے اسے چہکتے ہوئے دیکھ کر سوال کیا۔

Digest Novels .com

''تو اُداس کب تھی میں......؟'' نیہا نے مسکراتے ہوئے الٹا سوال کر دیا۔

''کچھ دنوں سے کچھ پریشان تھیں۔'' فراز نے کہا۔ ''لیکن آج تمہارے رویے میں تبدیلی نمایاں ہے۔''

''آپ سوچتے زیادہ ہیں۔'' نیہا نے لاڈ سے جواب دیا۔ ''اچھا ڈیڈ میں جا رہی ہوں۔ بعد میں بات کرتے ہیں۔ بائے۔''

☆☆☆

دلاور پولیس کی حراست میں تھا۔ اس کے سامنے اے ایس آئی شہزاد مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوا ٹہل رہا تھا جبکہ دلاور ہکا بکا سوال کر رہا تھا۔

''سر بتائیں تو سہی...... مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔''

''ابھی معلوم ہو جائے گا۔'' شہزاد نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''لیکن میں نے کیا کیا ہے۔ آخر میرا قصور کیا ہے۔'' دلاور نے زور دیتے ہوئے پوچھا۔

''دولت مند لڑکیوں کو پھانستے ہو۔ غلط کام کرتے ہو۔'' شہزاد نے اس کا کالر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اور یہاں ہمارے سامنے اتنے معصوم بن کر پوچھ رہے ہو کہ کیا کیا ہے۔''

''یہ...... یہ الزام ہے مجھ پر۔'' دلاور نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''یہ تو پتا چلے گا جب نیہا بی بی عدالت میں تمہارے خلاف گواہی دے گی۔''

شہزاد کے منہ سے نیہا کا نام سن کر دلاور چونک گیا۔ اس نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔

''نیہا...... لیکن میرا اس سے کیا تعلق؟''

''اچھا...... تم اس کے دوست نہیں تھے۔'' شہزاد نے طنزیہ کہا۔ ''وہ کیا کہتے ہو تم...... بوائے فرینڈ......''

''وہ معاملہ تو کب کا ختم ہو چکا۔'' دلاور منمناتے ہوئے بولا۔

''اسی وجہ سے تم اسے دھمکا بھی رہے تھے۔'' شہزاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بدنام کرنا چاہ رہے تھے اسے۔''

''یہ...... یہ سب جھوٹ ہے۔'' دلاور گھبراہٹ میں ہکلانے لگا۔ ''مم...... میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''ایسا کچھ کہا بھی نہیں......؟'' شہزاد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''سر جی...... غصے میں کہہ دیا ہو گا......'' دلاور نے کہا۔

''ہاں تو ابھی نکالتے ہیں نا تمہارا غصہ۔'' شہزاد نے اس کی گردن پکڑتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ کتنے آدمیوں کا گینگ ہے۔''

''گینگ...... کیسا گینگ......؟'' اب تو دلاور کی سٹی ہی گم ہو چکی تھی۔

''اوئے معصوم چوزے۔'' شہزاد نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''صدقے جاؤں تیری اس معصوم ادا پر۔ زیادہ ڈرامے بازی نہ کر سچ سچ بتا اور کتنے لوگ ہیں تمہارے ساتھ۔''

''سر مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' دلاور نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ ''آپ کس بارے میں بات کر رہے ہیں۔''

''بیٹا لگتا ہے تیری چھتر سے دھنائی کرنی پڑے گی۔'' شہزاد نے پاس رکھا ہوا چھتر اٹھاتے ہوئے کہا۔ دلاور کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ چھتر کا ایک ہی وار ہٹے کٹے انسان کی چمڑی ادھیڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اب شہزاد کے ہاتھوں اس کی کھال اتارنے سے کوئی روکنے والا نہیں تھا لیکن اسی وقت سب انسپکٹر صدیقی آ گیا۔

''کچھ معلوم ہوا اس سے۔'' صدیقی نے شہزاد سے سوال کیا۔

''منہ نہیں کھول رہا۔'' شہزاد نے چھتر دکھاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن ہمیں بھی سب اگلوانا آتا ہے۔''

''دیکھو دلاور۔'' صدیقی نے نرمی اور سنجیدگی سے کہا۔ ''اگر تم ہمیں سب کچھ سچ بتا دو گے تو ہو سکتا ہے مار کھانے سے بچ جاؤ۔''

''سر وہ نیہا۔ میری گرل فرینڈ...... مطلب دوست تھی۔'' دلاور نے بتانا شروع کیا۔ ''لیکن مجھ سے ناراض تھی۔ اس نے مجھ سے تعلق بھی ختم کر لیا تھا اسی لیے میں کچھ غصے میں تھا۔''

''اور اسی غصے میں تم نے اس کی زندگی برباد کر دی۔'' صدیقی نے کہا۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' دلاور نے کہا۔ ''وہ میری زندگی برباد کر رہی تھی۔ مجھ سے بے وفائی کر رہی تھی۔''

''کیا کیا تھا اس نے......؟'' صدیقی نے سوال کیا۔

''اس کو ایک نیا دوست مل گیا تھا۔'' دلاور نے جواب دیا۔

''کون......؟'' صدیقی کے سوال پر کہانی ماضی کی طرف پرواز کر گئی۔

☆☆☆

دلاور اپنی کار میں کہیں سے گزر رہا تھا کہ اس کی نظر سڑک کی دوسری جانب کسی مال کی پارکنگ میں موجود نیہا پر پڑی جو اپنی کار سے ٹیک لگائے کھڑی کسی سے ہنس ہنس کر بات کر رہی تھی۔ دلاور نے فوراً اپنی کار گھمائی اور اس کے سامنے پہنچ گیا۔

''ہاں میں پہنچ گئی ہوں۔ اور جناب آپ لیٹ ہو گئے ......وہ بھی پہلی ہی ملاقات میں......ٹھیک ہے۔ میں تو مذاق کر رہی تھی۔''

دلاور نے اپنی کار سے اترتے ہوئے سنا کہ وہ کسی سے خوب شوخی کے ساتھ بات کر رہی تھی۔ دلاور نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ ''نیہا......''

اس کی آواز پر نیہا نے چونکتے ہوئے دیکھا اور اکھڑ لہجے میں بولی۔ ''تم یہاں......میرا پیچھا کر رہے ہو؟''

''نہیں۔'' دلاور نے جواب دیتے ہوئے سوال کر دیا۔ ''لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''جو بھی کر رہی ہوں۔ تمہیں اس سے کیا مطلب ہے؟'' نیہا نے غصے سے کہا۔

''لیکن تم مجھ سے بے وفائی کیوں کر رہی ہو؟''

''اچھا میں بے وفائی کر رہی ہوں۔'' بے وفائی کا طعنہ سن کر تو جیسے نیہا کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ''اور جو تم نے کیا تھا۔ وہ کیا تھا؟''

''وہ ایک غلطی تھی۔'' دلاور نے شرمندہ ہوئے بغیر مکاری سے جواب دیا۔ ''چھوٹی سی غلطی۔''

''تمہارے لیے ہو گی چھوٹی سی غلطی۔'' نیہا نے اسے لتاڑتے ہوئے کہا۔ ''میرے لیے نہیں۔''

''یہ تم اچھا نہیں کر رہی ہو۔'' دلاور بدستور ڈھٹائی پر اترا ہوا تھا۔ ''اس کی تمہیں سزا بھگتنی پڑے گی۔''

یہ کہہ کر دلاور اچانک جنونی ہو گیا۔ وہ نیہا کے انتہائی نزدیک پہنچ گیا جیسے اسے کوئی نقصان پہنچانا چاہتا ہو۔ اس کی غصے سے ابلتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر نیہا ڈر گئی تھی۔ لیکن اچانک اسی وقت کسی نے دلاور کو پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔ وہ دلشاد تھا جو عین موقع پر نیہا کی مدد کو پہنچ گیا تھا۔

''اے مسٹر کون ہو تم۔'' دلشاد نے دلاور کو للکارتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے؟''

''تم کون ہو۔'' دلاور نے دلشاد کو پیچھے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ بہتر ہو گا کہ تم بیچ میں نہ پڑو اور اپنے کام سے کام رکھو۔''

''اچھا تمہارا آپس کا معاملہ ہے۔'' دلشاد نے اطمینان سے پوچھا۔ ''نیہا، تم بتاؤ کون ہے یہ؟''

''یہ دلاور ہے۔'' نیہا نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تنگ کر رہا ہے۔ ہراساں کر رہا ہے۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو تم۔'' دلاور ٹھنکارتے ہوئے بولا۔ ''میں تم سے بات کر رہا ہوں اور تم سن بھی نہیں رہیں۔''

''مجھے نہیں سننی تمہاری بات۔'' نیہا نے قطعی لہجے میں جواب دیا۔ ''میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''سن لیا۔'' دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اب چلتے پھرتے نظر آؤ ورنہ......''

''ورنہ کیا۔'' دلشاد کی بات پر دلاور مزید طیش میں آ گیا۔ ''تو کیوں ہیرو بن رہا ہے بیچ میں۔''

''تم چلے جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔'' دلشاد کی جگہ نیہا نے جواب دیا۔

''اچھا اب تم میرے لیے پولیس بلاؤ گی۔'' دلاور خود غیر یقینی کی سی کیفیت کا شکار ہو چکا تھا اس لیے اس نے پسپا ہونے میں ہی عافیت سمجھی۔ ''خیر ابھی تو جا رہا ہوں لیکن مسٹر تمہیں......تمہیں بھی دیکھ لوں گا میں۔''

جاتے جاتے بھی دلاور دلشاد کو دھمکانے سے باز نہیں آیا تھا۔ اس کی بات سن کر دلشاد غصے سے آگے بڑھا۔ ''کیا دیکھ لو گے مجھے۔ ہاں......بتاؤ۔''

لیکن اس سے پہلے کے معاملہ زیادہ بڑھتا اور بات ہاتھا پائی تک پہنچ جاتی، نیہا نے آگے بڑھ کر دلشاد کو روک لیا۔ ''رک جاؤ دلشاد۔ اسے جانے دو۔''

''دلشاد۔'' نام سنتے ہوئے دلاور معنی خیز انداز میں بولا۔ ''اچھا تو دلشاد نام ہے اس کا۔''

دلاور اسے گھورتا ہوا چلا گیا کیونکہ وہ فی الحال کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کے بعد دلشاد نے نیہا کو دونوں ہاتھوں سے تھامتے ہوئے پوچھا۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' نیہا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

''اب میں ہوں تمہارے ساتھ۔'' دلشاد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''لہٰذا اب کسی سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

اس کی بات سن کر نیہا مسکرائی۔ اسی وقت دلشاد کے

موبائل پر فریحہ کی کال آئی جو نیہا نے بھی دیکھ لی۔ لیکن دلشاد نے اس سے بات کرنے کے بجائے اس کا فون کاٹ دیا۔

''فریحہ کی کال تھی۔'' نیہا نے کہا۔ ''بات تو کرتے۔''

''مجھے نہیں کرنی اس سے بات۔'' دلشاد نے بیزاری سے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' نیہا نے بظاہر حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ اندر ہی اندر وہ بھی خوش ہو رہی تھی۔

''میں اسے صرف دوست سمجھتا ہوں۔'' دلشاد نے کہا۔ ''اور وہ پتا نہیں کیا سوچے بیٹھی ہے۔ وہ خود سے ہی آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ بات کو نہیں سمجھتی۔''

''اور مجھے۔'' نیہا نے شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''مجھے کیا سمجھتے ہو؟''

''اپنی زندگی......'' دلشاد نے محبت بھری نظروں سے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے جواب دیا۔

☆☆☆

دلشاد کی بات سے نیہا خوشی سے سرشار ہو چکی تھی۔ دونوں نے کافی وقت ساتھ گزارا۔ کھانا کھایا۔ کافی پی۔ سمندر پر ساتھ چہل قدمی کی۔ بہت ساری باتیں کیں۔ نیہا کو تو جیسے اس کی زندگی کا ساتھی مل چکا تھا۔ یہ دلشاد ہی تھا جو اس کے لیے ہر لحاظ سے مناسب تھا۔ گھر واپسی پر تو وہ جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اتنا اچھا مہذب، تمیزدار، محبت کرنے والا، پیسے والا، تعلیم یافتہ۔ اتنی ساری خصوصیات۔ دلاور تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ نیہا بہت خوش تھی۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگ جا بجا ملتے ہیں جو ذرا سی دیر میں ساری خوشی غارت کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ نیہا کو پتا ہی نہیں تھا کہ ایک مصیبت اس کا گھر پر انتظار کر رہی ہے۔ اور وہ مصیبت کوئی اور نہیں۔ اس کی اپنی سب سے اچھی دوست فریحہ تھی۔ جس سے اس نے دلشاد کو چھینا تھا۔ نیہا اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر ٹپٹا سی گئی کیونکہ اس کے دل میں چور تو تھا نا۔

''فریحہ تم...... تم کب آئیں؟''

''بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' فریحہ نے قدرے تلخی سے جواب دیا۔

''اندر تو آؤ۔'' نیہا نے اس کی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔''

''مجھے نہیں آنا اندر۔'' اس مرتبہ فریحہ کے لہجے میں غصے کا عنصر نمایاں تھا۔

''تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' نیہا نے نہ سمجھتے ہوئے

گھر کے بڑوں کے لیے

کے باذوق قارئین کے لیے خوشخبری

ماہنامہ پاکیزہ

کون خوابوں کے پار رہتا ہے

خوابوں، خیالوں اور تخیلات کی دنیا ہمیشہ ہی مسحور کن لگتی ہے۔ سنہرے اور روپہلے خوابوں پر نہ کسی کو اختیار ہے اور نہ ہی کوئی قدغن لگا سکتا ہے۔ امنگوں، آرزوؤں کی تکمیل میں تخیلاتی دنیا کبھی معاون ہوتی ہے تو کبھی انسان مایوس بھی ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں مایوسی بھی آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہو تو منزل تک پہنچنا آسان ہو جاتا ہے۔

حسین داستان اور خوابوں کی تعبیر...... ایسے ہی تو بنتی ہے ایک دلکش تحریر

مایہ ناز، قلمکار، ہردلعزیز ناول نگار محترمہ

افشاں آفریدی

کے ماہرانہ انداز بیان کا ایک اور دلکش، حسین و پر لطف قسط وار ناول

جلد ہی ماہنامہ پاکیزہ کے صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

پوچھا۔

''تم نے یہ اچھا نہیں کیا نیہا۔'' فریحہ نے اصل بات کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''تم نے دلشاد کو مجھ سے چھینا ہے۔''

''میں نے کسی کو نہیں چھینا تم سے۔'' نیہا نے جھوٹ بولا۔ ''تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''مجھے سب پتا ہے۔'' فریحہ نے کہا۔ ''تم اور دلشاد ساتھ تھے نا۔''

''ہاں تو۔'' نیہا نے بے پروائی سے کہا۔ ''اس میں کون سی معیوب بات ہے۔''

''معیوب بات یہ ہے کہ تم دونوں نے مجھ سے جھوٹ بولا۔'' فریحہ نے بتایا۔ ''دلاور سب بتا چکا ہے مجھے۔''

''فریحہ......'' نیہا نے گہرا سانس لے کر بات بنانے کی کوشش کی۔ ''تمہیں پوری بات نہیں پتا نا۔ میں بتاتی ہوں۔ میں کسی کام سے گھر سے باہر تھی۔ تو دلاور نے دیکھ لیا اور مجھے تنگ کرنے آ گیا۔ اسی وقت اتفاق سے دلشاد وہاں پہنچ گیا اور اس نے آ کر میری جان بچائی۔''

''اور یوں وہ تمہارا ہیرو بن گیا، ہے نا۔'' فریحہ کی بات سے لگ رہا تھا کہ وہ اس کی باتوں میں آنے والی نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے نیہا کے پاس فرار کا راستہ نہیں بچا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس معاملے کو اسی وقت واضح کر دیا جائے تو بہتر ہے۔

''اگر ایسا ہے تو...... تمہیں کیا تکلیف ہے۔'' نیہا نے ایک ادا سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تکلیف یہ ہے کہ وہ میرا دوست ہی نہیں تھا بلکہ محبوب تھا میرا۔'' فریحہ نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''غلط فہمی ہے تمہاری۔'' نیہا نے اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تمہارا صرف دوست تھا۔ محبوب نہیں۔''

''تمہارے ملنے سے پہلے تک وہ میرا ہی سب کچھ تھا۔'' فریحہ نے پچھتاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میں نے تم پر بھروسا کیا۔ اس سے ملوایا اور اپنے پاؤں پر میں نے خود ہی کلہاڑی ماری۔''

''اس نے خود کہا ہے۔'' نیہا نے دوبارہ اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''وہ تمہارا کبھی تھا ہی نہیں۔''

''اچھا۔'' فریحہ نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''بہت جلد وہ تمہارا بھی نہیں رہے گا۔''

''کیا کرو گی تم؟'' نیہا نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں بھی اتنی آسانی سے یہ محبت پروان چڑھنے نہیں دوں گی۔'' فریحہ نے جواب دیا۔

''فریحہ......'' نیہا نے اس کی بحث بازی پر چڑتے ہوئے کہا۔ ''تم جو چاہو کر لو لیکن میرا دماغ نہ کھاؤ۔''

اتنا کہہ کر وہ اندر کی طرف جانے کے لیے پلٹی تھی لیکن فریحہ خاموش رہنے والی نہیں تھی۔ اس نے نیہا کو لتاڑتے ہوئے کہا۔

''تم نے نہ صرف مجھے بلکہ دلاور کو بھی دھوکا دیا ہے۔''

''دلاور کا نام نہ لو میرے سامنے۔'' دلاور کا نام سن کر نیہا بھی طیش میں آ گئی۔

''کیوں نہ لوں اس کا نام۔'' فریحہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''ہم دونوں اتنی آسانی سے تمہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔ چاہے مجھے اس کے لیے کسی بھی حد تک جانا پڑے۔''

''کس حد تک جا سکتی ہو تم؟'' نیہا نے اسے جانچتے ہوئے کہا۔

''بدنام کر دوں گی تمہیں۔'' فریحہ نے اسے دھمکی دی اور پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔ نیہا اس کو جاتا دیکھتی رہ گئی تھی۔ کچھ دیر تک یوں ہی کھڑی رہی اور پھر سر جھٹک کر اندر چلی گئی۔ وہ بھی سیٹھ فراز کی بیٹی تھی۔ کسی کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈرتی نہیں تھی۔

☆☆☆

سلمان کچن میں کچھ بنا رہا تھا۔ دلشاد وہیں بیٹھا خیالی پلاؤ پکا رہا تھا۔

''کچھ میرا ہاتھ ہی بٹا دو۔'' سلمان نے کہا۔ ''یا ایسے ہی بیٹھے مکھیاں مارتے رہو گے۔''

''یار مجھ سے نہیں ہوتے یہ زنانہ کام۔'' دلشاد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''واہ زنانہ کام۔'' سلمان نے چڑتے ہوئے کہا۔ ''تو لے آؤ نا کوئی زنانی اس کام کے لیے۔''

''ابے سلمان سارے ذمے داری میری ہے کیا۔'' دلشاد نے بیزاری سے کہا۔ ''زنانی تم لے آؤ نا۔ کچھ تم بھی تو کر کے دکھاؤ۔''

''یار زنانی سے یاد آیا۔'' سلمان نے یاد کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری وہ کیسی ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''نیہا۔'' دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آئے ہائے کیسے کلیاں کھل گئیں اس نازنین کا نام لیتے ہی۔'' سلمان اسے چھیڑنے لگا۔ ''یہ بتاؤ کہ ملاقات

Digest Novels .com

ہوئی اس سے؟''

''ہاں۔'' دلشاد نے بتایا۔ ''آج ہی ملی تھی۔''

''پھر بات بڑھی؟'' سلمان نے قریب آتے ہوئے پوچھا۔

''ابے تو کیا بڑھی عورتوں کی طرح بات کرتا ہے۔'' دلشاد نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا۔ ''اس کے سوا تمہیں کوئی اور کام نہیں ہے کیا۔''

''ابے جب کوئی بڑا بوڑھا نہیں گھر میں تو مجھے ہی کرنا پڑے گا نا یہ کردار بھی۔'' سلمان نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تو سمجھ نہیں رہا میرے بھائی۔''

''تو سمجھا دے نا مجھے۔'' دلشاد نے طنزیہ کہا۔

''ابے بھائی کتنا اور وقت لے گا؟'' سلمان... نے بے صبری سے کہا۔

''صبر کر صبر۔'' دلشاد نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''

''کہیں پھل ہی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔'' سلمان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اور تم صبر ہی کرتے رہ جاتا۔''

''ایسے کیسے نکل جائے گا ہاتھ سے۔'' دلشاد نے رعونت سے کہا۔ ''یہ میرا ہاتھ ہے۔''

''یار ایسی لڑکیاں جلدی جلدی دوست اور محبوب بدلتی ہیں۔'' سلمان نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔ ''تجھ سے اچھا کوئی ٹکرا گیا تو ہو گیا کام تمام۔''

''کیوں پریشان ہوتا ہے۔'' دلشاد نے جھلاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی دو دن تو ہوئے ہیں۔''

''ابھی وہ ہاتھ میں ہے کچھ کرلے۔'' سلمان نے سرگوشی والے انداز میں کہا۔ ''ہاتھ سے نہ نکل جائے۔''

''مٹھی بند کرلوں گا۔'' دلشاد نے اپنی مٹھی بند کر کے دل سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''ایسے جکڑ لوں گا اسے۔''

''اس بند مٹھی سے بھی وہ پھسل نہ جائے۔ ریت کی طرح۔'' سلمان بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔ لیکن دلشاد کو خود پر پورا اعتماد تھا۔

''نہیں جا سکتی......کہیں نہیں جا سکتی۔ میرا نام بھی دلشاد ہے۔''

☆☆☆

نیہا اور دلشاد دونوں سمندر کے کنارے ساتھ بیٹھے تھے۔ سمندر کے شور کے ساتھ دونوں خاموش تھے۔ دلشاد اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کب وہ خاموشی توڑے۔ نیہا جو کسی گہری سوچ میں گم تھی اسی نے اس خاموشی کو ختم کر کے بولنا شروع کیا۔

''کل فریحہ آئی تھی گھر۔ اسے دلاور نے بتا دیا تھا۔ تمہارے اور میرے بارے میں۔''

''اچھا ہوا۔'' دلشاد نے بے پروائی سے کہا۔ ''پہلے ہی معلوم ہو گیا۔ ایک نہ ایک دن تو پتا لگنا ہی تھا۔''

''وہ بہت جھگڑ رہی تھی مجھ سے۔'' نیہا نے مزید بتایا۔ کہہ رہی تھی کہ میں نے تمہیں اس سے چھین لیا۔''

''کہنے دو۔ کہنے والوں کی زبان کو روک سکتے ہیں کیا۔'' دلشاد نے نرمی سے کہا۔ ''اور ہمیں کسی کے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''دھمکی بھی دے رہی تھی۔'' نیہا نے اصل خدشے کے بارے میں بتایا۔ ''مجھے بدنام کرنے کی۔ فریحہ اور دلاور کوئی نقصان نہ پہنچا دیں مجھے۔''

''اتنا آسان نہیں ہے یہ سب۔'' دلشاد نے اسے ہمت دلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اور دلاور میں اتنی ہمت نہیں۔ بزدل آدمی ہے وہ۔''

''کیا کروں میں۔'' نیہا نے اداسی سے کہا۔

''خوش رہو۔ زندگی کا لطف اٹھاؤ۔ جو پہلے کرتی تھیں۔ اب بھی وہی کرو۔''

دلشاد نے یہ سب کہہ کر سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی۔ نیہا اسے محبت بھری اور مسکراتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ دلشاد نے سگریٹ کا پیکٹ نیہا کی طرف بڑھایا۔ اس نے بھی ایک سگریٹ نکال لی۔ دونوں نے ایک ساتھ سگریٹ جلائی اور دھواں اڑانا شروع کر دیا۔ کچھ دیر بعد نیہا نے دلشاد کے کندھے پر سر ٹکاتے ہوئے کہا۔

''کتنا سکون مل رہا ہے تمہارے ساتھ۔ دل چاہ رہا ہے کہ بس یونہی بیٹھی رہوں تمہارے ساتھ۔ مجھے کبھی اپنے گھر میں بھی اتنا سکون نہیں ملا۔''

''مجھے بھی بہت سکون مل رہا ہے۔'' دلشاد نے کہا۔ ''لیکن اس سے بھی زیادہ سکون کی ایک جگہ ہے۔''

''کون سی جگہ؟'' نیہا کے سوال پر دلشاد نے بتایا۔

''میرا گھر بہت پرسکون ہے۔ چھوٹا سا ہے بالکل سادہ سا لیکن... غموں اور دکھوں کو سمو لیتا ہے اپنے اندر۔''

''مجھے دیکھنا ہے تمہارا گھر۔'' نیہا نے اس کے کندھے سے سر ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی۔''

نیہا کی اس اچانک فرمائش پر دلشاد حیران رہ گیا تھا۔ اسے سوچتا ہوا دیکھ کر نیہا نے سوال کیا۔

Digest Novels .com

digest library.com

”کیا سوچ رہے ہو۔ گھر والے اعتراض کریں گے کیا؟“

”نہیں۔ گھر والے کہاں۔ اکیلا ہی رہتا ہوں بس۔“ دلشاد نے جواب دیا۔ ”تمھیں میرا گھر دیکھنا ہے نا۔ تو پھر چلو میرے ساتھ۔“

☆☆☆

دونوں دلشاد کے گھر پر موجود تھے۔ ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ لیکن نیہا کو بہت سکون مل رہا تھا۔ وہ گھوم پھر کر اس کے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔ دلشاد ایک جگہ کھڑا شربت بنا رہا تھا۔

”زندگی کے کئی سال اس گھر میں گزارے ہیں۔“ دلشاد اسے بتا رہا تھا۔ ”اب کہیں اور جانے کو دل نہیں چاہتا۔ حالانکہ میں ایک اچھا اور بڑا گھر لے سکتا ہوں۔“

”تم اکیلے کیسے رہتے رہے ہو؟“ نیہا نے اس کی طرف پلٹتے ہوئے سوال کیا۔

”بالکل اکیلا تو نہیں۔“ دلشاد نے اسے بتایا۔ ”ایک دوست ہے۔ وہ بھی کبھی آجاتا ہے تو دل بہل جاتا ہے۔ ورنہ تو اکیلے میں یہ گھر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔“ نیہا نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب میں آجایا کروں گی۔ اچھا وقت گزر جایا کرے گا۔“

”تم کیا کرو گی یہاں روز روز آکر۔“ دلشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔

”خوب باتیں کیا کریں گے۔“ نیہا نے شوخی سے کہا۔ ”کھائیں گے پئیں گے۔“

”ہم ...... چلو اس بہانے رونق آجایا کرے گی۔“ دلشاد نے شربت کا گلاس نیہا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال یہ شربت تو پیو۔ اتنی جلدی میں تو یہی بن سکتا تھا۔“

نیہا نے اس کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ایک طرف رکھ دیا۔ ”اچھا ہی بنایا ہوگا۔“

”میں نے بنایا ہے اپنے ہاتھوں سے۔ دلشاد نے اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔

نیہا مسکرا کر شربت پینے لگی۔ دلشاد نے دوسرا شربت کا گلاس اٹھایا اور خود بھی پینا شروع کر دیا۔ پھر اس نے نیہا کی طرف دیکھا۔ وہ سر پکڑ رہی تھی۔

”دلشاد......“ نیہا کی ڈوبتی ہوئی آواز ابھری۔ ”پتا نہیں...... چکر سے آرہے ہیں۔“

نیہا کچھ ہی لمحوں میں مدہوشی کی سی کیفیت میں مبتلا ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ وہ مدد کے لیے دلشاد کو پکار رہی تھی۔ جلد ہی وہ مکمل تاریکی میں ڈوب گئی۔ نیہا بے ہوش ہو چکی تھی۔ اس کے بے ہوش ہونے پر دلشاد اطمینان سے بیٹھا تھا۔ وہ شربت کا گلاس ایک طرف رکھ کر بے ہوش نیہا کو دیکھنے لگا۔ اس کے ارادے مشکوک تھے۔ جو اس کے مکروہ چہرے کی بھیانک مسکراہٹ سے عیاں ہو رہے تھے۔

☆☆☆

نیہا کو جب ہوش آیا۔ وقت کافی گزر چکا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی۔ ایک طرف دلشاد بے پروا سے بیٹھا موبائل پر دیکھ رہا تھا۔ نیہا نے اپنا جائزہ لیا ہے تو اسے اپنا حلیہ بھی کچھ خراب سا لگا۔ سامنے لگے آئینے میں اسے اپنے بال بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس کا لباس مسلا ہوا تھا۔ اسے شک ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ اس نے دلشاد کو پکارا اور اپنی حالت پر جواب طلب کیا۔ دلشاد اس کی طرف مکاری سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”تمھیں چکر آگئے تھے۔ تم بے ہوش ہو گئی تھیں۔ گرمی بہت ہے نا...... شاید اسی لیے۔“

”مجھے سچ سچ بتاؤ۔ تم نے میرے ساتھ...... کچھ غلط تو نہیں کیا؟“

نیہا کہتے ہوئے بھی گڑبڑا رہی تھی لیکن دلشاد اپنی جگہ سے اٹھا اور پچکارتے ہوئے آگے بڑھا۔

”ارے پریشان کیوں ہوتی ہو میری جان۔ میں تمہارے ساتھ غلط کیوں کروں گا۔“

”رک جاؤ...... وہیں رک جاؤ۔“ نیہا اسے ترخ کر روکتے ہوئے بولی۔ ”تم نے کوئی گڑبڑ کی ہے نا میرے ساتھ۔ بولو......“

”ارے گڑبڑ کیسی۔“ دلشاد ڈھٹائی سے ہنستے ہوئے بولا۔ ”تم اور میں الگ تو نہیں ہیں نا۔ ایک جان دو قالب ہیں۔“

”کیا مطلب ہے اس بات کا۔“ نیہا جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم پر شک ہو رہا ہے۔“

”ارے اس میں شک کی کیا بات ہے۔ تم سے محبت کرتا ہوں میں۔“

دلشاد دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھا لیکن وہ اسے دھکیلتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ دلشاد بھی بے غیرتی سے باز نہیں آیا۔ اسے جاتے دیکھ کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

”ارے اتنی جلدی کیا ہے۔ تمہارے لیے ایک سرپرائز بھی ہے۔“

نیہا اس کی بات کو ان سنی کر کے جا چکی تھی۔ اس کے ساتھ بہت بری گڑبڑ ہو چکی تھی۔ اس کی اپنی عزت داؤ پر لگ چکی تھی۔ دلشاد اس کے جذبات سے کھیل چکا تھا۔ اب اس کا دولت میں کھیلنے کا وقت تھا۔ دلشاد کے ساتھ اس کام میں سلمان بھی برابر کا شریک تھا۔ ان دونوں کا کام ہی یہ تھا۔ اسی رات کو وہ نیہا کی نازیبا تصاویر سلمان کو دکھا رہا تھا۔ سلمان ماتھے پر بل ڈالے انہیں آگے بڑھا کر دیکھ رہا تھا۔

''کیا ہوا۔'' دلشاد نے سگریٹ جلاتے ہوئے پوچھا۔ ''تصویریں پسند نہیں آئیں کیا۔''

''تصویریں تو زبردست ہیں۔'' سلمان نے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے فون ہی کر لیتا۔''

''اچھا تو پہلے جناب کو فون کرتا۔'' دلشاد نے طنزیہ کہا۔ ''اتنا وقت نہیں تھا۔''

''تو نے بھی اکیلے اکیلے مزے کر لیے۔'' سلمان نے بے غیرتی سے شکوہ کیا۔ ''منصوبہ تو سارا میرا ہی تھا۔''

''ابے پیسہ تو تجھے بھی ملے گا نا۔'' دلشاد نے سگریٹ پھونکتے ہوئے کہا۔ ''خیر اسے آنا تو پڑے گا۔ اب بھاگ تو کہیں سکتی نہیں۔''

''چل تو پھر تصویریں بھیج اسے اور فون کر۔'' سلمان نے بے صبری سے فون اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''دیر نہ کر اب۔''

''کرتا ہوں کرتا ہوں۔ اتاؤلا کیوں ہو رہا ہے۔'' دلشاد نے تصویریں سینڈ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دیکھ چلی گئیں سب تصویریں۔ اب کچھ دیر بعد اسے فون کروں گا۔''

☆☆☆

نیہا اپنے کمرے میں اندھیرا کیے تنہا بیٹھی تھی۔ نہ کچھ کھا پی رہی تھی اور نہ ہی کسی سے بات کر رہی تھی۔ ایک باپ تھا وہ اپنے کاموں میں ایسا مصروف تھا کہ اسے بیٹی کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ باقی گھر کے ملازمین تھے۔ وہ تو فقط حکم کے غلام ہوتے ہیں۔ مالک جو کہے وہ مان کر واپس لوٹ جاتے ہیں۔ مجھے بھوک نہیں لگ رہی۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ تنگ نہ کرو۔ ایسے فقروں کی ملازموں کو عادت پڑ جاتی ہے اور وہ مالکان کے جذبات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اگر کوئی ایک آدھ پرانا بوڑھا ملازم خیال رکھنا بھی چاہے تو انہیں کوئی خاطر میں نہیں لاتا۔ یہی کچھ اس وقت نیہا کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ وہ باپ کی نظروں سے اوجھل اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اپنا دکھ بھی کسی سے نہیں بانٹ سکتی تھی۔ کس کو بتاتی اپنا دکھ ...... فریحہ کو، کس منہ سے۔ اس کے ساتھ تو خود نیہا نے دھوکا کیا تھا جس کی آج وہ سزا بھگت رہی تھی۔ کس کو بتائے کیا کرے۔ اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ اس کے موبائل کی ٹون بجی جسے وہ سن ہی نہیں پائی اور بدستور گم صم بیٹھی رہی۔ لیکن موبائل کی ٹون یکے بعد دیگرے متواتر بجتی جا رہی تھی۔ جیسے کوئی بہت سارے میسج بھیج رہا ہو۔ اسی مسلسل ٹون سے وہ بالآخر چونک گئی اور موبائل اٹھا کر دیکھا۔ دلشاد کے کئی میسج آئے ہوئے تھے۔ اس کا اس سے بات کرنے کا دل ہی نہیں چاہ رہا تھا لیکن بحالتِ مجبوری اس نے میسج کھول کر دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس پر اس کی نازیبا تصاویر موصول ہوئی تھیں۔ وہ یہ سب دیکھ کر صدمے کی سی کیفیت میں رہ گئی تھی۔ نیہا نے فون پٹخ کر سر تھام لیا تھا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں دلشاد کی کال آئی تو نیہا نے فوراً فون اٹھا کر غصے سے کہا۔

''کیا بکواس ہے یہ؟''

''بکواس نہیں ہے۔'' دلشاد نے انتہائی ڈھٹائی سے کہا۔ ''حقیقت ہے میری جان۔''

''تم نے یہ سب کیوں کیا میرے ساتھ۔'' نیہا نے کہا۔

''کیوں کیا؟'' دلشاد ہنسنے لگا۔ ''کیونکہ مجھے یہی کرنا تھا۔''

''شکر ہے۔'' نیہا نے روہانسا ہوتے ہوئے کہا۔ ''تم نے زیادہ دن محبت کا ناٹک نہیں کیا۔ جلد ہی اپنی اوقات دکھا دی۔''

''مجھے بھی زیادہ ڈرامے بازی پسند نہیں ہے۔'' دلشاد اطمینان سے جواب دیا۔

''تم اتنے گھٹیا ہو سکتے ہو۔'' نیہا کی آواز مزید بھرا گئی۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

''تمہاری سوچ سے بھی زیادہ۔'' دوسری طرف دلشاد سرد مہری سے بات کر رہا تھا۔ ''خیر یہ بتاؤ کہ تصویریں کیسی لگیں۔''

''میں تمہارا منہ توڑ دوں گی۔'' نیہا نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''جان سے مار دوں گی تمہیں۔''

''تم ایسا کچھ بھی نہیں کر سکتیں۔'' دلشاد نے اسے متنبہ کیا۔ ''کیونکہ تمہاری اتنی قیمتی تصاویر جو میرے پاس ہیں۔''

''ڈیلیٹ کرو انہیں۔ فوراً......'' نیہا نے کہا۔

''پیسے لگیں گے۔'' دلشاد نے جواب دیا۔ ''مفت میں تو ڈیلیٹ نہیں ہوں گی۔''

Digest Novels .com

''اب سمجھی۔ تو تمہارا یہ پلان تھا۔'' نیہا نے کہا۔

''ذہین ہو۔ شکر ہے جلد ہی سمجھ میں آ گیا۔'' دلشاد نے مکاری سے کہا۔ ''زیادہ دماغ نہیں کھپانا پڑے گا۔ کیا کریں۔ یہی اپنا دھندا ہے۔''

''اور فریحہ۔'' نیہا کو اچانک خیال آیا۔ ''وہ بھی تمہاری ساتھی ہے۔''

''فریحہ ہی ہمارا اصل شکار تھی۔'' دلشاد نے شوخی سے جواب دیا۔ ''پھر تم آ گئیں اور مجھے لگا کہ تم سے زیادہ پیسہ نکلوا سکتے ہیں۔ سو تمہیں پھنسا لیا۔''

''سنو......'' نیہا نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''پیسے مل جائیں گے۔ تم ان تصویروں کو ڈیلیٹ کر دو۔''

''ڈیلیٹ کر دوں گا لیکن رقم لینے کے بعد۔'' دلشاد نے جواب دیا۔ ''کل آ جاؤ ایک کروڑ روپے لے کر۔''

''کیا۔'' نیہا ایک دم چلائی۔ ''اتنی بڑی رقم میرے پاس کہاں سے آئے گی۔''

''تمہارے اکاؤنٹ میں ہو گی۔'' دلشاد نے کہا۔ ''فراز خان کی بیٹی ہو۔ مذاق بات تو نہیں ہے نا۔''

''لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' نیہا نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''تو اپنے باپ سے مانگو۔'' دلشاد نے اپنے تئیں تجویز دی۔ ''کچھ بھی بہانہ کر کے۔ جو بھی کرو یہ تمہارا مسئلہ ہے۔ میرا نہیں۔''

''تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' نیہا نے اسے دھمکانے کی کوشش کی۔ ''اگر ڈیڈ کو معلوم ہوا تو تمہارا وہ حشر کریں گے جو تم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا۔''

''تو بتا دو اپنے ڈیڈ کو۔'' دلشاد نے لکھتے ہوئے کہا۔ ''خالی خولی دھمکا کیوں رہی ہو۔ پھر اپنی تصاویر بھی انٹرنیٹ پر وائرل ہوتے دیکھ لینا...... فراز خان کی بیٹی نیہا کی تصاویر۔ ویسے ویوز تو بہت آئیں گے تمہارے۔ ہے نا بیوٹی کوئین۔''

''اپنی بکواس بند رکھو۔'' نیہا نے غراتے ہوئے کہا۔ ''میں دیتی ہوں تمہیں رقم۔ لیکن اگر تم نے کوئی گھٹیا حرکت کی تو......''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' دلشاد بے غیرتی سے بولا۔ ''ناراض کیوں ہوتی ہو۔ کل آ جاؤ۔ رقم بھی لے آؤ اور مل جل کر اس مسئلے کا کوئی حل نکالتے ہیں۔''

دلشاد فون بند کر کے ہنسنے لگا۔ دوسری طرف نیہا فون ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی۔ اسے ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا۔ کیا دلشاد کی شخصیت اتنی سحر انگیز تھی کہ وہ اسے سمجھ ہی نہ سکی اور اس کی سچائی کو نہ جان سکی۔ یا پھر یہ اس کی بے وقوفی تھی یا پھر قسمت ہی خراب تھی جو اس نے اتنی جلدی ایک انجان شخص پر آنکھ بند کر کے بھروسا کیا۔ اس کے وجیہہ چہرے کے پیچھے چھپی اس کی بدصورتی کو نہ پہچان پائی۔ اس کی اصل مکروہ شکل اور مکاری اس کی نظروں سے اوجھل رہی۔ اسے اپنا سب کچھ سمجھنے لگی تھی۔ بھروسا کرنے لگی تھی۔ اور وہ وحشی درندہ...... اسی نے اسے لوٹ لیا۔ اسی کشمکش میں نیہا نے ایک فیصلہ کیا۔ وہ خود دلشاد کا سامنا کرے گی۔ اس سے خود نمٹے گی کیونکہ وہ کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ گھر میں چھپ کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

☆☆☆

نیہا اگلے ہی روز دلشاد کے گھر پہنچ گئی۔ دلشاد اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھا تھا۔ نیہا کو دیکھتے ہی وہ خوشی سے کھڑا ہو گیا۔ کیونکہ سونے کی چڑیا جو آئی تھی۔ نیہا نے بیگ سے رقم کی گڈی نکال کر اس کے منہ پر ماری لیکن دلشاد نے رقم منہ پر مارنے کا برا نہیں مانا بلکہ کم رقم دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

''یہ کیا؟ یہ تو بہت تھوڑے ہیں۔'' دلشاد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ابھی اتنے ہی ملے ہیں۔'' نیہا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''باقی کچھ اور رقم ایک دو دن بعد مل جائے گی۔ تم تصویریں ڈیلیٹ کرو۔''

''اس طرح تو مزہ نہیں آئے گا نا۔'' دلشاد نے نوٹوں سے ہوا جھلتے ہوئے کہا۔ ''پیسے بھی پورے نہیں ہیں اور تصویریں بھی ڈیلیٹ کر دوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''میں نے کہا نا پیسے دے دوں گی۔'' نیہا نے غراتے ہوئے کہا۔ ''تھوڑے تھوڑے کر کے۔''

''ارے نہیں میری جان۔'' دلشاد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''تم نہیں سمجھیں ابھی تک۔ اب یہ تصاویر ڈیلیٹ نہیں ہو سکتیں۔ ابھی تو ہماری پارٹنرشپ کا آغاز ہوا ہے۔''

''کیسی پارٹنرشپ۔'' نیہا نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ ایک کروڑ تو فوری چاہئیں۔ یک مشت۔'' دلشاد نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے علاوہ ہر ماہ ایک معقول رقم تو تمہیں دینی ہی ہو گی۔''

''کتے کمینے۔'' نیہا ایک دم چلانے لگی۔ ''تو اپنی اوقات سے باہر نکل رہا ہے۔''

''ان گالیوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' دلشاد نے

Digest Novels .com

غیرتی سے بولا۔ "اوقات تو میں تمہیں دکھا ہی چکا ہوں۔ چلو ٹھیک ہے۔ چونکہ تم بہت کم رقم لائی ہو تو اس کا ہرجانہ بھی دینا ہو گا۔"

"کیسا ہرجانہ۔" نیہا نے سوال کیا لیکن دلشاد نے جواب میں سیٹی بجائی۔ جس کے بعد سلمان کمرے میں داخل ہوا۔

"میں چلتا ہوں۔ ہرجانہ یہ وصول کرے گا۔ بائے۔" دلشاد نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"میں تم دونوں کو گولی مار دوں گی۔"

نیہا نے پرس سے پستول نکالا۔ لیکن سلمان نے لمحوں میں اس سے پستول چھین لیا۔

"تم کچھ بھی کر کے دیکھ لو۔ کسی بھی جاسوسی کی صورت میں جب پولیس تفتیش کرے گی تو...... تمہاری تصویریں ہی وائرل ہوں گی۔" دلشاد نے سلمان نے پستول لیتے ہوئے کہا۔ "میں باہر ہوں۔ تصویریں دیکھ رہا ہوں۔ اگر یہ بی تنگ کرے گی تو سیٹی مار دینا۔ ہاتھ کے ہاتھ سب وائرل کر دوں گا۔"

دلشاد کمرے سے جا چکا تھا۔ سلمان اس کے پاس آ رہا تھا۔ نیہا اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔ وہ اس وقت خود کو شدید بے بس محسوس کر رہی تھی۔ یہاں آ کر اس نے پھر بے وقوفی کی تھی۔

"مجھے جانے دو۔" نیہا گڑگڑانے لگی۔ "پلیز میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔"

"کیسے جانے دوں۔ اس کھیل کا اصل ماسٹر مائنڈ تو میں ہی ہوں۔" سلمان جنونی انداز میں بولا۔ "میرا دوست تو مزے کر چکا۔ اب میری باری ہے۔"

نیہا کے ساتھ گزشتہ روز جو ہوا۔ وہ کسی کو بتا نہیں سکی تھی۔ جو اس دن ہوا، وہ بھی کس کو بتاتی۔ بے بس، لاچار اور مجبور پنچھی کی طرح گدھوں کے نرغے میں پھنس چکی تھی۔ اسے یاد تھا جب وہ گھر لوٹ رہی تھی تو اس وقت کمرے سے باہر دلشاد بے پروائی سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جس سے کل تک وہ محبت کرتی تھی۔ آج وہ ہی اس کی عزت و ناموس کا دشمن بن چکا تھا۔ نکلتے وقت اس کے کانوں میں دلشاد کی گھناؤنی آواز ضرور آئی تھی۔

"اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔ تمہارا اپنا ہی ٹھکانا ہے۔"

☆☆☆

نیہا بُری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی دنیا اُجڑ چکی تھی۔ ظاہر ہے لڑکی کے پاس اس کی سب سے قیمتی چیز عزت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو نیہا نے پہلے کبھی نہیں سمجھا تھا۔ لیکن جب سمجھ میں آئی ہے تو وہ لٹ چکی تھی۔ برباد تو ہو ہی چکی تھی۔ پھر بھی وہ مزید ان دونوں کی ناجائز خواہشات کو پورا نہیں کر سکتی تھی۔ نہ مالی اور نہ ہی جسمانی۔ بس پھر اس نے ایک.... فیصلہ کر لیا۔ اپنی جان دینے کا۔ کیونکہ اس میں دنیا کا سامنا کرنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ نہ لوگوں کی باتیں سننے کی اور نہ ہی اپنے باپ کی انا کو ٹوٹتے اور عزت کو مٹی ہوتے دیکھنے کی۔ وہ اپنی بے عزتی پر بُری طرح کانپ رہی تھی۔ بس پھر کیا تھا۔ اس نے ایک طرف رکھی چھری اٹھائی اور اسے دیکھ کر کچھ سوچنے لگی۔ چھری اپنے ہاتھ کی رگ کی طرف لے کر گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

نیہا نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے رخسار پر آنسو بہہ کر خشک ہو چکے تھے۔ وہ شاہانہ کے سامنے بیٹھی اسے اپنے اوپر گزرے ظلم اور خودکشی کی کوشش کا احوال سنا رہی تھی۔ شاہانہ سنجیدگی اور تاسف کے ساتھ اس کی باتیں سُن رہی تھی۔

☆☆☆

دلاور ابھی تک حوالات میں بند تھا۔ سب کو اسی پر سب سے پہلے شک ہوا تھا۔ شہزاد تو اس کی جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی بھی طرح اس سے اقبالِ جرم کروا لے۔ اس وقت بھی شہزاد اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا سرخ خونخوار آنکھوں سے اسے دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ شہزاد اسے دوبارہ مارنا شروع کرتا اسی وقت شاہانہ اندر آ گئی۔

"کیوں شور کر رہے ہو۔ خاموش رہو۔" شاہانہ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ "شہزاد۔ اگر اب یہ شور کرے تو چھترول کر دینا اس کی۔"

شاہانہ اتنا کہہ کر باہر چلی گئی۔ حالانکہ اسے سچ معلوم ہو چکا تھا۔ لیکن پولیس والوں کی بھی سمجھ نہیں آتی کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ ہر بات میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ اس کے دماغ میں یہی تھا کہ جب تک اصل مجرم پکڑا نہیں جاتا اس وقت تک دلاور کو ہی قربانی کا بکرا بنا کر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ابھی تک سلمان اور دلشاد نام کے مشکوک افراد کا کھوج نہیں لگایا جا سکا تھا۔ معاملہ بھی سیٹھ فراز کا تھا۔ جسے حل کرنا اشد ضروری تھا۔ سی سی ٹی وی کیمروں سے کچھ کھوج لگایا تھا۔ لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ دونوں لاپتا تھے۔ بس اتنا یقین تھا کہ وہ دونوں شہر میں ہی ہیں۔ شاید کسی کچے یا ناجائز قبضے کے

Digest Novels .com

علاقے میں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ... اعلیٰ حکام کو کیا جواب دیں۔ شاہانہ سے بھی بات ایس ایچ او شہروز کر رہا تھا۔

''پہلے بھی کہا تھا۔'' شاہانہ یاد دہانی کراتے ہوئے کہا۔ ''کسی اور مرغے کو پھنسا دیتے ہیں۔''

''لیکن نیہا کا کیا کریں گے؟'' شہروز نے منع کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ مجرموں کو شناخت نہیں کرے گی؟''

''اس کا ایک حل ہے میرے پاس۔'' شاہانہ نے ایک اور تجویز دی۔ ''ایک لڑکا ہے نا ہمارے پاس۔ نیہا کا دوست۔''

''تم دلاور کی بات کر رہی ہو۔'' شہروز نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہی بات۔ نیہا ان دونوں کو پہچانتی ہے۔''

''ابھی صدمے سے دوچار ہے۔ اتنی ٹینشن نہیں ہو گی۔'' شاہانہ نے کہا۔ ''دوسرا دلاور سے بھی وہ نفرت کرتی ہے۔ باقی باتیں اسے میں سمجھا... دوں گی۔''

''سر ہمارے مخبروں نے اطلاع دی ہے کہ ان دونوں لڑکوں دلشاد اور سلمان کا سراغ مل گیا ہے۔'' سب انسپکٹر صدیقی نے کمرے میں آتے ہوئے اطلاع دی۔ ''وہ دونوں شہر کے ایک نواحی علاقے کی ایک قبضہ بستی میں ہیں۔''

''لوکیشن ٹریس کرتے ہوئے فوراً چلو۔'' شہروز نے جلدی سے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں ایف آئی اے سے پہلے اُن کو پکڑنا ہے۔''

شہروز اور صدیقی دونوں فوراً باہر نکل گئے تھے۔ شاہانہ اپنی کرسی پر بیٹھی بڑبڑا رہی تھی۔

''ایف آئی اے والوں سے بھی جان نہیں چھوٹے گی۔''

☆☆☆

پولیس نے دونوں لڑکوں کا تعاقب کرتے ہوئے ایک جگہ کامیاب چھاپا مارا۔ دلشاد اور سلمان نے موت کو سر پر دیکھ کر فرار ہونے کی کوشش کی اور دیوار کود کر پچھلی گلی سے بھاگنے کی کوشش کی۔ لیکن پولیس جب اپنے پر آ جائے تو مجرم کو جائے فرار نہیں ملتی۔ پولیس نے ان دونوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ان کے پاس گرفتاری دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ شہروز، شہزاد اور دل مراد نے دل بھر کر انہیں ٹھنڈے مارے۔ تھک ہار کر شہروز نے شہزاد کو ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اے ایس آئی۔ ایک پھول دو ان میں سے ایک کو۔''

شہزاد نے پستول نکال کر سلمان کی ٹانگ پر گولی ماری۔ سلمان تکلیف سے دہرا ہو گیا تھا۔ صدیقی نے پریشان ہو کر اپنے ساتھیوں کو دیکھا کیونکہ وہ دونوں ہاتھ تو آ ہی چکے تھے۔ پھر شہروز نے شہزاد کو دل مراد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک اور حکم دیا۔ شہزاد نے انجان کھڑے ہوئے دل مراد کے ہاتھ پر گولی مار دی۔ دل مراد کی ایک بھیانک چیخ بلند ہوئی۔ سلمان اور دلشاد حیرت سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن صدیقی سب کچھ سمجھ چکا تھا۔

☆☆☆

تھانے میں پولیس پارٹی اپنی کامیابی پر خوشی منا رہی تھی۔ ہر کوئی خود کو ہیرو ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل مراد ہاتھ پر پٹی باندھے بیٹھا تھا۔ صدیقی ان سب سے الگ تھلگ تھا۔ کیونکہ وہ ان سب سے واقعی الگ تھا۔ ایک دیانتدار اور ایماندار پولیس افسر۔ صدیقی وہاں کے شور شرابے سے دور ہو کر شہروز کے کمرے میں آ گیا۔

شہروز اپنے کمرے میں بیٹھا کسی سے فون پر باتیں کرتا ہوا ڈینگیں مار رہا تھا۔ ''جی سر جان پر کھیل کر گرفتار کیا ہے۔ انہوں نے ہم پر فائرنگ کی جس کی وجہ سے ہمارا ہیڈ کانسٹیبل دل مراد زخمی ہوا ہے۔ جواباً ہمیں بھی فائرنگ کرنی پڑی اور اپنی جانوں پر کھیل کر مجرموں کو گرفتار کیا۔ جی سر کام ہی ایسا ہے۔ اپنی جان سے زیادہ قانون اور انصاف کو دیکھنا پڑتا ہے۔ تھینک یو سر۔''

شہروز نے فون بند کر کے شاہانہ سے کہا۔ ''ڈی ایس پی صاحب بھی خوش ہیں۔ ان کی بھی جان میں جان آئی ہے ورنہ فراز خان تو پاگل ہو گیا تھا۔''

''بے شک پولیس کے جوان شاباشی کے مستحق ہیں۔'' شاہانہ نے فخر اور غرور سے کہا۔ ''اگر ہم چاہیں تو کوئی ہم سے بچ نہیں سکتا۔''

''کاش ہم ایسا ہی کریں۔ ہر مرتبہ......'' صدیقی نے بھی اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

''اتنا آسان نہیں ہے۔'' شہروز نے بیزاری سے کہا۔ ''یہ تو فراز صاحب کا معاملہ تھا۔ اور ان دونوں لڑکوں کا کسی بڑے آدمی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ورنہ تمہیں پتا تو ہے کہ مجرموں کو پکڑنے میں کتنی رکاوٹیں آتی ہیں۔ خیر اب کچھ ترقی ہو جائے گی ہم سب کی۔ مبارک ہو سب کو......''

❖❖❖

Digest Novels .com

Digest Novels .com
digest library.com

پیش رفت

علی عباس

ہر جرم کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے... مجرم کے سوا اس سے کوئی واقف نہیں ہوتا... دارالحکومت کے صاف ستھرے ماحول میں حبس کا موسم گھٹن میں بدل رہا تھا... سفر جاری تھا اور تھکن بڑھ رہی تھی... قتل کی وارداتیں بڑھ رہی تھیں... ایک کے بعد ایک لاش سامنے آرہی تھی... پولیس اور تفتیش کار اپنے دائرۂ اختیار کے مطابق پیرہن بدلتے مجرم کی تلاش میں سرگرداں تھے مگر گتھی سلجھنے کے بجائے الجھتی جارہی تھی... طلسمِ راہ سے گزرتی سنسنی خیز کہانی کے دلچسپ موڑ...

قتل کی وارداتوں کے معمے کے لیے کی جانے والی پیش رفت کا احوال

میں بجلی کا بل ادا کر کے دفتر واپس لوٹ رہا تھا، جب راستے میں ہمیشہ کی طرح ٹریفک جام تھی۔ پندرہ منٹ گزر گئے، ٹریفک بحال نہ ہوئی تو باہر نکل کر دیکھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ میں اپنے صحافیانہ تجسس سے مجبور ہو کر بھیڑ کی جانب بڑھا۔ لوگوں کی باتوں سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ سڑک کنارے سے لاوارث لاش ملی تھی۔ ایک اور لاوارث لاش۔ آپ جانتے ہی ہوں گے کہ میں اس موضوع پر کافی عرصے سے تحقیق کر رہا ہوں۔

دار الحکومت سے کوئی نہ کوئی لاوارث لاش مل جاتی ہے جن کے بارے میں کبھی معلوم نہیں ہو پاتا کہ ہوا کیا؟ پولیس رسمی سی کارروائی کرتی ہے اور ایسے کیسز جلد کولڈ کیسز کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ کیسز ہوتے ہیں جن کے بارے میں قانون نافذ کرنے والے ادارے یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ معاملہ حل ہو چکا ہے اور اس پر مزید تفتیش کی ضرورت نہیں رہی۔ پولیس کے نقطۂ نظر سے یہ درست بھی ہوتا ہے مگر ایک صحافی کے لیے کیس اس وقت تک بند نہیں ہوتا جب تک اس کا کوئی منطقی نتیجہ نہ برآمد ہو۔ میرے لیے لاوارث لاشیں ملنے کا یہ معاملہ سرِدست حل طلب تھا۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس دوران پولیس کی ٹیم وہاں پہنچ گئی جس نے لاش کو اپنی تحویل میں لے لیا اور لوگوں کو منتشر کرنا شروع کیا تا کہ رش کم ہو اور ٹریفک کھل سکے۔ میں بھی گاڑی کی جانب بڑھ گیا کیونکہ مجھے رپورٹرز کی میٹنگ میں شرکت کرنی تھی جو ہر روز انجام دی جانے والی ایک ایسی سرگرمی ہے جو اخبار میں بہت اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس میٹنگ میں رپورٹرز کو مختلف خبروں پر کام کرنے کی ذمے داری دی جاتی ہے جبکہ ان خبروں کے بارے میں بھی جانا جاتا ہے جن پر وہ کام کر رہے ہوتے ہیں۔

میں دفتر پہنچا ہی تھا کہ راستے میں میرا اسسٹنٹ مجتبیٰ مل گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہڑبڑایا ہوا تھا۔ میرے کچھ کہے بنا ہی گویا ہوا۔

''سر آپ نے خبر دیکھی؟ چوہدری ولایت حسین کی لاش اُن کے گھر سے ملی ہے۔''

''کون سے چوہدری ولایت حسین؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''سر وہ حقوقِ آدمیت پارٹی کے سربراہ۔''

''اوہ۔'' میں اس دوران اپنے دڑبا نما کمرے میں پہنچ چکا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ فون اٹھایا تو دوسری جانب میرے اخبار کے ایڈیٹر احسن عباسی تھے۔ وہ حال ہی میرے اخبار کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تھے۔ نوجوان تھے اور اخباری صنعت کا کوئی خاص تجربہ نہیں رکھتے تھے مگر وہ اخبار کے مالک کے داماد تھے تو یوں وہ بھی اخبار کے مالکان میں سے ہی تھے۔

میں احسن عباسی کے آراستہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ لیپ ٹاپ پر اپنا کام کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر یوں چونکے جیسے مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو۔

''میر صاحب، آیئے آیئے۔'' وہ مجھے دیکھ کر کرسی سے اُٹھ گئے۔

میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھ گیا تو وہ مجھے مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوئے۔

''میر صاحب۔ کہیے شہر کے کیا حالات ہیں؟''

''عباسی صاحب آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔'' میں نے برجستہ کہا تو وہ مسکرا دیے۔

''میر صاحب، آپ ٹھہرے رپورٹر۔ فیلڈ میں جاتے ہیں تو شہر کے حالات سے ہم سے زیادہ ہی آگاہ ہوں گے۔'' انہوں نے میری جانب جملہ اچھالتے ہوئے کہا۔

''عباسی صاحب، یہ تو آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ کہیے خیریت سے بلایا ہے؟''

''خیریت ہی ہے۔ آپ نے چوہدری ولایت حسین کی موت کی خبر تو سنی ہوگی؟''

''جی...... جی۔'' میں ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''آپ کے اُن سے کیسے تعلقات تھے؟''

''ایک دو بار ملاقات ہوئی تھی۔ اُن کے بارے میں کافی کچھ پڑھا ہے۔''

''یہ معلوم کیجیے کہ اُن کا قتل ہوا ہے یا اُن کی موت کی وجہ طبعی ہے۔'' انہوں نے اپنی عینک کے اوپر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا؟'' میں چونک گیا کیونکہ مجھے جو معلوم تھا، اس کے مطابق تو ان کی لاش اپنے گھر سے ملی تھی اور پولیس نے ابتدائی کارروائی کرنے کے بعد لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دیا تھا۔

''آپ کو کیوں لگ رہا ہے کہ اُن کی موت کی وجہ طبعی نہیں ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

''دیکھیے، میں یہ نہیں کہہ رہا کہ اُن کی موت کی وجہ کیا ہے۔ یہ تو ادارے معلوم کریں گے۔ ہم تو صرف اداروں کی جانب سے ہونے والی تفتیش میں اگر کوئی پیش رفت ہوتی ہے تو اس حوالے سے ہی خبر دیں گے۔'' انہوں نے اپنی بات واضح کرتے ہوئے کہا۔

''اوہ، او کے۔''

احسن عباسی چونکہ صحافت میں نووارد تھے تو وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ اخبار کے چیف رپورٹر کے طور پر مجھے اس خبر پر کام کروانا تھا یا یوں کہہ لیجیے کہ متعلقہ رپورٹر نے اس خبر پر کام کرنا ہی تھا۔ انہوں نے مجھے اس بارے میں خبر دینے کا کہہ کر صرف اور صرف یہ باور کروایا تھا کہ وہ اخبار کے مدیر ہیں اور ملکی حالات سے بے خبر نہیں ہیں۔

میں اپنے کمرے میں واپس لوٹا تو دارالحکومت کی پولیس کے سربراہ ملک دانش علی کو کال کی۔ اُن سے میری گہری چھنتی تھی۔ وہ پولیس سروس کے ایک زندہ دل افسر تھے۔

انہوں نے پہلی ہی بیل پر فون اٹھالیا۔

''جی میر صاحب۔ میں امید کر ہی رہا تھا کہ آج آپ ضرور کال کریں گے۔'' انہوں نے بے تکلفانہ اور اپنے روایتی زندہ دل انداز میں کہا۔

''دیکھ لیجیے ملک صاحب آپ نے یاد کیا اور ہم نے آپ کو کال کرلی۔'' میں نے برجستہ کہا تو ان کا قہقہہ بلند ہوا۔

''ہم خادم!'' انہوں نے کہا۔

''آپ خادم نہیں۔ آپ تو اس ملک کے حقیقی حکمران ہیں۔'' میں نے کہا تو ہم دونوں کا قہقہہ بلند ہوا۔

''نہ کریں میر صاحب۔''

''چلیے۔ نہیں کرتے۔ یہ بتایئے کہ چوہدری ولایت حسین کی موت کی وجہ کیا ہے؟'' میں نے براہِ راست اپنے موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے میر صاحب۔'' انہوں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم فی الحال اس وقت تک کچھ بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں جب تک لاش کا پوسٹ مارٹم نہیں ہوجاتا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ ایک سینئر پولیس افسر ہیں۔ جائے وقوعہ کے جائزے سے کچھ تو اخذ کیا ہوگا؟''

''آپ درست کہہ رہے ہیں میر صاحب مگر لاش کی حالت بہت خراب ہوچکی تھی اور کمرے سے زبردستی کے کوئی شواہد نہیں ملے۔''

''لاش کتنی پرانی ہوسکتی ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''دو سے تین مہینے پرانی ہوسکتی ہے اور شاید اس سے بھی زیادہ۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے کے بعد ہی کچھ معلوم ہوسکے گا۔''

میں جانتا تھا کہ تفصیلی پوسٹ مارٹم رپورٹ آنے میں دو سے تین دن لگ جائیں گے جبکہ ڈی این اے کی جانچ میں تو ایک ہفتہ اور بسا اوقات دو ہفتوں سے بھی زیادہ وقت لگ جاتا ہے۔

میں نے ملک صاحب کا شکریہ ادا کیا اور ان سے جلد ملاقات کا وعدہ کرکے فون بند کردیا۔ میں نے اس کے بعد اپنے اخبار کے سینئر رپورٹر احمد رضا کو کال کی جو سیاسی بیٹ کرتے تھے اور ان کے سیاست دانوں سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ وہ فی الحال فیلڈ میں نہیں گئے تھے اور دفتر میں ہی موجود تھے۔ چنانچہ وہ چند ہی منٹوں بعد میرے کمرے میں موجود تھے۔ میں دراصل چوہدری ولایت حسین کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا۔ میری اُن سے ایک دو بار رسمی سی ملاقات ہوئی تھی مگر احمد رضا چونکہ بیٹ رپورٹر تھے تو وہ یقیناً چوہدری ولایت حسین کو بہت اچھے سے جانتے ہوں گے۔

میں نے احمد رضا سے چوہدری ولایت حسین کے بارے میں پوچھا تو وہ گویا ہوئے۔

''میر صاحب۔ چوہدری ولایت حسین نے برسرِاقتدار پارٹی سے الگ ہوکر اپنی پارٹی بنائی تھی اور طاقت ور حلقوں کے منظورِ نظر تھے۔''

''یہ تو میں جانتا ہوں۔ یہ بتایئے کہ آپ کی آخری بار ان سے کب ملاقات ہوئی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میری ان سے لگ بھگ تین مہینے پہلے ملاقات ہوئی تھی جب انہوں نے سیاست سے کنارہ کش ہونے کا اعلان کیا تھا۔''

''آپ تو کہہ رہے تھے کہ وہ طاقت ور حلقوں کے منظورِ نظر تھے؟''

یہ بات مجھے عجیب محسوس ہوئی تھی کہ وہ اگر طاقت ور حلقوں کے منظورِ نظر تھے تو پھر ان کو سیاست سے کنارہ کش ہونے یا سادہ لفظوں میں گوشہ نشیں ہونے کی کیا ضرورت تھی؟

''میر صاحب۔ میں آپ کی بات سمجھ رہا ہوں۔ منظورِ نظر تھے اس لیے تو ان کی سیاسی جماعت کے خلاف کریک ڈاؤن نہیں ہوا۔''

''احمد صاحب۔ آپ ایک سینئر اور جہاندیدہ سیاسی رپورٹر ہیں۔ آپ نے ان تین ماہ میں ایک بار بھی چوہدری ولایت حسین سے رابطہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی؟''

''میں نے ان سے ایک دو بار رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر ان کا فون بند جارہا تھا۔'' انہوں نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں اس معاملے کے مختلف پہلوؤں پر غور کررہا تھا۔ ایک ایسی شخصیت جس کے چاہنے والے ملک بھر میں موجود تھے اور جس کے بیانات اخبارات کی شہ سرخیاں بن جاتے تھے، اس کی اپنے گھر سے تین ماہ پرانی لاش ملی تھی اور اس بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ یہ کچھ عجیب محسوس ہورہا تھا۔

میں نے اگلی کال ملک کی سول خفیہ ایجنسی کے سربراہ

Digest Novels .com

علی جواد کو کی۔ اس خفیہ ادارے کی بنیادی ذمے داری تو منظم مجرمانہ سرگرمیوں کی بیخ کنی ہے مگر یہ سیاست دانوں کے فون ٹیپ کرنے کی وجہ سے بھی خبروں میں رہتی ہے۔

علی جواد نے فون کال اٹینڈ نہیں کی مگر میں جانتا تھا کہ وہ ضرور مجھے کال بیک کریں گے۔ ان سے میرا اس وقت سے تعلق تھا جب وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے طور پر بھرتی ہوئے تھے۔ وہ ترقی کرتے ہوئے خفیہ ادارے کے سربراہ بن گئے تھے مگر ان سے ہمیشہ خوشگوار تعلق رہا۔

مجھے فی الحال پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کرنا تھا جس کے بعد ہی میں آگے بڑھ سکتا تھا مگر میرے لیے یہ خبر اس لیے زیادہ اہمیت اختیار کر گئی تھی کیونکہ لاش کئی ماہ پرانی تھی اور ملک دانش علی کے مطابق تو یہ لاش دو سے تین ماہ پرانی ہو سکتی تھی۔ احمد رضا نے بھی یہ کہا تھا کہ ان کا چوہدری ولایت حسین سے آخری بار رابطہ تین ماہ قبل ہوا تھا۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب علی جواد تھے۔

"میر صاحب معذرت قبول کیجیے۔ میں میٹنگ میں مصروف تھا اس لیے آپ کی کال اٹینڈ نہیں کر سکا۔"

"آپ چوہدری ولایت حسین کا فون تو ٹیپ کر رہے ہوں گے؟" میں نے براہِ راست موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

"میر صاحب کیسی بات کرتے ہیں؟ ہم کیوں فون ٹیپ کرنے لگے؟" انہوں نے معصومیت سے کہا تو ہم دونوں کا قہقہہ بلند ہوا۔

"جواد صاحب۔ مان لیا آپ فون ٹیپ نہیں کرتے مگر میں کسی وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ گویا ہوئے۔

"ہم نے اُن کی کالز کا ڈیٹا نکلوایا ہے۔ انہوں نے آخری کال پندرہ اپریل کو وصول کی تھی اور آج 20 جولائی ہے۔"

"یعنی تین ماہ پانچ دن ہو گئے اور آپ نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ ملک کے ایک معروف سیاست داں کا فون کیوں بند ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میر صاحب۔ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے کہ وہ فون آن رکھتے ہیں یا بند۔"

میں جانتا تھا کہ وہ فون ٹیپ کرنے کے حوالے سے کچھ نہیں بتائیں گے کیونکہ فون ٹیپ کرنا غیر قانونی ہے مگر مجھے ایک اہم بات معلوم ہو گئی تھی اور وہ یہ کہ ان کے فون نمبر سے آخری کال تین ماہ سے زیادہ عرصہ قبل کی گئی تھی۔

میں نے علی جواد کا شکریہ ادا کیا۔ شام ہو رہی تھی۔ میں گھر جانے کے لیے نکلا تو راستے میں تجمل مل گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بوکھلایا ہوا تھا۔

"سر کچھ معلوم ہوا؟" اس نے پُراسرار لہجے میں پوچھا۔

"معلوم ہوگا تو سب سے پہلے آپ جناب کو ہی بتاؤں گا۔" میں نے جان چھڑانے کے انداز میں کہا تو وہ روہانسا ہو گیا۔

میں گھر واپس لوٹا تو زوجہ محترمہ اپنا منہ سُجائے میری ہی منتظر تھیں۔

"آ گئے آپ؟"

"اللہ کی بندی کیوں منہ پھُلایا ہوا ہے؟"

"آپ نے تو کہا تھا کہ آپ آج جلدی گھر آ جائیں گے۔"

"آ تو گیا ہوں۔"

"وقت دیکھ رہے ہیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"آپ نے تو مجھے خریداری کے لیے لے کر جانا تھا۔ اب اس وقت جائیں گے تو واپس کس وقت آئیں گے؟"

اس نے کہا تو میں نے خاموشی سے سر جھکا دیا کیونکہ بحث کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ کچھ دیر اور بولتی رہی۔ میں خاموشی سے اپنے اسٹڈی روم میں آ گیا۔ مطالعہ کرنے کو جی نہیں تھا تو یوں ہی آرام دہ کرسی پر دراز ہو گیا۔ چند لمحوں بعد ہی زوجہ محترمہ کی آواز آئی۔

"کھانا کھائیے اور مجھے شاپنگ کے لیے لے کر جائیے۔"

میرے سامنے انکار کا کوئی آپشن نہیں تھا۔ میں اٹھا، منہ ہاتھ دھویا، کھانا کھانے کے بعد ہم خریداری کے لیے نکل گئے۔ رات دیر گئے واپسی ہوئی۔ یہ بھی شکر ہوا کہ زوجہ محترمہ کا موڈ اب کچھ بہتر ہو گیا تھا مگر میں بُری طرح تھک چکا تھا۔ بستر پر دراز ہوتے ہی سو گیا۔ صبح فون کال نے جگایا۔ دوسری جانب احسن عباسی تھے۔

"میر صاحب۔ آپ نے خبریں دیکھیں؟"

"خبریں تو نہیں دیکھیں البتہ خواب ضرور دیکھ رہا تھا۔ آپ کی کال کی وجہ سے یہ سلسلہ ادھورا چھوڑنا پڑا۔" میں نے برجستہ کہا تو ہم دونوں بے ساختہ ہنس دیے۔

"میر صاحب خبریں دیکھیے۔ حقوقِ آدمیت پارٹی کی

Digest Novels .com

خواتین ونگ کی سربراہ نائلہ جعفر کو دن دہاڑے قتل کر دیا گیا ہے۔“

”کیا؟“ میں ان کی اس خبر پر تازہ دم ہو گیا تھا اور میرے اندر کا کرائم رپورٹر بھی جاگ گیا تھا کیونکہ کل ہی تو حقوقِ آدمیت پارٹی کے سربراہ چوہدری ولایت حسین کی موت کی خبر آئی تھی۔

”جی۔ میں نے آپ کو چوہدری ولایت حسین کی موت کی خبر پر کام کرنے کو کہا تھا؟“

”میں اسی پر کام کر رہا ہوں۔“

”آپ اب یہ دیکھیے کہ کیا ان دونوں واقعات میں کوئی تعلق ہے؟“

”جی جی۔“ میں نے اثبات میں جواب دیا کیونکہ وہ بہر حال میرے ایڈیٹر تھے اور ان سے بحث میں اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے ٹیلی ویژن آن کیا تو معلوم ہوا کہ نائلہ جعفر گھر سے اپنی پارٹی کے دفتر جانے کے لیے نکل رہی تھیں کہ گھات لگائے دو موٹر سائیکل سواروں نے ان پر فائرنگ کر دی جس سے ان کی موقع پر ہی موت ہو گئی تھی۔

میں نائلہ جعفر کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا مگر مجھے یہ معلوم تھا کہ انہوں نے چند برس قبل ایک سیاسی کارکن کے طور پر اپنا سیاسی سفر شروع کیا تھا اور چند ہی برس میں اپنی پارٹی کی خواتین ونگ کی سربراہ بن گئی تھیں۔ میں نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور فی الفور دفتر کا رُخ کیا۔ شہر میں جگہ جگہ حقوقِ آدمیت پارٹی کے کارکن احتجاج کر رہے تھے۔ میں بہر حال کسی نہ کسی طرح دفتر پہنچ گیا اور رپورٹرز کی میٹنگ سے فارغ ہونے کے بعد احمد رضا کو اپنے کمرے میں بلایا۔

”احمد صاحب۔ آپ کیا کہتے ہیں؟ یہ قتل کیوں کیا گیا ہوگا اور کیا اس کا چوہدری ولایت حسین کی موت سے کوئی تعلق تو نہیں ہے؟“

”میر صاحب۔ یہ معلوم کرنا تو پولیس کا کام ہے۔“

”آپ کا کیا کام ہے؟“ میں نے سوال کیا تو وہ کندھے اُچکا کر رہ گئے۔

”میر صاحب۔ آپ کرائم رپورٹر ہیں۔ آپ معلوم کیجیے۔“

”وہ تو میں معلوم کر ہی لوں گا۔ آپ فکر مت کیجیے۔ آپ یہ معلوم کیجیے کہ اب حقوقِ آدمیت پارٹی کا سربراہ کسے بنایا جا رہا ہے۔“

”جی میر صاحب۔“

مجھے اب کھلبلی سی ہونے لگی تھی کیوں کہ مجھے چوہدری ولایت حسین کی پُراسرار موت کے بعد ان کی ہی پارٹی کی ایک اور رہنما کے قتل پر کچھ عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ یہ اتفاق نہیں ہو سکتا تھا۔

نائلہ جعفر کا گھر سیکٹر نائن میں تھا۔ یہ دارالحکومت کا ایک پوش علاقہ تھا جہاں زیادہ تر وزرا اور سفارت کاروں کی رہائش گاہیں تھیں۔ میں دفتر سے سیکٹر نائن جانے کے لیے اٹھا کیونکہ جائے وقوعہ کا اچھے سے جائزہ لیے بغیر اس پورے معاملے کی تہ تک پہنچنا ممکن نہیں تھا۔ شہر میں اب بھی جگہ جگہ ٹائر جلا کر احتجاج ہو رہا تھا اور ٹریفک جام تھی۔ میں کسی نہ کسی طور پر سیکٹر نائن پہنچ گیا مگر اس پورے علاقے کو پولیس نے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

میں نے جائے وقوعہ سے قریب نسبتاً ایک سنسان گلی میں گاڑی پارک کی کیونکہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں کسی کی نظر میں آؤں مگر یہ ممکن نہیں تھا۔ سیکٹر نائن کے پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او مزمل گجر سے میری اچھی سلام دعا تھی اور میں نے ان کو کال کر کے یہ بتا دیا تھا کہ مجھے وقوعہ پر جانا ہے اور انہوں نے مجھے اس کی اجازت دے دی تھی مگر انہوں نے مجھے زور دے کر یہ کہا تھا کہ مجھے اگر کچھ عجیب محسوس ہو تو میں انہیں ضرور آگاہ کروں گا۔

میں جائے وقوعہ کے قریب پہنچا تو پولیس کی بھاری نفری موجود تھی اور مزمل گجر ایک جانب کھڑے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے سر کے اشارے سے متعلقہ اہل کار کو کہا کہ مجھے جانے دے۔ یہ ایک تیس فٹ چوڑی گلی تھی جو بند تھی، اس میں آٹھ دس گھر تھے اور نائلہ جعفر کا دائیں جانب سے آخری گھر تھا۔ میں نے باریک بینی سے گھروں کا جائزہ لیا۔ ایک گھر کے باہر سیکیورٹی کیمرا نصب تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھ سے کہا کہ اس میں لازمی طور پر قاتل کا چہرہ دکھائی دیا ہوگا مگر فی الحال کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنا ممکن نہیں تھا۔ ایک دو گھروں میں سیکیورٹی گارڈ بھی تھے جنہیں پولیس اپنی تحویل میں لے چکی تھی۔ میں اس گلی کا دورہ کرنے کے بعد واپس لوٹا تو مزمل گجر میرے ہی منتظر تھے۔

”میر صاحب کچھ خاص معلوم ہوا ہو تو بتائیے۔“

”فی الحال تو آپ ہی میری کچھ مدد کیجیے۔“ میں نے اپنی جان چھڑانے کے لیے کہا۔

”ہم تفتیش کر رہے ہیں۔ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ اندھا قتل ہے مگر فی الحال ایسا کوئی سراغ نہیں ملا جس سے اس قتل کا مقصد سمجھ آ سکے۔“

Digest Novels .com

کسی بھی تفتیش میں مقصد یا موٹیو بہت اہم ہوتا ہے۔ اگر موٹیو کے بارے میں معلوم ہو جائے تو قاتل تک پہنچنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس لیے پولیس سب سے پہلے مقصد تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہے جس کی عدالتی کارروائی میں بھی بہت زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔

میں دفتر لوٹا تو دوپہر کے تین بج رہے تھے۔ میں نے ملک دانش علی کو کال ملائی کیونکہ ان سے مجھے ایسی معلومات ملنے کی امید تھی جس سے اس معاملے کو سلجھانے میں بہت زیادہ مدد حاصل ہو سکتی تھی۔ انہوں نے ہمیشہ کی طرح دوسری بیل پر ہی میرا فون اٹھالیا۔

''میر صاحب۔ میں آپ کو ہی یاد کر رہا تھا۔''

''یہ تو آپ کی محبت ہے۔ چوہدری ولایت حسین کی موت کے بعد اب ان کی پارٹی کی ایک اور رہنما کا قتل ہو گیا ہے۔ کیا آپ کو ان دونوں واقعات میں کچھ ایسا ملا ہے جس سے ان دونوں واقعات کو ایک دوسرے سے جوڑا جا سکے؟''

''ابھی تک کی تفتیش کے مطابق تو کچھ بھی ایسا نہیں ملا۔ نائلہ جعفر کا قتل ایک پلانڈ مرڈر ہے جبکہ چوہدری ولایت حسین کی موت کے بارے میں اُس وقت تک کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آجاتی۔''

''نائلہ جعفر کے قتل کا کوئی مقصد سمجھ میں آیا؟'' میں جانتا تھا کہ اس سوال کا جواب کیا ملے گا مگر اندھیرے میں تیر چلانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''فی الحال تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔ اس قتل کا موٹیو سر دست واضح نہیں ہو سکا۔''

ہم کچھ دیر اور باتیں کرتے رہے مگر کوئی ایسا سراغ نہیں مل سکا جس سے اس گتھی کو سلجھانے میں مدد مل پاتی۔ میں نے اگلی کال فرانزک ایجنسی کے سربراہ وسیم قادر کو کی جن سے مجھے کوئی نہ کوئی اہم سراغ ملنے کی امید تھی۔ انہوں نے پہلی ہی بیل پر میری کال اٹینڈ کر لی۔

''میر صاحب۔ کہیے کیسے یاد کیا؟''

''وسیم صاحب۔ آپ چوہدری ولایت حسین کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کب تک جاری کر رہے ہیں؟''

''دیکھیے۔ میں فون پر اس بارے میں بات نہیں کر سکتا۔ آپ مجھ سے شام سات بجے ہوٹل بلیو اسکائی میں ملیے۔''

ہوٹل بلیو اسکائی سیکٹر فائیو میں فرانزک ایجنسی کے دفتر کے قریب ہی واقع تھا۔ اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر دفتر میں ہی گزارنے کا فیصلہ کیا اور پورے ساڑھے چھ بجے روانہ ہوا۔

میں سات بجنے میں پانچ منٹ پر ہوٹل بلیو اسکائی کے نیم روشن ریستوران میں موجود تھا۔ پورے سات بجے وسیم قادر بھی آگئے۔ وہ اکیلے ہی آئے تھے۔ رسمی سلام دعا کے بعد میں اصل موضوع کی جانب آیا اور ان سے اپنا پرانا سوال ہی دہرایا تو انہوں نے کہا۔

''تفصیلی پوسٹ مارٹم ہونے میں تو وقت لگے گا۔ ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ اور فرانزک شواہد سے یہ تو واضح ہو چکا ہے کہ یہ لاش تین ماہ پرانی ہے۔''

''آپ یہ اس قدر دعوے سے کس طرح کہہ سکتے ہیں؟''

''دیکھیے۔ ان کی لاش بہت بری طرح گل چکی ہے اور صرف ہڈیاں ہی ملی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لاش کافی پرانی ہے۔''

''آپ فرانزک شواہد کا ذکر کر رہے تھے۔''

''میں وہی بتا رہا ہوں کہ ان کے کال ڈیٹا ریکارڈز سے یہ واضح ہو گیا ہے کہ وہ تین ماہ سے کسی سے رابطے میں نہیں تھے۔ ان کے سوشل میڈیا اکاؤنٹس کی بھی جانچ کی ہے جس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے فیس بک پر آخری پوسٹ 15 اپریل کو لگائی تھی۔ اسی طرح انہوں نے آخری ای میل بھی انہی دنوں کی تھی۔''

''اچھا۔ اور کچھ؟''

''ان کے گھر میں ہر چیز پر بہت زیادہ گرد جم چکی تھی جس کا مطلب یہ ہے کہ گھر کافی دنوں سے بند تھا۔''

''کیا ایسے کوئی شواہد ملے کہ ان کا قتل کیا گیا ہے؟''

''نہیں۔ ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ایسے کوئی شواہد نہیں ملے۔''

''نائلہ جعفر کے قتل کے بارے میں آپ کی ابتدائی پوسٹ مارٹم رپورٹ کیا کہتی ہے؟''

''ان کو پوائنٹ بلینک رینج سے چار گولیاں ماری گئی تھیں۔''

''میں نے اُن کے گھر کے قریب ہی ایک گھر پر سیکیورٹی کیمرا دیکھا ہے۔ آپ نے اس کی فوٹیج حاصل کی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میر صاحب۔ ہم نے اس گھر سے معلوم کیا مگر وہ کیمرا کام نہیں کر رہا تھا، جبکہ جائے وقوعہ کے قریب چوک سے فوٹیج حاصل کی ہیں مگر ان میں قاتل آتے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے مگر جاتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔''

digest library.com
Digest Novels .com

"وہ کس جانب گئے، آپ نے اُن کا چہرہ تو دیکھا ہوگا؟"

"انہوں نے نقاب پہن رکھے تھے، اس لیے ان کی شناخت ممکن نہیں ہوسکی۔ شہر کے دیگر کیمروں کی فوٹیج حاصل کی ہیں جن کا فرانزک تجزیہ جاری ہے مگر فی الحال کوئی پختہ ثبوت نہیں مل سکا جس سے ان کی شناخت کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہوسکے۔"

"اچھا۔ آپ نے نائلہ جعفر کے کال ریکارڈز کا تجزیہ تو کیا ہوگا۔ کچھ عجیب محسوس ہوا؟"

"نہیں کچھ بھی عجیب محسوس نہیں ہوا۔ ان کو آخری کال ان کے بھائی اسد جعفر نے کی تھی۔ وہ ان کی سیاسی جماعت کے یوتھ ونگ کے سربراہ ہیں۔ ہم نے ان کو فوری طور پر حراست میں لے لیا تھا مگر فی الحال ان سے کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔"

میں نے کچھ اور سوال بھی کیے مگر کچھ ایسا معلوم نہیں ہو سکا جس سے اس معاملے پر مزید روشنی پڑتی۔

دو تین دن یوں ہی گزر گئے۔ تیسرے دن پولیس نے چوہدری ولایت حسین کی تفصیلی پوسٹ مارٹم رپورٹ جاری کردی جس سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو زہر دے کر قتل کیا گیا ہے مگر یہ زہر کس طرح دیا گیا یا کس نے دیا، پولیس نے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی تھی جبکہ نائلہ جعفر کے قتل کے حوالے سے بھی کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ مجھے بہرحال اب اس معاملے میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی کیونکہ چوہدری ولایت حسین کی موت کے بعد ان کی پارٹی کی سربراہی کے لیے ان کی بیوہ اور پارٹی کے ایک سینئر عہدے دار کے درمیان تنازع پیدا ہوگیا تھا۔

پارٹی کے کارکن یہ چاہتے تھے کہ ان کی بیوہ کو پارٹی کی سربراہی سونپی جائے جبکہ کچھ سینئر رہنماؤں کا یہ خیال تھا کہ چوہدری ولایت حسین کی بیوہ چونکہ سیاسی پس منظر نہیں رکھتیں، اس لیے وہ پارٹی سربراہ کے لیے موزوں امیدوار نہیں ہیں۔

یہ جمعرات کا دن تھا۔ مجھے فرصت ہی فرصت تھی اس لیے میں نے سب سے پہلے تو فرانزک ایجنسی کے سربراہ وسیم قادر کو کال کی۔

"جی میر صاحب۔ کہیے میں آپ کی کیا سیوا کر سکتا ہوں۔"

"وسیم صاحب۔ آپ نے اپنی تفصیلی رپورٹ میں یہ ذکر تو کیا ہے کہ مقتول کو زہر دیا گیا ہے مگر یہ ذکر نہیں کیا کہ کون سا زہر دیا گیا ہے؟" میں نے سیدھا نکتے پر آتے ہوئے کہا۔

"درست کہا۔ میڈیا کو جو رپورٹ جاری کی گئی ہے، اس میں زہر کا ذکر عوامی مفاد میں نہیں کیا گیا مگر آپ پوچھ رہے ہیں تو آپ کو بتا رہا ہوں کہ سنکھیا زہر دیا گیا ہے۔"

"اوہ، سنکھیا۔ یہ زہر تو سونے کے زیورات بنانے یا کان کنی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔"

"جی بالکل۔ اس کے استعمال سے چوبیس گھنٹے میں موت ہوجاتی ہے۔"

"یہ زہر دیا کس طرح گیا؟"

"ہم نے وہاں موجود ہر چیز کا فرانزک تجزیہ کیا ہے مگر فی الحال اس بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔"

میں نے وسیم قادر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اگلی کال سول خفیہ ایجنسی کے سربراہ علی جواد صاحب کو کی۔

"آپ نے چوہدری ولایت حسین اور نائلہ جعفر کے کال ریکارڈز نکلوائے ہوں گے، کیا آپ وہ مجھے فراہم کر سکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں کل صبح تک آپ کو یہ ریکارڈ آپ کے دفتر بھجوا دوں گا۔"

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اب یہ معاملہ واضح ہو چکا تھا۔ چوہدری ولایت حسین اور نائلہ جعفر دونوں کا قتل ہوا تھا۔ یہ قتل کیوں ہوا تھا اور قتل کی ان دونوں وارداتوں کے درمیان کیا تعلق تھا؟ مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا۔

چوہدری ولایت حسین کی رہائش شہر کے پوش ترین سیکٹر ایٹ میں تھی۔ میں نے ان کے گھر جانے اور اس جگہ کا جائزہ لینے کا فیصلہ کیا جہاں سے ان کی لاش ملی تھی۔ میں نے گاڑی نکالی اور سیکٹر ایٹ میں ان کے گھر کی گلی کے باہر چوک کے قریب گاڑی پارک کردی اور پیدل ان کے گھر کی جانب ہولیا۔ مجھے اب ان کے گھر میں داخل ہونا تھا مگر اس سے پہلے میں نے باریک بینی سے گلی کا جائزہ لیا۔ ان کے گھر کے باہر کوئی سیکیورٹی گارڈ موجود نہیں تھا مگر پولیس کا ایک اہلکار تعینات تھا جو اونگھ رہا تھا۔ گھر کو سیل کیا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ اس وقت گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔

میں بہت احتیاط برت رہا تھا اور یہ زندگی میں پہلی بار نہیں تھا جب میں کسی گھر میں یوں چوروں کی طرح داخل ہو رہا ہوں۔ ایسا بہت بار ہو چکا تھا اور مجھے میر حسن جاسوس کی عرفیت ملی بھی اسی وجہ سے تھی۔

گھر کے ایک جانب جامن کے پیڑ تھے جن کی اوٹ لے کر میں گھر کی دیوار پر چڑھا اور دوسری جانب پھلانگ

Digest Novels .com

گیا۔ گھر کیا تھا محل کیسے۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں مجھے پولیس اہل کار دیکھ نہ لے۔ گھر کے پورچ سے اندرونی حصے کو راستہ جاتا تھا، میں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بند تھا۔ میں کوئی لاک ماسٹر تو ہوں نہیں کہ تالا کھولنے میں مجھے مہارت ہوتی چنانچہ میں کوئی اور راستہ تلاش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے بالائی منزل کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی دکھائی دی۔ میں دیوار پر چڑھا تو ساتھ والے گھر میں موجود کتا مجھے دیکھ کر بھونکنے لگا۔ میں کتوں سے بہت خوف کھاتا ہوں، میری تو جان پر بن آئی۔ میں نے فوراً بالائی منزل کے کنارے پر ہاتھ ڈالا۔ کتا اب بھی بھونک رہا تھا مگر میں فی الفور اوٹ میں ہو گیا۔

کتا کچھ دیر اور بھونکتا رہا۔ پھر کسی کو نہ پا کر چلا گیا۔ میں خاموشی سے رینگتا ہوا اس کھڑکی کی جانب بڑھا جو کھلی ہوئی تھی۔ میں اس کھڑکی سے اندر داخل ہوا۔ گھر میں گہری تاریکی تھی۔ میں اپنے ساتھ ٹارچ لایا تھا، میں نے ٹارچ روشن کر لی۔ یہ غالباً لاؤنج تھا، جس میں دونوں جانب پینٹنگز لگی ہوئی تھیں اور مالک کے عمدہ ذوق کی گواہی دے رہی تھیں۔ میں نے لاؤنج اور اس میں کھلنے والے سارے کمروں کا جائزہ لیا مگر ان میں وہ کمرا موجود نہیں تھا جس سے چوہدری ولایت حسین کی لاش ملی تھی۔ میں نچلے پورشن میں گیا تو مجھے سامنے وہ کمرا نظر آ گیا جسے سیل کیا گیا تھا۔ میں کمرے میں داخل ہوا، ہر چیز پر بہت زیادہ گرد جمی ہوئی تھی۔ میں نے کمرے کا بغور جائزہ لیا جو غالباً اسٹڈی روم تھا مگر مجھے وہاں کچھ بھی ایسا نہیں ملا جس کے ذریعے زہر دیا گیا ہو۔ ایک فنگر موئسچرائزر، اور ایک کتاب ملی جو غالباً مقتول مرنے سے پہلے پڑھ رہا ہوگا۔

میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ مجھے باہر سے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً الماری کے عقب میں ہو گیا اور فوراً ہی اپنی ٹارچ بھی بجھا دی۔

میں نے دروازے کی آواز سنی مگر شکر ہے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں چند منٹ سانس روکے کھڑا رہا۔ جب مجھے باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی تو میں الماری کی اوٹ سے باہر آ گیا اور دوبارہ کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک فنگر موئسچرائزر کے سوا کچھ بھی ایسا نہیں ملا جس پر شک کیا جا سکتا۔ میں نے اسے اٹھایا اور باہر کی راہ لی۔ شکر ہے کہ اب ساتھ والے گھر میں کتا نہیں تھا۔ میں جامن کے درخت کی اوٹ لیتا ہوا دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔ میں نے دیکھا کہ پولیس اہلکار کسی سے فون پر باتوں میں مصروف تھا۔ میں کچھ دیر سانس روکے درخت کی اوٹ میں کھڑا رہا۔ جب مجھے باہر نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تو میں زمین پر جھکا اور ایک پتھر اٹھا کر اندر کی جانب اچھال دیا، پولیس اہلکار فوراً ''کون ہے؟...... کون ہے؟'' کی آواز لگاتا اندر کی جانب گیا تو میں درخت کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔

میں نے دفتر لوٹ کر فرانزک ایجنسی کے سربراہ وسیم قادر کو کال کی جن سے میری اس شام ملاقات طے ہوگئی، مجھے ان کو فنگر موئسچرائزر دینا تھا تاکہ یہ معلوم ہو سکتا کہ اس میں زہر تھا یا نہیں۔ یہ اگر ثابت ہو جاتا کہ زہر اس فنگر موئسچرائزر کے ذریعے دیا گیا تھا تو ایک اہم گتھی سلجھ سکتی تھی مگر اگلے دن جب وسیم قادر نے مجھے بتایا کہ اس میں زہر شامل نہیں تھا تو ایک اہم سراغ ضائع ہو گیا۔

علی جواد نے فون ریکارڈز میرے دفتر کے پتے پر بھجوا دیے تھے جن کا میں رات بھر باریک بینی سے جائزہ لیتا رہا مگر مجھے قتل کی ان دونوں وارداتوں میں کوئی مشترکہ کڑی نہیں ملی۔ مجھ سے کوئی چیز تو چھوٹ رہی تھی۔ چوہدری ولایت حسین کو زہر دیا گیا تھا تو کس طرح؟ اس سوال نے مجھے بے چین کر دیا تھا۔

میں نے اگلے روز دوبارہ چوہدری ولایت حسین کے گھر کا رخ کیا اور ان کے کمرے کا تفصیل سے جائزہ لیا۔ ان کے کمرے میں کچھ بھی ایسا نہیں تھا جس پر شک کیا جا سکتا۔ وہ کتاب اسی طرح پڑی تھی۔ یہ ایک جاسوسی ناول تھا جس میں ایک بک مارک بھی رکھا ہوا تھا۔

''ہو سکتا ہے کہ مقتول نے صفحہ پلٹنے کے لیے فنگر موئسچرائزر کا استعمال نہ کیا ہو اور اپنی عادت سے مجبور ہو کر تھوک کا سہارا لیا ہو۔'' میرے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا تھا جس کے باعث میں نے وہ ناول اٹھا لیا۔ اس کے سوا ایسا کچھ بھی نہیں تھا جس پر شک جاتا۔ اس شک کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ سنکھیا ایک طاقت ور زہر ہے جو بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ ہوتا ہے اور اس کی تھوڑی سی مقدار بھی جان لیوا ہو سکتی ہے۔ یورپ میں قرونِ وسطیٰ کے عہد میں سنکھیا کو زہروں کا حکمران کہا گیا تھا۔ میں واپس دفتر لوٹا اور وہ ناول وسیم قادر کے حوالے کر دیا۔

مجھے اب فرانزک ایجنسی کی رپورٹ کا انتظار کرنا تھا۔ میں اس دوران میں نائلہ جعفر کے فون ریکارڈز میں ایک نمبر کو شناخت کرنے میں کامیاب رہا تھا جس سے نائلہ جعفر کو بارہا کال کی جا رہی تھی۔ میں نے یہ نمبر سویلین خفیہ ایجنسی کے سربراہ علی جواد کو دیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مجھے اس کا سی ڈی آر یا کال ڈیٹا ریکارڈز نکلوا دیں۔

Digest Novels .com

مجھے اب صرف انتظار کرنا تھا۔ میں نے یہ وقت ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور چوہدری ولایت حسین کی اہلیہ بیگم زینت ولایت حسین سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا کیونکہ ان کا فون نمبر چوہدری ولایت حسین اور نائلہ جعفر دونوں کے کال ریکارڈز میں ظاہر ہو رہا تھا مگر اس ملاقات کی ایک اور اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے خاوند تین ماہ سے وفات پا چکے تھے مگر وہ اس حوالے سے بے خبر رہی تھیں۔ میں نے ان کا نمبر ملایا مگر انہوں نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ کچھ دیر بعد خود ہی ان کی کال آ گئی۔ دوسری جانب ان کی سیکریٹری تھی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا تو اس نے مجھ سے کچھ دیر ہولڈ کرنے کے لیے کہا۔ چند لمحوں بعد دوسری جانب بیگم زینت ولایت حسین تھیں۔

''جی میر صاحب۔ آپ کا بہت چرچا سنا تھا۔ آج آپ سے بات بھی ہو رہی ہے۔''

''کیا آج شام میں آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟''

میں نے وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور براہ راست اپنے موضوع پر آ گیا۔

''کیوں نہیں۔ آپ شام سات بجے میرے گھر تشریف لے آئیے۔ میں آپ کی منتظر رہوں گی۔'' میں نے گھر کا پتا نوٹ کیا اور پورے سات بجے ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہ میری ہی منتظر تھیں۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں اصل موضوع پر آ گیا۔

''چوہدری ولایت حسین تین ماہ قبل وفات پا گئے تھے۔ نہ آپ کو معلوم ہوا نہ گھر کے کسی اور فرد کو؟''

''میر صاحب۔ چوہدری صاحب اکثر کئی کئی دن سیاسی اور سماجی منظرنامے سے کنارہ کشی اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اس دوران ان کا فون بھی بند رہا کرتا۔''

''مگر اس بار تو تین ماہ سے زیادہ کا وقت گزر گیا اور کسی نے ان سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''کوشش تو کی۔ آپ سے کس نے کہا کوشش نہیں کی۔ میں ان سے کافی دن سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رابطہ نہیں ہوا تو ان کے گھر گئی۔ گھر بند تھا تو پولیس کو اطلاع دی اور تب ہی تو ان کی موت کے بارے میں معلوم ہوا۔''

''کیا انہوں نے اپنے بعد آپ کو پارٹی کی سربراہی سونپی تھی؟''

''دیکھیے میر صاحب، انہوں نے مجھے پارٹی کی سربراہی تو نہیں سونپی تھی بلکہ ان کی زندگی میں، میں ہمیشہ سیاست سے دور رہی مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی موت کے بعد بھی میں سیاست میں نہیں آؤں گی؟''

انہوں نے بال میرے کورٹ میں اچھال دی تھی۔

''آپ کے خیال میں چوہدری ولایت حسین کے قتل کا سب سے زیادہ فائدہ کسے ہوا ہوگا؟''

''میر صاحب۔ میرا خیال ہے کہ یہ معلوم کرنا پولیس کا کام ہے۔''

''آپ ان کی بیوی ہیں تو اس ناتے کچھ نہ کچھ تو آپ بھی جانتی ہوں گی؟''

''میر صاحب دیکھیے، کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر کہوں گی کہ ان کی موت سے فائدہ تو مجھے بھی ہو رہا ہے کہ میں پارٹی سربراہ کے لیے سب سے مضبوط امیدوار ہوں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ قتل میں نے کیا ہے۔ مجھے اگر ان کی موت کے بعد پارٹی سربراہی نہ بھی ملے تو تب بھی ان کی پراپرٹی ان کے ورثا کو ہی ملے گی جن میں میں بھی شامل ہوں تو اس صورت میں بھی مجھے ہی فائدہ ہوگا، اس لیے میں کہوں گی کہ اس قتل کا مقصد کوئی ذاتی رنجش ہو سکتی ہے۔ کوئی پرانی ناراضی جس کا بدلہ کچھ اس طرح سے لیا گیا ہے۔''

''آپ کے خیال میں نائلہ جعفر کے قتل کی کیا وجہ رہی ہوگی؟''

''یہ تو پولیس والے ہی بتا سکتے ہیں۔ وہ پارٹی کی ایک متحرک کارکن تھی اور اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتی۔''

''آپ کی ان سے فون پر بہت بات ہوتی تھی؟''

''بہت بات تو نہیں ہوتی تھی۔ ایک دو بار سرسری سی بات ہوئی تھی۔ وہ بھی چوہدری صاحب کی وفات کے بعد۔''

ہم کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جس کے بعد میں نے ان سے رخصت لی۔ مجھے اس گفتگو سے یہ تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اگر بیگم زینت ولایت حسین نے قتل کیا بھی ہوگا تو وہ آسانی سے قبول نہیں کریں گی۔

اگلے دن میں صبح دفتر پہنچا، رپورٹرز کی میٹنگ سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے نسیم قادر صاحب کی کال آ گئی۔ میرا نشانہ ٹھیک جگہ پر لگا تھا۔ زہر ناول کے صفحات پر لگایا گیا تھا لیکن یہ کس نے لگایا تھا، یہ فی الحال معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ یہ کتاب بیرون ملک کے کسی پبلشر نے شائع کی تھی جس کے ذریعے خریدار کا معلوم کرنا ناممکن تھا۔ چنانچہ اب واحد امید اس فون نمبر کے کال ڈیٹا ریکارڈز سے بندھ گئی تھی جس سے نائلہ جعفر کو کال کی گئی تھی۔

میں نے بہرحال وقت ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور سیکٹر نائن کے پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او مزمل گجر سے

Digest Novels .com

ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے ان سے کام کی کوئی نہ کوئی معلومات مل سکتی ہیں۔ میں پولیس اسٹیشن پہنچا تو مزمل گجر پیٹرولنگ پر گئے ہوئے تھے۔ میں ان کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے سول خفیہ ایجنسی کے سربراہ علی جواد کی کال آگئی۔

''میر صاحب، لگتا ہے آپ دوبارہ جاسوسی کرنے لگے ہیں؟''

''کیا کہہ رہے ہیں علی صاحب۔ جاسوسی نہیں، یوں سمجھیے کہ آپ کی مدد کر رہا ہوں۔''

''اس طرح ہی کہہ لیں۔ آپ نے جس فون نمبر کے کال ڈیٹیل ریکارڈز کے لیے کہا تھا۔ اس نمبر سے ایک ہی کال کی گئی تھی۔ میں نے آپ کو سی ڈی آر واٹس ایپ کر دیا ہے۔ دیکھ لیجیے۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ میں یہ ریکارڈز دیکھ ہی رہا تھا کہ اس دوران ایس ایچ او مزمل گجر آگئے۔

''میر صاحب، کیسے آنا ہوا؟''

''گجر صاحب۔ نائلہ جعفر کے قتل کے معاملے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟''

''آپ بتائیے میر صاحب؟ ہم تو ٹامک ٹوئیاں ہی مار رہے ہیں۔''

''آپ ایک جہاندیدہ پولیس افسر ہیں۔ ایسے معاملات تو آپ چٹکیوں میں حل کر لیتے ہیں۔'' میں نے برجستہ کہا تو ہم دونوں کا قہقہہ بلند ہوگیا۔

''میر صاحب شرمندہ نہ کریں۔ کوشش تو پوری کر رہے ہیں مگر قاتلوں کی شناخت ہو تو کچھ پیشرفت ہو۔''

''موٹیو کا کچھ معلوم ہوا؟''

''نہیں، فی الحال کچھ بھی معلوم نہیں ہوا۔''

''کچھ معلوم ہو تو ضرور بتائیے گا۔'' میں نے ان کو تاکید کی اور واپس دفتر کا رُخ کیا۔

میں دفتر آ کر اس نامعلوم شخص کے کال ڈیٹیل ریکارڈ کا باریک بینی سے جائزہ لینے لگا جس نے نائلہ جعفر کو کال کی تھی۔ یہ سم صرف تھوڑی دیر کے لیے آن کی گئی تھی جس سے نائلہ جعفر کو ہی کال کی گئی تھی مگر سب سے چونکا دینے والی بات یہ تھی جس فون نمبر سے کال کی گئی تو اس کی لوکیشن جائے وقوعہ سے چند سو میٹر کے دائرے میں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ فون کرنے والا شخص غالباً اسی علاقے کا رہائشی تھا جہاں پر نائلہ جعفر کی رہائش تھی۔

ایک اور اہم بات یہ معلوم ہوئی تھی کہ یہ نمبر کسی غلام رسول کے نام پر رجسٹرڈ تھا جس کا ریکارڈ میں پتا دارالحکومت کے کسی نواحی گاؤں کا دیا گیا تھا۔ میری چھٹی حس یہ تو کہہ رہی تھی کہ غلط شناخت پر فون نمبر لیا گیا ہوگا مگر میں نے اس کے باوجود جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

میں اگلی صبح غلام رسول نامی اس شخص سے ملاقات کے لیے اس کے گاؤں روانہ ہوگیا جو دارالحکومت سے نصف گھنٹے کی دوری پر تھا۔ اس کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ دارالحکومت میں سیکیورٹی گارڈ ہے۔ حیران کن طور پر وہ اسی علاقے میں سیکیورٹی گارڈ تھا جس علاقے میں نائلہ جعفر کی رہائش تھی۔ مجھے غلام رسول کا نمبر مل گیا تھا مگر گاؤں سے واپسی پر مجھے کافی تاخیر ہوگئی تھی جس کے باعث میں نے اس سے اگلے روز ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں اگلے روز صبح جلدی جاگ گیا اور ناشتا کرنے کے فوراً بعد غلام رسول سے ملاقات کرنے کے لیے اس پتے پر پہنچا جو مجھے اس کے گھر والوں نے فراہم کیا تھا۔ مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ وہ اس گھر میں چوکیدار تھا جس پر پوری گلی میں واحد سیکیورٹی کیمرا نصب تھا اور یہ کافی عرصے سے خالی پڑا تھا۔ یہ ایک اہم سراغ ہو سکتا تھا۔

''غلام رسول تم کب سے یہاں ڈیوٹی کر رہے ہو؟'' میں نے اپنی آواز میں رعب پیدا کرتے ہوئے براہِ راست پوچھا۔

''آپ کون ہیں؟'' اس نے گڑبڑا کر کہا۔

''پریشان مت ہو۔ روٹین کی پوچھ گچھ ہے۔'' میں نے کہا۔

''۔۔۔ آپ، پولیس میں ہوتے ہیں؟''

''ہاں، یہی سمجھ لو۔'' میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

''میں تین ماہ سے یہاں ڈیوٹی کر رہا ہوں۔''

''کیا تمہارے نام پر کوئی اور فون نمبر بھی رجسٹرڈ ہے؟''

''نہیں صاحب۔'' اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

''یہ نمبر دیکھو۔'' میں نے اس کے سامنے وہ نمبر کر دیا جس سے نائلہ جعفر کو کال کی گئی تھی۔

''نہیں صاحب۔ یہ میرا نمبر نہیں ہے۔''

''اچھا۔ تم نے گزشتہ چند دنوں کے دوران کسی کو اپنا شناختی کارڈ تو نہیں دیا۔''

''نہیں صاحب۔''

Digest Novels .com

"اچھا یہ بتاؤ۔ اس گھر میں کون رہتا ہے؟"

"ایک بیگم صاحبہ رہتی ہیں۔"

"کون بیگم صاحبہ؟ کوئی نام تو ہوگا؟"

"صاحب جی، میں چوکیدار ہوں۔ میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ کسی باہر کے ملک میں رہتی ہیں۔"

"تم اپنی مالکن کا نام بھی نہیں جانتے؟ کبھی کوئی آیا ہو، کسی کو دیکھا ہو؟"

"نہیں صاحب۔ میں نے کبھی کسی کو گھر آتے جاتے نہیں دیکھا۔"

"اچھا، اُس دن کہاں تھے جب اس گلی میں قتل ہوا تھا؟"

"صاحب جی، مجھے بیگم صاحبہ نے چھٹی پر بھیج دیا تھا۔ میں جب واپس آیا تو مجھے تب ہی اس بارے میں معلوم ہوا۔"

میرا اس گھر پر رہنے والوں پر شک بڑھتا جا رہا تھا کیونکہ غلام رسول اس قدر منظم انداز سے منصوبہ بندی نہیں کر سکتا تھا، وہ گاؤں کا ایک سیدھا سادہ دیہاتی تھی۔ کسی نے اس کا شناختی کارڈ لیا تھا اور غلط استعمال کیا تھا مگر وہ کون تھا؟ یہ معلوم کرنا تھا اور یہ بھی کہ اس گھر میں کون رہتا تھا۔

یہ موبائل سم سیکٹر تھری کی ایک فرنچائز سے خریدی گئی تھی جس سے یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ یہ سم واقعتاً غلام رسول نے خریدی تھی یا کسی اور نے؟ میں نے سیکٹر تھری کا رُخ کیا۔ یہ ایک بڑی فرنچائز تھی جس کے منیجر سے میں نے اپنا تعارف کروایا تو وہ مجھ سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوا اور میری مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے ریکارڈ سے یہ معلوم کر لیا کہ یہ سم مئی کے مہینے میں جاری ہوئی تھی، اس نے اس تاریخ کا سی سی ٹی وی کیمروں کا ریکارڈ نکلوایا تو یہ واضح ہو گیا کہ غلام رسول نے سم نہیں خریدی تھی۔ یہ کوئی نوجوان تھا جس نے فیس ماسک سے اپنا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور سب سے عجیب بات اس کی شرٹ جس پر ڈریگن کا نشان تھا۔ یہ نشان عموماً امریکا کے ہائی اینڈ فیشن برانڈ رابرٹ گراہم کی شرٹس پر ہوتا ہے۔ یہ بہت مہنگی شرٹس ہوتی ہیں جو ہر کوئی نہیں خرید سکتا۔

مجھے اب ایک ایسے نوجوان کو تلاش کرنا تھا جو امپورٹڈ اور مہنگی شرٹس زیبِ تن کرتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بیرونِ ملک رہتا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس نے یہ شرٹ آن لائن خریدی ہو۔ ہونے کو تو بہت کچھ ہو سکتا تھا مگر میں نے احتیاطاً سم خریدنے والے نوجوان کا فوٹو حاصل کر لیا تھا تاکہ غلام رسول کو دکھا کر یہ جان سکوں کہ آیا وہ اس نوجوان کو جانتا ہے یا نہیں؟

میں دفتر واپس لوٹا تو مجھے میرے ایڈیٹر احسن عباسی نے اپنے دفتر بلا لیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح اپنے لیپ ٹاپ پر جھکے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کو کہا اور گویا ہوئے۔

"میر صاحب۔ سنا ہے آپ بیگم زینت ولایت حسین سے تفتیش کرنے گئے تھے؟" انہوں نے تفتیش پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"احسن صاحب میں کوئی پولیس والا تھوڑا ہی ہوں جو کسی سے تفتیش کروں گا۔"

"لیکن مجھے تو یہی معلوم ہوا کہ آپ بیگم صاحبہ سے تفتیش کر رہے تھے۔"

"وہ شاعر نے شاید اسی موقع کے لیے کہا ہے،" جو چاہے آپ کا حُسنِ کرشمہ ساز کرے۔" میں نے برجستہ کہا تو ہم دونوں مسکرا دیے۔

"میر صاحب۔ چلیے چھوڑیے، یہ بتائیے کہ آپ کہاں تک پہنچے؟"

"احسن صاحب۔ آپ کے الفاظ میں تفتیش جاری ہے۔ کچھ ٹھوس ہاتھ لگے گا تو ضرور بتاؤں گا بلکہ ڈھنڈورا پیٹوں گا۔"

"مرضی ہے آپ کی میر صاحب۔"

احسن صاحب اس پورے معاملے کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کر رہے تھے مگر میں نے بھی ان کو کچھ معلوم نہیں ہونے دیا کیونکہ ایک رپورٹر کے لیے سب سے اہم اس کے سورسز یا ذرائع ہوتے ہیں اور دوسرا وہ معلومات ہوتی ہیں جو وہ ان سورسز سے حاصل کرتا ہے اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں صرف سورسز کی جانب سے حاصل ہونے والی معلومات پر انحصار نہیں کرتا بلکہ خود فیلڈ میں جا کر کام کرتا ہوں جس سے آج کل کے رپورٹرز دور بھاگتے ہیں۔

مجھے اب دو پہلوؤں سے اس معاملے پر آگے بڑھنا تھا۔ سب سے پہلے تو یہ کہ غلام رسول کے گھر کے مالک کون تھے جن کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ وہ اس پوری کارروائی میں ملوث ہو سکتے ہیں اور دوسرا وہ نوجوان کون تھا جس نے یہ موبائل سم خریدی تھی؟

میں اگلے روز رپورٹرز میٹنگ سے فارغ ہوا تو سیکٹر ایٹ کا رُخ کیا۔ غلام رسول مجھے دیکھتے ہی اٹینشن ہو گیا۔

Digest Novels .com

digest library.com

"غلام رسول! یہ تصویر دیکھو، کیا اس نوجوان کو جانتے ہو؟" میں نے کھردرے لہجے میں پوچھا تو وہ تصویر ہاتھ میں لے کر غور سے دیکھنے لگا۔

"نہیں صاحب، میں نے اس نوجوان کو پہلے نہیں دیکھا۔"

"یہ بتاؤ تمہاری مالکن کب واپس آ رہی ہیں؟"

"صاحب میں کیا جانوں۔ میں تو چوکیدار ہوں۔"

"کیا گھر کی چابی ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں صاحب میرے پاس صرف باہر کے تالے کی چابی ہے۔"

"تمہارے پاس اپنے مالکوں میں سے کسی کا بھی موبائل نمبر نہیں ہے۔"

"بیگم صاحبہ کا ہے۔"

"کیا، بیگم صاحبہ کا ہے تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں دیا؟"

"صاحب جی آپ نے مانگا ہی نہیں۔" اس نے روہانسا ہو کر کہا تو میں چپ ہو گیا۔

میں نے اس نمبر پر کال کی تو یہ بند جا رہا تھا۔ میں دفتر واپس لوٹا اور سویلین خفیہ ایجنسی کے سربراہ علی جواد کو کال کی۔ انہوں نے پہلی بیل پر ہی میری فون کال اٹینڈ کر لی۔

"میر صاحب، لگتا ہے آپ ضرور قاتلوں تک پہنچ کر رہیں گے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں علی صاحب۔ کچھ معلوم ہوگا تو آپ کو ضرور آگاہ کروں گا۔"

"حکم کیجیے میر صاحب۔"

"یہ ایک فون نمبر ہے، اس کے کال ڈیٹیل ریکارڈز نکلوانے ہیں۔"

"کوئی مسئلہ ہی نہیں میر صاحب۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ آپ کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ تو ہم جیسوں کے لیے ہوتا ہے۔" میرے اس مذاق پر وہ بھی مسکرا دیے۔

یہ فون نمبر ایک اہم سراغ ثابت ہو سکتا تھا جس سے شاید نائلہ جعفر کے قتل کی گتھی سلجھ جاتی۔ میں دوسری جانب چوہدری ولایت حسین کے معاملے پر بھی غور کر رہا تھا تبھی میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا۔

اگر زہر دینے والے کا پتا نہیں چل رہا تو شاید زہر خریدنے والے کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سنکھیا کوئی ایسا زہر نہیں جو ہر کسی کو آسانی سے دستیاب ہو جائے۔ یہ زہر سونے کا کام کرنے والے استعمال کرتے ہیں اور ان کو یہ ایک خاص مقدار میں دیا جاتا ہے تو یہ زہر کسی نے تو خریدا ہوگا اور پھر اس مہارت سے ناول کے صفحوں پر بکھیرا کہ کتاب پڑھتے ہوئے جب صفحہ الٹنے کے لیے عادتاً ہاتھ منہ میں گیا تو زہر بھی منہ کے اندر چلا گیا اور یوں موت ہو گئی۔

مجھے اب یہ معلوم کرنا تھا کہ یہ زہر خریدا کس نے۔ میں نے یہ پتا کرنے کے لیے شہر کی جیولرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین سے رابطہ کیا کیونکہ ایک ایک دکان پر جانا ناممکن تھا۔ وہ میرے پرانے شناسا تھے، انہوں نے میری مدد کرنے کی حامی بھر لی تھی۔

میں دو جمع دو چار کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا جب مجھے علی جواد صاحب کی کال موصول ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ موبائل نمبر کسی زریاب حسین کے نام پر رجسٹرڈ ہے اور تین ماہ قبل ہی لیا گیا تھا۔ انہوں نے مجھے اس کے کال ڈیٹیل ریکارڈ واٹس ایپ کر دیے۔ حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ یہ موبائل نمبر کسی خاتون کے نام نہیں بلکہ ایک مرد کے نام پر رجسٹرڈ تھا جبکہ اس سے ایک ہی فون کال اور وہ بھی کسی پراپرٹی ڈیلر کو کی گئی تھی۔ یہ فون نمبر بھی سیکٹر تھری کی اسی فرنچائز سے خریدی گئی تھی جس سے غلام رسول والی سم خریدی گئی تھی۔

میں نے اس امید پر سیکٹر تھری کا دوبارہ رُخ کیا کہ شاید اب کی بار مجھے ٹھوس معلومات مل جائیں۔ فرنچائز کا منیجر مجھ سے بہت پُرتپاک انداز سے ملا اور اس نے مجھے سی سی ٹی وی فوٹیج بھی دکھائی جس میں وہی نوجوان جو غلام رسول والی تصویر میں نظر آیا تھا، دکھائی دے رہا تھا مگر اس بار بھی اس کے چہرے پر فیس ماسک تھا جس کے باعث اس کی شناخت ممکن نہیں تھی۔

میں یہ معلومات حاصل کر کے فارغ ہوا تو سیکٹر ایٹ میں پراپرٹی ڈیلر کے دفتر کا رُخ کیا، اسے اپنا تعارف کروایا تو وہ مدد کرنے پر تیار ہو گیا۔ میں نے اسے موبائل نمبر دکھایا تو اس نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا مگر میں نے جب اسے گھر کا پتا بتایا تو وہ بول پڑا۔

"میر صاحب، میں نے یہ گھر ایک خاتون کو لے کر دیا تھا۔"

"کیا انہوں نے یہ گھر خریدا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ انہوں نے یہ گھر خریدا نہیں تھا بلکہ کرائے پر لیا تھا۔"

"کیا کرائے پر لیا تھا؟"

"جی کرائے پر ہی لیا تھا۔ اور مجھے اس لیے یہ یاد ہے کہ انہوں نے خاص طور پر اس گلی میں گھر کرائے پر لینے یا خریدنے کے لیے کہا تھا۔"

"کیوں کیا وہ کسی خاص وجہ سے اس گلی میں گھر لینا چاہتی تھیں؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے مجھے رابطے کے لیے ایک موبائل نمبر بھی دیا تھا۔"

"کیا آپ مجھے وہ موبائل نمبر فراہم کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں، میں آپ کو ابھی کر دیتا ہوں۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

میرے پاس اب ایک اور موبائل نمبر تھا۔ مجھے امید تھی کہ اب کی بار کوئی پختہ ثبوت ہی ہاتھ لگے گا۔ میں نے دوبارہ علی جواد صاحب کو کال کی تاکہ اس فون نمبر کے کال ریکارڈز نکلوا سکوں۔ علی جواد نے ہمیشہ کی طرح خندہ پیشانی سے میری مدد کرنا قبول کیا۔ ظاہر ہے کہ اس میں ان کا اپنا بھی مفاد تھا کیونکہ ان میں سے کسی ایک کے قتل کی گتھی بھی سلجھتی تو ان پر بھی بوجھ کم ہوتا۔ مجھے اب اس نمبر کے کال ریکارڈز آنے تک انتظار کرنا تھا۔

یہ ان چند کیسز میں سے ایک ہے جن کے لیے مجھے کئی دن قربان کرنا پڑے تھے اور ایک ایک سراغ بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا۔ میں یہ تو جان چکا تھا کہ اس پورے معاملے میں غلام رسول ملوث نہیں مگر اس کا کوئی نہ کوئی کردار ضرور تھا چاہے اس کو اس بارے میں معلوم تھا یا نہیں۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے جیولرز مارکیٹ کے چیئرمین کی کال آگئی۔ میں نے فون کال اٹینڈ کی تو وہ اپنے روایتی انداز میں بولے۔

"میر حسن صاحب! میں نہیں جانتا کہ آپ کے لیے یہ معلومات فائدہ مند ہوں گی یا نہیں۔"

"جی صاحب۔ آپ بتائیے کیا معلومات ہیں؟"

"مجھے ایک جیولر نے بتایا ہے کہ اس نے کچھ ماہ قبل ایک نوجوان کو یہ زہر فروخت کیا تھا۔"

"کیا اس نے اس نوجوان کی شکل دیکھی تھی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں، اُس نوجوان کے چہرے پر فیس ماسک تھا۔"

"مگر اس نے یہ زہر دیا کیوں؟"

"وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے یہ زہر دینا نہیں تھا بلکہ جب اس نوجوان نے یہ کہا کہ اس کو یہ زہر سائنسی تجربات کے لیے چاہیے تو تب ہی اس نے اس کو سنکھیا دیا۔"

"کیا وہ اس نوجوان کو پہچان سکتا ہے؟"

"یہ کہنا تو میرے لیے مشکل ہے، شاید وہ پہچان جائے۔"

"میں آپ کو ایک تصویر واٹس ایپ کر رہا ہوں۔ آپ اس کو یہ دکھا کر پوچھیے کہ کیا اس نے اس نوجوان کو دیکھا ہے۔"

مجھے امید تھی کہ اس طرح شاید یہ دونوں معاملات آپس میں جڑ جاتے جس سے ایک اُلجھن تو دور ہو جاتی تھی۔ میں نے نائلہ جعفر کے بھائی اسد جعفر سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا جس کی نائلہ جعفر کو آخری بار کال بھی آئی تھی۔ میں نے اس کو فون کال کی تو اس نے پہلی ہی بیل پر کال اٹینڈ کر لی۔ میری اس سے شناسائی تو نہیں تھی مگر وہ مجھے نام سے جانتا تھا۔ میں نے تعارف کروایا تو وہ پُرجوش ہو گیا اور اس نے آج شام سات بجے ملاقات کا وقت دے دیا۔

میں دفتر سے اسد جعفر کے گھر جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ مجھے جیولرز ایسوسی ایشن کے چیئرمین کی فون کال آگئی جنہوں نے مجھے یہ بتایا کہ دکان دار نے اس نوجوان کو شناخت نہیں کیا۔ اس سے پورا معاملہ ہی منہ کے بل الٹ گیا تھا۔ مجھے اب بھی دونوں معاملات کے درمیان کوئی ایسی مشترک کڑی ڈھونڈنی تھی جس کے باعث ان دونوں معاملات کو آپس میں جوڑا جا سکتا۔ میں کافی دیر تک یہ جمع تفریق کرتا رہا مگر جب کوئی نتیجہ نہ نکلا تو میں اسد جعفر سے ملاقات کے لیے دفتر سے نکل پڑا۔

وہ دارالحکومت کے دوسرے کونے میں رہتا تھا۔ اس وقت شام کے چھ بج گئے تھے اور مجھے اس کے گھر پہنچنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ جاتا تھا۔ میں سڑک پر گاڑی دوڑا رہا تھا کہ مجھے ایک خیال نے گرفت میں لے لیا۔ میں شرٹ کے ذریعے بھی تو ملزم تک پہنچ سکتا ہوں۔ یہ اگرچہ گھاس میں سوئی ڈھونڈنے کے مترادف تھا مگر اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں یہ سوچتا ہوا اسد جعفر کے گھر پہنچ گیا۔ وہ گھر کے باہر کھڑا میرا ہی منتظر تھا۔ رسمی علیک سلیک کے بعد میں گویا ہوا۔

"اسد جعفر صاحب۔ آپ نے اپنی بہن نائلہ جعفر کو آخری کال کی تھی۔ کیا میں اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟"

"جی کیوں نہیں۔ مجھ سے پولیس نے بھی اس بارے میں سوال کیا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں نے آخری کال کی تھی۔ میں نے البتہ کال ضرور کی تھی۔ نائلہ جعفر دراصل ایک

ہنگامی پریس کانفرنس کرنے والی تھیں۔"

"ہنگامی پریس کانفرنس مگر کیوں؟"

"اس بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں۔ انہوں نے اس بارے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔"

"کیا یہ پریس کانفرنس چوہدری ولایت حسین کے قتل کے حوالے سے تو نہیں تھی۔"

"میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ شاید اس بارے میں روبینہ شاہین کو معلوم ہو۔"

"یہ روبینہ شاہین کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ نائلہ کی سیکریٹری تھیں اور ان کے کافی قریب تھیں۔ وہ اس بارے میں بہتر بتا سکتی ہیں۔"

"چوہدری ولایت حسین کے حوالے سے کبھی کوئی بات کی ہو؟"

"ایسی تو کبھی کوئی بات نہیں ہوئی۔"

ہم کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے روبینہ شاہین کا نمبر لے لیا تھا کیونکہ اکثر اس طرح کے معاملات میں کڑی سے کڑی جڑتی رہتی ہے۔ آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ ایک صحافی کے طور پر میری توجہ خبر نکلوانے تک محدود رہنی چاہیے تھی تو بات یہ ہے کہ میں دوسرے رپورٹرز کی طرح خبر تک محدود رہ سکتا تھا مگر شروع سے ہی میری یہ عادت رہی ہے کہ میں کسی معاملے میں ہاتھ ڈالوں تو پھر اسے حل کیے بغیر مجھے چین نہیں پڑتا اور اس معاملے میں میری دلچسپی اس لیے بھی بڑھ گئی تھی کہ اس میں ہر قدم ایک نیا انکشاف ہو رہا تھا، کڑی سے کڑی جڑ رہی تھی مگر سرِ دست کوئی ایسی کڑی نہیں ملی تھی جس سے معاملہ حل کی جانب جاتا یا ان دونوں معاملات میں کوئی مشترک کڑی مل پاتی جو ان دونوں معاملات کو جوڑ دیتی۔

میں گھر واپس پہنچا تو کچھ تھکاوٹ محسوس کر رہا تھا۔ زوجہ محترمہ نے میری طبیعت کو بھانپ لیا اور مجھے ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے مجبور کرنے لگیں۔ میں جب نہ مانا تو منہ بسور لیا۔ میں نے یہ ضرور کیا کہ دوا لے لی اور اپنی آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا لیکن میرا دماغ اب بھی کام کر رہا تھا۔ میرے لیے اس وقت یہ معلوم کرنا سب سے اہم تھا کہ یہ ڈریگن کے نشان والی شرٹ کس نے اور کہاں سے خریدی... تھی جس سے شاید مجھے کوئی سراغ مل پاتا۔ میری طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو میں نے لیپ ٹاپ کھولا اور رابرٹ گراہم شرٹ فروخت کرنے والے آن لائن اسٹورز کا پتا کرنے لگا۔ اس ڈیزائن کی شرٹ دارالحکومت میں صرف ایک اسٹور پر فروخت کی جا رہی تھیں۔ یہ اسٹور سیکریٹریٹ کے مرکز میں واقع تھا۔ میں نے اس کا نمبر اور ایڈریس نوٹ کر لیا۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے اس ذریعے سے کوئی مفید معلومات مل پاتیں۔ میں یہ سوچتا سوچتا سو گیا۔

"میر صاحب، میر صاحب!" میں اپنی زوجہ محترمہ کی آواز پر جاگا تو دیکھا کہ وہ بوکھلائی ہوئی ہیں۔

"کیا ہوا اللہ کی بندی؟"

"ٹیلی وژن دیکھیے۔"

میں بھاگا بھاگا ٹیلی وژن لاؤنج میں آیا تو دیکھا روبینہ شاہین کے قتل کی خبر چل رہی تھی۔ اسے صبح سویرے دو نامعلوم افراد نے گولی مار کر قتل کر دیا تھا۔ میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بیگم صاحبہ میری کیفیت سمجھتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میں اس معاملے پر کافی دنوں سے کام کر رہا تھا۔ اس قتل کے واقعے نے مزید الجھا دیا کیونکہ نائلہ جعفر پر بھی دو بندوں نے ہی فائرنگ کی تھی۔ ہو نہ ہو، ان دونوں واقعات کا آپس میں کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔

روبینہ شاہین ایک متوسط طبقے کی آبادی میں رہتی تھی۔ میں اس کے گھر پہنچا تو دیکھا پولیس اہلکاروں نے پورے علاقے کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ مجھے پولیس اہل کار نے جائے وقوعہ کی جانب جانے سے روک دیا۔ مقامی ایس ایچ او میرا پرانا شناسا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر دور سے ہی آواز لگائی۔

"میر صاحب، آپ آ گئے۔ میں آپ کا ہی منتظر تھا۔"

"کیوں خیریت۔ آپ کب سے ہمارے منتظر ہونے لگے؟"

"دیکھیے میر صاحب۔ ہم آپ کی صلاحیتوں کے مداح ہیں۔ آپ جس طرح گہرائی میں اُتر کر معاملات حل کرتے ہیں، وہ کوئی پولیس والا بھی نہیں کر سکتا۔"

"محنت کیا کیجیے نا۔ آپ لوگوں کو جلد از جلد فائل کلوز کرنے کی پڑی ہوتی ہے۔" میں نے ترنت جواب دیا تو ہم دونوں نے ہی قہقہہ لگایا۔

"میر صاحب آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں مگر جانتے ہی ہیں کہ پولیس اہل کاروں کی تعداد کم ہے اور شہروں کی آبادی ہے کہ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔"

ان کی بات بھی ٹھیک تھی کیونکہ وطنِ عزیز میں ایک لاکھ آبادی کے لیے اوسطاً 182 پولیس اہل کار ہیں جن کی بڑی تعداد بھی وی آئی پی ڈیوٹیز پر تعینات ہوتی ہے۔ اس

صورتِ حال میں پولیس کے لیے گہرائی میں جا کر تفتیش کرنا ممکن نہیں رہتا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ پولیس اہلکاروں کی چونکہ جدید خطوط پر تربیت نہیں کی گئی تو اس وجہ سے بھی وہ روایتی انداز سے تفتیش کرنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں۔

انہوں نے مجھے بہر حال جائے وقوعہ پر جانے سے نہیں روکا۔ یہ پندرہ فٹ چوڑی گلی تھی جس میں زیادہ تر گھر پانچ مرلے یا اس سے چھوٹے گھر تھے۔ روبینہ شاہین ایک پورشن میں اکیلی رہتی تھی۔ مقامی ایس ایچ او سے بات کر کے مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ گھر سے پارٹی کے دفتر جانے کے لیے نکلی تھی کہ دو موٹر سائیکل سواروں نے اس پر گولی چلا دی تھی۔ پولیس نے لاش کے جائزے سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ اس کو بلینک رینج سے گولی ماری گئی تھی۔ کچھ اسی طرح نائلہ جعفر کا بھی قتل ہوا تھا۔ کیا ان دونوں معاملات میں کوئی مماثلت تھی یا یہ صرف تفتیش کو بھٹکانے کی ایک کوشش تھی؟

میں نے یہ سوچتے ہوئے دفتر کا رُخ کیا تو دیکھا کہ میرے کمرے میں میرے نام سے ایک پارسل پڑا ہے۔ میں نے پارسل کھولا تو اس میں گولیاں تھیں۔ میں سکتے میں آ گیا۔ گولیاں بھیجنے کا مطلب مجھے دھمکانا تھا۔ میں نے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھا مگر اس پر بھیجنے والے کا نام نہیں لکھا تھا۔ میں نے مجتبیٰ سے پوچھا تو وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ریسپشن سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ یہ لفافہ کوئی نوجوان میرے نام پر چھوڑ کر گیا ہے مگر بھیجنے والے یا بھیجنے والی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ اس نوجوان کو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔

یہ پہلی بار نہیں تھا۔ مجھے اس سے قبل بھی مختلف کیسز پر کارروائی کرنے پر دھمکیاں دی جاتی رہی ہیں۔ یہ صحافت کا حصہ ہے، اس لیے میں پریشان نہیں ہوا۔ اس کا ایک مطلب تو یہ بھی تھا کہ میں درست سمت میں جا رہا تھا اور مجھے یہ گولیاں بھیج کر ٹریک سے ہٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دفتر کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے فون اٹھایا تو دوسری جانب میرے اخبار کے ایڈیٹر احسن عباسی تھے جنہوں نے مجھے دفتر آنے کے لیے کہا۔

میں ان کے دفتر گیا تو وہ عام معمول سے ہٹ کر لیپ ٹاپ پر جھکے ہوئے نہیں تھے بلکہ دروازے پر کھڑے میرے منتظر تھے۔ انہوں نے میرے داخل ہوتے ہی دروازہ بند کر لیا اور پُراسرار انداز میں گویا ہوئے۔

''میر صاحب، یہ دیکھیے!'' انہوں نے مجھے ایک خاکی لفافہ دکھایا جس میں گولیاں موجود تھیں۔

''یہ تو مجھے بھی آج ہی موصول ہوا ہے۔'' میں نے اطمینان سے جواب دیا تو وہ میرا منہ تکنے لگے۔

''دیکھیے، ہمارا کام خبر دینا ہے۔ ہم اس معاملے میں فریق نہیں بن سکتے۔'' ان کے لہجے میں تشویش تھی۔

''ہم فریق بن بھی نہیں رہے عباسی صاحب۔ میں اپنی خبر پر ہی کام کر رہا ہوں۔'' میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا تو انہوں نے جز بز ہوتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ رہا ہوں میر صاحب مگر میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ آپ احتیاط کیجیے۔ ہمارا کام صرف اور صرف خبر دینا ہے۔''

عباسی صاحب کی تشویش کسی حد تک درست بھی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا کوئی خاص صحافتی تجربہ نہیں تھا۔ شاید پہلی بار ان کی ادارت میں اس طرح کی خبر پر کام ہو رہا تھا اور وہ دباؤ برداشت نہیں کر پا رہے تھے جبکہ مجھے دو دہائیوں کے تجربے کے دوران ایسی صورتِ حال کا کئی بار سامنا کرنا پڑا تھا۔ میں نے ان کو تسلی دی اور کہا کہ میں تو صرف اپنی خبر پر ہی کام کر رہا ہوں اور یہ کہ اگر کسی کو مسئلہ ہو رہا ہے تو میرے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔

میں اپنے کمرے میں واپس لوٹا مگر میرا دماغ جمع تفریق کر رہا تھا۔ چوہدری ولایت حسین کی پُراسرار موت، پھر نائلہ جعفر کا قتل اور اب روبینہ شاہین کے قتل نے کئی سوال پیدا کر دیے تھے۔ کیا ان سب معاملات میں اس کے علاوہ بھی کوئی مماثلت تھی کہ یہ ایک ہی سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے؟ یہ سب قتل چند دنوں کے وقفے سے ہوئے تھے اور یہ کہ نائلہ جعفر اور اب روبینہ شاہین کو دو موٹر سائیکل سواروں نے پوائنٹ بلینک سے گولی ماری تھی۔ میں اس بارے میں جتنا زیادہ سوچتا، اتنا زیادہ اُلجھتا چلا جاتا۔ مجھے نائلہ جعفر کے سامنے والے گھر کے حوالے سے بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

حقوقِ آدمیت کی سربراہی کی جنگ بالآخر ختم ہو چکی تھی اور بیگم زینت ولایت حسین اس کی نئی سربراہ بن گئی تھیں۔ ان کی بات میرے ذہن میں اب بھی گردش کر رہی تھی کہ ممکن ہے یہ قتل ذاتی رنجش کا شاخسانہ ہو مگر اب بھی تصویر واضح نہیں ہو رہی تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری جانب سویلین خفیہ ایجنسی کے سربراہ علی جواد تھے۔ انہوں نے اس فون نمبر کا کال ڈیٹا نکلوا لیا تھا۔ یہ فون نمبر کسی زہرہ سہگل کے نام پر رجسٹرڈ تھا جس سے پراپرٹی ڈیلر کے علاوہ کچھ اور نمبروں پر کال کی گئی

تھی اور یہ نمبر گزشتہ چھ ماہ سے ایکٹو تھا مگر اب یہ بند تھا۔ یہ ایک اہم سراغ تھا۔

میں نے زہرہ سہگل سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان کے گھر کا پتا اسلام آباد کا ہی تھا مگر جب ان کے گھر گیا تو یہ معلوم ہوا کہ وہ بیرونِ ملک گئی ہوئی ہیں مگر ایک حیران کن انکشاف یہ ہوا کہ وہ حقوقِ آدمیت پارٹی کے خواتین ونگ کی انفارمیشن سیکریٹری اور متحرک سیاسی کارکن تھیں۔ یہ ایک اہم سراغ تھا جو مجھے قاتل تک لے جانے میں مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے اب زہرہ سہگل کی واپسی کا انتظار نہیں کرنا تھا بلکہ اگر یہ قتل اس نے ہی کیا تھا تو پھر اس کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے تھے۔ یہ معاملہ اب بھی حل طلب تھا کہ نائلہ جعفر کے سامنے والے گھر میں رہنے والی خاتون کون تھی؟ وہ اگر زہرہ سہگل تھی تو پھر بہت کچھ واضح ہو جاتا۔ میں نے زہرہ سہگل کی تصویر حاصل کر لی تھی۔ یہ تصویر میں نے غلام رسول اور پراپرٹی ڈیلر دونوں کو دکھائی مگر انہوں نے اس خاتون کو پہچاننے سے انکار کر دیا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ گھر زہرہ سہگل نے کرائے پر نہیں لیا تھا تو وہ خاتون کون تھی جس نے یہ گھر حاصل کیا تھا؟

دو تین روز گزر گئے مگر کوئی بھی ٹھوس پیشرفت نہیں ہوئی۔ یہ بدھ کا روز تھا اور میں اپنے دفتر میں بیٹھا کمپیوٹر پر وقت ضائع کر رہا تھا جب مجھے غلام رسول کی کال موصول ہوئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس کے گھر کی مالکن ابھی ابھی واپس آ گئی ہیں۔ میں اچھل پڑا۔ یہ ایک اہم پیش رفت تھی۔ میں فوراً دفتر سے نکلا اور گاڑی سیکٹر نائن کی جانب دوڑا دی۔ میں جب سیکٹر نائن پہنچا تو دیکھا کہ وہ خاتون گھر سے باہر نکل رہی ہیں۔ خاتون نے آنکھوں پر چوڑے شیشوں والے سن گلاسز لگا رکھے تھے اور چہرے کو... فیس ماسک سے ڈھانپا ہوا تھا۔ وہ گاڑی پر روانہ ہوئی تو میں نے بھی گاڑی اس کے پیچھے لگا لی۔ وہ ایک مال میں جا کر رکی۔ میں بھی رُک گیا۔ اس کی چال ڈھال سے ایسا کچھ بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ اس کو یہ معلوم ہو چکا ہو کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔

مجھے یہ جاننا تھا کہ وہ کہاں جاتی ہے اور کیا کرتی ہے؟ میں مال کے باہر اس کا انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے بعد بھی جب وہ خاتون واپس نہ آئی تو مجھے بے چینی ہونے لگی۔ اس کا ڈرائیور مگر اب بھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔ میں عموماً جھنجلاتا نہیں ہوں مگر آج میں جھنجلا گیا تھا۔ میں نے اسی جھنجلاہٹ میں گاڑی کے ڈرائیور کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ گاڑی مجھ سے سو گز کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں ڈرائیور سے بات کرنے ہی والا تھا کہ میری نظر ایک نوجوان پر پڑی جس نے ڈریگن والی شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ نظروں کے سامنے آیا اور اچانک مال کی کسی دکان میں غائب ہو گیا۔ میں گاڑی کو نظرانداز کرتا ہوا نوجوان کی جانب بھاگا تو پتھر سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچا۔ میں جب مال کے اندر پہنچا تو مجھے وہ نوجوان نظر نہیں آیا جو آناً فاناً غائب ہو چکا تھا۔ میں پارکنگ میں واپس آیا تو وہ گاڑی جا چکی تھی۔ میں ہاتھ ملتا رہ گیا۔

میں واپس سیکٹر نائن کے اس گھر میں آیا جہاں سے میں نے گاڑی کا تعاقب شروع کیا تھا مگر میری ساری محنت رائگاں گئی تھی۔ گھر کی مالکن واپس نہیں لوٹی تھی۔ میں نے گھر پر نظر رکھنے کا فیصلہ کیا۔ رات دیر گئے تک جب کوئی گھر میں آتا جاتا دکھائی نہیں دیا تو میں نے واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ میرے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ میں نے گھر واپسی کی راہ لی۔ رات کے ایک بجے گھر واپس پہنچا تو دیکھا زوجہ محترمہ منہ پھلائے میری ہی منتظر تھیں۔

”وقت دیکھ رہے ہیں؟ آپ کو تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔“ میں جانتا تھا کہ اس وقت بیگم صاحبہ غصے میں ہیں اس لیے خاموش رہا۔

وہ منہ میں بڑبڑاتی ہوئی کھانا کھانے لگی۔ بھوک سے میری جان نکل رہی تھی۔ میں کھانا کھا کر فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے غلام رسول کی کال آ گئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ خاتون واپس گھر آ گئی ہیں۔ میں اپنی زوجہ محترمہ سے ضروری کام پر جانے کا بہانہ بنا کر گھر سے نکلا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ دور سے اُلوؤں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے گھر کے قریب گلی کے نکڑ پر گاڑی لگا دی۔ میرے لیے اس وقت یہ جاننا اہم تھا کہ وہ خاتون کون ہے اور اس کا اس قتل سے کیا تعلق ہے؟

میں گلی میں داخل ہوا تو گھر کے اندر کی روشنی جل رہی تھی۔ میں نے خاموشی سے گھر کا جائزہ لیا اور غلام رسول کو اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مجھے گھر میں داخل ہونا ہے۔ وہ بے چارہ مجھے پولیس آفسر سمجھ رہا تھا، اس لیے وہ میرے اشاروں پر چل رہا تھا۔ میں دبے قدموں گھر میں داخل ہوا۔ اس وقت میرے لیے یہ جاننا اہم تھا کہ وہ خاتون کون ہے؟ میں کھڑکی پر پہنچا اور اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے محسوس ہوا کہ میرے عقب میں کوئی ہے۔ میں نے اپنا سانس روک لیا، اور اس سے قبل کہ مجھ پر حملہ ہوتا، میں نے گھوم کر کک لگائی۔ میرا نشانہ خطا نہیں گیا۔ کک میرے مقابل کی چھاتی پر لگی تھی۔ یہ ایک چوبیس، پچیس سال کا

Digest Novels .com

خوبرو نوجوان تھا۔ وہ لڑکھڑا گیا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، میں فوراً دیوار پھلانگ کر باہر آ گیا۔ غلام رسول حیرانی سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں کچھ ہی لمحوں میں اپنے گھر کی جانب جانے والی مرکزی شاہراہ پر تھا۔

مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو شاید میری جان بھی جا سکتی تھی کیونکہ وہ نوجوان مجھ پر بندوق کے بٹ سے حملہ کرنے ہی والا تھا مگر یہ وہ نوجوان نہیں تھا جس کی تصویر میرے پاس موجود تھی۔

میں گھر پہنچا تو صبح ہو رہی تھی، زوجہ محترمہ منہ بسورے میری ہی منتظر تھیں۔ وہ یہ جانتی بھی ہے کہ ایک صحافی کے لیے سب سے اہم خبر کا حصول ہوتا ہے اور میری واپسی کا کوئی وقت معین نہیں مگر یہ بات میں اسے سمجھاتا بھی تو کیسے۔ میں نے ناشتا کیا اور خاموشی سے اپنے اسٹڈی روم کی راہ لی کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ آج میری خیر نہیں۔ مجھے یہ خیال ستا رہا کہ وہ نوجوان اگر مجھ پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو کیا ہوتا۔

صحافت میں پہلا اصول اپنی حفاظت ہے۔ میں اگرچہ ایڈونچر کرتا ہوں مگر نئے آنے والے صحافیوں کو یہ مشورہ دینا نہیں بھولتا کہ آپ زندہ رہیں گے تو خبر پر کام کر سکیں گے۔ مجھے یوں کسی کے گھر میں داخل نہیں ہونا چاہیے تھا مگر میں نے اپنی تجسس طبیعت سے مجبور ہو کر یہ قدم اٹھا لیا تھا جس کی مجھے بھاری قیمت چکانا پڑ سکتی تھی۔

میں چند گھنٹوں کی نیند لے کر جاگا تو دوبارہ اس گھر کا رُخ کیا جہاں پر مجھ پر حملہ ہوا تھا۔ غلام رسول کا کہیں اَتا پتا نہیں تھا۔ گھر کے باہر تالا لگا ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ گھر کے رہائشی جا چکے تھے۔ مجھے بہرحال اس گھر پر نظر رکھنا تھی کیونکہ مجھے امید تھی کہ گھر والے واپس آئیں گے۔ میں گلی کے نکڑ پر کھڑا گھر پر نظر رکھ رہا تھا جب مجھے بیگم زینت ولایت حسین کی کال موصول ہوئی۔

”میر صاحب، امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ کیا آپ میرے گھر تشریف لا سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنا تھی۔“

میں جانا تو نہیں چاہتا تھا مگر مجبوری تھی۔ ہو سکتا ہے کوئی اہم خبر میری منتظر ہو۔ میں کچھ ہی دیر میں بیگم زینت ولایت حسین کے گھر کے باہر کھڑا تھا۔ اُن کے ملازم نے مجھے ان کے آراستہ پیراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا جہاں بیگم زینت ولایت حسین میری منتظر تھیں۔

”میر صاحب کیسے ہیں آپ؟ معذرت کہ میں نے آپ کو تنگ کیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے آج ہی یہ معلوم ہوا کہ چوہدری صاحب نے 50 کروڑ روپے کا بیمہ کروایا ہوا تھا جو ان کی موت پر ان کے ورثا کو ملنا ہے۔“

”50 کروڑ روپے کا بیمہ؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا کیونکہ یہ ایک بڑی رقم تھی اور اس رقم کے لیے کوئی بھی چوہدری ولایت حسین کا قتل کر سکتا تھا۔

”کیا آپ کے علاوہ بھی چوہدری صاحب کے کوئی ورثا ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میری ایک بیٹی ہے، بس۔“

”ان کے کوئی بھائی بہن نہیں تھے؟“

”نہیں۔“

”آپ کی بیٹی کیا کرتی ہیں؟“ میں نے ایسے ہی مروتاً پوچھ لیا۔

”اس نے انجینئرنگ کر رکھی ہے اور ملازمت تلاش کر رہی ہے۔“

”کیا چوہدری صاحب مطالعے کے بہت زیادہ شوقین تھے؟“ میرے ذہن میں اچانک یہ سوال آیا تو میں نے پوچھ لیا۔

”جی۔ کتابیں تو میری سوکن تھیں۔“

”وہ کتابیں خود خریدتے تھے یا آن لائن منگواتے تھے؟“

”آپ جانتے ہی ہیں میر صاحب کہ اُن کے پاس اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ وہ کتابیں خریدنے بک شاپ پر جا پاتے۔ وہ زیادہ تر آن لائن منگوا لیے کرتے تھے۔ کبھی کبھار بیٹی بھی اُن کے لیے کتابیں لے آتی تھی۔“

”آپ کبھی نہیں لائیں؟“ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

”مجھے زیادہ کتابیں پڑھنے کا شوق نہیں ہے۔ دونوں باپ بیٹی کو بہت شوق تھا۔ دونوں ایک طرح کی کتابیں ہی پڑھتے تھے تو بیٹی جب بک شاپ پر جاتی تو ان کے لیے بھی کتابیں لے آتی تھی۔“

میرے پاس اتفاق سے اُس نوجوان کی تصویر موجود تھی جس نے غلام رسول کے نام پر سم نکلوائی تھی تو وہ تصویر میں نے بیگم زینت ولایت حسین کے آگے کر دی مگر انہوں نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔

میں نے ان سے زہرہ سہگل کے بارے میں پوچھا تو وہ گویا ہوئیں،

”ہاں وہ پارٹی کی متحرک کارکن ہے مگر کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔ ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔ آپ کی اُن سے

Digest Novels .com

digest.library.com

کیسی سلام دعا ہے؟"

"وہ بیٹی کی اچھی دوست ہے مگر میری کوئی زیادہ سلام دعا نہیں۔"

ہم کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جس کے بعد میں نے ان سے اجازت چاہی اور واپس دفتر کا رُخ کیا۔ کوئی بات تو تھی جو میرے ذہن میں کھٹک رہی تھی مگر کیا، اس کا جواب مجھے فی الحال نہیں مل رہا تھا۔

مجھے اب شرٹ کے ذریعے اُس نوجوان تک پہنچنا تھا جس نے غلام رسول کے نام پر سم خریدی تھی۔ میں نے معلوم کیا تھا کہ پورے دارالحکومت میں ڈریگن والی شرٹ ایک ہی دکان والے امپورٹ کرتے تھے اور دارالحکومت کے علاوہ ملک بھر میں آن لائن بیچتے تھے۔ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ایک ہائی اینڈ فیشن برانڈ ہے تو ظاہر ہے کہ اس کے خریدار کوئی بہت زیادہ نہیں تھے۔

میں دکان پر گیا اور اس کے مالک سے اپنا تعارف کروایا تو مجھے یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ وہ میری خبروں اور مضامین کا باقاعدہ قاری تھا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں کس طرح شرلاک ہومز کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔ یہ اُن کی محبت تھی وگرنہ میں کہاں اور شرلاک ہومز جیسا لافانی کردار کہاں۔

میں نے جب ان کو وہ تصویر دکھائی تو وہ حیرانی سے گویا ہوئے۔

"یہ تو اپنا فواد ہے۔ یہ میرے دوست کا بیٹا ہے امریکا سے تعلیم حاصل کر کے کچھ ماہ قبل ہی واپس لوٹا ہے۔ یہ میری شاپ سے اکثر خریداری کرتا ہے۔ خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت ہی ہے۔ بس ایسے ہی پوچھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

یہ ایک اہم پیش رفت تھی اور اندھیرے میں چلایا تیر نشانے پر لگا تھا۔

"آپ کے پاس اس کا ایڈریس تو ہوگا؟" میں نے پوچھا۔ کیونکہ مجھے امید تھی کہ اس طریقے سے میں اُس تک پہنچ جاؤں گا۔

"ایڈریس تو مجھے یاد نہیں۔ شاید سیکٹر فائیو میں رہتا ہے۔ اس کا موبائل نمبر ہے میرے پاس۔" انہوں نے یہ کہا اور مجھے اس کا فون نمبر دے دیا۔

یہ تو ایک حقیقت ہے کہ شاطر سے شاطر مجرم بھی جرم کا نشان چھوڑ جاتا ہے اور اس پورے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ایک شرٹ کی وجہ سے مجھے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ میں مجرم کے قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ مجرم نہیں بھی تھا تو اس پوری واردات میں اس کا کوئی نہ کوئی اہم کردار ضرور تھا۔

میں شش و پنج میں مبتلا تھا کہ میں واپس دفتر جاؤں یا نہیں؟ میں دفتر واپس تو نہیں گیا بلکہ قریب ایک ڈھابے پر جا کر چائے منگوائی اور جمع تفریق کرنے لگا۔ مجھے غلام رسول سے کسی بھی طور رابطہ کرنا تھا اور اس گھر کے مکینوں کے بارے میں معلوم کرنا تھا اور ساتھ ہی اس فواد کی کنڈلی بھی نکالنی تھی جو اب میرے ریڈار پر آچکا تھا۔

میں نے فواد کے فون نمبر کی بنا پر اس کا پتا معلوم کر لیا تھا چنانچہ میں واپس دفتر جانے کے بجائے فواد کے گھر کی جانب چل دیا جو سیکٹر فائیو میں تھا۔ مجھے اس گھر پر نظر رکھنی تھی کیونکہ مجھے امید تھی کہ اس گھر سے کوئی اہم سراغ مل سکتا ہے۔ یہ بیس فٹ چوڑی اور نسبتاً سنسان گلی تھی۔ میں سہ پہر کو اس گلی میں پہنچا ہوں گا مگر مجھے کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ میں تین دن تواتر کے ساتھ گھر پر نظر رکھتا رہا اور بالآخر مجھے وہ نوجوان گھر میں جاتا دکھائی دیا۔ مجھے اب اُس کی ہر حرکت پر نظر رکھنا تھی۔ وہ کچھ لمحوں بعد گھر سے باہر نکلا تو میں نے اس کا تعاقب شروع کیا۔ وہ مرکزی شاہراہ سے گریز کرتا ہوا گلیوں سے ہوتا ہوا جا رہا تھا۔ میں اس کا تعاقب کر رہا تھا جب اس نے اچانک موٹر سائیکل کو بریک لگائی اور موٹر سائیکل موڑ کر تیز رفتاری سے میرے قریب سے نکل گیا۔ میں جتنی دیر میں گاڑی موڑتا، وہ میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

میرے سامنے اب واپس لوٹنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اب دوبارہ کچھ دن تو گھر نہیں آئے گا۔ میں دفتر واپس نہیں لوٹا بلکہ میں نے غلام رسول کا نمبر ملایا تاکہ یہ معلوم کرسکوں کہ اس کے مالک کہاں گئے ہیں۔ اس نے فون اٹینڈ کیا تو میں نے کھردرے لہجے میں اُس سے پوچھا۔

"تم کہاں ہو؟ تم ڈیوٹی پر نہیں آرہے؟"

"آپ کون بات کر رہے ہیں؟"

"میں پولیس انسپکٹر۔ کہاں ہو تم؟"

"صاحب جی آپ۔ میم صاحبہ نے مجھے ملازمت سے فارغ کر دیا ہے۔"

مگر کیوں؟" میں نے پوچھا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میری وجہ سے ایک غریب محنت کش ملازمت سے محروم ہو گیا تھا۔

"صاحب جی۔ وہ بات یہ ہے اُس دن آپ گھر اجازت کے بغیر آئے تو میم صاحبہ کو اس بات کا بہت غصہ تھا۔"

"تم نے اُن کو بتانا تھا کہ میں پولیس میں ہوں۔" میں

نے تلخ لہجے میں کہا تو وہ گویا ہوا۔

''صاحب جی۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میں کیا کہتا۔'' اس کی بات بھی درست تھی۔

''کچھ بتا سکتے ہو کہ تمہاری میم صاحبہ کہاں ملیں گی؟''

''نہیں صاحب جی۔ اُن سے میری.... دو تین بار ہی ملاقات ہوئی ہے۔ وہ زیادہ بات نہیں کرتیں۔''

''وہ اس دن وہاں ایک نوجوان تھا، وہ کون تھا؟''

''صاحب جی۔ معلوم نہیں۔''

''کیا اس کا نام جانتے ہو؟''

''نہیں، نام تو نہیں جانتا مگر اس کو پہلے بھی گھر آتے جاتے دیکھا ہے۔''

ایک نوجوان کے بارے میں تو معلوم ہو چکا تھا مگر دوسرے نوجوان کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی اب تک خاتون کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکا تھا۔

مجھے یہ تو یقین تھا کہ میں مجرموں کے قریب پہنچ چکا ہوں مگر اب تک مجھ پر موٹیو واضح ہو سکا تھا اور نہ ہی یہ کہ آیا یہ خاتون اور نوجوان صرف نائلہ جعفر کے قتل میں ملوث ہیں یا چوہدری ولایت حسین بھی انہی کی سازش کا شکار ہوئے تھے۔ زہر کے بارے میں معلوم تو ہو گیا تھا کہ ایک نوجوان نے یہ لیا تھا مگر اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔

میں نے اگلے دو تین دن نوجوان کے گھر پر نظر رکھی مگر اس بار میں گاڑی پر نہیں تھا بلکہ موٹر سائیکل پر تھا اور میرا اسسٹنٹ مجتبیٰ بھی میرے ساتھ تھا جبکہ میں نے اپنا حلیہ بھی تبدیل کر لیا تھا کیونکہ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ نوجوان کو یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اس کا تعاقب ہو رہا ہے، اس لیے وہ محتاط ہے۔ چوتھے دن مجھے وہ نوجوان دوبارہ نظر آیا۔ وہ گھر کے اندر گیا۔ اس بار میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا، کچھ دیر بعد وہ نوجوان واپس لوٹا، اس نے دائیں بائیں دیکھا، شاید یہ جائزہ لے رہا تھا کہ کوئی اُس پر نظر رکھے ہوئے تو نہیں ہے۔

میں نے مجتبیٰ کو اشارہ کر دیا چنانچہ ہم دونوں اُس کا تعاقب کر رہے تھے۔ میں دائیں جانب تھا اور مجتبیٰ مجھ سے کچھ فاصلے پر بائیں جانب تھا۔ اس بار وہ نوجوان کچھ دیر گلیوں میں گھومتا رہا مگر جب اس کو تسلی ہو گئی کہ اس کا کوئی پیچھا نہیں کر رہا تو اس نے موٹر سائیکل کو مرکزی شاہراہ پر موڑ دیا اور دس منٹ بعد وہ ایک پانچ ستارہ ہوٹل کی پارکنگ میں موٹر سائیکل لگا رہا تھا۔ میں اور مجتبیٰ دونوں اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہوٹل کی لابی میں گیا تو دو افراد اس کے منتظر تھے، میں ان دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایک وہ نوجوان تھا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور دوسری چوبیس پچیس سال کی خاتون۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے پہلے اس خاتون کو دیکھا ہو۔ پھر اچانک میرے دماغ نے کام کیا، یہ تو ہو بہو اپنی ماں کی کاپی تھی۔ جی ہاں، وہ چوہدری ولایت حسین کی اپنی بیٹی تھی۔

میں چونک گیا کیونکہ مجھ پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ اُس نے ہی اپنے باپ کا بھی قتل کیا ہے کیونکہ وہ ہی اپنے باپ کے لیے کتابیں خریدا کرتی تھی۔ میں غیر مسلح تھا اور نہ میرا یہ کام تھا کہ میں ان کے سامنے آ کر ان کو ہوشیار کرتا۔ میں نے مجتبیٰ کو ان پر نظر رکھنے کے لیے کہا اور خود ہوٹل کے باہر دارالحکومت کی پولیس کے سربراہ ملک دانش علی کو کال کرنے آ گیا۔ میں نے پوری تفصیل ان کے گوش گزار کی تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

رات دیر گئے پولیس اور خفیہ اداروں نے کارروائی کرتے ہوئے اس لڑکی اور ان دونوں نوجوانوں کو گرفتار کر لیا جس کے بعد لڑکی نے انکشاف کیا کہ اس نے ہی اپنے باپ کی کتاب پر زہر لگا کر ان کا قتل کیا تھا کیونکہ اُس کو شک تھا کہ اُس کے باپ کا نائلہ جعفر کے ساتھ افیئر چل رہا ہے اور نائلہ جعفر کو بھی اس نے اسی لیے مروایا تھا جبکہ روبینہ شاہین اس لیے ماری گئی کیونکہ اس کو اس پر شک ہو گیا تھا۔ فواد اور دوسرا لڑکا اس کے دوست تھے اور اُس کی دولت کے لالچ میں اُس کے ساتھ مل گئے تھے۔

بیگم زینت ولایت حسین کی بات درست ثابت ہوئی تھی کہ یہ قتل دولت یا پارٹی کے عہدے کے لیے نہیں بلکہ ذاتی رنجش کی وجہ سے ہوا تھا مگر وہ بے خبر تھی کہ یہ پوری سازش اس کی اپنی بیٹی نے رچائی تھی۔ خاتون کو بہت دن پہلے یہ شک ہو گیا تھا کہ اس کا پیچھا کیا جا رہا ہے تبھی اس نے مجھے گولیوں والا لفافہ بھیجا تھا تاکہ میں ڈر کر پیچھے ہٹ جاؤں مگر یہ چال اس کو ہی مہنگی پڑی تھی کیونکہ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں درست سمت میں جا رہا ہوں اور اب وہ قانون کی گرفت میں تھی۔

یہ میری زندگی کے چند مشکل ترین کیسز میں سے ایک تھا مگر میں خوش تھا کہ میں بالآخر سرخرو ہو گیا تھا۔ یہ خبر اگلے دن میرے نام سے شہ سرخیوں میں شائع ہوئی اور مجھے کئی روز تک دوستوں کی مبارک بادی فون کالز موصول ہوتی رہیں۔

❖❖❖

Digest Novels .com

وطن کی مٹی

محمد ذیشان اختر

انسانی زندگی دکھ درد سے خالی نہیں... یہ دکھ اور اضطراب زندگی میں ہلچل کی علامت ہیں... جو ارتعاش اور تحرک کا باعث بنتے ہیں... ایسے ہی دکھوں سے جڑی کہانی کے نشیب و فراز... 14 اگست 1947ء کو آزادی کی نوید ملی تھی... پاک و ہند کے بٹوارے میں کچھ علاقے ایسے بھی تھے جن کا الحاق برسوں گزر جانے کے باوجود نہ ہوسکا... جبکہ وہاں کے عوام کے دل پاکستان کے ساتھ دھڑکتے تھے... دو محبت کرنے والے محبت اور ایثار کے پرخار راستوں پر چلتے ہوئے اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرچکے تھے... مگر زمین کا فیصلہ ہنوز ہواؤں میں معلق تھا۔

جشنِ آزادی کے حوالے سے وطن کی مٹی کے متوالوں کا دل گداز فسانۂ محبت

ہاجرہ اور کیپٹن مرسل کا کیس کلوز کرنے سے پہلے مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ اسے کانفیڈنشل رکھوں۔ یہ آرڈر گپتا کی طرف سے آیا تھا۔ مجھے اس کمینے کی شکل سے ہی نفرت تھی مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ گپتا کے آرڈرز سے انکار کا مطلب تھا، اپنی ملازمت سے ہاتھ دھونا اور شاید زندگی سے بھی۔

مگر میں بھی ایڈونچر پسند ہوں۔ جس کام سے مجھے منع کیا جاتا ہے، اسے کرکے دکھاتا ہوں اور جب وہ کام کرلیتا ہوں تو پھر ایک کمیشن بیٹھتا ہے کہ یہ راز پریس والوں تک کیسے پہنچا۔ میرے ادارے کو اپنی خامیوں کا پتا چل جاتا ہے اور مجھے انعام بھی مل جاتا ہے۔

اسی لیے گپتا کے آرڈر ملنے کے باوجود میں نے ہاجرہ اور کیپٹن مرسل کا کیس سو فیصد نہیں تو پچاس فیصد اوپن تو پبلک کردیا۔

میں نے گپتا کے آرڈر موصول ہونے کے بعد پریس کے دو جانے مانے لوگوں کو چائے پر بلایا اور اس کیس کی فائل ایک نظر دکھادی۔ مجھے ان دونوں کی مہارت پر یقین تھا اور ویسا ہی ہوا۔ ان کی کیمرے سے بھی تیز نگاہوں نے کیس کی فائل کے اہم مندرجات کو محفوظ کرلیا اور تیس منٹ کے مختصر وقت میں ان ماہرین نے پورے کیس کو ازبر کرلیا۔ چند ماہ بعد ایک کور اسٹوری کی صورت دیش کے ایک نامور اخبار میں فٹ ہوگئی۔

مجھ پر انکوائری بھی بیٹھی مگر انکوائری کرنے والوں کو کوئی ثبوت نہ ملا کہ ہاجرہ اور کیپٹن مرسل کی اسٹوری کس طرح پریس تک پہنچی۔

اخبارات میں چھپنے والی اسٹوری نامکمل اور ادھوری تھی مگر جاسوسی ڈائجسٹ کے قارئین کے لیے میں اس کہانی کو اصل صورت میں پیش کررہا ہوں۔

☆☆☆

اس دلچسپ کہانی کا آغاز آج سے ستتر سال قبل ہوا تھا جب تقسیمِ ہند کا اعلان ہوچکا تھا لیکن بھیم پورہ کا فیصلہ ابھی باقی تھا۔

اس وقت بھیم پورہ ایک سرحدی گاؤں تھا اور بھیم راج اس گاؤں کا مالک، حاکم، سرپرست، باپو، ہمدرد اور نہ جانے کیا کیا تھا مگر بھیم راج کو فوج نے غدار قرار دے کر مار ڈالا۔ اس کی بیوی اور ایک سالہ بچی کو فوجی عدالت نے ستتر سال کی قید سنا دی۔

بھیم راج کی موت نے گاؤں میں آگ لگا دی اور معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید اُلجھنے لگا۔ کسی فوجی کارروائی سے پہلے کرنل نے خود گاؤں جانے کا فیصلہ کیا۔

ایک روز دوپہر کا وقت تھا۔ سورج نے زمین پر قہر برسایا ہوا تھا۔ فضا میں ایک بے یقینی کی سی کیفیت طاری تھی۔ درخت بالکل ساکت تھے، جیسے سانس روکے قدرت کے کسی فیصلے کے منتظر ہوں۔

گاؤں کے چبوترے پر، برگد کے درخت کے نیچے، پنچایت لگی ہوئی تھی۔ گاؤں کے معزز بوڑھے، کسان، نوجوان سب کے سب اکٹھے تھے۔ چھوٹے بچوں کو گھروں کے اندر بھیج دیا گیا تھا۔ کچھ عورتیں دوپٹے سروں پر لیے، دروازوں کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے دیواروں کے پیچھے چھپی نظریں بھی سوال پوچھ رہی ہوں۔

کسی نے آ کر خبر دی۔ ”کرنل آ رہا ہے۔“

فضا ایک دم بھاری ہو گئی۔ کچی گلی میں دھول اُڑنے لگی۔ دور سے فوجی گاڑیوں کی آوازیں آئیں اور تھوڑی ہی دیر بعد سب سے آگے والی گاڑی میں کرنل کی وردی میں ملبوس شخص گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو اور گاڑیاں بھی تھیں۔

گاؤں والوں کے چہروں پر اضطراب تھا۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنی لاٹھیوں اور بھالوں سے ان فوجی گاڑیوں پر ٹوٹ پڑیں۔ اگر کرنل نہ ہوتا تو شاید وہ ایسا کر بھی لیتے مگر یہ کرنل تھا جس کی شخصیت نے گاؤں والوں کو روک

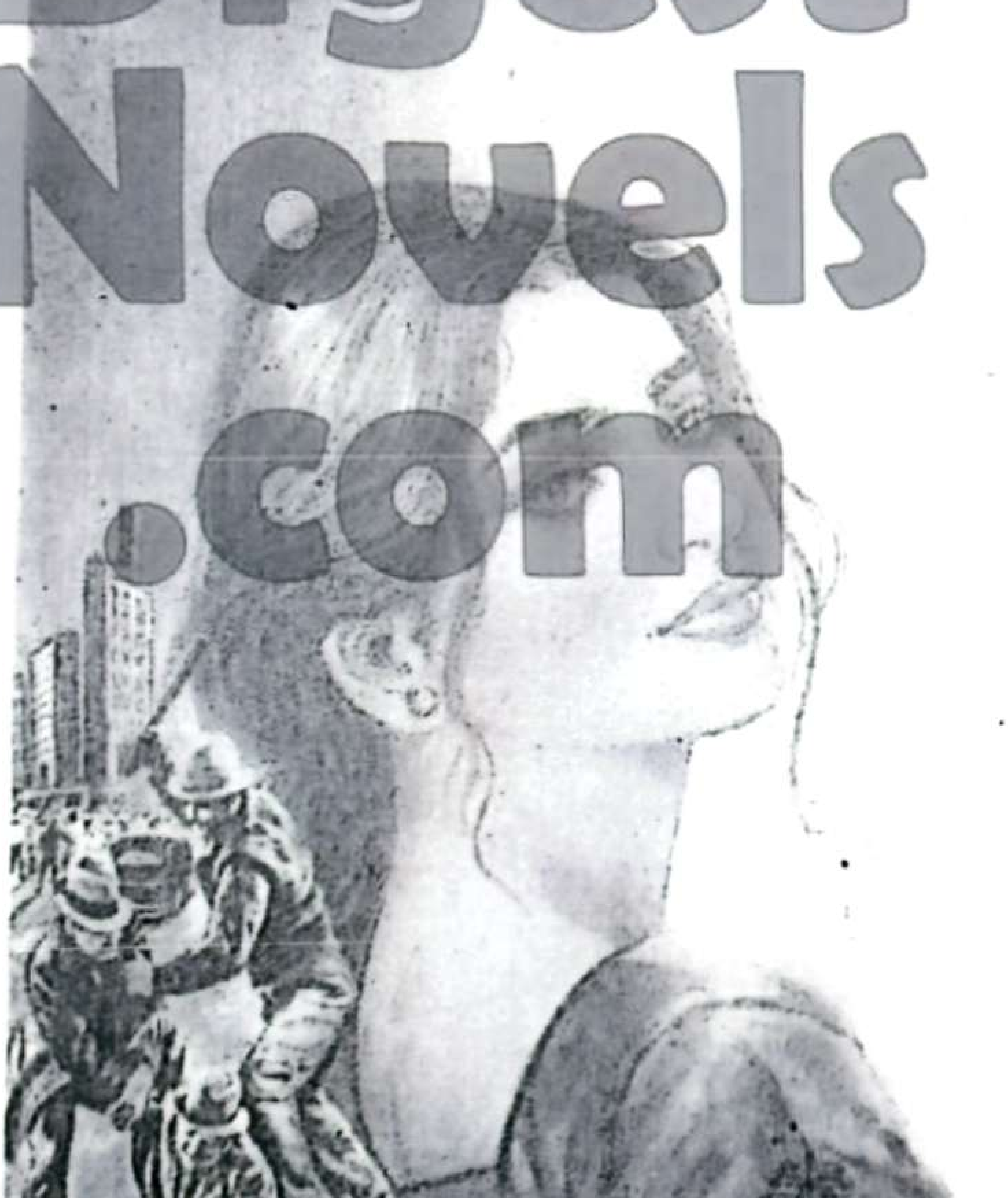

Digest Novels .com

رکھا تھا۔

مگر گاؤں والے اس بات سے بے خبر تھے کہ یہ وہی کرنل ہے جس کے حکم پر بھیم راج کو گولی ماردی گئی تھی۔

کرنل کی گاڑی جب پنچایت کے چبوترے کے پاس آکر رکی تو نہ کوئی نعرہ لگا، نہ کسی بچے نے تالیاں بجائیں۔ گاؤں والوں نے نظریں نیچی کرلیں۔ یہ خاموشی گویا نفرت سے لبریز احتجاج تھا۔

کرنل نے محسوس کیا کہ وہ غیر محفوظ ہے، مگر وہ چبوترے کی طرف بڑھا۔ سامنے ایک خالی اور آرام دہ کرسی رکھی گئی تھی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا، مگر اسے محسوس ہوا جیسے کرسی کی گدی بھی اس کے لیے نرم نہ تھی۔ ضمیر کی خلش نے اسے کانٹوں کا بستر بنادیا تھا۔

کرنل نے گلا کھنکھارا اور بولا۔ ”میں یہاں ایک اہم اعلان کے لیے آیا ہوں۔“

بوڑھا بابا غلام جو پنچایت کا بزرگ ترین رکن تھا، سرد لہجے میں بولا۔

”پہلے یہ بتاؤ، بھیم راج کے ساتھ انصاف ہوا یا ظلم؟“

کرنل نے آنکھیں چرا کر کہا۔ ”فوجی عدالت نے فیصلہ کیا تھا۔ اس میں میری مرضی شامل نہ تھی۔“

کرنل جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اسے فوجی درس گاہ میں جو سب سے پہلا درس دیا گیا تھا، وہ یہ تھا کہ سویلین سے جب بھی بولو، جھوٹ بولو۔ اسی میں تمہاری بقا ہے۔ اگر تم سچ بولنے لگے تو تمہارا کوئی راز، راز نہیں رہے گا۔ سویلین کے سامنے سچ بولنا، کمزوری کی علامت ہے، جھوٹ ہی تمہارا ہتھیار ہے۔

ایک نوجوان آگے بڑھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ کرنل سے بولا۔

”وہ تو ہمارا راجا تھا۔ ہم سب کی عزت۔ اس کی بیوی، معصوم بچی، ان دونوں کو تم نے قید کردیا۔ تمہاری عدالتوں کو شرم نہ آئی؟“

کرنل نے جواب دینے کی کوشش کی مگر ہر طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

”بھیم راج بے گناہ تھا!“

”ہم نے دیکھا تھا وہ کس قدر اپنے گاؤں سے محبت کرتا تھا!“

”اسے دشمن کہا گیا، لیکن دشمن تو وہ لوگ تھے جنہوں نے اُسے مارا!“

کرنل کے چہرے پر پسینہ آگیا۔ وہ جانتا تھا، اگر یہ لوگ بپھر گئے تو معاملہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ وہ یہاں فوجی ایکشن کے لیے نہیں آیا تھا۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

”سنیں سب لوگ!“ کرنل کی آواز میں وہ دبدبہ نہیں رہا تھا جو کبھی ہوتا تھا مگر پھر بھی اس نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

”فوج نے فیصلہ کیا ہے کہ گاؤں کی آئندہ حیثیت یعنی الحاق کا فیصلہ قانونی اور مذہبی اصولوں کے تحت کیا جائے گا۔“

ایک معمر شخص بولا۔ ”تم کیا سمجھتے ہو؟ فیصلہ اب کس کے ہاتھ میں ہے؟“

کرنل نے سادگی سے کہا۔ ”ظاہر ہے آپ لوگوں کے ہاتھ میں۔“

وہی معمر شخص بولا۔ ”تم سمجھ رہے ہو کہ بھیم راج تو چلا گیا جسے فیصلہ کرنا تھا۔ اب فیصلہ ہم لوگ کریں گے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔“

”تو پھر؟“ کرنل بولا۔

اسی معمر شخص نے کہا۔ ”قانون کے مطابق بھیم راج کے بعد گاؤں کی ملکیت ان کی بیوی کے پاس ہے۔“

اب فضا میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ عورتیں گھروں کے دروازوں سے باہر جھانکنے لگیں، مرد ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

کرنل کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس نے بات آگے بڑھائی اور بولا۔

”بھیم راج کی بیوی تو اب جیل میں ہے۔ وہ کیسے فیصلہ کرے گی کہ گاؤں بھارت کا حصہ بنے گا یا پاکستان کا۔ یہ حق اسے کس نے دیا؟“

”اسے یہ حق بھیم پورہ کے قانون اور مذہبی اصولوں نے دیا ہے۔“ معمر شخص نے بتایا۔

”بکواس۔“ کرنل کو یقین نہ آیا۔

ایک شخص آگے بڑھا۔ اس نے اپنے کندھے پر ایک چمڑے کا بیگ لٹکایا ہوا تھا۔ اس نے کرنل کو کچھ کاغذات اپنے چمڑے کے بیگ سے نکال کر دکھائے۔

کرنل جیسے جیسے کاغذات دیکھتا جارہا تھا، اس کے چہرے پر جیسے زلزلہ آرہا تھا۔

کاغذات کی رُو سے بھیم راج کی بیوی کو یہ قانونی حق حاصل تھا کہ وہ گاؤں کے مستقبل کا فیصلہ کرتی۔ بیوی کے مرنے کی صورت میں یہ حق اس کی بیٹی یا بیٹے کو مل جاتا۔

Digest Novels .com

''ایک بات بتائیں۔ اگر بھیم راج کی بیوی اسلام قبول کر لیتی ہے، تب بھی یہ حق اسے حاصل رہے گا کہ وہ الحاق کا فیصلہ کرے؟'' کرنل نے پوچھا۔
لوگ بڑبڑانے لگے۔ کوئی حیران، کوئی پریشان۔
''مگر وہ تو قید میں ہے!'' ایک نوجوان چلّایا۔
''مگر وہ تو......'' کرنل بولتے ہوئے رکا۔ اس کے چہرے پر تذبذب آیا۔ پھر بولا۔ ''اس نے تو اسلام قبول کر لیا ہے۔''
مجمع خاموش ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگا۔
اب کرنل نے چہرہ بابا غلامے کی طرف کر لیا جو پنچایت کا سربراہ تھا۔
غلامے نے اپنی سفید داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''بھیم راج کے مرتے ہی الحاق کا حق اس کی بیوی کو مل گیا۔ اس نے ستی ہونے کا فیصلہ نہیں کیا ورنہ یہ حق اس کی بیٹی کو مل جاتا۔ اب اگر اس نے اسلام اپنے شوہر کی موت کے بعد اختیار کیا ہے تو الحاق کا حق اسے پھر بھی حاصل ہوگا۔ چاہے اس نے غصے اور صدمے میں اسلام قبول کیا ہو یا اپنی خوشی سے۔''
کرنل کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ یہ سوچ کر آیا تھا کہ الحاق کا فیصلہ پنچایت کے پاس ہوگا۔ وہ فوجی کارروائی سے بچنا چاہتا تھا اور اپنی فوج کی بٹالین کو کسی اور محاذ پر لے جانا چاہتا تھا۔ اس نے تیزی سے کہا۔
''ہم بھیم راج کی بیوی اور اس کی بیٹی کو، جو صرف ایک برس کی ہے، زندہ رکھیں گے۔ جیل میں ماں کو قانونی طریقے سے رائے دینے کا حق دیا جاتا ہے۔''
ایک کسان نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مگر میں نے سنا ہے کہ یہ وہی ماں ہے جو روز جیل سے پاکستان کے حق میں نعرے لگاتی ہے؟ پھر وہ الحاق آپ کی مرضی سے کیوں کرے گی؟''
''ہاں۔'' کرنل نے کہا۔ ''اسی لیے میں آپ سب کو بتانے آیا ہوں کہ اگر یہ گاؤں پاکستان کا حصہ بنتا ہے تو بھارت کو بین الاقوامی سطح پر بہت نقصان ہوگا۔''
کچھ لمحوں کے لیے سکوت طاری رہا۔ تبھی ایک دراز قد نوجوان کھڑا ہوا، جس کے بازوؤں پر زخموں کے نشان تھے۔ وہ بھیم راج کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا تھا۔
''کرنل صاحب!'' وہ دھیمے مگر مضبوط لہجے میں بولا۔
''ہم بھیم راج کی بیوی کا مزاج جانتے ہیں۔ وہ کسی لالچ اور دباؤ میں نہیں آئے گی۔ نہ مال، نہ زمین۔ آپ نے اُس کے بے گناہ شوہر کو مار کر اچھا نہیں کیا۔ اب وہ جو آواز بلند کرے گی، ہم سب اس کے ساتھ ہوں گے۔ اب بات پاکستان یا بھارت کی نہیں رہی۔ اب بات گاؤں کے مظلوم سردار کی موت کی ہے۔''
کرنل کی آواز کسی حد تک کانپنے لگی۔ ''اور اگر اس نے پاکستان کا نام لیا، تو بھارت کے ہاتھوں سے یہ گاؤں نکل جائے گا اور میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔ میرا بھی سب کچھ......'' وہ آخری بات کہتے ہوئے چونک گیا۔ فوراً سنبھل کر بولا۔
''میرا مطلب ہے...... کہ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔''
غلامے کی آنکھوں میں چمک آئی۔ وہ دھیرے سے بولا۔ ''پھر فیصلہ ہم پر نہیں، انصاف پر چھوڑ دو۔''
کرنل کا چہرہ تاریک پڑ گیا۔ وہ اٹھا اور بولا۔ ''میں جلد دوبارہ آؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ بھیم راج کی بیوی پاکستان کے حق میں نعرہ لگانے کے بجائے بھارت کے حق میں فیصلہ کرے۔''
کرنل یہ کہہ کر واپس اپنی گاڑی کی طرف مڑ گیا۔
اس کے جاتے ہی مجمع سے ایک ہی نعرہ بلند ہوا۔
''بھیم راج زندہ تھا، زندہ رہے گا۔''
''ہم انصاف چاہتے ہیں۔''
یہ نعرے کافی دور تک کرنل کا پیچھا کرتے رہے۔

☆☆☆

کرنل درگا پرساد اپنے آفس میں چمڑے کی گہری کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں میز پر بکھرے نقشے، خفیہ رپورٹس اور پچاس سال پرانی زرد فائلوں پر مرکوز تھیں۔
ہوا بند تھی، پسینے کی ہلکی بوندیں اس کے ماتھے پر نمودار ہو رہی تھیں۔ ہر طرف خاموشی تھی مگر کرنل کا دماغ شور سے گونج رہا تھا۔ وہ بھیم راج کی موت کو یاد کر رہا تھا۔
بھیم راج گاؤں کا مالک تھا۔ پنچایت اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ نڈر، مخلص اور مذہبی ہم آہنگی کا علمبردار تھا۔ اس کی بیوی، نرملا، گاؤں کی مٹی سے جڑی، تعلیم یافتہ اور وفا... شعار عورت تھی۔ ایک روز کرنل کے پاس خبر آئی کہ بھیم راج ان لوگوں کی باتوں میں آ گیا ہے جو پاکستان سے ہمدردی رکھتے تھے اور اسی سے الحاق چاہتے تھے۔ کرنل کو یہ جان کر سخت غصہ آیا۔ اس نے آرڈر پڑھے۔ لکھا تھا۔
''بھیم راج کو فوری طور پر اس کی بیوی اور ایک سالہ بچی سمیت گرفتار کر کے رپورٹ دی جائے۔''

کرنل نے ایسا ہی کیا۔ بھیم راج اپنی بیوی اور بچی کو لے کر کسی کام سے گاؤں سے باہر جارہا تھا کہ کرنل نے اسے گرفتار کرلیا۔

فوجی عدالت نے بھیم راج کو غدار قرار دے کر اسی وقت فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کردیا۔ نرملا کو اس کی ننھی بچی سمیت قید کردیا گیا۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ نرملا سمجھ ہی نہ سکی کہ ہو کیا رہا تھا؟ صبح سویرے وہ بھیم راج کے ساتھ گاؤں سے نکلی تھی۔ جب سورج ڈھل رہا تھا تو وہ بیوہ ہوچکی تھی اور سلاخوں کے پیچھے قید تھی۔

چند ماہ گزرے۔ غم، نفرت اور تنہائی نے نرملا کو بدل دیا۔ اسے بھارتی فوجیوں سے نفرت ہونے لگی اور وہ اسلام اور پاکستان کو یاد کرنے لگی۔ ایک روز وہ بولی۔

''میرا بھیم راج مجھ سے چھن گیا۔ اب میں صرف فاطمہ ہوں۔''

اسے کلمہ آتا تھا۔ بچپن میں اس کے اسکول کی مسلمان بچیاں اور بچے کلمہ پڑھتے تھے۔ نرملا نے بھی کلمہ پڑھا اور خود ہی مسلمان ہوگئی۔ اس نے اپنا نام فاطمہ رکھ لیا اور اپنی بچی کا ہاجرہ۔

یہ سب اتنا غیر معمولی تھا کہ کرنل کو حیرانی ہوئی۔ اس نے گاؤں جاکر پنچایت سے بات کرنے کا فیصلہ کیا مگر پنچایت نے اسے بتایا کہ معاملہ ان کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اب صرف ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا فوجی کارروائی کا۔

فوجی کارروائی کا مطلب تھا کہ سپاہیوں کو وہاں بھیجنا اور سپاہیوں کے گاؤں میں داخل کرنے کا مطلب تھا کہ گاؤں کے ایک ایک چپے کی سپاہیوں کے مابین حصے داری۔

کرنل پورا مال اکیلے ہی ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اگر کسی طرح گاؤں والے بھارت سے الحاق کا فیصلہ کردیتے تو کرنل کو وعدے کے مطابق آدھا گاؤں مل جاتا اور بقیہ آدھا گاؤں سول حکومت کا ہوجاتا۔ لیکن اگر فوجی کارروائی ہوتی تو ہر سپاہی کو اس فوجی مہم کا معاوضہ ملتا۔ کسی کو گھر، کسی کو دکان، کسی کو زمین، کسی کو پانی۔ اسی سے بچنے کے لیے کرنل جنگ سے بچنا چاہتا تھا۔

کرنل یہی سب سوچ رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا۔

ایک کپتان اور دو سپاہی اندر داخل ہوئے۔ ان میں سے ایک نے فوجی انداز میں اسے سیلیوٹ کیا۔

''سر، بھیم راج کی بیوی اب تک بہت ناراض ہے۔ اس نے ایک درخواست لکھی ہے۔''

کرنل نے آنکھیں سکیڑ کر سوالیہ نظروں سے کپتان کو دیکھا۔ ''اب کیا ہوا؟'' کرنل نے پوچھا۔

کپتان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''سر، اُس نے جیل میں اسلام قبول کرلیا ہے اور خود کو فاطمہ کہنے لگی ہے۔ اب وہ کہتی ہے کہ اسے کچھ کتابیں فراہم کی جائیں۔ وہ بضد ہے کہ پاکستان ہی اس کا وطن ہے۔''

کرنل نے کرسی پر اپنی پوزیشن بدلی، ایک لمبا سانس لیا، پھر کرخت لہجے میں کہا۔ ''جانتا ہوں۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ خیر، پڑھو۔ کون سی کتابیں ہیں؟''

کپتان نے درخواست کھولی اور پڑھنے لگا۔ جیسے جیسے وہ کتابوں کے نام پڑھتا جارہا تھا، کرنل کا چہرہ غصے سے سرخ ہوتا جارہا تھا۔

''بکواس کرتی ہے۔ جیل میں بیٹھ کر سیاست کرے گی۔'' کرنل غصے سے لال بھبھوکا ہوگیا۔

''مگر سر، فوجی قانون کے تحت ہم اسے یہ کتابیں فراہم کرنے کے پابند ہیں۔'' کپتان بولا۔

کرنل سوچ میں پڑ گیا۔

''سر، کچھ لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اگر فاطمہ اور اس کی بچی کو اس کی مرضی کرنے دی جائے یعنی پاکستان بھیج دیا جائے تو پنچایت کو قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ پنچایت کچھ روز بعد خود ہی بھارت کے حق میں فیصلہ دے دے گی۔''

کرنل نے فوراً جوابی رائے کا اظہار کیا۔ ''مذہبی قانون کے مطابق بھیم پورہ کی وارث اس وقت وہ عورت ہے۔ وہ پاکستان کے ہاتھوں میں چلی گئی تو پاکستان کو دعویٰ کرنے کا موقع مل جائے گا۔''

یہ کہتے ہوئے کرنل نے اپنی انگلی میز پر زور زور سے مارنا شروع کردی۔ وہ اس کے سوچنے کا انداز تھا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ چکے تھے۔

''نہیں!'' کرنل دہاڑا۔

کپتان نے نظریں جھکالیں پھر آہستگی سے پوچھا۔ ''تو پھر، سر۔ اگر ہم حادثے کا انتظام کریں؟ جیسا کہ کچھ لوگ تجویز کر رہے ہیں۔ بھیم راج کی بیوی راستے میں حادثاتی طور پر مرجائے؟''

کرنل کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آواز زہر آلود ہو گئی۔ ''کپتان، کیا تم پاگل ہو؟ اگر فاطمہ اور اس کی بچی کو کچھ ہوا تو فوجی عدالت کا بنایا ہوا پھانسی کا پھندا ہوگا اور ہماری گردنیں ہوں گی۔ تم شاید بھول رہے ہو کہ وہ آرمی ایکٹ کے تحت ہماری ذمے داری ہے اور ہم جوابدہ ہیں۔''

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سپاہی نظریں جھکائے کھڑے تھے۔

کرنل نے دوبارہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”فاطمہ اور اس کی بچی، اب ہماری قیدی ہیں۔ ان کی حفاظت ہماری ذمّے داری ہے۔ ہم اسے ماریں گے نہیں۔ نہ جانے دیں گے۔ وقت کو اپنا کام کرنے دو۔“

”سر، مگر ہماری حکومت تو فیصلہ چاہتی ہے۔“ کپتان نے سوال کیا۔

کرنل نے کپتان کی بات سن کر قہقہہ لگایا اور بولا۔

”پنچایت کبھی بھی حتمی فیصلہ نہیں دے گی۔ سب ڈرے ہوئے ہیں اور فاطمہ کے منتظر ہیں اور جب تک وہ جیل میں ہے، وہ قانونی طور پر فیصلہ دینے کے قابل نہیں۔ گاؤں کی قسمت ایک ماں کے ہاتھ میں ہے اور وہ ماں ہماری قید میں ہے۔ بس، وقت گزرتا رہے۔“

”مگر سر۔ آپ جانتے ہیں کہ سپاہیوں کے دلوں میں بھیم پورہ گاؤں کی زمین پر گھر بنانے کی شدید خواہش ہے۔ وہ خوشی خوشی لڑلیں گے اور گاؤں پر قبضہ کرلیں گے۔ آپ کے آرڈر کے منتظر ہیں۔“ کپتان بولا۔

”میں اپنے سپاہیوں کے لیے اس سے بھی اچھی زمین کا بندوبست کرنا چاہ رہا ہوں۔ یہ جگہ ویسے بھی ہماری بٹالین سے چھننے والی ہے۔ دوسرے لوگ آنے والے ہیں۔ پھر یہاں کی زمین پر قبضہ کربھی لیا اور گھر بنا بھی لیے، تب بھی سپاہیوں کو یہاں سے جانا پڑے گا۔ یہاں دوسری بٹالین تعینات کرنے کی باتیں ہورہی ہیں۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ سپاہی اس گاؤں کا خیال دل سے نکال دیں۔ ویسے بھی انہیں دوسری بٹالین کے سپاہیوں کے مقابلے میں اچھی تنخواہ مل رہی ہے۔“ کرنل نے جواب دیا۔

کرنل جانتا تھا کہ چار ہزار سپاہیوں کا یہ گروہ جو اس کی نگرانی میں تھا، نہایت منظم گروہ تھا۔ اسے قابو میں رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ سپاہیوں کو دوسری زمین کا لالچ دیا جاتا۔ ورنہ اگر سارے سپاہی مل کر کرنل پر دباؤ ڈالتے تو کرنل گاؤں پر حملہ کرنے پر مجبور ہوجاتا۔ اس صورت میں کرنل کے ہاتھ سے گاؤں نکل جاتا اور چار ہزار سپاہی اس کی ملکیت میں حصے دار بن جاتے۔

یہ حصے داری کرنل کو منظور نہ تھی، اسی لیے وہ اپنی بٹالین کو جلد از جلد دوسری جگہ منتقل کرنا چاہتا تھا اور چاہتا تھا کہ کسی جھنجھٹ کے بغیر یہ گاؤں بھارت کے ساتھ مل جائے۔

کرنل کافی دیر خاموش رہا اور کچھ نہ بولا۔ یہ کپتان کے لیے اشارہ تھا کہ وہ کمرے سے نکل جائے۔

کپتان کچھ دیر کھڑا رہا، پھر سیلوٹ کرکے کمرے سے چلا گیا۔

☆☆☆

فاطمہ جب نرملا تھی، تو اس نے دلّی شہر جا کر ایف اے کیا تھا۔ بھیم راج کی ملاقات اس سے وہیں کالج کے کیفے ٹیریا میں ہوئی تھی۔ دونوں کی دوستی ہوئی، محبت ہوئی اور پھر شادی۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے جلسوں کے بعد دلّی میں کچھ ہنگامے ہوئے تو بھیم راج نے نرملا کو گاؤں بھیج دیا۔ وہ خود ابھی دلّی میں رہنا چاہتا تھا۔ اس نے نرملا کو بتایا کہ وہ مزید تعلیم جاری رکھنا چاہتا ہے، اسی لیے اس نے دلّی میں کچھ عرصہ رکنے کا فیصلہ کیا تھا۔

نرملا گاؤں چلی گئی۔ وہاں سے وہ بھیم راج کو خط لکھتی۔ بھیم راج بھی وقت پر جواب دیتا تھا تو کبھی تاخیر ہو جاتی۔

دو سال بعد بھیم راج تعلیم مکمل کر کے گاؤں مستقل واپس آ گیا اور اس کے باپ نے گاؤں کی ملکیت اور ساتھ ہی ساری ذمّے داری بھی بھیم راج کے سر ڈال دی۔

بھیم راج جلد ہی گاؤں والوں کے دلوں میں بس گیا۔ ہر سُو اس کے گن گائے جانے لگے۔

شادی کے پانچویں سال اس کی بیوی کی گود ہری ہو گئی۔ نرملا نے ایک پیاری سی بچی کو جنم دیا۔

ابھی وہ ایک سال کی تھی کہ تقسیم ہند کا فیصلہ ہو گیا اور بھیم راج پر دونوں طرف سے دباؤ پڑنے لگا۔ بھیم راج اکیلے کوئی فیصلہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ آس پاس کے گاؤں والوں کی پسند معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے نرملا سے کہا کہ وہ کچھ روز کے لیے آس پاس کے گاؤں جائے گا۔

بھیم راج واپس لوٹا تو نہایت پریشان تھا۔ نرملا نے کئی بار اس سے وجہ پوچھی مگر وہ ٹال گیا۔ ایک روز اچانک اس کے ابا چل بسے۔ ماں نے ستی ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ برٹش حکومت سے چھپ کر اس کی ماں ستی ہو گئی اور اپنے شوہر کے ساتھ ہی جل کر مر گئی۔ اگر حکومت کو پتا چل جاتا تو وہ اس کی ماں کو ستی ہونے اور چتا میں زندہ جلنے سے روک دیتے۔

ماں باپ کے اس طرح اچانک چلے جانے کے بعد بھیم راج شدید ذہنی اذیت میں آ گیا۔

ایک روز وہ نرملا اور اپنی ایک سالہ بچی کو لے کر کسی کام سے گاؤں سے باہر گیا۔ واپسی میں سپاہیوں نے اسے

Digest Novels .com

گھیر لیا اور ایک نامعلوم جگہ لے گئے۔ وہ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس کے اردگرد بہت سارے فوجی تھے۔

نرملا دیکھ رہی تھی کہ اس کے شوہر بھیم راج کو بھارتی فوجی تیسری منزل پر لے گئے اور تھوڑی دیر بعد اس کے سر پر کپڑا ڈال کر باہر لے آئے۔ نرملا اس بات سے ناواقف تھی کہ وہ بھیم راج ہی تھا۔

تھوڑی دور لے جا کر سپاہیوں نے اسے ایک درخت سے باندھ دیا اور تڑاتڑ گولیاں برسا دیں۔

نرملا نے اپنی آنکھوں سے یہ سارا منظر دیکھا تھا۔ اسے بہت افسوس ہوا کہ سپاہیوں نے نہ جانے کسے اس طرح بے رحمی سے مار ڈالا تھا۔ جب لاش پر سے کپڑا ہٹایا گیا تو وہ بھیم راج نکلا۔

نرملا چیخنے لگی اور بے ہوش ہوگئی۔

اسے ہوش آیا تو وہ ایک تاریک کمرے میں تھی۔ اس کی بچی اس کے پاس تھی اور چپ تھی۔

نرملا نے سب سے پہلے اپنی بچی کو سینے سے لگایا۔ بچی سو چکی تھی۔ ہلنے جلنے سے بیدار ہوگئی۔ نرملا نے فوراً اسے دودھ پلایا اور بھیم راج کو یاد کرنے لگی۔

بچی دودھ پینے کے بعد سو گئی۔ نرملا نے اسے ایک طرف لٹایا اور کمرے کا دروازہ بجانے لگی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

کئی گھنٹوں بعد دروازہ کھلا اور کچھ لوگ اندر آئے۔ ان میں عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی۔ سب نے سپاہیوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ انہوں نے نرملا کو بتایا کہ بھیم راج کو فوجی عدالت سے سزائے موت جبکہ اس کی بیوی اور بچی کو ستتر سال کی قید کی سزا ہوئی تھی۔

نرملا کا حلق خشک اور آواز بند ہو چکی تھی۔

اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکالا گیا اور اسے ایک فوجی گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔

نرملا نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ اس کی آدھی زندگی تو اسی وقت ختم ہو چکی تھی جب اس نے بھیم راج کی لاش دیکھی تھی۔ بقیہ آدھی زندگی باقی تھی کیوں کہ اس کی بچی ابھی زندہ تھی۔

نرملا کو ایک باقاعدہ جیل میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس نے جیل میں چپ سادھ لی تھی۔

اس جیل میں کچھ اور بھی عورتیں تھیں جن میں سے کچھ کے بچے بھی تھے۔ کوئی ایک سالہ، کوئی دو سالہ۔ کوئی مسلمان تھا تو کوئی ہندو۔

نرملا کا اب یہی خاندان تھا۔

☆☆☆

کوئی دو ماہ بعد نرملا نے اونچی آواز میں سپاہیوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ دو سپاہی جیل کے دروازے پر کان بند کیے کھڑے رہتے تھے۔ وہ نہ تو قیدی عورتوں اور ان کے بچوں کی طرف دیکھتے تھے اور نہ ہی منہ سے کچھ بولتے تھے۔ انہیں برداشت کرنے کی خاص تربیت دی گئی تھی۔

جیل میں قید مسلمان عورتوں نے جب نرملا کی یہ حالت دیکھی تو ان سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے نرملا کو تسلی دی اور اسے صبر کا مظاہرہ کرنے کا کہا۔ نرملا کی طبیعت میں آہستہ آہستہ سکون آنے لگا۔

تیسرا مہینہ شروع ہوا تو نرملا نے بلند آواز میں پکار کر اپنے مسلمان ہونے اور پاکستان سے محبت کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔ وہ پڑھی لکھی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ باہر کیا ہو رہا تھا۔ باہر ہندو مسلمان کا نہیں بلکہ بھارت اور پاکستان کا جھگڑا چل رہا تھا۔ بھارتی فوجیوں نے اس کے شوہر کو قصور بتائے بغیر مار ڈالا تھا۔ اس واقعے نے اس کے ذہن پر شدید منفی اثر ڈالا تھا۔ وہ پاکستان اور اسلام سے محبت کرنے لگی۔ شاید بھارتی سپاہیوں سے دشمنی میں۔

تیسرے مہینے فوجی عدالت کی طرف سے ایک عورت جیل میں ایک رسمی کام کے لیے آئی۔ اس نے سپاہیوں جیسا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات بھی تھے۔ اس نے قیدی عورتوں کو بتایا کہ وہ ایک ٹرم مکمل ہونے پر ان کے مسائل سننے آئی تھی کہ انہیں خوراک اور صحت کے حوالے سے کوئی تکلیف تو نہیں۔

نرملا نے اس عورت سے انگلش میں بات کی۔ وہ عورت حیران رہ گئی کہ جیل میں ایک تعلیم یافتہ عورت بھی قید تھی۔

اس نے رو رو کر اسے بھیم راج کی موت کے بارے میں بتایا مگر وہ عورت جو قیدی عورتوں کے تاثرات جاننے آئی تھی، وہ صحت اور صفائی کے علاوہ اور کوئی بات کرنے اور سننے کے لیے تیار نہ تھی۔ اسے کسی کے بھی شوہر، باپ یا بھائی کی موت کا قصہ سننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

نرملا کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے اس عورت سے کہا کہ کتابیں نہ پڑھنے کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت انتہائی خراب ہو چکی ہے۔ اس لیے اسے کتابیں، رجسٹر اور قلم، روشنائی مہیا کی جائے۔ ساتھ ہی اس نے اس عورت کو بتایا کہ وہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو چکی ہے اور اس نے اپنا نیا نام فاطمہ، جبکہ اپنی بچی کا نام ہاجرہ رکھا ہے۔

اس عورت نے نرملا کی بات نوٹ کی اور اس کی درخواست کیپٹن تک پہنچادی۔

کیپٹن نے فوراً کرنل کے علم میں یہ بات لائی کہ نرملا مسلمان ہوچکی ہے اور کچھ کتابیں مانگ رہی۔ اب اس کا نام فاطمہ ہے۔

☆☆☆

ایک سال بعد فاطمہ کو اس کی مطلوبہ کتابیں فراہم کر دی گئیں۔ ساتھ ہی لکھنے کا سامان بھی مہیا کر دیا گیا۔

فاطمہ نے سب سے پہلا خط بابا غلاے کو لکھا تھا اور اسے بتایا تھا کہ وہ جیل میں قید تھی۔ کیوں؟ اس بات کا علم خود فاطمہ کو بھی نہ تھا۔

فاطمہ نے جو کتابیں منگوائی تھیں، وہ زیادہ تر عالمی سیاست، جغرافیہ، تاریخ اور بین الاقوامی حالات سے متعلق تھیں۔

ہاجرہ بڑی ہورہی تھی۔ جیل کافی کشادہ تھی۔ ہاجرہ دوسرے بچوں کے ساتھ جیل ہی میں کھیلتی تھی۔

بچے بڑے ہوئے تو پہرے دار انہیں دیکھنے لگے۔

بچے انہیں مخاطب کرتے اور وہ سر گھما کر انہیں دیکھتے تھے۔ یہ وہ بچے تھے جو گیتا سے بھی واقف تھے اور قرآن سے بھی۔

انہیں اشلوک بھی یاد تھے اور آیات بھی۔ سب ایک ساتھ مل کر کھانا کھاتے تھے، پڑھتے تھے اور کھیلتے تھے۔

اس کے باوجود فاطمہ نے اپنی بیٹی ہاجرہ کے دل میں بھارتی فوج کے خلاف نفرت کا بیج بونا شروع کر دیا۔ اس نے اسے بتایا کہ کس طرح سپاہیوں نے اس کے باپ کو قتل کیا تھا اور آج تک اس کا قصور نہیں بتایا۔ ہاجرہ اپنی ماں کی سب باتیں سنتی اور جب بچوں کے ساتھ کھیلنے جاتی تو بچوں کے اس گروپ میں شامل ہوتی جو خود کو پاکستانی کہتا تھا۔

☆☆☆

ایک روز بچوں کا آپس میں جھگڑا ہوگیا۔ چھوٹی ہاجرہ نے ایک لڑکے کو دھکا دے کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا۔

اس کی ماں نے پوچھا۔ ”ہاجرہ، تم نے اس لڑکے کا سر کیوں پھاڑا؟“

ہاجرہ نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ”ماں‘ وہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنی ماں سے کہو کہ اپنے گاؤں کا بھارت میں شامل ہونے کا اعلان کردے۔ پاکستان میں نہیں۔“

فاطمہ سوچنے لگی کہ آج تک تو اس نے کسی کو نہیں بتایا کہ وہ بھیم پورہ گاؤں کی مالکن تھی اور اسی کے فیصلے کی پنچایت منتظر تھی۔ حالانکہ اس نے صاف صاف لکھ کر دے دیا تھا کہ وہ پاکستان سے الحاق کی خواہش مند تھی مگر بابا غلاے نے اسے لکھا تھا کہ اس بات کا اعلان کرنے کے لیے فاطمہ کا گاؤں کے چبوترے پر کھڑے ہو کر اعلان کرنا ضروری تھا۔ یہی مذہبی رسم تھی۔

اس کا مطلب تھا کہ اس کے لکھے ہوئے خط باقاعدہ پڑھے جاتے تھے اور جیل میں کوئی عورت اس بات سے واقف تھی کہ فاطمہ بھیم پورہ گاؤں کی مالکن تھی اور پنچایت اس کے فیصلے کی منتظر تھی۔ جبھی تو اس چھوٹے سے لڑکے نے ہاجرہ سے یہ بات کہی تھی کہ وہ اپنی ماں سے بات کرے اور بھارت میں گاؤں کو شامل کرنے کی بات کرے۔

مگر فاطمہ کی مجبوری یہ تھی کہ وہ جیل سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے بھی گاؤں نہیں جاسکتی تھی۔ اب ستر سال سے قبل وہ جیل سے باہر نکل ہی نہیں سکتی تھی۔

ستر سال تک وہ شاید ہی جی پاتی۔ اسے جب جیل میں ڈالا گیا تھا، تب وہ پچیس کی ہوچکی تھی۔ ستر سال بعد وہ ایک سو دو سال کی ہوجاتی۔ تب تک شاید ہی جی پاتی۔

مگر اسے یقین تھا کہ اس کی بیٹی ہاجرہ ضرور زندہ رہے گی اور بوڑھی ہی سہی، مگر ایک روز جیل سے باہر نکل کر اپنے گاؤں کا پاکستان سے الحاق کا اعلان کرے گی۔

اسی لیے وہ اپنی بیٹی ہاجرہ کے دل میں پاکستان سے محبت اور بھارت سے نفرت کا بیج بو رہی تھی۔ اس بیج نے اس روز اپنی کونپل دکھادی تھی جب ہاجرہ نے اس لڑکے کو دھکا دے کر اس کا سر پھاڑ دیا تھا جو پاکستان کے بجائے بھارت کی بات کر رہا تھا۔

☆☆☆

digest library.com

ایک روز فاطمہ نے فوجی عدالت کے لیے خط لکھا۔

”میری بیٹی کو پڑھایا جائے اور اسے اس کی عمر کے مطابق کتابیں فراہم کی جائیں۔“

اس خط کو کرنل کے پاس پہنچنے میں چھ ماہ لگ گئے۔

کرنل نے اسے فوراً بلوالیا اور پوچھا۔

”کیسی کتابیں؟ اور کس زبان میں؟“

یہ پہلا موقع تھا کہ کرنل نے فاطمہ سے بات کی تھی۔

”اردو میں اور میری بیٹی کو اسلام اور انگریزی کی تعلیم بھی دی جائے۔“

”اور یہ سب ہم کیوں کریں؟“ کرنل نے پوچھا۔

”تعلیم ہمارا حق ہے۔ آپ ہمارا سہاگ ضرور چھین سکتے ہیں، مگر ہم سے اور ہمارے بچوں سے تعلیم کا حق نہیں

Digest Novels .com

چھین سکتے۔"

☆☆☆

دو ماہ بعد جیل کی توسیع شروع ہوگئی۔جیل کے برابر میں ہی ایک کمرا تعمیر کیا جانے لگا جس کا ماحول جیل کے مقابلے میں کافی بہتر تھا۔وہ بچوں کے لیے تعلیم حاصل کرنے اور کتابیں حاصل کرنے کا کمرا تھا۔

کمرا تیار ہونے میں ایک سال بیت گیا۔یہ نہایت سست روی کا مظاہرہ تھا مگر فاطمہ خوش تھی کہ چلو سست رفتاری سے ہی سہی مگر ایک اسکول نما کمرا تو بن گیا۔

سارا سال بچے اس کمرے کو تعمیر ہوتا دیکھتے رہے۔وہ خوش تھے کہ انہیں جیل سے نکل کر ایک نئے کمرے میں جانے کا موقع ملے گا۔

کمرا تیار ہو گیا تو سارے بچوں کو وہاں بھیجا گیا۔ ہاجرہ بھی دیگر بچوں کے ساتھ وہاں گئی مگر تھوڑی ہی دیر بعد واپس آگئی۔

فاطمہ نے اس سے پوچھا۔

"کیا ہوا ہاجرہ؟ تم کیوں لوٹ آئیں؟"

ہاجرہ نے اسے بتایا کہ کمرے میں ایک استاد کو بھیجا گیا تھا۔اس کے ہاتھ میں پرانا سا ہندی قاعدہ تھا اور منہ میں پان۔اس نے بچوں کو ہندی کے حروف سکھانے شروع کیے۔ ہاجرہ نے فوراً اعتراض کیا۔

"یہ کیا ہے؟ یہ تو ہندی ہے۔"

استاد نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ جواب دیا۔"بھارت میں ہو، اردو کیسے چلے گی؟"

ہاجرہ چلی آئی۔

ہاجرہ کی ماں کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ بچوں کو صرف قوم پرستی کی تعلیم دی جارہی تھی۔اس نے فوجی عدالت کو خط لکھا، پھر کیپٹن کو درخواست بھیجی ......آخر بات کرنل تک جا پہنچی۔

☆☆☆

"اب کیا شکایت ہوگئی تمہیں؟" کرنل نے فاطمہ کو بلا کے اس سے پوچھا۔

"ہندی کا قاعدہ ایک سال سے بچوں کو پڑھایا جارہا ہے۔سارے بچے صرف اور صرف ہندی سیکھ رہے ہیں۔ جیل میں آتے ہیں تو کیا مسلمان اور کیا ہندو بچے، سب بھارت ماتا کی جے بولتے ہیں۔" فاطمہ نے بتایا۔

"ایک دو سال تک انہیں ہندی سکھائی جائے گی۔ جب وہ دس سال کے ہوجائیں گے، تب ہی انگریزی سکھائی جائے گی۔" کرنل نے اسے بتایا۔

فاطمہ سمجھ گئی کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا۔

"تو آپ کا منصوبہ یہ ہے کہ دو تین سالوں میں بچوں کی ذہن سازی کی جائے اور انہیں بھارت سے محبت اور پاکستان سے نفرت سکھائی جائے۔" فاطمہ نے پوچھا۔

"نفرت۔نہیں بالکل نہیں۔اب تم خود اپنے آپ کو ہی دیکھ لو۔کیا میں نے تم سے نفرت کی؟ تم نے جو کہا میں نے کیا۔کتابیں دلوائیں۔کمرا بنوایا۔شاید تم نہیں جانتیں کہ یہ سب کتنا مشکل کام ہے۔غداروں کے بیوی بچوں کو تو شوٹ کر دیا جاتا ہے مگر میں نے تم سب کو زندہ رکھا کہ شاید تم لوگوں کے بچے سدھر جائیں۔" کرنل نے کہا اور اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

"پھر بھی میں چاہوں گی کہ آپ میری بچی کو اسلام اور اردو کی تعلیم دیں۔" فاطمہ بولی۔

"میں تمہاری یہ بات بھی ماننے کو تیار ہوں۔نہ جانے کیوں تم سے انسیت سی ہونے لگی ہے۔یوں لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ غلط ہوا ہے۔" کرنل نے کہا۔

فاطمہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ کرنل پتا پھینک رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ کرنل اس کے بدن کو بھی نظروں سے ٹٹول رہا تھا۔خیر، اپنی عزت کی اسے بالکل پروا نہ تھی۔اتنی کتابیں پڑھ پڑھ کر اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ اگر کسی نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو خود مجرم کی گردن پھنس جائے گی۔فوجی عدالتوں کا انصاف بہت سخت تھا۔اپنے کسی بھی فیصلے کے خلاف ہونے والے عمل پر وہ سخت ایکشن لیتی تھیں۔

اس نے کرنل کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ رہی۔ایک چپ، سو سکھ۔کرنل بھی خاموش رہا۔

کچھ دیر بعد فاطمہ کو وہاں سے واپس جیل بھیج دیا گیا۔

☆☆☆

فاطمہ کے جانے کے دو روز بعد کرنل نے فاطمہ کا کیس کھولا اور اس پر اپنے کمنٹس لکھے۔

کرنل نے لکھا تھا۔

"قیدی نمبر 248، سابقہ نرملا، حالیہ فاطمہ، اپنی بیٹی ہاجرہ کو اردو زبان اور اسلامی تعلیم دینا چاہتی ہے۔"

یہ لکھنے کے بعد کرنل نے سگریٹ سلگایا اور کیپٹن کو بلوا لیا۔

کپتان آیا تو کرنل میز پر انگلیوں کی تھاپ دینے لگا۔

"یہ عورت آخر زندہ کیوں ہے؟ اور وہ بھی بغیر مرد

DigestNovels.com

کے۔"

"جنرل صاحب کا حکم ہے، سر۔" کیپٹن نے ادب سے کہا۔ "اگر یہ عورت مرگئی تو پاکستانی حکومت اس کیس کو عالمی عدالت میں لے جائے گی اور اگر یہ گاؤں......"

"مجھے یاد ہے۔ اگر یہ گاؤں پاکستان میں چلا گیا تو...... بھارت کو سفارتی نقصان ہوگا۔" کرنل نے کہا۔

اسے گاؤں کی وہ زمین یاد آنے لگی جو روز اس کے خوابوں میں آتی تھی، ہری بھری فصلوں والی، سونے جیسی زمین۔ اس سے وعدہ کیا گیا تھا۔

"اگر کرنل درگا پرساد یہ گاؤں بھارت میں شامل کرواتا ہے تو آدھی زمین اس کی ہوگی۔ صرف یہی نہیں، آس پاس کے جتنے بھی گاؤں بغیر فوجی مداخلت کے بھارت میں شامل ہوں گے، اس میں آدھا حصہ کرنل کو ملے گا۔"

کرنل اس بات کو اپنے نیچے کے عہدے والوں سے خفیہ رکھنا چاہتا تھا۔ اس نے سامنے بیٹھے ہوئے کپتان کی طرف دیکھا اور کہا۔

"یہ فائل اوپر لے جاؤ۔"

کپتان نے سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اور سیلوٹ کر کے چلا گیا۔

☆☆☆

اگلے ہفتے ایک نیا استاد آیا۔ صاف ستھرا لباس، داڑھی اور آنکھوں میں وقار۔

استاد کا نام تھا مولوی برکت۔ وہ خاص ہاجرہ کے لیے آیا تھا۔

اس نے آتے ہی قرآن کا پہلا سبق دیا اور پھر ہاجرہ سے پوچھا۔ "کیا تمہیں اردو آتی ہے؟"

ہاجرہ نے فخر سے جواب دیا۔ "جی ہاں۔ امی نے سکھائی ہے۔"

"تو کچھ لکھ کر دکھاؤ۔" استاد نے کہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ سات سالہ ہاجرہ کا معیار کیا تھا۔

ہاجرہ نے قلم اٹھایا اور خواجہ حیدر علی آتش کا ایک شعر لکھا۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

استاد صاحب حیران رہ گئے۔ انہوں نے پوچھا۔ "یہ کس نے تمہیں پڑھایا ہے؟"

ہاجرہ بولی۔ "میری ماں نے۔"

دو تین روز میں استاد صاحب کو اچھی طرح اندازہ گیا تھا کہ ہاجرہ کا ذہن اسلامی تعلیمات اور پاکستان کے متعلق سوچتا ہے۔ انہوں نے اسی طرح ہاجرہ کو پڑھانا شروع کر دیا۔

ایک ماہ بعد انہوں نے ایک کاغذ پر ہاجرہ کی کارکردگی لکھی اور اسے کہا کہ وہ اپنی ماں کو جا کر یہ کاغذ دے۔

مولوی برکت نے ہاجرہ کی تعریف سے کہیں زیادہ فاطمہ کی تعریف لکھی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک عظیم عورت ہے جو اس قدر محنت سے ہاجرہ کو پڑھا رہی تھی۔

مولوی برکت اور فاطمہ میں خطوط کا تبادلہ ہونے لگا۔ ہاجرہ ان کے خطوط ایک دوسرے تک پہنچاتی تھی۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں گھر بیٹھے حاصل کریں
جاسوسی، ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرسالانہ بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 3000 روپے
بیرون ممالک کے لیے زرسالانہ 50,000 روپے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں
رابطہ:
مرزا اثر عباس
0301-2454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی
مین کورنگی روڈ۔ کراچی

مولوی برکت دل پھینک آدمی تھا۔ وہ آہستہ آہستہ فاطمہ کو محبت اور عشق و عاشقی سمجھانے لگا۔ فاطمہ اسے جواب میں لکھتی کہ وہ صرف ہاجرہ کی تعلیم و تربیت پر توجہ دے۔

تین ماہ بعد جب ٹرم رپورٹ والی عورت آئی تو اس نے واپسی میں کرنل کو بتایا کہ جیل کے ساتھ والے کمرے کی تعمیر سے بچوں کی ذہنی صحت پر بہت اچھا اثر پڑا تھا۔

کرنل کو تجسس ہوا کہ وہ بھی اس کمرے کو جا کر دیکھے۔

کچھ روز بعد کرنل وہاں گیا تو بچوں کو پڑھتا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔

چھٹی ہوئی تو اس نے ہاجرہ کو بلایا۔

”یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟“ کرنل نے پوچھا۔

”خط ہے۔“ ہاجرہ نے جواب دیا۔

”کس کا؟“ کرنل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مولوی صاحب نے امی تک پہنچانے کا کہا ہے۔“ ہاجرہ بولی۔

کرنل چونک گیا۔ اس نے ہاجرہ کو جانے دیا لیکن اسی روز سے مولوی برکت علی کی نگرانی شروع کروادی۔

☆☆☆

تین روز بعد کرنل کو جب رپورٹ ملی تو وہ چلا اٹھا۔

”یہ کیا تماشا ہے؟ جیل میں پاکستان کی تعلیم؟ صرف اردو پڑھانے کی اجازت دی گئی تھی اور ارکان اسلام کی۔ بس۔ اور یہ عاشقی کب سے چل رہی ہے؟“

کپتان اس کے پاس ہی موجود تھا۔ کہنے لگا۔

”سر، فاطمہ کو زندہ رکھنا ضروری ہے کیا؟ اگر بیٹی کی ذہن سازی پر ہم توجہ دیں اور فاطمہ کو راستے سے ہٹا دیں تو؟“

کرنل کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ”ابھی نہیں۔ مولوی برکت کو پیش کرو۔“

تھوڑی دیر بعد مولوی برکت علی، کرنل کے سامنے موجود تھا۔ سپاہی اسے گھر سے اٹھا لائے تھے۔

کرنل نے مولوی برکت علی کو کرسی پر بٹھایا اور میٹھے لہجے میں کہنے لگا۔

”مولوی صاحب، بھیم پورہ گاؤں کی ملکیت اب ایک عورت کے ہاتھ میں آگئی ہے۔ ہاجرہ اسی کی بیٹی ہے۔ پنچایت اس کے اعلان کی منتظر تھی کہ بھیم پورہ پاکستان کا حصہ بنے گا یا بھارت کا، مگر اس سے پہلے کہ کوئی فیصلہ ہو، ہاجرہ کی ماں کو سزا ہوگئی۔ کیا نام تھا اُس کی ماں کا؟ میں بھولتا ہوں۔ کیا کریں مولوی صاحب۔ عمر ہی ایسی ہوگئی ہے میری۔ باتیں بھول جاتا ہوں۔“

”جی، اس کا نام فاطمہ ہے۔“ مولوی برکت علی فوراً بولا۔

”ہاں، آپ نے درست کہا۔ میں بھول گیا تھا۔“ کرنل نے کہا۔

مولوی برکت کے ایک جملے ”جی، اس کا نام فاطمہ ہے“ کے الفاظ اور لب و لہجے سے کرنل کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مولوی برکت، فاطمہ سے واقعی بیاہ کا خواہش مند تھا۔

”مولوی صاحب۔ فاطمہ نے کئی بار لکھ کر دیا ہے کہ پاکستان سے الحاق چاہتی ہے مگر رسم یہی ہے کہ گاؤں کے چبوترے پر کھڑے ہو کر اعلان کیا جائے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ اعلان کبھی نہ ہو۔ اس سے ہمیں نقصان ہوگا۔ اس سے پہلے کہ فاطمہ کو قتل کرنے کا حکم جاری ہو......“ اتنا کہہ کر کرنل چپ ہوگیا۔

”کک کیا؟ فاطمہ کو قتل کیا جا سکتا ہے؟“ مولوی برکت علی نے پوچھا۔

”جی ہاں۔ اسی لیے تو آپ کو بلوایا ہے کہ آپ اُس سے ملیں اور اسے سمجھائیں کہ وہ اپنے اس فیصلے سے باز آجائے۔ دیکھیں نا مولوی صاحب! اگر فاطمہ مر بھی جائے تو بغیر اعلان کے گاؤں بھارت کا حصہ رہے گا۔ کیونکہ ہم سب یہاں ہیں مگر فاطمہ کیوں ناحق مرے؟ اسے زندہ رہنے کا اور ایک نئی زندگی شروع کرنے کا حق حاصل ہے اور آپ اسے پسند بھی کرتے ہیں۔ تو کیوں نا ہم آپ دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھ دیں۔“ کرنل اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔

ابھی کچھ دیر پہلے کرنل نے فاطمہ کے قتل کی بات کر کے مولوی برکت کو شدید خوفزدہ کر دیا تھا اور اب فوراً ہی فاطمہ اور مولوی برکت کی بات کر کے اسے خوش کر دیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جب دو انتہاؤں کے درمیان مولوی برکت علی کا ذہن آئے گا تو وہ ضرور کوئی کام کی بات کرے گا۔

ایسا ہی ہوا۔ مولوی برکت علی نے کہا۔

”کرنل صاحب۔ فاطمہ اگر میرے نکاح میں آجائے تو اس کی بیٹی ہاجرہ کو میں ایک اچھے باپ کی طرح قبول کروں گا اور اس کی اچھی پرورش بھی کروں گا۔ اور ساتھ ہی میں آپ کے مقصد میں آپ کا ساتھ بھی دوں گا۔ اگر بھارت سے الحاق میں سب کا فائدہ ہے تو میں یہ بات فاطمہ کو سمجھاؤں گا۔ وہ زندہ دل اور باشعور لڑکی ہے۔ جیل کے اندر رہ کر اس کے اندر بھارت مخالف سیاسی نظریات پنپ رہے ہیں۔ ہاجرہ نے بھی بچوں کا ایک علیحدہ گروپ بنا لیا ہے جو خود

Digest Novels .com

کو پاکستانی گروپ کہتا ہے جبکہ دوسرا بھارتی گروپ ہے۔ یہ ختم ہونا چاہیے۔'' مولوی برکت بولا۔

''بہت خوب مولوی صاحب۔ آپ تو نہایت ذہین اور سمجھدار ہیں۔ آپ نے تو ہماری مشکل آسان کر دی۔ بس ہم آپ دونوں کی شادی کرواتے ہیں۔ ہماری طرف سے بات پکی۔'' کرنل نے کہا۔

مولوی برکت کا دل باغ باغ ہو گیا۔ وہ تصور میں فاطمہ کو دُلہن کے روپ میں دیکھ رہا تھا۔

''اور ہاں۔ اگر فاطمہ، میرا مطلب ہے بھابی جی، اگر شادی کے بعد بھارت سے الحاق کا اعلان کرتی ہیں تو ہم پوری کوشش کریں گے کہ سیکولر اسٹیٹ پورے گاؤں پر قبضہ نہ کرے بلکہ آدھا گاؤں مولوی برکت کی ملکیت میں ہو۔'' کرنل نے ایک اور آفر کی۔

مولوی برکت کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ وہ چند لمحوں میں اپنے تصور میں آدھے گاؤں کا مالک اور فاطمہ کا شوہر بن چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد چائے آ گئی۔ دونوں نے بیٹھ کر چائے پی اور پھر ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔

☆☆☆

ایک روز سبق پڑھتے پڑھتے ہاجرہ ایک مسلمان بچے پر چلّانے لگی۔

''بھارت ایک فریب ہے۔ دغا باز۔ دھوکے باز۔ تو مسلمان ہو کر بھارتی گروپ میں ہے نا۔''

وہ بچہ خاموش رہا۔

اسی وقت ہاجرہ نے کتاب بند کی اور آگے بڑھ کر اسے زور سے دھکا دیا۔ ''میری ماں کہتی ہے کہ پاکستان سچا وطن ہے۔ تم سب بھارتی جھوٹ بولتے ہو۔'' ہاجرہ زور زور سے پکارنے لگی۔

مولوی برکت نے اسی وقت ہاجرہ کے گال پر دو طمانچے جڑ دیے۔

ہاجرہ رونے لگی۔ اس کی آواز سن کر فاطمہ بے قرار ہو گئی۔ اس نے جیل کی سلاخوں کے پاس آ کر زور سے آواز دی۔

''مولوی صاحب! ہاجرہ کیوں رو رہی ہے؟''

فاطمہ کی آواز نہایت سُریلی تھی۔ مولوی برکت نے اس روز زندگی میں پہلی مرتبہ فاطمہ کی آواز سنی تھی۔ اس کا دل فاطمہ کے لیے اور بھی بے قرار ہو گیا۔

''کچھ نہیں۔ بس لڑائی جھگڑا کرنے پر ہلکی سی سزا دی

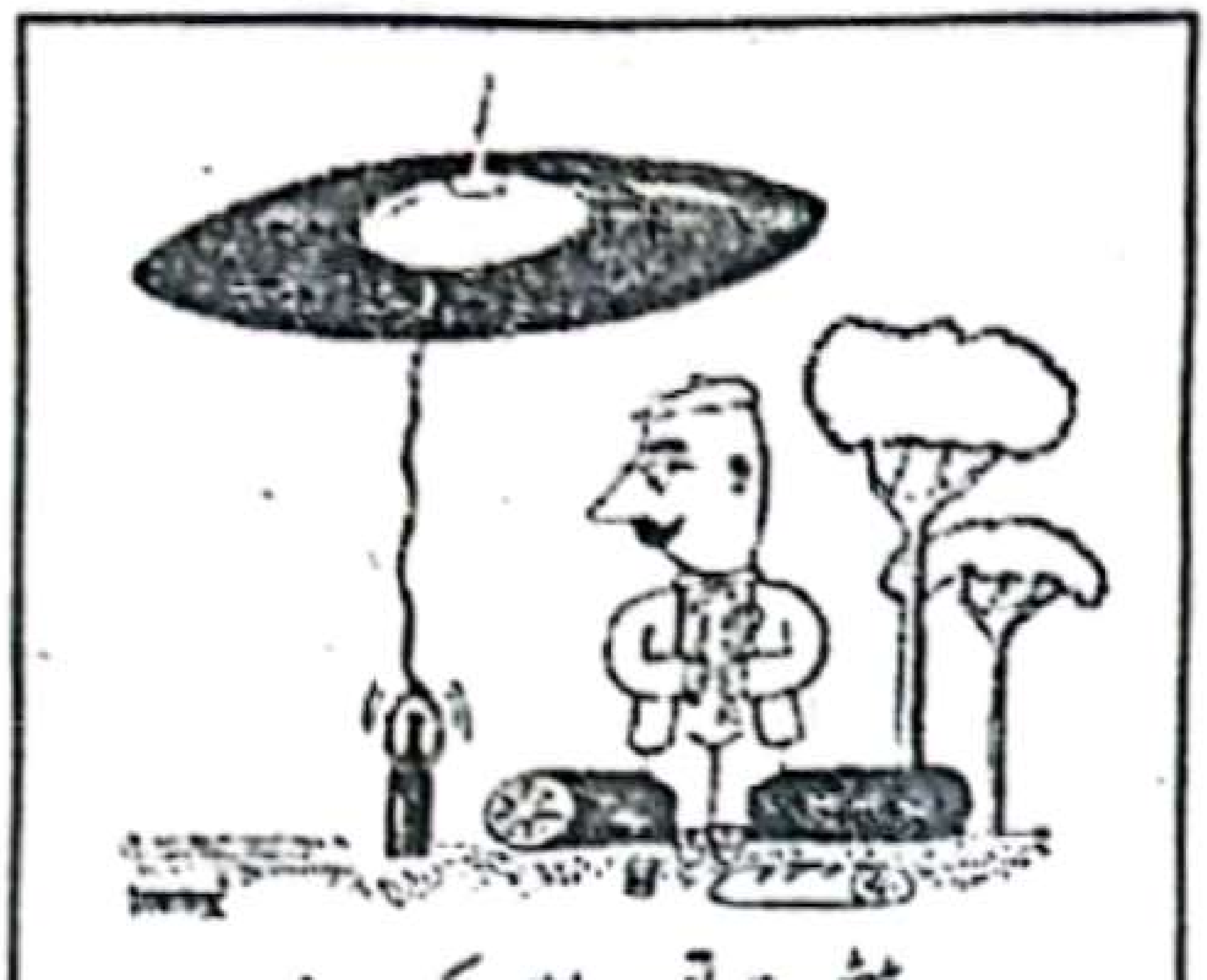

بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔'' مولوی برکت نے جواباً کہا۔

فاطمہ چپ ہو گئی۔

مولوی برکت نے ہاجرہ سے کہا۔

''بیٹی، آج سے تم میری بیٹی ہو۔ دیکھو بیٹی، اسلام ہمیں برداشت اور محبت کرنا سکھاتا ہے۔ تم محبت اور دوستی سے کام لو۔ دیکھو، میری اور تمہاری دوستی ہے نا؟''

''نہیں۔ آپ نے مجھے مارا ہے۔ آپ میرے دوست نہیں ہیں۔ اور آپ میری ماں کو غلط غلط باتیں لکھتے ہیں۔ آپ ان سے کہتے ہیں کہ آپ کو خوب سارے بچوں کی ضرورت ہے۔ اتنے سارے بچے تو ہیں یہاں پر۔ پھر آپ میری ماں کو ایسا کیوں لکھتے ہیں؟''

مولوی برکت کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

''تم......تم...... میرے خط پڑھتی ہو کیا؟'' مولوی برکت نے پوچھا۔

''ہاں۔ پڑھتی ہوں۔'' ہاجرہ نے معصومیت سے کہا۔

مولوی برکت چپ ہو گیا۔ اسے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔

☆☆☆

کرنل کے حکم پر فاطمہ کو اس بات کا پابند کیا گیا کہ وہ ہاجرہ کے ساتھ اس وقت موجود رہے جب وہ دوسرے کمرے میں پڑھ رہی ہو۔ اس طرح ہاجرہ دیگر بچوں کو نقصان نہیں پہنچا سکے گی اور فاطمہ اسے روکے گی۔

ہاجرہ کو یہ حکم نامہ ملا تو اس نے اس پر اپنے دستخط کر دیے۔

اس رات ہاجرہ سونے لگی تو فاطمہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور کہنے لگی۔

''ایک دن تو اس جیل سے نکلے گی۔ بوڑھی ہی سہی، مگر

Digest Novels .com

اپنے گاؤں کے چبوترے پر کھڑے ہو کر پاکستان سے الحاق کا اعلان کرے گی۔"

ہاجرہ نے نیند میں کہا۔ "ہاں، پاکستان سے الحاق کے بعد ہم دونوں پاکستان چلیں گے۔"

"ہاں بیٹی، ضرور چلیں گے مگر کاش تمہارے ابا بھی زندہ ہوتے۔"

فاطمہ کی آنکھ سے آنسو بہنے لگے۔

ہاجرہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سو چکی تھی۔

جس وقت فاطمہ اپنے شوہر بھیم راج کو یاد کر رہی تھی، اسی وقت کرنل کے دفتر میں پنچایت کا سربراہ بابا غلاے آیا ہوا تھا اور اس سے باتیں کر رہا تھا۔

"جناب، فاطمہ کو تھوڑی دیر کے لیے گاؤں آنے دیں۔ اس طرح تو نہ ہم بھارت کے رہیں گے اور نہ ہی پاکستان کے۔ گاؤں میں کوئی پولیس اسٹیشن نہیں رہا۔ سب یا تو پاکستان چلے گئے یا بھارت۔ چوری چکاری کافی بڑھ گئی ہے۔ پانی کا بھی مسئلہ ہو رہا ہے۔"

کرنل اس کی بات سنتا رہا اور بولا۔ "میں مسئلے حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ فاطمہ ابھی جیل میں ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ باہر نہیں آسکتی۔"

"تو پھر الیکشن کروا لیتے ہیں۔" بابا غلاے نے کہا۔

کرنل چیخ اٹھا۔ "نہیں، ابھی نہیں۔ مجھے وقت دو۔"

پھر اپنا لہجہ نرم کرتے ہوئے بولا۔

"فاطمہ کی طبیعت آج کل ٹھیک نہیں ہے، ایک دو قیدی بوڑھیوں کا انتقال بھی ہو گیا ہے۔ جیل میں کچھ معاملات سنجیدہ ہیں۔ تم بعد میں آنا۔ دو چار مہینوں بعد۔ میں تب تک تمہارا پانی کا مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر اپنے سپاہی نہیں بھیج سکتا۔ امن و امان کا مسئلہ تم لوگ خود ہی مل جل کر حل کرو۔ رات میں خود چوکیداری کرو۔"

بابا غلاے اس کی تقریر سن کر چلا گیا۔

کرنل کو بار بار ہاجرہ سے خطرہ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ ایک نظریہ تھی، ایک بیج تھی جو تناور درخت بننے جا رہا تھا۔

☆☆☆

کچھ روز بعد کرنل نے مولوی صاحب کو بلا کر پوچھا۔

"سنائیں مولوی صاحب۔ فاطمہ سے کیسی بات چیت چل رہی ہے؟"

مولوی برکت علی شرما گیا۔

"بھئی کوئی عشق معشوقی شروع ہونی چاہیے۔ جیل کی بوسیدہ فضا میں پھول کھلنے چاہئیں۔ ایسا کرتے ہیں کہ جس کمرے میں آپ ہاجرہ کو پڑھاتے ہیں، وہاں کچھ گلاب کے پھولوں کے گملے لگوا دیتے ہیں۔ ذرا ماحول اچھا ہو جائے گا۔" کرنل نے کہا۔

مولوی برکت ابھی بھی خاموشی سے مسکراتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ فاطمہ سے شادی کے بعد تو اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔

"مولوی صاحب، میں چاہتا ہوں کہ آپ ہاجرہ کی ذہن سازی کریں۔ اسے بھارت سے محبت کا درس دیں۔ دیکھیں نا، یہاں بھی تو لاکھوں مسلمان رہتے ہیں۔ مساجد ہیں مزارات ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے۔ آپ خود سمجھدار ہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں کہ آپ بچی ہاجرہ کو صرف اسلامی تعلیم نہ دیں۔ اسے دنیاوی تعلیم بھی دیں۔ دوسرے بچوں سے دوستی کرنا سکھائیں۔ پاکستان کے نام پر اور اسلام کے نام پر گروپ بندی ختم کرنے کی تعلیم دیں۔ مل جل کر رہیں تو اس میں سب کا فائدہ ہے۔ آپ کو فاطمہ مل جائے گی اور آدھا گاؤں بھی۔"

مولوی برکت علی نے کرنل کی بات سن کر سر ہلایا۔

اس روز کرنل نے مولوی برکت کے لیے چائے کے بجائے شراب منگائی۔ نہایت ہلکے نشے کی شراب تھی۔

مولوی برکت نے پوچھا۔ "یہ کیا ہے کرنل صاحب؟"

"یہ شربت ہے۔ آپ کو فولاد بنا دے گا۔" کرنل نے کہا۔

مولوی برکت انکار نہ کر سکا۔ وہ ایک ہی سانس میں پورا گلاس پی گیا۔

اگلے روز مولوی برکت نے ہاجرہ کو ہندی کے اشلوک پڑھانے کی کوشش کی۔

ہاجرہ نے کتاب بند کر دی اور بولی۔ "میں صرف اردو پڑھوں گی اور وہی پڑھوں گی جو میری ماں نے کہا ہے۔"

"اگر ہندی نہیں پڑھو گی تو ہندوؤں سے مقابلہ کیسے کرو گی؟ وہ آپس میں بات کر رہے ہوں گے اور تمہیں سمجھ ہی نہیں آئے گی؟"

یہ کہہ کر مولوی برکت نے ہاجرہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"ہاں۔ آپ کہہ تو ٹھیک رہے ہیں۔ ان سے مقابلہ کرنے کے لیے ان کی زبان آنی چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ آپ مجھے پڑھائیں۔" ہاجرہ نے کہا۔

مولوی برکت خوش ہو گیا۔ اس نے اس روز واپسی پر کرنل کو خبر دی کہ ہاجرہ نے آج ہندی اشلوک پڑھے تھے۔

کرنل نے مولوی برکت کو شاباش دی اور اسے جلد فاطمہ سے شادی اور شادی کے بعد آدھے گاؤں کی ملکیت کا یقین دلایا۔

کرنل اور مولوی برکت، دونوں ہی اپنی خواہشات کے بیچ پھنس چکے تھے۔ کرنل سوچ رہا تھا کہ ایک بچی جو ایک سال کی عمر میں جیل میں آئی تھی، وہ اس کے خوابوں کے لیے سب سے بڑا خطرہ بننے جارہی تھی۔

دوسری طرف فاطمہ ہر رات اپنے رب سے یہی دعا کرتی۔

''یارب! میری بیٹی کو زندہ رکھ، تاکہ وہ چبوترے پر کھڑے ہوکر پاکستان کے نام کا نعرہ لگا سکے۔''

☆☆☆

ایک روز کرنل نے کپتان کو بلایا اور پوچھا۔ ''کتنے سال کی ہوگئی ہے ہاجرہ؟''

''تیرہ سال کی، سر۔'' کپتان نے بتایا۔

کرنل نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔

''یہ تو شادی کے لائق عمر ہے۔ ایسا کرو۔ فاطمہ کو سوموار کو میرے پاس لاؤ۔'' کرنل بولا۔

کپتان سیلوٹ کرکے چلا گیا۔

پورے کیمپ میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ کرنل نے ہاجرہ کی شادی کے متعلق بات کی تھی۔ اڑتے اڑتے یہ بات کرنل کے کانوں تک پہنچ گئی۔

کرنل نے فوراً کپتان کو بلایا اور پوچھا۔

''یو، ایڈیٹ۔ میری اور تمہاری گفتگو باہر تک کیسے پہنچی؟''

کپتان کا سر شرم سے جھک گیا۔

''اوہ۔ تو یہ تم ہی ہو۔ جاہل۔ میٹنگ کی بات باہر کردی اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنا انجام نہیں سوچا۔'' کرنل غصے میں آگ بگولا ہورہا تھا۔

اس نے فوراً کپتان کا تبادلہ کردیا۔

نیا کپتان اس کی کنوئیر بیلٹ کے طور پر دو روز بعد پہنچنے والا تھا۔ اس کا نام تھا کیپٹن مرسل۔

اگلے روز اُس کے سامنے فاطمہ کو پیش کیا گیا۔

کرنل نے فاطمہ کو تنہائی میں بلایا تھا۔ سپاہیوں کو باہر بھیج دیا گیا۔ کمرے میں نیم اندھیرا تھا۔ کھڑکی کے پردے ہلکے ہلکے ہل رہے تھے، جیسے ہوا بھی کچھ کہنا چاہتی ہو۔

کرنل نے اپنی مخصوص سرد اور سیاسی لہجے میں بات کا آغاز کیا۔

''فاطمہ! تم سمجھ دار ہو، تعلیم یافتہ ہو اور سب سے بڑھ کر تمہارے ہاتھ میں ایک گاؤں کی تقدیر ہے۔ اگر تم چاہو تو سب کچھ ٹھیک ہوسکتا ہے۔''

کرنل کی آنکھوں میں کچھ ایسی بات تھی کہ فاطمہ کو اپنی نظریں نیچی رکھنی پڑیں مگر اس نے آواز میں لرزش نہ آنے دی اور کہا۔

''کرنل صاحب، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں، صاف بات کریں۔''

کرنل مسکرایا مگر وہ مسکراہٹ کسی سانپ کی زہریلی پھونک سے کم نہ تھی۔ وہ بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔ ہندو مذہب قبول کرلو۔ تمہیں اور تمہاری بیٹی کو مکمل تحفظ دیا جائے گا۔ میں تمہیں قید سے نکال دوں گا، تمہاری بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دلاؤں گا اور سب سے بڑھ کر، تمہارا گاؤں۔ وہ تمہارا ہی رہے گا مگر بھارت کے ساتھ۔''

فاطمہ نے اس وقت ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا، اس نے فوراً اور انتہائی اعتماد سے کہا۔ ''میں مسلمان ہوچکی ہوں۔ میرا دین، میرا عقیدہ، میری شناخت ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کرسکتی، نہ ہی اپنے ایمان کو چھوڑ سکتی ہوں۔ ہاں، اگر آپ سچے دل سے مسلمان ہوجائیں تو میں آپ سے شادی کے لیے تیار ہوں۔ میرا گاؤں کس کے ساتھ رہے گا، اس کا فیصلہ گاؤں والوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا خیال ہے کرنل صاحب؟''

کرنل کا چہرہ سخت ہوگیا، آنکھیں انگاروں کے مانند دہکنے لگیں۔ اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

''تو پھر تیار ہوجاؤ، میں تمہیں مجبور بنادوں گا اور پھر تمہاری بیٹی کو بھی۔''

اس دھمکی پر فاطمہ کا چہرہ زرد پڑ گیا مگر اس نے زبان سے کوئی احتجاج نہ کیا، بس اپنی آنکھوں میں بجھتے ہوئے اندیشوں کا عکس لے کر کمرے سے نکل آئی۔

digest library.com

☆☆☆

اسی روز فاطمہ نے مولوی برکت سے بات کی جب وہ ہاجرہ کو سبق دے کر اس سے باتیں کرنے لگا تھا۔ اس نے مولوی برکت سے کہا۔

''برکت صاحب، میں خطرے میں ہوں اور میری بیٹی بھی۔ میں ابھی نہیں بتاسکتی کہ کس سے خطرہ ہے، مگر آپ میری ایک مدد کریں۔''

مولوی برکت نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیسی مدد؟''

''کسی طرح ہاجرہ کو جیل سے باہر نکال لیں۔ اسے

اپنی بیٹی بنا کر رکھ لیں۔''

مولوی برکت دم بخود رہ گیا، چند لمحے خاموشی کے بعد اس نے سر ہلایا۔

''ٹھیک ہے۔ اگر تم بھی چاہتی ہو تو میں تیار ہوں مگر اس کے لیے تمہیں مجھ سے شادی کرنی ہوگی۔ میں تمہیں بھی اس جیل سے نکال لوں گا اور ہاجرہ کو بھی۔ ایک بہت اچھا اور نیک دل افسر میرا واقف کار ہے۔ اگر میں اس سے کہوں گا تو وہ انکار نہیں کر سکے گا۔''

فاطمہ نے سر جھکا لیا۔ یہ اُس کی جانب سے رضامندی کا اظہار تھا۔

فاطمہ صرف ہاجرہ کی وجہ سے خود کو مجبور سمجھنے لگی تھی۔ ہاجرہ تیرہ سال کی ہو چکی تھی اور اس نے اچھا قد نکال لیا تھا۔ کرنل کی اس دھمکی کے بعد کہ وہ اسے اور اس کی بیٹی دونوں کو مجبور بنا دے گا، وہ کسی غیبی مدد کی منتظر تھی۔ اسی لیے اس نے مولوی برکت کی بات کو مددِ غیبی سمجھا اور جب مولوی برکت نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔

مولوی برکت کا دل خوشی سے اُچھلنے لگا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے فاطمہ کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ بے اختیار اس کا ہاتھ چومنے لگا۔

''بس کریں برکت صاحب۔ ابھی نہیں۔'' فاطمہ نے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

''بس یوں سمجھو کہ اِدھر ہمارا نکاح ہوا اور اُدھر تم اور ہاجرہ قید سے رہا ہوئے۔ بہت اچھا دوست ہے میرا۔ میں تمہیں اس سے ملوانے بھی لے جاؤں گا۔'' مولوی برکت خوشی خوشی بتانے لگا۔

فاطمہ کچھ دیر بعد بولی۔ ''کون ہیں آپ کے دوست؟''

مولوی برکت جو مسلسل فاطمہ کا ہاتھ چومے جا رہا تھا، چونک پڑا اور کہنے لگا۔

''کیا کہا؟ میں ذرا مصروف تھا۔ سن نہ سکا۔''

فاطمہ نے اپنا سوال دہرایا۔

''کون ہیں آپ کے وہ اتنے اچھے دوست؟''

''کرنل درگا پرساد۔ وہ مجھ سے وعدہ کر چکا ہے کہ وہ تمہیں اور تمہاری بیٹی کو رہائی دلوا دے گا۔''

فاطمہ نے چونک کر مولوی برکت کی طرف دیکھا، جیسے ایک بجلی کی سی لہر اس کے دماغ کو سن کر کے چلی گئی ہو۔ اس نے کہا۔

''کیا؟ کرنل؟ تمہیں کرنل نے کہا؟''

مولوی نے بے خبری میں اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہاں، وہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہم دونوں نکاح کر لیں تو وہ ہماری مدد کرے گا اور مجھے آدھا گاؤں بھی دے گا۔'' مولوی برکت نے جوشِ محبت اور فرطِ مسرت میں بک دیا۔

فاطمہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ کرنل نے مولوی برکت کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سے..... نکاح کرا کے وہ اپنی چال پوری کرنا چاہتا تھا۔ گاؤں کے آدھے حصے والی بات کو کرنل نے مولوی برکت کو اپنے جال میں پھنسانے کے لیے استعمال کیا تھا۔

فاطمہ سمجھ گئی کہ یہ سب کرنل کی سازش تھی۔ اسے مولوی برکت پر گھن آنے لگی۔ مولوی برکت اس کا جو ہاتھ چوم رہا تھا، وہی ہاتھ چھڑا کر اس نے ایک زور کا طمانچہ مولوی برکت کے گال پر مارا۔

''تو تم کرنل کے آدمی ہو۔ بے غیرت۔ بے ایمان۔ لالچی۔''

مولوی برکت کو اس طرح کے ردِعمل کی توقع نہ تھی۔ فاطمہ کا طمانچہ کافی زوردار تھا۔ ہاجرہ ان دونوں کی طرف دیکھنے لگی۔

''کمینی۔ مجھ پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' مولوی برکت ایک دم سے چیخ اٹھا اور فاطمہ کا گلا دبانے لگا۔

مولوی برکت ابھی کچھ دیر قبل ہی کرنل کے دفتر سے ایک مشروب پی کر آیا تھا۔ اس مشروب کی خاص بات یہ تھی کہ وہ کچھ دیر بعد مستی کی کیفیت لاتا تھا اور اس کے بعد شدید غصے کی کیفیت۔ کرنل کے پاس اس قسم کے دسیوں مشروبات تھے جو مختلف کیفیات ابھارنے کے لیے تیار کیے گئے تھے۔

فاطمہ کا آخری وقت آن پہنچا تھا۔ مولوی برکت پاگل ہو چکا تھا۔ فاطمہ کے ہاتھوں کو چومتے وقت اس پر مستی کی کیفیت چھانے لگی تھی لیکن فاطمہ کے طمانچے کے بعد اس کے اندر شدید غصہ پیدا ہو گیا تھا اور وہ آپے سے باہر ہونے لگا تھا۔ اسی کیفیت میں اسے جو خیال آیا، وہ شدید ہو گیا۔

فاطمہ نے دل میں فیصلہ کیا تھا کہ وہ خود کو اور اپنی بیٹی کو مولوی برکت سے بھی دور رکھے گی، کیونکہ اب اس پر بھی اعتبار ممکن نہیں رہا تھا مگر مولوی برکت اس سے پہلے ہی اس کا گلا دبانے لگا۔

ہاجرہ یہ سب دیکھ کر آگے آئی اور اس نے اپنی ماں کو بچانے کی کوشش کی۔ اتنے میں وہ دو سپاہی جو دروازے پر تعینات تھے، ہاجرہ کے قریب آئے۔ ایک نے اس کے بال

پکڑ لیے اور منہ دبا دیا۔ جبکہ دوسرے نے اسے پیچھے سے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

ان سپاہیوں کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ ہاجرہ ہل بھی نہ سکی۔ وہ صرف اتنا محسوس کر رہی تھی کہ اسے بے بس کر دیا گیا ہے اور وہ منہ سے کوئی آواز بھی نہیں نکال سکتی تھی۔

ہاں البتہ وہ سن ضرور سکتی تھی۔ مولوی برکت کی آواز گونج رہی تھی جو فاطمہ کا گلا دباتے ہوئے اس پر چلا رہا تھا۔

مگر فاطمہ تو کب کی اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔

اپنی ماں کو مرتا دیکھ کر ہاجرہ بے ہوش ہو گئی۔ مولوی برکت بھی نڈھال ہو کر پاس ہی گر گیا اور لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ سپاہیوں نے اسے فوراً گرفتار کر لیا۔

☆☆☆

گرد آلود ہوا میں سورج کی تپش مدھم پڑ رہی تھی۔ قلعے کی پرانی دیواروں پر شام کی پرچھائیاں رینگنے لگی تھیں۔ یہ چھوٹا سا قلعہ جو پہاڑی مقام پر واقع تھا، یہ وہ جیل تھی جہاں کچھ ماہ قبل فاطمہ کا جنازہ نکلا تھا اور اس کی لاش کو خاموشی سے دفن کر دیا گیا تھا۔

جیل کا دروازہ خستہ مگر مضبوط تھا، جس کے دونوں جانب دو محافظ پہرا دے رہے تھے۔ ان کی وردیاں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ تھکن کے باوجود وہ چوکس تھے۔

دور سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ دونوں سپاہی چونک کر سیدھے کھڑے ہو گئے۔

”کون ہو سکتا ہے اس وقت؟“ ایک نے سرگوشی کی۔

دھول کی لہر کے اندر سے ایک سیاہ کوٹ پہنے، کشادہ سینے والا جوان مرد ظاہر ہوا۔ اس کے چہرے پر سختی اور آنکھوں میں فیصلہ تھا۔

”کیپٹن مرسل!“ دوسرا محافظ زیر لب بولا۔

کیپٹن نے گھوڑا روکا۔ اس کی نگاہ سیدھی جیل کے دروازے پر جمی ہوئی تھی، جیسے اندر چھپی کسی حقیقت کو وہ پار کر کے دیکھنا چاہتا ہو۔

”دروازہ کھولو۔ مجھے چارج لینا ہے۔“ اس نے خشک لہجے میں کہا۔

محافظوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر دروازے کی زنجیر ہٹائی۔

جیل کے اندر کی تاریکی میں ایک نئی کہانی چھپی تھی، جسے کیپٹن مرسل اپنے قدموں کے ساتھ جگانے آ رہا تھا۔

☆☆☆

کیپٹن مرسل نے جیل کا چارج سنبھالتے ہی سب سے پہلے کچھ ماہ پرانا، مگر دردناک کیس فائل سے نکالا۔ فاطمہ قتل کیس۔

کیس کے ابتدائی کاغذات خون آلود سچ کی گواہی دے رہے تھے۔ خبر تھی کہ فاطمہ نامی ایک قیدی عورت کو اس کی کم سن بیٹی کے استاد نے گلا گھونٹ کر قتل کر دیا۔ کیپٹن مرسل نے فائل پڑھنے کے بعد اندازہ لگایا کہ اس قتل کی خبر کو فائل میں لگا کر بس کسی طرح دبانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس نے کرنل سے بات کی۔ کرنل نے معاملہ کیپٹن مرسل کے حوالے کر کے وقتی طور پر خود کو الگ کر لیا اور دلی شہر کسی خفیہ اجلاس میں شرکت کا بہانہ بنا کر چلا گیا۔

کیپٹن مرسل نے جیل کے محافظوں اور اس دن کی ڈیوٹی پر موجود عملے سے فرداً فرداً پوچھ گچھ شروع کی۔ ہر سوال کی تہ میں اسے ایک نیا جھوٹ چھپا ملا۔ فاطمہ کے ساتھ جیل میں کیا سلوک ہوتا رہا؟ اس کا جرم کیا تھا؟ اور کیوں ایک استاد کو اس کے قریب لایا گیا؟ یہ سب سوال کیپٹن کے دماغ میں دہکنے لگے۔

وہ کئی راتیں دیر تک کیس فائل کا مطالعہ کرتا رہا۔ اسے پتا چلا کہ فاطمہ نے جیل میں اسلام قبول کیا تھا اور اس کی بیٹی ہاجرہ دینی تعلیم کے لیے ایک مولوی کے سپرد کی گئی تھی۔

کیپٹن مرسل نے جیل کے محافظوں سے جو بیانات لیے تھے، ان سے ثابت ہوتا تھا کہ مولوی برکت کا کرنل سے ملنا جلنا تھا۔ رپورٹ میں لکھا تھا کہ مولوی کی نیت میں کھوٹ تھا۔

فاطمہ کا یہ جملہ جیل کے ایک محافظ کے بیان میں قلم بند تھا۔

”مولوی برکت! میں اپنی بیٹی کو تم جیسے شخص کے حوالے نہیں کروں گی۔“

اس محافظ کے بیان کے مطابق مولوی برکت نے اگلے روز فاطمہ کو گلا دبا کر مار ڈالا تھا۔

رپورٹ میں ”اقدام قتل“ کا لفظ لکھا گیا تھا اور مولوی برکت نے اپنا جرم قبول بھی کر لیا تھا۔ مولوی برکت کو سزائے موت سنا دی گئی تھی اور اس کی لاش دفن کی جا چکی تھی۔

ایک لحاظ سے کیس ختم ہو چکا تھا۔ لیکن کیپٹن مرسل کو اس کیس میں بہت سے پہلو الجھے ہوئے معلوم ہوئے تھے۔

دو اہم پہلو تھے جن پر کیپٹن مرسل کو حیرانی تھی۔ اول یہ کہ مولوی برکت نے فاطمہ کا گلا دبایا لیکن فاطمہ نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور نہ ہی اس کمرے کے باہر کھڑے محافظوں نے کچھ دیکھا۔ جب محافظ اندر پہنچے تو فاطمہ مر چکی

Digest Novels .com

تھی اور مولوی برکت ڈر کے مارے ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا۔ دوم یہ کہ اس قتل سے صرف ایک روز قبل کرنل نے پرانے کیپٹن کا تبادلہ کر دیا تھا۔

کیپٹن مرسل کی آنکھوں میں اب صرف ایک مقصد تھا۔ اس سارے جرم کے پیچھے کسی سازش کا سراغ لگانا۔ اس نے جیل کے ایک ایک عملے سے انٹرویو کرنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے جیل میں تعینات سپاہیوں کے روز و شب اور معمولات پر نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ اس کی دیانت داری دشمنوں کو کھٹکنے لگی تھی۔ جیل میں موجود کچھ اہلکار اس کے خلاف خفیہ محاذ بنانے لگے، مگر وہ جانتا تھا کہ سچ وہ پتھر ہے جسے جتنا دبایا جائے، وہ اتنی ہی شدت سے ابھرتا ہے۔

کیپٹن مرسل نے سب سے پہلے ان سپاہیوں کا بیان لیا جنہوں نے مولوی برکت کو گرفتار کیا تھا۔

☆☆☆

کرنل ابھی تک دلّی شہر سے نہیں لوٹا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں کیپٹن مرسل ہی جیل کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

اس نے ان دونوں محافظوں کو اپنے پاس بلایا جو فاطمہ کی موت کے وقت قتل کے کمرے کے باہر ڈیوٹی دے رہے تھے۔

کیپٹن مرسل نے ایک محافظ سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ مولوی برکت، فاطمہ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ تم کیا کہتے ہو؟"

پہلا محافظ کچھ دیر خاموش رہا۔ جیسے ماضی کے پردے میں چھپی کوئی حقیقت اس کے ہونٹوں تک آ تو رہی ہو مگر خوف اسے روک رہا ہو۔

کیپٹن مرسل نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور نرمی سے کہا۔

"یہ وقت سچ چھپانے کا نہیں ہے۔ تم جو بھی جانتے ہو، مجھے صاف صاف بتاؤ۔"

پہلے محافظ نے گہرا سانس لیا، پھر تھکی آواز میں بولا۔

"صاحب، میں اُس روز ڈیوٹی پر نہیں تھا جب فاطمہ کا قتل ہوا۔ میری اور اس دوسرے محافظ کی ڈیوٹی ایک روز کے لیے تبدیل ہوئی تھی۔ اسی روز یہ واقعہ ہوا تھا۔ لیکن اس سے پہلے مجھے مولوی برکت کی نیت میں کوئی خاص کھوٹ معلوم نہیں ہوا تھا۔ وہ اصل میں فاطمہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ شادی تک بات پہنچ گئی تھی مگر میں نے کئی بار دیکھا کہ فاطمہ تنہائی میں دعا کرتی تھی۔ شاید اس پر کوئی دباؤ تھا۔"

کیپٹن مرسل نے کاغذ پر نوٹ لیتے ہوئے پوچھا۔

"اور ہاجرہ؟ مولوی کا اس سے رویّہ کیسا تھا؟"

پہلا محافظ بولا۔ "صاحب، ہاجرہ ہمارے سامنے ایک سال سے تیرہ سال کی ہوئی ہے۔ بڑی پیاری بچی ہے۔ وہ مولوی برکت کو بطور استاد پسند کرتی تھی۔ مولوی اسے پیار سے پڑھاتا تھا۔ مگر پتا نہیں ایک مرتبہ وہ اس سے سختی سے پیش آیا۔ مگر پھر سب ٹھیک ہو گیا۔ قتل سے ایک دن پہلے تک مولوی برکت اور فاطمہ کے درمیان تلخ کلامی تو دور کی بات اونچی آواز میں کبھی بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی بڑی عزت کرتے تھے۔ فاطمہ بھی مولوی برکت کی بڑی عزت کرتی تھی۔"

مرسل نے چونک کر پوچھا۔

"مگر فائل میں تو کسی محافظ کا بیان لکھا ہوا ہے کہ فاطمہ نے مولوی برکت سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی ہاجرہ کی شادی مولوی برکت سے نہیں کرے گی۔ یہ کیا قصہ ہے؟"

محافظ نے نظریں چُرا کر کہا۔ "صاحب، یہ رپورٹ جھوٹی ہے۔ وہ دو محافظ جو اس روز قتل کے کمرے کے باہر تعینات تھے، یہ اُن کا بیان ہے۔ میں نے انہیں آج تک نہیں دیکھا۔ نہ اس واقعے کے بعد اور نہ ہی اس واقعے سے پہلے۔"

مرسل حیران رہ گیا۔ اس نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ۔ تمہیں کیسے علم ہوا کہ مولوی برکت، فاطمہ سے شادی کرنا چاہتا تھا؟"

"ایک مرتبہ اس کی بیٹی ہاجرہ نے زور زور سے کہا تھا کہ مولوی برکت اس کی ماں کو خط لکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سپاہیوں کے درمیان باتیں ہونے لگی تھیں کہ جس کمرے میں مولوی برکت، ہاجرہ کو پڑھاتا ہے، اس کمرے میں گلاب کے پودے لگائے گئے ہیں۔" محافظ بولا۔

"مگر گلاب کے پودے تو نہ مولوی برکت لا سکتا تھا اور نہ ہی فاطمہ۔ اس کے لیے تو کرنل صاحب کی اجازت ضروری ہے۔"

محافظ بولا۔ "ہم کیا جانیں صاحب۔ ہم تو کرنل صاحب کے کمرے کے اندر نہیں جاتے۔ پہلے والے کپتان صاحب جاتے تھے۔ ان کو سب پتا ہوگا مگر ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔"

مرسل سوچ میں پڑ گیا۔ اسے یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی کہ مولوی برکت جو فاطمہ اور ہاجرہ کی عزت کرتا تھا، آخر کیوں کر فاطمہ کا قتل کر بیٹھا اور اس قتل سے ایک روز قبل....

Digest Novels.com

کپتان کا تبادلہ کر دینا، اسے یہ سب ایک دوسرے سے پیوست واقعات لگ رہے تھے۔

''اچھا ایک بات تو بتاؤ۔ تم نے کبھی سوچا کہ فاطمہ اگر مولوی برکت سے شادی کرلے گی تو وہ جیل سے باہر کیسے نکلے گی؟ کیا شادی کے بعد مولوی برکت جیل میں آجاتا؟'' مرسل نے پوچھا۔

دونوں محافظ سوچ میں پڑ گئے۔ پھر ایک بولا۔

''صاحب، کرنل صاحب جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ مولوی برکت کو فاطمہ سے شادی کے لیے راضی کیا ہوگا۔ کیونکہ وہ خود اس کی بیٹی ہاجرہ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔''

کیپٹن مرسل کرسی سے اچھل پڑا۔ اس نے کہا۔

''کیا؟ کرنل ہاجرہ سے شادی کرنا چاہتا تھا؟''

''جی صاحب۔ پچھلے کپتان صاحب نے تو یہی بتایا تھا۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ ہوگیا۔''

کیپٹن مرسل نے بہت اہم راز اگلوا لیا تھا۔ اس نے دونوں محافظوں کو جانے کا کہا اور خود فائل کھول کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کیوں نا ہاجرہ سے ملا جائے۔

☆☆☆

جیل کی خاموش فضا میں ایک پرانا اسٹور روم، آج کیپٹن مرسل کا عارضی دفتر بنا ہوا تھا۔ اس کمرے کو مرسل نے خاص طور سے تیار کروایا تھا اور یہاں سپاہیوں کی آمدورفت نہیں تھی جو سن گن لینے گھومتے رہتے تھے۔

کمرے کے کونے میں کچھ فائلیں، خالی چائے کے کپ اور مٹی کی ایک ہلکی سی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

مرسل لکڑی کی میز کے پار بیٹھی ایک لڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا۔ نحیف سی لڑکی مگر چہرے پر ایک عجیب ٹھہراؤ۔

یہ تیرہ سالہ ہاجرہ تھی، فاطمہ کی معصوم بیٹی۔

مرسل نے نرمی سے کہا۔ ''ہاجرہ، مجھے کچھ باتیں پوچھنی ہیں تم سے۔ اگر تم تیار ہو۔''

ہاجرہ نے خاموشی سے سر ہلایا۔ مرسل کو لگا جیسے وہ برسوں سے بولی ہی نہ ہو۔

''میرا نام محمد مرسل ہے۔ عہدے سے کیپٹن ہوں۔ یہاں نیا آیا ہوں۔ میری ماں دہلی میں رہتی ہیں۔ ایک چھوٹی بہن ہے جو اسکول میں پڑھتی ہے۔''

ہاجرہ اس کی بات خاموشی سے سر جھکائے سنتی رہی۔

''اس دن کیا ہوا تھا جب تمہاری ماں......'' کیپٹن مرسل نے پوچھا اور جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ہاجرہ کی پلکیں لرزیں۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں روشنی آئی، پھر وہ بجھ گئی۔ وہ دھیرے سے بولی، جیسے کوئی زخم اپنے آپ بیان ہو رہا ہو۔

''مولوی برکت میرے باپ کی طرح تھے شروع میں۔ وہ مجھے قاعدہ پڑھاتے تھے، نرمی سے بات کرتے تھے۔ لیکن پھر وہ میری ماں سے کچھ الگ سا برتاؤ کرنے لگے۔''

مرسل نے پلکیں جھپکیں، اسے دل میں بےچینی محسوس ہوئی۔

ہاجرہ نے گفتگو جاری رکھی۔ ''وہ امی کو خط لکھتے تھے۔ کچھ دنوں سے عجیب انداز میں دیکھتے۔ میں بچی تھی، مگر سب سمجھنے لگی تھی۔''

ہاجرہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''پھر کیا ہوا، اُس دن؟''

ہاجرہ کی آواز بدل گئی، جیسے کوئی دروازہ کھل گیا ہو اور ایک طوفان باہر آگیا ہو۔

''اس دن وہ آئے، مجھے سبق دیا۔ میں ایک کونے میں چلی گئی اور دیوار کی طرف منہ کر کے سبق یاد کرنے لگی۔ وہ امی کے پاس بیٹھ گئے۔ پھر اچانک ایک زوردار تھپڑ کی آواز آئی۔ میں گھبرا گئی۔ مولوی برکت چیخ رہے تھے کہ وہ میری امی کو ختم کردیں گے۔''

کیپٹن مرسل چونک پڑا۔

اگر مولوی برکت چیخنے لگا تھا تو جیل کی دوسری طرف موجود محافظوں کو فوراً کمرے کے اندر آنا چاہیے تھا۔ اسی لمحے مرسل کو یاد آیا کہ وہ دونوں نئے محافظ تھے۔

اس نے ہاجرہ سے پوچھا۔ ''کیا مولوی برکت کا چیخنا سن کر دونوں محافظ کمرے کے اندر آئے تھے؟''

''نہیں۔ اندر تو کوئی نہیں آیا تھا۔ حالانکہ انہیں آنا چاہیے تھا۔''

اب ہاجرہ کی آواز میں کپکپاہٹ آگئی تھی۔

''میں نے دیکھا۔ وہ امی کا گلا دبا رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں خوفناک ہوگئی تھیں۔ امی ہاتھ پاؤں مار رہی تھیں۔ میں چیخی۔ لیکن پیچھے سے دو آہنی ہاتھوں نے میرے بازو پکڑ لیے۔ کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں صرف دیکھ سکتی تھی۔ امی نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے دم توڑ دیا۔''

ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''میں کچھ نہیں کر سکی۔ کچھ بھی نہیں۔''

مرسل نے کرسی سے اٹھ کر نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ خود بھی خاموش تھا، الفاظ جیسے کہیں دور رہ گئے

Digest Novels .com

digest library.com

تھے۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ صرف ایک قتل نہیں، ایک سازش تھی۔

☆☆☆

کرنل کئی ماہ تک واپس نہ آیا۔

مرسل اس دوران اس کے کمرے کی مفصل تلاشی لے چکا تھا۔ اسے کمرے سے وہ مشروب بھی مل گیا تھا جو کرنل کے کمرے میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔

یہ ایک خاص مشروب تھا جسے پینے سے مستی کی کیفیت اور سُرور چھانے لگتا تھا۔ اس کے بعد ایک دم سے اتنا شدید غصہ آتا تھا کہ انسان اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا تھا۔ اس مشروب کی بوتل آدھی ہو چکی تھی۔ مرسل سمجھ گیا تھا کہ کرنل نے مولوی برکت کو اُس روز جب فاطمہ کا قتل ہوا تھا، یہی مشروب پلایا تھا۔

اس کے بعد کیپٹن مرسل نے اپنے دلّی کے ''دوستوں'' سے رابطہ کر کے انہیں ساری تفصیل بتائی تھی۔

ایک روز خبر آئی کہ کرنل درگا پرساد کا دلّی شہر میں ہارٹ فیل ہو گیا۔ مرسل تک یہ خبر پہنچی تو وہ دفتر میں چائے پی رہا تھا۔ ایک سپاہی نے اسے آ کر یہ اطلاع دی تھی۔

کیپٹن مرسل نے سپاہی کو کہا کہ وہ جلدی سے تمام سپاہیوں کو جمع کرے اور کرنل کی روح کو سکون پہنچانے کے لیے کچھ پھول لے آئے۔

سپاہی دوڑ کر باہر چلا گیا۔

مرسل... کاغذ قلم لے کر بیٹھ گیا اور کرنل کے نام تعزیتی تقریر لکھنے لگا۔

تقریر لکھنے کے دوران اسے سپاہی نے آ کر اطلاع دی کہ تمام سپاہی گراؤنڈ میں جمع ہو گئے ہیں۔

مرسل اٹھا اور اپنی کیپ درست کر کے، چھڑی ہاتھ میں لیے باہر نکل آیا۔

اس کا رخ ہاجرہ کی جیل کی جانب تھا۔

ہاجرہ سلاخوں سے لگی مرسل کا ہی انتظار کر رہی تھی۔

اس نے مرسل کو آتا دیکھا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔

مرسل ہاجرہ کے قریب آیا اور آہستگی سے بولا۔

''کرنل مر گیا ہے۔ مبارک ہو۔''

ہاجرہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

''مجھے سپاہیوں سے ایک خطاب کرنا ہے۔ خدا اس کرنل کے ساتھ انصاف کرے اور اسے جہنم میں اچھے سے رکھے۔''

ہاجرہ کچھ نہ بولی۔ بس آنکھیں بند کیے سلاخوں کے دوسری طرف کھڑی رہی۔

☆☆☆

کرنل کی موت کی خبر جیل کی سرد و خاموش دیواروں میں ایک ارتعاش کی طرح پھیل گئی۔ کچھ کو سکون ملا، کچھ کو خوف۔

کرنل کے مرنے کے بعد اس قلعے میں کوئی نیا کرنل نہیں بھیجا گیا بلکہ مرسل کو ہی انچارج بنا دیا گیا۔

ہاجرہ اب تیرہ سے چودہ سال کی ہونے لگی تھی۔ کرنل کی موت کی خبر سننے کے بعد وہ خوش رہنے لگی تھی۔ مرسل اس کے قریب رہنے لگا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرتا، اسے خط لکھتا۔ ہاجرہ اس کے خطوط میں چھپی محبت کا جواب محبت سے دیتی۔ دو تین ماہ میں ہاجرہ نے خوب رنگ و روپ چڑھا لیا تھا۔

کیپٹن مرسل نے جوان لڑکیوں کے لیے الگ کمرا، جوان لڑکوں کے لیے الگ کمرا اور بوڑھی اور ادھیڑ عمر کی عورتوں کے لیے الگ کمرا مختص کر دیا تھا۔ جیل میں اب کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔

کچھ عرصے بعد مرسل نے اپنے کمرے کے ساتھ ایک کمرا تعمیر کروایا اور اسے جیل قرار دے کر ہاجرہ کو وہاں منتقل کر دیا۔

اب مرسل کا دفتر اور ہاجرہ کا کمرا ایک دوسرے سے متصل تھا۔ مرسل اس کے کمرے کا دروازہ مقفل رکھنے کا پابند تھا۔ ہاجرہ جیل سے نکل کر قیدِ تنہائی میں آ گئی تھی مگر مرسل نے اسے تنہا نہ چھوڑا۔ وہ روز جب بھی نماز کے لیے اٹھتا، ہاجرہ سے ملنے جاتا اور اس کا حال چال پوچھتا۔

اسی طرح آٹھ سال بیت گئے اور ہاجرہ اکیس برس کی ہو گئی۔

☆☆☆

آٹھ سالوں میں سارے سپاہی تبدیل ہو گئے۔ اگر کوئی نیا سپاہی آتا تو وہ یہی سمجھتا کہ مرسل کے برابر والے کمرے میں اس کی بیوی رہتی ہے مگر کچھ عرصے بعد اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ مرسل کی بیوی نہیں بلکہ قیدی عورت ہے جو بھیم پورہ کی رانی ہے۔

ان آٹھ سالوں میں نہ تو مرسل کا تبادلہ ہوا اور نہ کوئی نیا افسر اس پہاڑی قید خانے میں آیا۔

ہاجرہ کی فرمائش پر اسے کتابیں فراہم کی جاتیں۔ مرسل حیران تھا کہ وہ ہندی کے بجائے اردو زبان اور بھارت کے بجائے پاکستان کا مطالعہ کرتی تھی۔

☆☆☆

ایک روز ہاجرہ نے کاغذ کا ایک پرزہ مرسل کو دیا اور کہا۔

''میں قید ہوں، مگر میری آواز قید نہیں کی جاسکتی۔ اگر تم سچے مسلمان ہو، تو اسے باہر کسی اخبار تک پہنچادو۔''

مرسل نے کاغذ کھول کر دیکھا۔ وہ ایک تقریر تھی۔ سادہ مگر پُراثر۔ مرسل اسے پڑھنے لگا۔

''کیا وہ ملک آزاد کہلاتا ہے جہاں قیدیوں کے بیچ انصاف دفن ہو؟ کیا وہ جھنڈا فخر کے لائق ہے جو مظلوم کی آنکھ میں آنسو چھوڑ دے؟ میری ماں، میرے باپ اور خود میرا قصور کیا ہے؟ یہی کہ ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔''

مرسل نے ایک لمحے کے لیے کچھ نہ کہا۔ وہ بس ہاجرہ کی تحریر پڑھے جارہا تھا۔

پھر اس نے کاغذ تہ کیا اور باہر چلا گیا۔

اگلے دن وہ تقریر ایک اخبار کے صفحۂ اول پر چھپی۔

سیاسی حکام نے مرسل کو طلب کرلیا اور پوچھا۔ ''ہاجرہ کی تقریر باہر کیسے نکلی؟''

مرسل نے جو جواب دیا، اس سے وہ مطمئن نہیں ہوئے۔

قلعے میں ہلچل مچ گئی۔ بابا غلاے ہاجرہ سے ملنے آیا مگر ہاجرہ سو رہی تھی۔ بابا غلاے انتظار کرتا ہوا خوار ہو کر واپس لوٹ گیا۔ وہ کیپٹن مرسل کو اگلے روز آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

سیاسی حکام نے مرسل کو روکا، پوچھ گچھ کی گئی مگر اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''اگر ایک قیدی لڑکی ملک کی روح کو جھنجوڑ دے، تو مسئلہ لڑکی میں نہیں، ملک کے ضمیر میں ہوتا ہے۔''

حکام چاہ کر بھی کیپٹن مرسل کا تبادلہ نہیں کروا پارہے تھے۔ نہ جانے کہاں سے حکم آیا تھا کہ قیدی عورتوں کے انچارج کے تبادلے کی صورت نہیں ہوں گے۔ اس کے لیے کمانڈر انچیف کی اجازت درکار ہونے کی شرط لگ گئی تھی اور کمانڈر انچیف برطانیہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

اب ہاجرہ نے تقریریں روزانہ کی بنیاد پر لکھنی شروع کردیں۔ وہ جیل کی عورتوں والے حصے میں قیدی عورتوں کو جمع کرتی، انہیں پڑھنا سکھاتی اور اپنے تجربات سناتی۔ اس کی تقریریں دبانے کی کوشش کی جاتی، مگر مرسل انہیں ہر بار خفیہ طور پر باہر بھیج دیتا۔

ایک دن ہاجرہ نے مرسل سے کہا۔ ''آپ کو ڈر نہیں لگتا؟ اگر آپ پکڑے گئے؟''

مرسل نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ ''ڈر مجھے اُس دن لگے گا، جس دن تم خاموش ہو جاؤ گی۔''

☆☆☆

ایک روز بابا غلاے، ہاجرہ سے ملنے آیا۔ اُس روز بابا غلاے نے ہاجرہ کو پاکستان سے الحاق کی ایک نئی راہ دکھائی۔

اس روز جیل کی دیواروں کے پیچھے سورج کی کرنیں، جو کبھی ہاجرہ کو گرماتی تھیں، آج وہی کرنیں اس کے دل میں اتر رہی تھیں، جیسے کوئی بھاری پردہ اس کے شعور سے ہٹ رہا ہو۔

بابا غلاے نے اس سے کہا تھا۔ ''بیٹی، اگر پاکستان سے الحاق کا اعلان کرنا ہے، تو تجھے پنچایت کے چبوترے پر خود آ کر اعلان کرنا ہوگا۔''

ہاجرہ کچھ لمحے خاموش رہی پھر دھیرے سے بولی۔

''اگر میں نہ آسکی تو؟''

بابا غلاے نے گہری سانس لی اور پلکیں نم کرتے ہوئے کہا۔

''اگر بھیم راج زندہ ہوتا، تو وہ ضرور اعلان کرتا، آخر وہ تیرا باپ تھا۔''

یہ سننا تھا کہ ہاجرہ کا ذہن کسی اور ہی سمت دوڑ گیا۔ اسے صرف ایک خیال نہیں آیا تھا، یہ تو پہیلی کا گمشدہ ٹکڑا تھا۔ وہ بولی۔

''بابا غلاے۔ اگر میری شادی ہوجائے، تو؟''

اس نے دل میں سوچا تھا کہ اگر مرسل اسے اپنالیتا تو شاید کوئی راہ نکل آتی۔ مرسل تو جیل سے باہر تھا۔ وہ پنچایت میں جاسکتا تھا۔ وہ پاکستان سے الحاق کا اعلان کرسکتا تھا۔

''ہاں بیٹی۔ اگر تیری شادی ہوجائے تو تیرا شوہر یہ اعلان کرسکتا ہے۔'' بابا غلاے بولا۔

ہاجرہ کے چہرے پر ایک دم سے سکون اور اطمینان آگیا۔ جیسے کوئی پرانی الجھن سلجھ گئی ہو۔

''بابا۔ اگر میری ماں مولوی برکت سے شادی کرلیتی تو کیا وہ پنچایت میں جا کر اعلان کرسکتا تھا؟''

''ہاں بیٹی۔ تمہاری ماں کا نکاح برکت سے ہوجاتا، تو پاکستان یا بھارت سے الحاق کا اختیار مولوی برکت کو مل جاتا۔''

ہاجرہ کی سانس رکنے لگی۔ وہ سارا کھیل سمجھ گئی تھی۔

اس نے بابا غلاے سے کہا۔ ''بابا، تم جاؤ۔''

Digest Novels .com

اسے شدید ذہنی شاک لگا تھا۔ بابا غلامے چلا گیا۔ ہاجرہ نے فوراً کیپٹن مرسل سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ دیوار سے لگ کر کھڑی ہاجرہ، فرش کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے بول رہی تھی۔

''مرسل! کرنل درگا پرساد شاید یہ جان چکا تھا کہ اگر میری ماں مولوی برکت سے نکاح کرلے گی تو مولوی برکت کو وہ اختیار حاصل ہو جائے گا جس کے ذریعے وہ بھیم پورہ کے الحاق کا فیصلہ کر سکے۔ پہلے پہل شاید کرنل یہی چاہتا تھا کہ مولوی برکت کے ذریعے بھیم پورہ کو بھارت سے جوڑ دے۔''

مرسل خاموشی سے سنتا رہا۔ ہاجرہ کی آواز میں تجزیہ نہیں، تجربہ بول رہا تھا۔

''مگر پھر کرنل کے ارادے بدل گئے۔'' ہاجرہ کی نظریں بلند ہوئیں۔ ''اسے احساس ہوا کہ اگر فیصلہ مولوی برکت کے ہاتھ میں گیا تو وہ خطرہ بن سکتا ہے۔ اس لیے اس نے برکت پر بھروسا کرنے کے بجائے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا اور — میری ماں کو ختم کروا کر، برکت کو بھی قتل کے الزام میں زمین کے نیچے دفن کرا دیا۔''

ہاجرہ کی پلکیں لرزنے لگیں مگر آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی کے باوجود، اس کا چہرہ پتھر کی طرح مضبوط تھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ وہ کرنل تم سے شادی صرف اختیار کے لیے کرنا چاہتا تھا۔ پہلے اس نے یہ سوچا کہ مولوی برکت کے ذریعے بھیم پورہ کا بھارت سے الحاق کروا دے گا مگر پھر اس کی نیت بدل گئی اور اس نے معاملات اپنے ہاتھ میں لیے۔ تم سے شادی کی صورت میں وہ پورے بھیم پورہ کا حاکم بن جاتا۔ اسی لیے اس نے الحاق کا منصوبہ ختم کرنا چاہا۔ تمہاری ماں تو اس سے کبھی شادی کرتی نہیں۔ اس کی نظریں تم پر تھیں۔ مجھے بھی اب لگتا ہے کہ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ مولوی برکت اور تمہاری ماں کو درمیان سے ہٹا کر خود سامنے آئے گا۔ تمہاری ماں کو قتل کروایا اور پھر برکت کو بھی تمہاری ماں کے قتل کے الزام میں ابدی نیند سلا دیا تا کہ وہ اس کے لیے کوئی خطرہ نہ بن سکے۔''

ہاجرہ نے آہستہ سے سر ہلایا اور کہا۔

''ہاں اور اگر میں اس کرنل سے شادی کر بھی لیتی، تو وہ مجھے ایک دن ختم کر دیتا۔ کیونکہ سپاہیوں کو بھیج کر یا کسی حکومت سے الحاق کر کے، اسے صرف کچھ حصہ ملتا مگر جیسے ہی اس کے ذہن میں آیا کہ اگر وہ میرا شوہر بن جائے گا تو وہ حصے داری سے بچ جائے گا۔ اسے تو سب کچھ چاہیے تھا، پوری زمین، پورا اختیار۔''

مرسل کی نظروں میں حیرت اور دکھ ساتھ ساتھ اُبھرے۔ خاموشی طویل ہونے لگی۔ جیسے وقت نے بھی سانس روک لی ہو۔ پھر ہاجرہ نے نہایت نرم مگر گہرے لہجے میں پوچھا۔

''مرسل! کیا تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟''

مرسل نے پل بھر کے لیے نظریں جھکالیں۔ صرف ایک.... لمحہ وہ رکا اور پھر دھیرے سے بولا۔

''محبت؟ شاید ہاں مگر تم میری قیدی ہو ہاجرہ اور تم مجھے اپنا زندگی بھر کا محافظ بنانا چاہتی ہو۔ یہ آسان نہیں ہے۔''

وہ ایک قدم پیچھے ہٹا اور سر اٹھا کر گویا ہوا۔ ''مجھے وقت دو۔ مجھے سمجھنا ہے کہ ایک سپاہی اگر اپنی قیدی سے اور ایک جابر اپنے مجبور سے محبت کرنے لگے تو اس کا حل کیا ہے؟ کیا وہ عشق بغاوت بن جاتا ہے؟ یا صرف ایک خواب؟''

ہاجرہ خاموش کھڑی رہی۔ شاید وہ اس وقت کا انتظار کرنے لگی تھی جب محبت کا سوال، اختیار کے فیصلے سے بلند تر ہو جائے گا۔

☆☆☆

کئی روز خاموشی میں ہی گزر گئے۔ اخبارات میں ہاجرہ کے کالم دھڑا دھڑ چھپ رہے تھے۔ ہاجرہ ایک دم سے منظرِ عام پر آ گئی تھی۔ پاکستان کے حمایتی رپورٹر، اس کے تحریر کردہ ہر لفظ پر آرٹیکل لکھ رہے تھے۔

وہ بھی اس قید سے نکل کر دنیا کو بتانا چاہتی تھی کہ پاکستان سے محبت صرف ایک سیاسی نعرہ نہیں، ایک قربانی ہے، ایک عقیدہ ہے، ایک فیصلہ ہے، جس کی قیمت جان سے بھی بڑھ کر ہو سکتی ہے۔

مگر ہاجرہ کے دل میں ایک خوب صورت دل بھی تھا جو اَب کیپٹن مرسل کے لیے دھڑکنے لگا تھا۔ ان سب حوادثِ زمانہ میں ہاجرہ کے لیے امید کی ایک کرن تھی۔ کیپٹن مرسل۔

اسے تو بس کیپٹن مرسل کے محبت نامے کا انتظار تھا۔ لیکن اسے اندازہ نہ تھا کہ مرسل اپنی ماں کو ہاجرہ سے ملوانے لے آئے گا۔

جولائی کی ایک روشن صبح تھی۔ جیل کے لان میں ہلکی دھوپ چھن چھن کر درختوں کی شاخوں سے زمین پر گر رہی تھی۔ ہاجرہ معمول کے مطابق اپنے قید خانے نما کمرے کی

Digest Novels .com

دیوار کی کھڑکی کے پاس بیٹھی کچھ لکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں کچھ اور ہی ہلچل تھی۔ اس کے دل میں بے چینی تھی، جیسے کوئی اہم واقعہ ہونے والا ہو۔

اسی لمحے جیل کے دروازے پر ایک بڑی فوجی گاڑی آ کر رکی۔ دروازہ کھلا اور ایک باوقار، سادہ مگر پُروقار لباس میں ملبوس خاتون نیچے اتریں۔ ان کے چہرے پر خاندانی عظمت، نرمی اور وقار کا عکس تھا۔

ان کے ساتھ کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک شخص بھی تھا جو جیلر سے کچھ بات کرنے لگا۔ پھر جیلر کے اشارے پر وہ خاتون جیل کے احاطے کی طرف بڑھیں۔

یہ کیپٹن مرسل کی ماں تھیں۔

☆☆☆

کیپٹن مرسل نے ایک خط میں فاطمہ اور ہاجرہ کی کہانی لکھ دی تھی اور ساتھ ہی اپنے دل میں پوشیدہ محبت کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

مرسل کی ماں نے بیٹے کو خط کا جواب نہیں دیا، بلکہ خاموشی سے اپنا دوپٹا درست کیا، چادر اوڑھی اور ہاجرہ سے ملنے گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ گاڑی مع ایک منیجر، ان کے لیے ہر وقت دستیاب رہتی تھی۔

وہ جیل کے اندر آئیں تو ہاجرہ کو بتایا گیا کہ ایک بزرگ خاتون نے اس سے ملنے کی درخواست کی ہے۔ ہاجرہ حیران تھی۔ کیپٹن مرسل موجود نہ تھا۔ وہ کسی کام سے باہر گیا ہوا تھا۔

کمرے کا دروازہ کھلا اور کیپٹن مرسل کی ماں، ہاجرہ کے کمرے کے اندر داخل ہوئیں۔

ہاجرہ نے اپنی آنکھیں اٹھا کر دیکھا، تو ایک سادہ، پُروقار چہرہ اس کے سامنے تھا۔

نووارد خاتون نے دھیرے سے کہا۔ ''بیٹی! تم ہی ہو ہاجرہ؟''

''جی ہاں مگر آپ کون ہیں؟'' ہاجرہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

کیپٹن مرسل کی ماں نے کرسی کھینچی اور اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

''میرا بیٹا مرسل تمہارا محافظ ہے مگر اس نے اپنے خط میں جو الفاظ تمہارے لیے لکھے ہیں، وہ محافظ کے نہیں، ایک عاشق کے الفاظ تھے۔''

ہاجرہ کے چہرے پر حیرت اور شرم ایک ساتھ چھا گئے۔

''آپ، آپ مرسل کی والدہ ہیں؟'' ہاجرہ بمشکل بولی۔

کیپٹن مرسل کی ماں نے ہاجرہ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا اور کہا۔

''ہاں۔ میں یہاں اس لیے آئی ہوں کیونکہ میں اپنے بیٹے کے جذبات کو جھٹلانا نہیں چاہتی۔ میں یہ دیکھنے آئی ہوں کہ آخر وہ کون سی بیٹی ہے جو قید میں بھی عزت، روشنی اور حوصلے کی مثال بنی بیٹھی ہے۔''

کچھ دیر تک دونوں میں گفتگو ہوتی رہی۔ پھر ہاجرہ نے انہیں اپنی والدہ کی موت کے بعد کی داستان سنادی۔

کیپٹن مرسل کی ماں نے جب ساری داستان سن لی تو کہا۔

''بیٹی۔ میں تم سے مل کر جان گئی ہوں تم قید میں ہو، مگر تمہاری روح آزاد ہے۔ تم مظلوم ہو، مگر تمہارے الفاظ میں قوم کی رہنمائی ہے۔ میں خود پاکستان سے محبت کرتی ہوں مگر بھارت میں میرے شوہر کا جسدِ خاکی ہے۔ اسی لیے میں یہاں ہوں اور مرسل میری وجہ سے یہاں ہے مگر ہمارے دل پاکستان کے لیے دھڑکتے ہیں۔''

ہاجرہ کی آنکھوں میں امید کے چراغ جل اٹھے۔ وہ کہنے لگی۔

''ماں جی۔ میں صرف اپنی ماں کا انصاف چاہتی ہوں اور ان کا وہ مقصد پورا کرنا چاہتی ہوں جس کی خاطر انہوں نے اپنی جان وطن پر قربان کی۔ میں بھیم پورہ کا پاکستان سے الحاق چاہتی ہوں۔ میں نہیں جانتی محبت کیا ہوتی ہے۔ مجھے صرف یہ یقین ہے کہ مرسل ایک اچھا انسان ہے۔ وہ میری آواز اخباروں تک پہنچاتا رہا، جبکہ سب اسے روک رہے تھے۔ صرف مرسل ہی پاکستان سے الحاق کا اعلان کر سکتے ہیں۔ بلکہ اب تو کوئی دو سو کے قریب گاؤں کے سردار بھی پاکستان سے الحاق کے خواہش مند ہیں۔''

ہاجرہ نے مرسل سے شادی کی بات کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اس کی ذاتی پسند پر وطن کو فوقیت حاصل رہے۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ مرسل ایک اچھا انسان ہے مگر وطن کو کیپٹن مرسل پر برتری حاصل ہے۔

کیپٹن مرسل کی ماں ہاجرہ کی بات سمجھ گئی تھیں۔ وہ مسکرائیں اور آہستہ سے بولیں۔ ''بیٹی، میں تمہاری ماں نہیں بن سکتی، مگر تم چاہو تو میں تمہیں بہو ضرور بنا سکتی ہوں۔ مرسل تم سے نکاح کرنا چاہتا ہے۔ میری رضامندی کے ساتھ۔''

ہاجرہ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ پھر آہستہ

digest library.com

سے بولی۔

”میں...... میں قید میں ہوں، ماں جی۔“

ماں نے کہا۔

”بیٹی، قید سے رہائی ایک دن ضرور آتی ہے۔ لیکن جو دل ایک دوسرے سے جڑ جائیں، وہ ساری زنجیروں کو توڑ سکتے ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ہاجرہ کو گلے سے لگالیا۔

☆☆☆

کیپٹن مرسل سوچ رہا تھا کہ اس کی ماں اس ہیبت ناک جیل کی بے رنگ دیواروں کے بیچ ایک رنگ، ایک دعا اور ایک محبت کا دِیا جلا گئی تھیں۔ ہاجرہ کے کمرے میں وہ خوشبو رہ گئی تھی جو صرف ماں کے لمس سے آتی ہے۔ اب ہاجرہ ایک ایسی دُلہن بننے جارہی تھی جس کے قدم ابھی زنجیروں میں تھے لیکن دل حوصلے کے آسمان پر پرواز کررہا تھا۔

اس رات اس نے جیل کے سرکاری کمرے میں اپنی ماں کا پیغام کھولا۔ اس کی ماں نے لکھا تھا۔

”بیٹا، تم نے جس لڑکی کو چنا ہے، وہ ایک مشن ہے۔ صرف دل کی بات نہ سنو، اس کے مقصد کو اپنی آواز بنالو۔ تبھی تم اس کے ہم سفر کہلاؤ گے۔“

چند روز بعد، جیل کے اندر ایک چھوٹی سی تقریب ہوئی۔ مرسل، گواہ کی حیثیت سے چند فوجی افسر، مرسل کی ماں اور نکاح پڑھانے والے مولوی صاحب شریک تھے۔

نکاح سادگی سے ہوا اور قاضی کے سامنے مرسل نے ”قبول ہے۔“ کہا۔

ہاجرہ نے سادگی سے دوپٹے کے نیچے سر جھکا کر کہا۔

”قبول ہے۔“

نہ ہار پہنائے گئے، نہ بینڈ باجا بجا مگر وہ لمحہ تاریخ کا ایک روشن صفحہ بن گیا۔ اس روز ایک قیدی لڑکی، ایک فوجی افسر اور درمیان میں صرف ایک ہی مقصد تھا۔ عشق اور وطن سے محبت۔

ادھر جیل میں محبت اور عشق کے دیپ جل رہے تھے اور اُدھر دلی میں محبت اور قربانی کے جذبے کا غلط فائدہ اٹھایا جارہا تھا۔ کیپٹن مرسل اور ہاجرہ کی سچائی اور خلوص کے مقابلے میں دو سو گاؤں اور دیہاتوں کے سردار، اپنے مفادات، لالچ اور طاقت کی سیاست میں اُلجھے ہوئے مے نوشی میں مصروف تھے۔ حب الوطنی اور ذاتی مفادات کے درمیان ایک ٹکراؤ پیدا ہونے جارہا تھا جس سے کیپٹن مرسل اور ہاجرہ، دونوں ہی ناواقف تھے۔

☆☆☆

دہلی شہر کی روشنیوں سے بجی ایک شاندار کوٹھی کے مرکزی ہال میں جام گردش کررہے تھے۔

کرسٹل گلاسوں میں چھلکتی شراب کی چمک، ریشمی پردوں کے سائے میں مدھم ہنسی کے قہقہے اور قالینوں پر بیٹھے وہی دو سو گاؤں اور دیہاتوں کے سردار جو ہاجرہ سے وقتاً فوقتاً ملتے رہتے تھے۔ ان کی زبانوں پر آج ہاجرہ اور کیپٹن مرسل کی محبت کا ذکر تھا لیکن دلوں میں مفاد کا سودا بسا ہوا تھا۔

ان سرداروں نے ہاجرہ اور کیپٹن مرسل کی شادی کو ایک تاریخی لمحہ قرار دیا۔ لیکن یہ لمحہ ذاتی مفادات کی ایک سیڑھی بننے جارہا تھا۔

ایک سردار، جس کا پیٹ اس کی عیاشی کا گواہ تھا، نشے میں جھومتے ہوئے بولا۔ ”کیپٹن مرسل کا عشق ہمارے لیے نعمت بن گیا ہے۔ ہاجرہ کا مشن ہمیں وہ مقام دلائے گا جس کے ہم برسوں سے خواب دیکھتے آئے ہیں۔“

دوسرے سردار نے جام تھامتے ہوئے کہا۔

”پاکستان کو اب ہماری ضرورت ہے۔ ہم ان کے لیے ناگزیر ہیں اور ہم بدلے میں ان سے لیں گے اقتدار، دولت اور بین الاقوامی شناخت۔“

ہال میں ہنسی گونجتی رہی۔ تمام دو سو گاؤں اور دیہاتوں کے سردار اس ایک بات پر متفق تھے کہ ان کی پاکستان سے حُبُ الوطنی کے ایک سنہری دور کا آغاز ہونے والا ہے جس میں جذباتیت کی کوئی ضرورت نہیں، صرف عقل سے کام لینے کی ضرورت تھی۔

”بس کیپٹن مرسل بھیم پورہ کا پاکستان سے الحاق کا اعلان کردے۔ اس کی ٹرین کے پیچھے ہم اپنے ڈبے لگالیں گے۔“ ایک سردار نے ہنستے ہوئے کہا۔

ایک عورت جو کافی بھڑکدار لباس پہنے ہوئے کچھ سرداروں کو جام پلارہی تھی، کہنے لگی۔

”تو بھیم پورہ سے اعلان کا انتظار کیوں ہے؟“

ایک سردار نے اٹھ کر کہا۔

”لو بھئی سنو۔ یہ سوال پوچھ رہی ہے کہ بھیم پورہ کے اعلان کے ہم منتظر کیوں ہیں؟ ارے بی بی۔ وہی تو اہم ترین علاقہ ہے۔ بھیم پورہ ہی تو وہ جگہ ہے جہاں سے دریا نکل کر پاکستان جارہا ہے۔ ہم تو دریا کی مچھلی ہیں مچھلی۔“

سب سردار اس کی طرف متوجہ ہوگئے اور ہنسنے لگے۔

یہ وہ رات تھی جب اقتدار کے سوداگر، شراب کے

نشے میں، ایک نئے شہر کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ہاجرہ اور مرسل کی سچی قربانی، ان کے لیے صرف ایک مہرہ تھی۔

☆☆☆

ہاجرہ اور مرسل کی شادی کو ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے۔

ہاجرہ جیل میں تھی، مگر اب دل کی قید ختم ہو چکی تھی۔ وہ اب قیدی نہیں، ایک بیوی بھی تھی۔

مرسل کا دل ہر دن اس کے لیے تڑپتا تھا۔ اسے وہ لمحہ قریب آتا دکھائی دیتا تھا جب وہ مکمل آزادی کے ساتھ اس کا ہاتھ تھامے گلشن کی سیر کر رہا ہوتا۔

انہی دنوں بھیم پورہ کے مرکزی ہال میں ایک بڑی بیٹھک رکھی گئی۔ اعلان کیا گیا کہ دو سو گاؤں اور دیہاتوں کے سردار، کیپٹن مرسل سے ملاقات کریں گے تاکہ وہ بھیم پورہ کے پاکستان سے الحاق کے حوالے سے اپنا آخری مؤقف پیش کریں۔

وقت شام چھ بجے طے تھا لیکن کیپٹن مرسل وقت سے پہلے ساڑھے پانچ بجے ہی پہنچ گیا۔ اس نے اجلاس کے مقام تک جانا چاہا مگر وہ اچانک رک گیا۔

ایک چھوٹے سے دروازے کے پار، ہال سے متصل ایک کمرے میں زور زور سے قہقہے اور مکالمے گونج رہے تھے۔ مرسل نے چلنے کے بجائے وہیں رک کر سننے کا فیصلہ کیا۔

اندر سے آواز آئی۔

''یہ مرسل اگرچہ فوجی ہے، مگر جذباتی بھی بہت ہے۔''

دوسری آواز نے قہقہہ لگایا۔ ''محبت نے عقل چھین لی ہے اُس کی۔ اب تو ہمیں اس کا فائدہ اٹھانا ہے۔''

تیسری آواز میں طنز چھپا تھا۔ ''ہاجرہ کو قوم کی بیٹی بنانا تھا، ہم نے اسے اقتدار کی سیڑھی بنا دیا۔''

چوتھی آواز کچھ زیادہ سنجیدہ تھی۔ ''ہمیں پاکستان سے صرف زمین نہیں، طاقت چاہیے۔ اگر مرسل نے الحاق کا اعلان کر دیا، تو سب کچھ ہماری جھولی میں ہوگا۔''

مرسل کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہ وہی سردار تھے جو ہاجرہ سے ملنے آتے، اس کے آگے سر جھکاتے، محبت کے نغمے گاتے اور ہاجرہ کو اپنی بیٹی کہتے تھے۔ لیکن آج، جب کوئی دیکھنے والا نہیں تھا، تو ان کے چہروں سے نقاب اتر گئے تھے۔

مرسل کے قدم پیچھے ہٹنے لگے۔ اس کی پیشانی پر پسینہ اور دل میں طوفان برپا ہو چکا تھا۔ وہ بنا ملاقات کیے، خاموشی سے وہاں سے نکل آیا۔

☆☆☆

مرسل بھیم پورہ سے واپس آیا تو سیدھا ہاجرہ کے کمرے میں گیا اور اس نے ہاجرہ کو سب کچھ بتا دیا۔

ہاجرہ کی تو وہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔

وہ ہاجرہ کے سامنے بیٹھا تھکے ہوئے لہجے میں بول رہا تھا۔

''ہاجرہ! تم جنہیں بھائی کہتی تھیں، بزرگ کہتی تھیں، جن کے دیہاتوں کو آزادی کا پیغام دیا، وہ سب جھوٹے نکلے۔''

ہاجرہ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی اترنے لگی۔

''مرسل! کیا سب کچھ صرف مفاد کے لیے تھا؟ کیا میری ماں کی قربانی بھی ایک سودا بن گئی؟''

مرسل کی آنکھوں میں نمی تھی۔ وہ ہاجرہ کے ہاتھ کو تھامتے ہوئے بولا۔ ''میں نے ان کے منہ سے نکلا ہوا ہر ایک لفظ سنا۔ وہ سب تمہیں صرف سیڑھی سمجھتے ہیں۔ تمہاری جدوجہد، تمہاری عزت، ان کے لیے صرف موقع تھی۔''

ہاجرہ خاموش رہی پھر آہستہ سے بولی۔

''کبھی سوچا نہ تھا کہ سب کچھ اتنا کھوکھلا ہوگا، مرسل لیکن شاید یہ ہماری آزمائش ہے۔''

مرسل نے سر ہلایا اور بولا۔ ''اب ہمیں اس محبت کو قربانی بنانا ہوگا۔ ان سرداروں کو نہیں، عوام کو بیدار کرنا ہوگا۔ میں تمہارے ساتھ ہوں ہاجرہ۔ چاہے یہ جنگ دلوں میں لڑی جائے یا میدان میں۔ الحاق پاکستان کے ساتھ ہی ہوگا۔''

لیکن ہاجرہ خاموش رہی۔ اسے شدید صدمہ ہوا تھا۔

مرسل کے لیے اس لمحے، محبت خاموش تھی، لیکن سچی تھی۔ فریب چیخ چیخ کر اپنی شناخت کھو چکا تھا۔

مگر ہاجرہ شاید ہمت ہار بیٹھی تھی۔

☆☆☆

ہاجرہ نے اپنے دل میں پاکستان سے الحاق کے لیے جو خواب بُنے تھے، وہ تمام خواب اب چکنا چور ہو چکے تھے۔

اس نے سوچا تھا کہ وہ اور اس کے گاؤں کے لوگ، اپنی محبت، وفاداری اور قربانی کے جذبے سے پاکستان کا حصہ بنیں گے۔ لیکن جب اس نے ان سرداروں کی باتیں

Digest Novels .com

کیپٹن مرسل سے سنیں، تو اس کی روح کانپ گئی۔
ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ایک کونے میں جا بیٹھی۔
اب اس کے پاس نہ امیدیں تھیں نہ کوئی تحریک۔ اب صرف ایک کونا تھا اور کتابوں کی خاموشی۔

☆☆☆

بابا غلامے کئی بار کیپٹن مرسل کے پاس آکر بھیم پورہ چلنے کی درخواست کر چکا تھا۔
ایک دو روز تو مرسل خاموش رہا پھر اس نے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ گاؤں آکر پاکستان سے الحاق کا اعلان کرے گا۔
بابا غلامے نے یہ بات جا کر سب گاؤں کے سرداروں کو بتا دی تھی۔
ایک روز کیپٹن مرسل ہاجرہ کے پاس آیا۔ وہ منہ دوسری جانب کیے بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ مرسل اس کے قریب آیا اور جھک کر کہا۔
''ہاجرہ، لوٹ آؤ زندگی میں۔ ہم اب اپنے لیے جئیں گے۔ نیا منصوبہ بنائیں گے، عوام کو بیدار کریں گے۔ ان سرداروں کے کالے کرتوت اور سیاہ چہرے سب کے سامنے لائیں گے۔''
لیکن ہاجرہ کی آواز جیسے گم ہو چکی تھی۔
مگر کیپٹن مرسل یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ خود غرض سردار، ہاجرہ کی مخالفت برداشت نہیں کریں گے۔ ہاجرہ نے ان کا ساتھ نہ دیا، تو وہ اسے راستے سے ہٹا دیں گے اور پھر استصواب رائے کے نام پر سب کچھ اپنے حق میں کر لیں گے۔
''دیکھو ہاجرہ۔ میں نے حکومت پاکستان کے نام ایک خط لکھا ہے کہ یہ الحاق مفادات اور لالچ پر مبنی ہے۔ اگر انہیں تسلیم کیا گیا تو یہ ملک کے نظریے کے ساتھ ایک مذاق ہوگا۔''
ہاجرہ کچھ نہ بولی۔
مرسل نے ہاجرہ کی پیٹھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اسے سیدھا کیا تو اس کی چیخ نکل گئی۔
ہاجرہ کے منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ بالکل بے حس و حرکت تھی۔

☆☆☆

ہاجرہ کو کسی نے زہر دے کر قتل کر دیا تھا۔
اخباروں نے لکھا۔ ''کیپٹن مرسل کا حفاظتی دائرہ توڑ کر پاکستان سے الحاق کے دشمن ہاجرہ کو قتل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہاجرہ کے شوہر کیپٹن مرسل کچھ ہی روز میں بھیم پورہ اور آس پاس کے دو ڈھائی سو گاؤں کا پاکستان سے الحاق کا اعلان کرنے والے تھے مگر قوم پرستوں نے جیل میں ہاجرہ کو قتل کروا دیا۔''
مرسل پر مقدمہ چلا۔ اس نے فوجی عدالت میں ساری حقیقت بیان کی۔ ان سرداروں کی خود غرضی، ان کے خفیہ منصوبے اور ہاجرہ کی سچائی۔
عدالت نے گواہیوں اور ثبوتوں کی بنیاد پر فیصلہ دیا۔
''کیپٹن مرسل بے گناہ ہے۔''

☆☆☆

ہاجرہ کی موت کو ایک سال گزر چکا تھا۔ قیدی عورتوں کے درمیان یہ خبر پھیل گئی کہ ہاجرہ کو اس کی ماں فاطمہ کی قبر کے پاس ہی دفن کیا گیا تھا۔
فاطمہ اور ہاجرہ کے خواب اب بھی بھیم پورہ کی فضاؤں میں سانس لیتے تھے مگر افسوس کہ وہ دونوں زندہ نہ رہیں۔ ہاجرہ نے تو مرنے سے پہلے ان دو سو گاؤں کے سرداروں کے اصل چہرے دیکھ لیے تھے جو اب بھی ہاجرہ کو ''دختر بھیم پورہ'' کے نام سے یاد کرتے تھے۔ وہ ایک ایسی بیٹی، جس نے خود غرضی کی قیمت جان سے چکائی تھی۔
اب ایک بار پھر الیکشن کا موسم تھا۔ نعرے تھے، جھنڈے تھے، بینرز تھے۔ ہر گاؤں میں جشن تھا۔
''ہم پاکستان کے لیے ووٹ دیں گے۔''
نتائج کا اعلان ہونے میں صرف ایک گھنٹا باقی تھا۔ ہر جانب خوشی کی لہر دوڑ رہی تھی۔ ہر زبان پر ایک ہی بات تھی۔
''ہم نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ اب ہم پاکستانی ہیں۔''
ہر خود غرض اور لالچی سردار ایک دوسرے کو مبارکباد دے رہا تھا۔ اقتدار، وزارتیں، مراعات کے حال ان کے خواب ایک بار پھر بیدار ہو چکے تھے۔ لیکن جشن کے ان لمحوں میں، اچانک فضا بدل گئی۔
بھارتی فوج بھیم پورہ کی حدود میں داخل ہو گئی۔ ٹینک، جیپیں اور قدموں کی گونج نے ان لوگوں کی مسکراہٹیں چھین لیں۔ گاؤں کے در و دیوار لرز اٹھے۔
لوگ پہاڑوں پر چڑھ گئے اور پاکستان کی طرف دیکھنے لگے۔
کہاں ہیں ہمارے محافظ؟

لیکن پاکستانی توپیں خاموش تھیں۔
اینٹی ٹینک گنیں خاموش تھیں۔

☆☆☆

ریڈیو پر صرف سیاسی بیانات آرہے تھے۔
''یہ بھارتی اقدام ظلم ہے۔''
''بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔''

لاکھی سردار بے چین ہو گئے۔ اب وہ فوجی ہیڈکوارٹرز کو فون کر رہے تھے۔ وزیروں کو خطوط لکھ رہے تھے۔ ہر دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔

''ہم نے تو پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا! ہم تو اپنے الحاق کا جشن منا رہے تھے!''

لیکن اب دشمن ان کے دروازے پر تھا اور پاکستان کے ہتھیار خاموش۔

فاطمہ اور ہاجرہ کی قبر کی مٹی جو سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

دس بارہ سردار گاؤں میں گھس جانے والے سپاہیوں کے آگے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے اور زوردار آواز میں مغلظات بکنے لگے۔

سپاہیوں نے انہیں پکڑ کر جیل میں بند کر دیا۔

آئندہ چند روز میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں۔ وہ تمام لوگ جو قومی خزانے پر بوجھ ڈالنے کی سازش میں شریک تھے، انہیں پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔

☆☆☆

ہاجرہ کی موت نے صرف دو سو گاؤں کو نہیں، بلکہ کیپٹن مرسل کی روح کو بھی خاموشی کی قبر میں دفن کر دیا تھا۔

کبھی، جب وہ اپنی یونیفارم پہن کر سینہ تان کر جلوسوں کے درمیان چلتا تھا، لوگ اسے دیکھ کر نعرے لگاتے تھے۔ مگر اب وہ ہر دن، ہر رات، ایک مجرم کی طرح اپنے ضمیر کے کٹہرے میں کھڑا رہتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ اسے ہاجرہ کے سائے کی طرح اس کے ساتھ رہنا چاہیے تھا۔ وہ اکثر اپنی ماں کو خط لکھتا۔

''اگر میں وقت سے پہلے جا پہنچتا۔ اگر میں اُس روز ہاجرہ کے ساتھ ہوتا۔''

یہ ''اگر'' اس کے دماغ میں کنکر بن کر گونجتے رہتے۔

ماں نے کئی بار سمجھایا، مگر مرسل کا دل اس دنیا سے اٹھ چکا تھا۔ وہ دنوں تک کمرے میں بند رہتا، کھانا پینا چھوڑ دیتا، خود سے باتیں کرتا، کبھی چلاتا، کبھی رو پڑتا۔

''میں اسے بچا نہ سکا۔ میں نے اس کا خواب دفن ہوتے دیکھا۔''

کئی بار اس نے اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی۔ رسّی کا پھندا، زہر کی شیشی، بندوق کی نالی مگر ہر بار جیسے کوئی پوشیدہ طاقت اسے روک لیتی۔

آخرکار اسے ملٹری کے لیے اَن فٹ قرار دے کر کچھ عرصے کے لیے ذہنی صحت کی رپورٹ کو بنیاد بنا کر بیرونِ ملک سفیر مقرر کر دیا گیا۔

☆☆☆

یورپ کی ایک چھوٹی مگر خوب صورت ریاست میں وہ تعینات ہوا تھا۔ یہاں کی فضائیں، یہاں کا سکون اور یہاں کے اجنبی چہرے، سب کچھ اس کے اندر کی ویرانی کے مقابلے میں ایک بے جان خاموشی جیسے تھے۔

مگر ایک روز، جیسے قدرت نے اس کی ٹوٹی ہوئی سانسوں میں کوئی نیا رنگ پھونک دیا۔ وہ بس یونہی، رسمی طور پر ایک آرٹ گیلری کے افتتاح پر گیا تھا۔ ہجوم میں ایک چہرہ، ایک آہستہ قدم، ایک خاموش مسکراہٹ اس نے دیکھی۔

جیسے وقت تھم گیا ہو۔

وہ ہاجرہ تھی۔

مرسل کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ رک نہ سکا اور تقریب کی پروا کیے بغیر اس چہرے کے پیچھے چل پڑا۔

مگر لڑکی نے انجان بن کر رخ موڑ لیا۔

مرسل کو دھوکا لگا۔ ''یہ وہ نہیں ہو سکتی۔ یہ ہاجرہ نہیں ہو سکتی۔'' مگر دل گواہی دے رہا تھا۔ ''ہاں یہ وہی ہے۔''

کیپٹن مرسل نے کچھ روز اُس لڑکی کے پیچھے گزارے۔ اس نے اس کا نام معلوم کیا۔ وہ زہرا تھی۔ پیشے سے وہ محقق تھی۔ انسانی حقوق پر تحقیق کرتی تھی۔

زہرا ہر بات میں ہاجرہ جیسی تھی۔ کتابوں سے محبت، بچوں سے انس، سادگی، پاکستان سے محبت اور آنکھوں میں چھپی ہوئی ایک گہری چوٹ۔

مرسل نے آہستہ آہستہ اس سے رابطہ قائم کیا۔

پہلے ایک کانفرنس، پھر ایک لائبریری، پھر ایک کافی شاپ۔

زہرا ہمیشہ مسکرا کر بات کرتی، مگر ایک فاصلہ رکھتی۔

مرسل کو اسے شادی پر راضی کرنے میں ایک سال لگا۔ اسے یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ ایک سال میں بھیم پورہ میں ملٹری آپریشن ہوا تھا۔

شادی سے ایک دن پہلے، مرسل کی ماں اچانک

Digest Novels .com

بیرون ملک آ پہنچی۔
مرسل حیران ہوا۔ ماں نے اسے بٹھایا اور دھیرے دھیرے پردہ چاک کیا۔

''بیٹے، ہاجرہ زندہ ہے۔''

مرسل کی سانس رک گئی۔

''ہمیں علم ہو چکا تھا کہ وہ لالچی سردار ہاجرہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ میں نے خود اعلیٰ قیادت سے درخواست کی۔ میں نے کہا کہ اگر ہاجرہ کو بچانا ہے تو ہمیں ایک ڈراما رچانا ہوگا۔ ہم نے ہاجرہ کی موت کا جھوٹا اعلان کیا۔ ہاجرہ کو مرنے کی اداکاری کرنا پڑی۔ اس کی تدفین کی جھوٹی رسم ادا کی گئی اور نہایت عجلت میں موم سے بنی لاش کی تدفین کی گئی۔ ہاجرہ کو نئی شناخت کے ساتھ خفیہ طور پر بیرون ملک منتقل کر دیا گیا۔ سب کچھ خفیہ تھا۔ تمہارے سائے تک کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ تمہاری اصل اداکاری نہایت ضروری تھی تاکہ سب کو یہ یقین ہو جائے کہ ہاجرہ اب زندہ نہیں رہی۔''

مرسل حیران ہو کر کبھی ماں کو دیکھتا، کبھی زہرا کو۔

''وہ ایک پورا جال تھا۔ میری موت کی خبر سے ان دو سو سرداروں نے سب کچھ بے فکری سے کہنا شروع کر دیا۔ وہ سب کاغذات، رابطے اور پیغامات اکٹھے کیے گئے اور پھر اُن پر ہاتھ ڈالا گیا۔'' ہاجرہ نے کہا۔

مرسل کی آنکھیں نم تھیں۔

ماں نے مسکرا کر کہا۔ ''مرسل۔ یہی زہرا... تمہاری ہاجرہ ہے۔''

مرسل آگے بڑھا اور ہاجرہ کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ''تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

ہاجرہ نے دھیرے سے کہا۔ ''میری ساس نے کہا تھا کہ مرسل کو کچھ نہ بتانا۔ سب کچھ اصلی اور فطری لگنا چاہیے۔ اگر تم مرسل کو بتا دو گی، تو سب کچھ مصنوعی ہو جائے گا۔ دشمن شک کرے گا۔''

مرسل اسے پیار سے دیکھنے لگا۔ ہاجرہ نے کچھ دیر بعد مرسل کو خود سے الگ کیا اور بولی۔ ''میں نے تمہیں روتے دیکھا، تڑپتے دیکھا۔ میری روح بھی روئی مگر میں جانتی تھی کہ اگر ہم کامیاب ہوں گے، تو وہ دو سو سردار بے نقاب ہو جائیں گے۔''

مرسل نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بولا۔ ''اب سب ختم ہو گیا۔ اب تم میرے ساتھ ہو۔''

مرسل اور ہاجرہ اب عوامی خدمت کے ایک نئے سفر پر تھے۔ وہ ایک تعلیمی فاؤنڈیشن بنا چکے تھے۔ وہ دنیا بھر میں گھومتے اور ایک سادہ مگر طاقتور نعرہ لگاتے۔

''ہماری زمین، ہمارا خواب، پاکستان''

ہاجرہ نے نقاب ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اس کی شکل دیکھ کر دشمن اس پر ضرور حملہ کریں گے۔ حجاب میں حفاظت تھی۔

digest library.com

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔

ہاجرہ نے ایک بیٹی اور ایک بیٹے کو جنم دیا۔

کئی سال بعد کیپٹن مرسل صوفے پر بیٹھا، ہاتھ میں چائے کا کپ تھامے ہوئے ٹی وی پر خبروں کا شور سن رہا تھا۔

ایک ٹی وی اینکر غصے سے کہہ رہا تھا۔

''ان سابقہ سرداروں میں سے کچھ نے اب عوامی نمائندگی کے نام پر نئی پارٹیاں بنا لی ہیں، مگر ان کا مقصد ایک ہی ہے۔ ذاتی مفاد!''

کیپٹن مرسل نے چائے کا گھونٹ لیا، لب سختی سے بھینچے اور پھر غصے سے چیخا۔ ''اب بھی باز نہیں آئے! خون چوسنے والے، پاکستان کا نام لے کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔''

اس نے ریموٹ زور سے میز پر پٹخا۔ پھر ریموٹ دوبارہ اٹھایا کہ اچانک دو آوازیں ایک ساتھ کمرے میں گونجیں۔

یہ مرسل کی بیٹی اور بیٹا تھے۔ بیٹی دھیمے احتجاج سے بولی۔

''ابو پلیز! ہماری گریجویشن کی لائیو تقریب لگائیں نا۔''

بیٹا بھی ناراضی سے بولا۔ ''ہم کب سے کہہ رہے ہیں، یہ خبریں بعد میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔''

کیپٹن مرسل نے دونوں کی طرف دیکھا۔ دونوں اپنے کیپس اور گاؤن میں ملبوس، خوشی سے چمکتے ہوئے چہروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

مرسل کے چہرے کی سختی یکا یک نرم پڑ گئی۔

اُس نے ٹی وی چینل بدلا۔ اسکرین پر اب ایک روشن اسٹیج نظر آیا۔ بچوں کی کامیابی کی آوازیں، تالیوں کی گونج۔

مرسل کے چہرے پر دھیمی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے صوفے سے ٹیک لگا لی۔ اسے پیچھے ہاجرہ کے ہاتھوں کا لمس اپنے کندھے پر محسوس ہوا۔

ہاجرہ نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''مرسل! تم دیکھ رہے ہو نا؟ یہ بچے اور یہ تعلیم ہی ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے۔''

❖❖❖